مقالاتِ سلیمان

(حصہ اول)

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

اِنَّہٗ مِنْ سُلَیْمٰنَ وَاِنَّہٗ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سلسلۂ دار المصنفین

(۹۶)

مقالاتِ سلیمان

(تاریخی)

حصہ اوّل

علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے اُن تاریخی مضامین کا مجموعہ جو انھوں نے ہندوستان
کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر لکھے،

مُرتّبہٗ
سید صباح الدین عبدالرحمٰن ایم-اے

در مطبع معارف اعظم گڈھ طبع گردید
(سنہ ۱۹۶۶ء)
(کتبہ اقبال احمد)

۱

۷۸۶

فہرست

مقالات سلیمان

(تاریخی)



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ مرتب

اُستاذی المحترم حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے علم و فن میں بڑی بوقلمونی تھی، وہ نہ صرف ایک عالم دین تھے، بلکہ سیرت نگار بھی، مفسر بھی، محدث بھی، متکلم بھی، ادیب بھی، شاعر بھی، نقاد بھی، اور مؤرخ بھی تھے، مگر وہ اپنے اُستاذ علامہ شبلیؒ کے اس قول کو برابر نقل فرماتے رہتے کہ اصلی فن تو تفسیر، حدیث اور علم کلام ہے، ادب و تاریخ تو علمی دسترخوان کی محض چٹنی ہے، جو زبان کا ذائقہ بدلنے کے لئے دسترخوان پر ہوتی ہے، اسی طرح ادبی و تاریخی مضامین محض علمی ذائقہ بدلنے کے لئے لکھے جاتے ہیں، اُن کا عمل اسی پر رہا، اُن کی عزیز اور بیش قیمت زندگی سیرۃ النبیؐ لکھنے میں صرف ہوئی جس کا شمار اس وقت اسلامی دنیا کی مقبول ترین کتابوں میں ہے، اس شاہکار کے مرتب کرنے میں انھوں نے اس کا اہتمام رکھا کہ اس میں کلام پاک اور حدیث کے علاوہ کسی اور چیز کا حوالہ نہ آئے، چنانچہ انھوں نے اس کتاب کے تقریباً تین ساڑھے تین ہزار صفحات لکھے ہوں گے، لیکن اُس کو کلام پاک کی آیتوں اور حدیث کی روایتوں ہی سے مزین کیا ہے، حتی الوسع کسی مصنف اور کسی تصنیف کا سہارا نہیں لیا ہے، وہ جب کلام پاک کی آیتوں کی تفسیر بیان فرماتے، یا کسی حدیث کی روایت کرتے تو ایسا معلوم ہوتا، کہ دنیا کی لذیذ ترین نعمتیں اُن کے پاس سمٹ کر آگئی ہیں، اُن کا محبوب مشغلہ درسِ قرآن دینا تھا، وہ برابر اُس کا درس دیتے رہتے، کبھی ایسی جگہ ہوتے جہاں درس کا اہتمام

نہ ہوسکتا تو کوئی ایک آدمی بھی مل جاتا تو اُس کا درس شروع کر دیتے، اس درس کو سنتے وقت احساس ہوتا، کہ ان میں علم کی غیر معمولی بصیرت اور بصارت کے ساتھ فکر و نظر کی کتنی بڑی گہرائی، ژرف نگاہی اور باریک بینی بھی ہے، اُن کو ڈاکٹر اقبال نے بجا طور پر علوم اسلام کی جوئے شیر کا فرہاد کہا ہے،

وہ اپنے اصل موضوع سے ہٹ کر جب کبھی ادب و تاریخ کے کسی پہلو پر قلم اُٹھاتے، تو اُن کی فکر و نظر کے جلوے اس میں بھی دکھائی دیتے، اُن کے ادبی مضامین کا مجموعہ "نقوشِ سلیمانی" ہے، جو بہت مقبول ہوا، اُن کی کتاب "خیام" اُن کی ادبی تحقیقات کا ایک شاہکار ہے، اسی طرح "عرب و ہند کے تعلقات"[1] اُن کی تاریخی تحقیقات کا ایک ایسا مایۂ ناز سرمایہ ہے جس پر خود فنِ تحقیق کو ناز ہو سکتا ہے، وہ جب کسی موضوع پر قلم اُٹھاتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ وہ اس عالم رنگ و بو سے ہٹ کر کسی اور عالم میں پہونچ گئے ہیں، جہاں ہر طرف صرف تلاش و تجسس تحقیق و تدقیق اور محنت و ریاضت ہی کی نیرنگیاں کار فرما ہیں، اور ان ہی کی بہار آفریں قوس و قزح میں گم ہو کر اپنی تحریر کو قلم بند فرما رہے ہیں، اُن کی ہر تصنیف اور اُن کا ہر مقالہ اُس کی کھلی شہادت ہے، اُن کا سنجیدہ اور تحقیقاتی رنگ اُن کا اصلی اسلوب بیان ہے جس سے اردو زبان کو بڑا وزن اور وقار حاصل ہوا،

اگر اُن سے پوچھا جاتا کہ کیا تاریخ ان کا محبوب موضوع ہے تو صاف فرما دیتے ہرگز نہیں لیکن اربابِ نظر اُن کو بہت بڑا مورخ بھی سمجھتے رہے، اور جب تک اردو زبان قائم ہے، نہ صرف اُن کی مشہور کتاب "عرب و ہند کے تعلقات" زندۂ جاوید بن کر رہے گی، بلکہ اُن کے تاریخی مقالات کی اہمیت بھی اپنی نوعیت اور افادیت کے لحاظ سے برابر باقی رہے گی، اُن کو مورخانہ فکر و نظر کا جو عطیۂ قدرت کی طرف سے ملا تھا، اس کی بدولت تاریخ کے علاوہ وہ جو چیز بھی لکھتے، اس میں مورخانہ تجسس

---

[1] اس کا انگریزی ترجمہ مجتبیٰ سعید احمد دیسنوی نے کیا، جو ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۳ء کے اسلامک کلچر حیدرآباد دکن کی مختلف اشاعتوں میں شائع ہوا،

کے ساتھ مورخانہ تجزیہ کا رنگ خود بخود پیدا ہو جاتا جس سے اُن کی کتابوں اور تحریروں میں ایک امتیازی شان پیدا ہو جاتی یہی وجہ ہے کہ اُن کی کتابیں ہر طبقہ میں غور اور شوق سے پڑھی جاتی ہیں اور دار المصنفین کی تو وہ راس المال ہیں ؛

اُن کے تاریخی مقالات میں بھی بڑا تنوع ہے، اس وقت ناظرین کے ہاتھوں میں جو کتاب ہے، اُس میں صرف وہ مقالات ہیں، جو ہندوستان کی تاریخ کے کسی پہلو پر وقتاً فوقتاً لکھے گئے، ان میں سے جو بھی مضمون جب لکھا گیا، اُس کی حیثیت قطب نما کی ہوگئی تھی، زیر نظر کتاب کا پہلا مضمون "ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد میں ہندوؤں کی تعلیمی اور علمی ترقی" ہے، یہ ۱۹۱۸ء کے معارف میں ایک سال تک مسلسل شائع ہوتا رہا، اور بہت شوق سے پڑھا گیا، اس مضمون کی اشاعت کے اکیس سال بعد راقم نے اس کا انگریزی ترجمہ کر کے اسلامک کلچر حیدرآباد دکن بھیجا، تو اس رسالہ کے اڈیٹر نے اس کو بہت پسند کیا، اور شکریہ کے ساتھ دو قسطوں (اکتوبر ۱۹۳۸ء و اکتوبر ۱۹۳۹ء) میں شائع کیا، پھر ۲۴ سال کے بعد ۱۹۶۵ء میں اس کا بنگالی ترجمہ مولانا غلام محی الدین اڈیٹر آج ڈھاکہ نے کیا، اس موضوع پر اب بہت کچھ تحقیقات ا ہو چکی ہیں ڈاکٹر سید عبد اللہ اورنٹیل کالج لاہور نے "ادبیاتِ فارسی میں ہندوؤں کا حصّہ" کے نام سے پوری کتاب لکھ کر ڈی لٹ کی ڈگری پائی ہے، انھوں نے اپنی کتاب کے تعارف میں اعتراف کیا ہے کہ

"جب ۱۹۲۸ء میں میرے مخدوم پرنسپل محمد شفیع صاحب اور استاذ محترم پروفیسر محمد اقبال صاحب نے الفرڈ پٹیالہ اسکالر کی حیثیت سے مجھ سے اس مضمون پر کچھ لکھنے کی فرمایش کی، تو میں دیبی پرشاد سائل کی کتاب آثار شعرائے ہنود کے سوا کسی ماخذ سے واقف نہ تھا، جب اس سلسلہ میں میں نے جستجو سے کام لیا، تو معلوم ہوا کہ مولانا سید سلیمان ندوی صاحب اس موضوع پر ایک طویل سلسلۂ مضامین معارف ۱۹۱۸ء میں سپرد قلم کر چکے ہیں جنھیں میں نے اپنے لئے ایک مستقل ماخذ کے طور پر

استعمال کیا،۔۔ ۔۔ ۔۔ اس امر کا اعتراف کیا جاتا ہے، کہ میں نے ان مضامین سے بے حد مدد لی ہے جس کے لئے میں جناب سید صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں"

مقالہ "خلافت اور ہندوستان" اُس وقت لکھا گیا جب ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۱ء میں ہندوستان کے مسلمان بہت ہی پُر آشوب دور سے گذر رہے تھے، پہلی جنگ عظیم کے بعد اسلامی ممالک خصوصًا ترکی پر سخت وقت آیا، اُس کے حصے بخرے کئے جارہے تھے، ترکی کا سلطان قسطنطنیہ میں اتحادیوں کے ہاتھوں بے بس ہو رہا تھا، اتحادی فتح کے غرور اور نشہ میں خدا کی خدائی کی شکست و ریخت میں مصروف تھے، اور ملکوں کی قسمت کا فیصلہ کر رہے تھے، اس وقت ہندوستان کے دردمند مسلمان رہنماؤں نے اپنی جانوں پر کھیل کر ایک خلافت کانفرنس قائم کی جس میں مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی نے ایسی تنظیمی قوت پیدا کر دی کہ پورا ہندوستان اُس کی آواز پر اُٹھتا بیٹھتا تھا، اس تحریک میں سید صاحب بھی پیش پیش ہو کر ترکی کی حمایت میں زبان و قلم اور دعوت و اشاعت سے لڑتے رہے، وہ مولانا شوکت علی اور محمد علی کے ساتھ ایک وفد میں لندن بھی گئے، اور وہاں خلافت و جزیرۃ العرب کے مسائل اور ہندوستان کے مسلمانوں کے جذبات اور اُن کے مذہبی مطالبات کی وضاحت کی، پروفیسر مارگولیتھ اور ایک اطالوی مستشرق سے مسئلۂ خلافت پر علمی نبرد آزمائی بھی ہوئی، اور اس مسئلہ پر مشہور انگریزی مجلہ فارن افیرز میں ایک مدلل اور جامع مضمون لکھا جس کی تعریف مولانا محمد علی نے بار بار کی، وہاں سے واپسی کے بعد خلافت عثمانیہ اور دنیائے اسلام" اور "خلافت اور ہندوستان" کے عنوان سے دو اہم مضامین معارف کے کئی نمبروں میں لکھے جن کو مختلف ناشروں نے علیحدہ علیحدہ رسالوں کی صورت میں بھی شائع کیا، اُن سے تحریک خلافت کو بڑی مدد ملی، ہندوستان اور خلافت جس وقت نظر سے لکھا گیا ہے، اور اُس میں جو تاریخی معلومات ہیں، ان سے ناظرین اب بھی مستفید ہو سکتے ہیں،

(دیبا

مضمون "ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کیونکر ہوئی" معارف کی کئی قسطوں میں شائع ہوا۔ عیسائیوں اور غیر مسلموں کے اس پروپیگنڈے سے کہ ہندوستان میں اسلام تلوار کے زور سے پھیلا خود مسلمان متاثر ہو چلے تھے لیکن جب حضرت سید صاحب کا یہ مضمون معارف میں شائع ہوا، تو مسلمانوں کو ایسا محسوس ہوا کہ اُن کی جھکی ہوئی گردنیں یکایک خوشی بلکہ فخر سے اٹھ گئی ہیں، کیونکہ اسی مضمون کے ذریعہ سے اُن کو معلوم ہوا کہ ہندوستان میں اسلام سلاطین کی تلواروں سے نہیں پھیلا، بلکہ اُس کی ترقی اُن ہی طریقوں سے ہوئی جس سے دنیا میں ہر داعی مذہب کی ہوئی ہے، ہوتی ہے، اور ہوگی، اس مضمون میں جو تاریخی صداقتیں پیش کی گئی ہیں، اُن سے وہ تمام غلط فہمیاں دور ہوگئیں، جو معاند مورخوں اور عیسائی مبلغوں نے پھیلا رکھی تھیں، خواجہ حسن نظامی مرحوم نے تو اس مضمون کو رسالہ کی صورت میں شائع کر کے بڑی کثرت سے تقسیم کرایا، جو ہر جگہ شوق سے پڑھا گیا۔

"لاہور کا ایک فلکی آلات ساز" ہندوستان کے اصطرلاب اور اُن کے صناعوں کی جو تفصیلات پیش کی گئی ہیں، اُن سے حضرت سید صاحب کے ذوق کے تنوع کا اندازہ ہوگا، اُن کو علم ہیئت سے بھی کچھ دلچسپی تھی، مارچ و جون ۱۹۰۹ء کے رسالہ الندوہ لکھنؤ میں اسلامی رصد خانے کے عنوان سے جو مضمون لکھا وہ آج بھی اپنی مفید معلومات کی وجہ سے لائق مطالعہ ہے، اسی دلچسپی کی وجہ سے حضرت سید صاحب نے لاہور کا ایک فلکی آلات ساز" میں عہد مغلیہ میں جو اصطرلاب بنائے گئے، اُن سے متعلق پُر مغز اور دلچسپ معلومات فراہم کئے ہیں، اس مضمون سے جرمنی کے ڈاکٹر فان کلیو بر نے بڑی دلچسپی لی، اور جب راقم کا کیا ہوا اس کا انگریزی ترجمہ اکتوبر ۱۹۳۵ء کے اسلامک کلچر حیدرآباد دکن میں شائع ہوا، تو شکاگو یونیورسٹی کے ایک لائق فاضل نابیا ایبٹ نے اس کو غور سے پڑھا، اور جنوری ۱۹۳۶ء کے اسلامک کلچر میں اس پر ایک استدراک لکھا۔

اس کتاب کا ایک بہت ہی اہم مقالہ "تاج محل اور لال قلعہ کے معمار" ہے، جو ۱۹۳۳ء میں لاہور

میں ادارۂ معارفِ اسلامیہ کے پہلے اجلاس میں ڈاکٹر اقبال کی صدارت میں پڑھا گیا، اس میں پہلی دفعہ پوری تحقیق اور سند کے ساتھ یہ بتایا گیا، کہ تاج محل اور لال قلعہ کا معمار نادر العصر استاد احمد لاہوری (المتوفی ۱۰۵۹ھ) تھا، تاج محل کی تعمیر ۱۰۵۱ھ میں ہوئی، یعنی استاد احمد کی وفات سے نو برس پہلے ختم ہو چکی تھی، اور دہلی کا لال قلعہ ۱۰۴۸ھ سے شروع ہو کر احمد کی وفات سے ایک سال پہلے ۱۰۵۸ھ میں تکمیل پایا، لال قلعہ کی تعمیر میں استاد احمد کا بھائی استاد حامد، اور اس کا لڑکا لطف اللہ مہندس بھی شریک رہا، اس مضمون میں استاد احمد کے لڑکوں کا بھی ذکر ہے، جو تعمیر، ہندسہ اور ریاضیات میں ماہر تھے، انگریز مورخوں نے یہ غلط فہمی پھیلا رکھی تھی کہ تاج محل کو ایک طالوی معمار نے تیار کیا، لیکن اس مقالہ کے بعد یہ غلط فہمی جاتی رہی، ۱۹۵۱ء میں دہلی کے مشہور اخبار اسٹیٹسمین کے کچھ انگریز کالم نویسوں نے پھر بحث چھیڑ دی، کہ تاج محل کے معمار ہندوستان کے نہیں، بلکہ یورپ کے تھے، راقم نے حضرت سید صاحب کے اس محققانہ مضمون کا حوالہ دے کر انگریز کالم نویسوں کی رائے کی تردید کی تو حکومتِ ہند کے آثارِ قدیمہ کے ڈائرکٹر نے بھی تائید کی کہ تاج محل کا معمار ہندوستانی مہندس نادر العصر استاد احمد لاہوری تھا، راقم نے اس مضمون کے بھی انگریزی میں ترجمہ کرنے کی عزت حاصل کی، جو جرنل آف دی بہار ریسرچ سوسائٹی جلد ۳۴ حصہ اول و دوم ۱۹۴۸ء میں چھپا، گو اس کے اڈیٹر نے فارسی ٹائپ کے نہ ہونے کی وجہ سے اس کی فارسی عبارتوں کو حذف کر دیا، جس سے اصل کی شان باقی نہیں رہی، اردو کا یہ مضمون تمام مورخوں کے لئے قیمتی ماخذ بن گیا ہے؛

مقالۂ قنوج" میں یہ دکھایا گیا ہے کہ عرب جغرافیہ نویس اور سیاح سندھ میں جس قنوج کا ذکر کرتے ہیں، وہ کوئی علٰحدہ قنوج نہ تھا، بلکہ وہی قنوج ہے جو موجودہ فرخ آباد کے ضلع میں واقع، اور جو کسی زمانہ میں ہندوستان کی سب سے بڑی راجدھانی تھی، عربوں نے سندھ کی سمت میں جس قنوج کا ذکر کیا ہے، اس سے مقصود سلطنتِ قنوج کا آخری سرحدی مقام تھا، اس کو ثابت کرنے کیلئے

حضرت سید صاحب نے جس غیر معمولی تلاش و تفتیش کا ثبوت دیا ہے وہ مقالہ کے مطالعہ سے اندازہ ہوگا، یہ ادارہ معارفِ اسلامیہ کے تیسرے اجلاس دہلی میں پڑھنے کے لئے لکھا گیا تھا لیکن حضرت سید صاحب اس میں شرکت نہ کر سکے، اس لیے وہاں پڑھا نہ گیا، تو معارف میں شائع کر دیا گیا، اس کا انگریزی ترجمہ جناب سید ابو عاصم ایم اے ال ال بی نے کیا جو اکتوبر ۱۹۴۲ء کے اسلامک کلچر حیدرآباد میں شائع ہوا،

مقالہ ہندی الاصل اور ہندوی النسل مسلمان سلاطین، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن کے ایک توسیعی لکچر کے لئے لکھا گیا تھا لیکن وہاں پڑھا نہ جا سکا، یہ کراچی میں انجمن ترقی اردو کے ایک جلسہ میں ڈاکٹر محمد حسین کی صدارت میں پڑھا گیا، جو اُس وقت حکومت پاکستان کے وزیر تھے، اس میں دہلی، سندھ، ملتان، کشمیر، گجرات، اور دکن کے ایسے سلاطین کا ذکر ہے، جو یا تو ایک طرف سے بیرونی اور دوسری طرف سے ہندی ہیں، یا جو باپ اور ماں دونوں طرف سے ہندی ہیں، اس مقالہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ ہندوستان کے ایسے فرمانرواؤں نے دوسرے بادشاہوں کے مقابلہ میں ہندوستان کی کسی طرح کم خدمت نہیں کی، اس کی تفصیلات ناظرین کے لئے دلچسپ بھی ہیں، اور پُر از معلومات بھی،

اس کتاب میں کچھ ایسے مضامین بھی ہیں، جو بہت مختصر ہیں لیکن اُن سے حضرت سید صاحب کی بالغ نظری اور باریک بینی کا اندازہ ہوگا، ان کا معمول تھا کہ جب کہیں جاتے تو وہاں کے قابلِ ذکر تاریخی مقامات اور کتب خانے کی سیر ضرور کرتے، اور وہاں جوہری بن کر اپنی جوہر شناسی کا ثبوت دیتے، ۱۹۱۶ء میں سرنگاپٹم تشریف لے گئے، تو اُن کے قلم سے "سلطان ٹیپو کی چند باتیں" کے عنوان سے کچھ سطریں نکل پڑیں، جن میں اُن کے کچھ چشم دید مشاہدات اور کچھ تاریخی حقائق ہیں، اسی طرح ۱۹۳۵ء میں بہار کے مشہور تاریخی مقام نالندہ (ضلع پٹنہ) کی سیر کی تو اپنے مضمون "نالندہ کی سیر" میں اس کی تاریخ کے ساتھ بودھ زمانہ کے تمام آثار، مثلاً اس کی آٹھ خانقاہوں، سنگی مندر، رصد خانے اور عجائب خانہ سے متعلق مفید معلومات فراہم کیں، اور اسی مختصر مضمون میں یہ بتایا ہے کہ عام طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ

نالندہ کی خانقاہ مسلمانوں کے زمانہ میں مسلمانوں کے ہاتھوں تباہ ہوئی لیکن یہ صحیح نہیں، کیونکہ کھدائی سے جو عمارتیں نکلی ہیں، وہ برباد کی ہوئی نہیں ہیں، البتہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ محمد بختیار خلجی کے حملۂ بہار کے وقت نالندہ کی حالت ایسی منتشر اور پراگندہ ہوئی کہ پھر اُس کا شیرازہ نہ بندھ سکا،

حضرت سید صاحب نے جب جب جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے کتب خانے کی سیر کی، تو ان کی جوہر شناس نگاہیں کچھ ایسی کتابوں پر پڑیں، جن سے انھوں نے قیمتی تاریخی معلومات حاصل کئے، جیسا کہ ان کے دو چھوٹے مضامین "ہندوکشی عالمگیر کے عہد کی دو عجیب کتابیں"، اور "سند معافی جزیہ" سے ظاہر ہوگا

ہندوستان کی عمومی تاریخ کی تدوین و ترتیب کے متعلق حضرت سید صاحب کا خاص نقطۂ نظر ان کے اُس خطبۂ صدارت سے ظاہر ہوگا، جو انھوں نے دسمبر ۱۹۴۲ء میں آل انڈیا ہسٹری کانگریس کے شعبۂ تاریخ ہند از منہ وسطیٰ (۲۰۶ھ ۱۲۰۶ء تا ۱۵۲۶ء) میں دیا، یہ خطبہ اس کتاب میں ناظرین خود ملاحظہ کریں، اس میں حضرت سید صاحب نے بڑے دکھ کے ساتھ فرمایا ہے، کہ پالٹکس کے کھیل سے اس ملک کا علم تاریخ بھی بچا ہوا نہیں، انگریزوں نے مسلمانوں کی تاریخ الٹ پلٹ کر کچھ ایسی سمجھائی اور پڑھائی کہ جو دل اُن سے ٹوٹے، وہ اب تک نہ جٹ سکے، اور پھر اسی دکھ اور درد کے ساتھ فرمایا کہ اب گو نہ وہ فاتح رہے، اور نہ وہ مفتوح، مگر زمانہ کے تطاول سے اُن کے زمانہ کے پیدا شدہ جذبات کے سوکھ جانے والے درخت کو پانی دے دے کر ہرا کیا جا رہا ہے، اسی لئے اس کانگریس کے مؤرخوں کو مخاطب کر کے فرمایا:-

"مجھے یہ کہنا تھا کہ تاریخ کے فن کو قوموں کے پھوٹ اور میل میں بہت کچھ دخل ہے اسلئے وہ لوگ جنکی نظریں اس ملک کا مستقبل ہے اور جنکے ہاتھوں میں اسکے مستقبل کا بنانا یا بگاڑنا ہے اُن کو اپنی ذمہ داری کو سمجھنا چاہئے اور اس حالت میں جب کہ ہم سب کو معلوم ہے، کہ ہم کو اب اسی ملک میں جینا اور مرنا ہے تو عداوت اور نفرت کی پچھلی باتوں کو اس طرح دہراتے رہنا جس سے یہ جذبہ اسی طرح پلتا

اور بڑھتا، اور پھلتا، اور پھولتا رہے، اپنے ملک کے ساتھ بڑی بے وفائی ہے"

اور پھر آخر میں اپنے دل کی گہرائیوں سے فرمایا:۔

"ہندوستان کی جو تاریخ لکھی جائے اس کا مقصد ہندوستان کے متفرق اجزاء کو باہم جوڑنا ہو، توڑنا نہ ہو، حال کو ماضی کی ناگواری کی تلخی کو بڑھا کر کیوں برباد کیا جائے، اور کیوں مستقبل کے لئے یہ کوشش جاری رہے، کہ وہ کبھی خوش آیند نہ ہو سکے"۔

حضرت سید صاحب کے حکم سے راقم نے اس خطبہ کا انگریزی ترجمہ کیا، جو اجلاس میں پڑھا گیا، پھر اس کانگریس کی روداد میں شامل کیا گیا، یہ خطبہ اسی زمانہ میں مدراس کے اخبارات ہندو اور دکن ٹائمس، پھر کلکتہ کے اسٹار آف انڈیا اور مارننگ نیوز میں بھی شائع ہوا، دارالمصنفین میں ہندوستان کی تاریخ کی تدوین و ترتیب کا جو سلسلہ جاری ہے، اس کے لئے یہ مشعل راہ بنا ہوا ہے،

اس خطبہ کے دینے سے پہلے بھی حضرت سید صاحب کو برابر اس کا دکھ رہا کہ اسکولوں کالجوں میں تاریخ ہند کی تعلیم سے فوائد کے بجائے نقصانات پہونچ رہے ہیں، اگست ۱۹۳۲ء کے معارف کے شذرات میں تحریر فرمایا:۔

سرکاری مدارس میں تاریخ ہند کی تعلیم کا اضافہ بظاہر علم کے اضافہ کے لئے ہو گر درحقیقت یہ اقوام ہند میں قدیم اختلافات و نزاعات کے اضافہ کرنے کے لئے کیا گیا ہو حالانکہ ہندوستان کو آگے چلنا ہے تو پیچھے پھر کر دیکھنا نہیں چاہئے آج اس بحث سے کہ سلطان محمود کا حملہ ہندوستان پر جائز تھا یا ناجائز اور شہاب الدین غوری نے کتنے مندر غارت کئے، اور عالمگیر نے ہندوؤں پر کیا کیا ظلم کئے، سوراج کی منزل میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتا، کیا ہمارے ہم وطن اس نکتہ کو سمجھنے کی کوشش کریں گے"؟

اسی شذرات میں یہ بھی فرمایا:۔

"ہماری یونیورسٹیوں کی تاریخ ہند کی کتابوں میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسی ہی باتیں جمع کی جاتی ہیں، جن سے ان دونوں قوموں (مراد ہندو مسلمان) کے جذبات میں مزید اشتعال پیدا ہو، اور اس کا اتفاق آیندہ مشکل سے بڑھ کر محال ہو جائے، حالانکہ اس ملک کی تاریخ میں ایسے واقعات کی بھی کمی نہیں، جن کے پڑھنے سے ان دونوں قوموں کے درمیان اختلاط و محبت کے جذبات پیدا ہوں، مگر بازاری قدر دانی کے تابع مصنف و کتب فروش اپنی ذاتی عارضی کامیابی کے مقابلہ میں ملکی اور قومی بھلائی کی قیمت کی پروا نہیں کرتے"

معارف کے ان شذرات کو پڑھ کر پونہ سے حضرت سید صاحب کے ایک دوست پروفیسر شیخ عبدالقادر نے ان کو لکھا کہ ان تلخیوں کو دور کرنے کے لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمانان ہند کی صحیح اور اصلی تاریخ کا حقہ معاصرین اور متاخرین کے لئے درست کریں، شے کہن سے نئی بوتلیں بھر کر شراب طہور کو جدید کاسوں (مزاجھا کافوراً) انڈیلیں. (دیکھئے معارف نومبر ۱۹۳۲ء) حضرت سید صاحب نے اس کے جواب میں معارف کی اسی اشاعت ہی میں تحریر فرمایا، کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ **ہندوستان کی ایک محقق تاریخ لکھنا آج مسلمانوں کا سب سے بڑا فرض ہے**، دارالمصنفین اس کے لئے اپنے مقدور بھر سب کچھ کرنے کو تیار ہے لیکن ضرورت ہے کہ دوسرے دردمند اہل علم بھی ہمارے کاموں میں حصہ لیں اور اپنی سعی و تحقیق سے ممنون فرمائیں، اور پھر ایک بزم تاریخ ہند کی تشکیل کی، اور اس میں شرکت کرنے کے لئے پروفیسر شیخ عبدالقادر پونہ، پروفیسر محمد حبیب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، پروفیسر ہارون خاں شروانی حیدرآباد دکن، پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی، اسماعیل کالج بمبئی، مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی، مولف تاریخ گجرات احمدآباد، ڈاکٹر محمد ناظم محکمۂ آثار قدیمہ دکن، پروفیسر سید عبدالقادر، اسلامیہ کالج لاہور، حکیم سید شمس اللہ قادری حیدرآباد دکن، مولوی سید ہاشمی فریدآبادی، مولوی سید مقبول احمد صاحب صمدنی مؤلف حیات جلیل، مولوی

اکبر شاہ خاں صاحب نجیب آبادی، مؤلف آئینۂ حقیقت، علامہ عبد اللہ یوسف علی، ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ لاہور نے اپیل کی،

یہ اپیل بڑی گرمجوشی کے ساتھ سنی گئی، اور مختلف سمتوں سے خطوط آئے، کہ یہ کام ضرور شروع کیا جائے لیکن اس کے شروع کرنے میں جو دقتیں تھیں، اُن کی طرف حضرت سید صاحب نے دسمبر ۱۹۳۴ء کے معارف میں تو یہ لکھ کر توجہ دلائی، کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد اور سلاطین اسلام کی بادشاہی وحکومت اور مسلمانوں نے اس ملک کو جو ترقی دی، اور یہاں جو تمدن پیدا کیا، اُن سب کی ایک مفصل اور مکمل تاریخ کی ضرورت تاریخی علمی، قومی، سیاسی ہر حیثیت سے روز بروز بڑھتی جاتی ہے، لیکن یہ کام اس قدر اہم ہے کہ اس کو صرف شخصی ہمت سے انجام دینا مشکل ہے، ارباب نظر کی نگاہیں اس کے لئے برابر دار المصنفین پر پڑ رہی ہیں، دار المصنفین نے اب تک اس خدمت کے انجام دینے سے اس لئے پہلوتہی کی، کہ اس کے لئے گراں قدر مصارف کی ضرورت ہے، جس کے لئے دار المصنفین کا موجودہ سرمایہ کافی نہیں" حضرت سید صاحب نے اس کام کے سلسلہ میں بتایا کہ تاریخ ہند کے غیر مطبوعہ قلمی نسخے حاصل کئے جائیں، تاریخ ہند پر انگریزی میں جتنی کتابیں لکھی جا چکی ہیں، وہ خریدی جائیں، جن قلمی نسخوں کا حاصل کرنا ممکن نہ ہو، اُن کے مطالعہ کے لئے مصنفین سفر کریں، پھر کتاب کی ترتیب و تدوین کیلئے لائق اشخاص کی خدمات مناسب معاوضہ پر حاصل کی جائیں،

ان کا خیال تھا کہ تاریخ ہند کی تدوین پندرہ حصوں میں کی جائے جن میں عربوں، غزنویوں، غوریوں، خلجیوں، تغلقوں، لودیوں، مغلوں کے علاوہ، دکن، گجرات، مالوہ، خاندیس، کشمیر، ملتان، جونپور، بنگال، حیدرآباد، مرشد آباد، عظیم آباد، اودھ، روہیلکھنڈ، میسور، اور ارکاٹ، وغیرہ کے مسلمان فرماں رواؤں کی تاریخ قلمبند کی جائے لیکن انھوں نے زیادہ تر علمی، ثقافتی اور تمدنی تاریخ لکھے جانے پر زور دیا،

۱۹۳۴ء کی ارزانی کے زمانہ میں حضرت سید صاحبؒ کا خیال تھا کہ یہ کام سترہ ہزار میں پورا ہو جائیگا، اس اپیل پر نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی نے ایک سال تک پچاس روپیے ماہوار دینے کا وعدہ فرمایا، اور خان بہادر مولوی محمد حسین خاں صاحب سابق ڈپٹی اکونٹنٹ گورنمنٹ آف انڈیا، وسابق فنانس منسٹر رامپور نے پانچ سو یکمشت عطا کیا، اسی قلیل رقم سے حضرت سید صاحب نے کام شروع کر دیا، اور جن اصحاب سے حضرت سید صاحب نے قلمی اعانت کی اپیل کی تھی، انھوں نے خاموشی اختیار کر لی، خود مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی کو احمد آباد سے دار المصنفین بلایا گیا، کہ یہ کام جاری ہو جائے، اور مولانا عبد السلام ندوی مرحوم کو ہندوستان کی تمدنی تاریخ لکھنے کو کہا گیا،

راقم اس زمانہ یعنی ۱۹۳۴ء میں علی گڈھ سے تعلیم سے فارغ ہو کر جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں پروفیسر محمد مجیب کی نگرانی میں تاریخ ہند پر کچھ کام کرنے چلا گیا تھا، ۱۴ دسمبر ۱۹۳۴ء میں حضرت سید صاحب نے ایک مکتوب میں کچھ اور باتوں کے علاوہ یہ تحریر فرمایا،

"دار المصنفین میں تاریخ ہند کا کام شروع کر دیا گیا ہے، تم کو تاریخ ہند سے دلچسپی رہی ہے، اور یہ ذوق تم نے اپنے والد مرحوم سے وراثت میں پایا ہے، ان سے مجھکو بڑا لگاؤ تھا، ان کی جوانی کی موت بھلائی نہیں جاتی،[1] اس لگاؤ کی بنا پر تمھاری طرف میری نظر برابر اٹھتی رہی، دار المصنفین پیسے کمانے کی جگہ نہیں، اس لئے یہاں تم کو بلانے میں تامل رہا، کیونکہ اور نوجوانوں کی طرح تم کو بھی اچھی ملازمت حاصل کرنے کا حوصلہ ہوگا، لیکن تم پسند کرو، تو یہاں آجاؤ، اور تاریخ ہند کے کاموں میں حصہ لو، ابھی بلا شرط آؤ، میری طرف سے بھی کوئی شرط نہیں، تم یہاں آکر کچھ دنوں رہو، یہاں کے کاموں میں تمھارا جی لگے، اور تم یہاں رہنے پر رضامند ہو جاؤ"

---

[1] راقم کے والد بی، اے، پاس ہونے کے بعد ڈپٹی کلکٹری کے لئے نامزد کرلئے گئے تھے، لیکن اس عہدہ پر مامور ہونے سے پہلے وفات پاگئے،

تو دارالمصنفین اپنی بساط کے مطابق تمھاری کچھ مالی خدمت بھی کر دے گا لیکن جو زیادہ سے زیادہ خدمت کر سکتا ہے اس کا اندازہ تم کو پہلے سے ہے،......" (حضرت سید صاحب نے اس خط میں ہر جگہ آپ لکھا تھا، لیکن راقم نے اس کو تم بنا دیا ہے)

اس مکتوب نے میری زندگی کا رُخ بدل دیا، حضرت سیّد صاحب کا شاگرد بننے کی بڑی آرزو تھی، یہ آرزو پوری ہوتی نظر آئی اس لئے جنوری ۱۹۳۵ء میں جامعہ ملیہ دہلی سے دارالمصنفین چلا آیا، اس سے پہلے بھی یہاں کئی بار آچکا تھا لیکن اس مرتبہ اس کی سرزمین جنتِ ارضی اور اس کی ہر چیز زندگی سے معمور نظر آئی، شاید اس لئے کہ یہاں پوری زندگی گذارنی تھی، حضرت سیّد صاحب بھی میرے آجانے سے خوش تھے،

دوسرے دن اُن کی میز کے قریب جاکر بیٹھا تو انھوں نے تاریخ ہند کی اسکیم بتا کر فرمایا کہ تم ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے فوجی نظام پر مواد جمع کرو، عرض کیا کہ یہ میرے لئے دشوار اور خشک موضوع ہے، فرمایا کہ دشوار گذار راہیں طے کرنے کے بعد ہی تحقیق کے رموز سے واقف ہوگے، حکم تھا اس لئے تعمیل میں لگ گیا لیکن میرے کام کی رفتار بہت سُست رہی، اور سچ تو یہ ہے کہ چار پانچ سال تک حضرت سیّد صاحب کی نگرانی میں قلم پکڑنا سیکھتا رہا، اور جب کچھ کام کرنا سیکھا تو ۱۹۴۱ء میں یکایک صحت خراب ہوگئی، اور کئی سال تک پریشان رہا، میری علالت کی داستان دکھ بھری ہے، اور یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ حضرت سیّد صاحب کی دعاؤں کی بدولت صحت ہوگئی، انھوں نے بہت سی دعائیں ورد کرنے کے لئے لکھ بھیجیں، اور ایک بار یہ بھی تحریر فرما کر دل بڑھایا کہ

"......تم ہر وقت یاد آتے ہو تم کو اللہ تبارک تعالیٰ دارالمصنفین ضرور واپس بھیجے گا، ابھی تم سے بہت کچھ کام لینا ہے، میں تمھارے لئے برابر دعائیں کرتا رہتا ہوں عجل اللہ"

شفاء کلی، ہاں بھائی، مولانا (یعنی مولانا اشرف علی تھانویؒ) نے بھی تمھارے لئے دعا کی، یہ بھی پوچھا کہ کیا بیمار ہیں، پھر دعا فرمائی، مولانا عبد الماجد نے تمھارے لئے تعویذ بھی ہے، جو بھیج رہا ہوں......"

اسی خط میں لکھا کہ

"تم جب سے گئے ہو تاریخ ہند کا کام بالکل رکا ہوا ہے، تم آؤ تو پھر یہ کام شروع ہو"

حضرت سید صاحب کے اس قسم کے شفقت آمیز خطوط دوا اور علاج سے زیادہ موثر ثابت ہوئے، تاریخ ہند کے کام رک جانے کی وجہ یہ ہوئی، کہ مولانا ابوظفر ندوی مرحوم، تاریخ سندھ اور پھر غزنویوں اور غوریوں پر ایک جلد لکھکر احمد آباد چلے گئے، مولانا عبد السلام ندوی مرحوم نے ہندوستان کی تمدنی تاریخ پر کچھ ابواب بہت اچھے لکھے تھے، لیکن پھر ان کا اشہب قلم دوسرے میدان کی طرف چل نکلا، تو اس طرف متوجہ نہیں ہوئے، ملک کے جن اصحاب قلم سے اس اسکیم میں شرکت کرنے کی امید تھی، انھوں نے پہلوتہی کی، صرف دارالمصنفین کے اندر ہی یہ کام محدود ہو گیا، اور رفقا دوسرے کاموں میں لگے ہوئے تھے، اس لئے یہ راقم ہی تاریخ ہند پر کچھ خامہ فرسائی کرتا رہا،

۱۹۴۴ء تک آتے آتے اپنی صحت کی خرابی کے باوجود ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کا فوجی نظام پر کام کسی طرح ختم کیا، حضرت سید صاحب نے اگست ۱۹۴۴ء کے معارف کے شذرات میں یہ لکھ کر میری ہمت افزائی کی،

" دارالمصنفین کی مجوزہ تاریخ ہند کے متعدد حصے تکمیل پا چکے ہیں، اس سلسلۂ تاریخ کا اہم مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کے ان تمدنی، صنعتی، علمی، اور فنی کارناموں کو دکھایا جائے، جن سے یہ معلوم ہو کہ ہندوستان کی تعمیر میں ان کی کوششوں کو کہاں تک دخل ہے، اس ضمن میں ایک پوری جلد ہندوستان میں مسلمانوں کی فوجی وعسکری تنظیم پر ہے، جس کو ہمارے

رفیق سید صباح الدین عبدالرحمن، ایم اے نے کئی سال کی تلاش و محنت میں ترتیب دیا ہے، یہ کتاب ابھی اُن کے قلم سے پوری ہو کر ختم ہوئی ہے۔"

یہ کتاب ۱۹۴۴ء میں ختم ہونے کو تو ہو گئی تھی، پھر بھی اُس کے بعض ابواب میں اضافہ کی ضرورت تھی، اس لئے اُس کی طباعت و اشاعت میں عجلت نہیں کی، اسی اثنار میں میری پہلی اہلیہ کی اچانک وفات، گھر کے اور بزرگوں اور سرپرستوں کی المناک موت سے میری صحت اور بھی زیادہ بگڑ گئی، اور دنیا میرے لئے تنگ اور تاریک ہو گئی، تاریخ ہند کا کام بھی بالکل رُک گیا، دارالمصنفین ۱۹۴۷ء عیسوی تک اس سلسلہ میں مولانا ابوظفر ندوی صاحب مرحوم کی صرف ایک کتاب تاریخ سندھ شائع کر سکا، جو بہت پسند کی گئی، مولانا ابوظفر ندوی صاحب نے غزنویوں اور غوریوں کی جلد کی طباعت رکوا دی، کہ اس میں وہ مزید اضافہ کرنا چاہتے تھے۔

علاج کے مختلف مراحل طے کر کے ۱۹۴۷ء کے اگست میں دارالمصنفین لوٹا تو حضرت سید صاحب اس وقت بھوپال میں تشریف فرما تھے، انھوں نے ایک مکتوب میں مورخہ ۲۸ رمضان المبارک ۱۳۶۶ھ میں تحریر فرمایا،

"میں بہت خوشی سے تمھارا احاطہ دارالمصنفین میں خیر مقدم کرتا ہوں، میرے ساتھ دارالمصنفین کے تمھارے احباب بھی بے چینی سے تمھارے منتظر تھے، بے شبہ تمھارے علاج میں بہت روپیہ خرچ ہوا لیکن

قیمتِ خود ہر دو عالم گفتۂ ‏ ‏ ‏ ‏ نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

اللہ تعالیٰ تم کو صحت و عافیت کے ساتھ تا دیر دارالمصنفین کی خدمت کا موقع دے، اب تم سے اور برادرم شاہ معین الدین ہی سے ساری امیدیں وابستہ ہیں، تم لوگوں کو دارالمصنفین کے چراغ کو ہر طرح روشن رکھنا ہے، اور ہاں بھائی اب پورے عزائم کے ساتھ تاریخ ہند کے

سلسلہ کو بھی جاری رکھو، اللہ تبارک تعالیٰ پورا فرمائیں؛ آمین"

اس محبت نامہ نے حوصلہ بڑھایا، اور تاریخ ہند کے کاموں میں منہمک ہو گیا، حضرت سید صاحب کے حکم سے ۱۹۴۸ء میں راقم کی کتاب بزم تیموریہ اور ۱۹۴۹ء میں بزم صوفیہ شائع ہوئیں، اُن میں حضرت سید صاحب کو بزم صوفیہ زیادہ پسند تھی، اور یہی پسندیدگی میری محنت کا اصلی صلہ تھا، انھوں نے اس پر ایک مقدمہ بھی لکھنے کی خوشخبری دی تھی لیکن وہ حج کے لئے تشریف لے گئے، اور وہاں سے آکر بمبئی میں علیل ہو گئے تو اُن ہی کے حکم سے اُس کی اشاعت میں تاخیر نہ کی گئی، اور شائع کر دی گئی، بزم تیموریہ میں حضرت سید صاحب کا ایک دیباچہ بھی ہے لیکن اس کی اشاعت کے بعد ایک گرامی نامہ مورخہ ۳۰ دسمبر ۱۹۴۸ء میں تحریر فرمایا:۔

"خوشی ہوئی کہ تمھاری کامیاب تصنیف بزم تیموریہ اہل ذوق کو پسند آرہی ہے، مجھکو پہلے بزم تیموری پسند نہیں تھی، کیونکہ میں اُن کو عیش و تنعم کا دلدادہ، شراب و کباب کا متوالا، حسن و عشق کا پرستار، نقش و تصویر اور سرود و ساز کا دمساز ہی سمجھتا رہا، لیکن جو تصویر تم نے کھینچی ہے، وہ نہایت عمدہ ہے، اور مصور کے کمالات تعریف کے مستحق ہیں،

اور جب بزم صوفیہ چھپ کر ان کے پاس پہونچی تو انھوں نے یہ تحریر فرما کر محض اپنی شفقت و محبت کا اظہار کیا:۔

"تمھاری یہ کتاب انشاء اللہ مفید ثابت ہوگی، کیونکہ اس کا انداز اصلاحی ہے، اور بابرکت بھی ہے، مصنف کے لئے باعث خیر اور موجب اجر ہوگی، انشاء اللہ تعالیٰ

تاریخ ہند کے سلسلہ کی تکمیل کے لئے جس سرمایہ کی ضرورت تھی، وہ اب تک کہیں سے نہیں ملا، اور نہ کسی گوشہ سے قلمی اعانت حاصل ہوئی، ۱۹۴۹ء میں حضرت سید صاحب بھوپال سے اپنے وطن دیسنہ تشریف لائے، تو اُن کے ساتھ کافی دنوں تک رہنے کا موقع ملا، وہ تاریخ ہند

کے کاموں کی سست رفتار سے بددل تھے لیکن ان کو تمام مجبوریوں اور مشکلوں کا بھی احساس رہا، ایک روز فرمانے لگے :-

"میں تو چراغ سحری ہوں، شاہ معین الدین صاحب دارالمصنفین کے اور کاموں میں لگیں گے اب تم ہی کو تاریخ ہند کے سلسلہ کو مکمل کرکے ان کے چھپوانے کا بھی انتظام کرنا ہے"

ان فقروں کے بارے دب کر رہ گیا، اسی سلسلہ میں انھوں نے فرمایا کہ اب سیاسی واقعات کی کھتیونی کے بجائے مسلمانوں کے دور کے تمدنی، ثقافتی، علمی، معاشرتی، اقتصادی وغیرہ حالات پر لکھنے کی زیادہ ضرورت ہے، اسی دوران گفتگو میں یہ سوال آگیا کہ کیا ہندوستان کے سلاطین اسلام کے نمایندے تھے، حضرت سید صاحب نے فرمایا کہ وہ نمایندے نہ تھے، اور دلائل میں وہی باتیں کہیں جو انھوں نے آل انڈیا ہسٹری کانگریس کے شعبۂ تاریخ ہند ازمنۂ وسطیٰ کے خطبۂ صدارت میں کہی تھیں، جو اس کتاب میں شامل ہے، یعنی یہ کہ اُن کی حکمرانی کا طرز اور فرماں روائی کا اصول خالصۃً اسلامی نہ تھا، اور نہ اُن کے سپہ سالار اور فاتح اپنے مفتوحہ علاقوں کے ساتھ اسلامی طریقہ کا پورا پورا برتاؤ کرتے تھے، اُن کے صلح و جنگ، فتح و غنیمت اور محاصل و مداخل کے اصول بھی اسلامی نہ تھے، راقم الحروف نے مودبانہ طور پر عرض کیا کہ یہ صحیح ہے کہ وہ اسلام کے نمایندے نہ تھے لیکن غیر مسلم انہی کی تاریخ کو اسلامی تاریخ سمجھتے ہیں، ہمارے صوفیہ، علما اور صلحا کے کارناموں کو وہ ہماری مذہبی سرگرمیاں سمجھکر پڑھنے کے لئے تیار نہیں، اس کے علاوہ یہ سلاطین اسلام کے نمایندے تو نہ تھے لیکن انہی کی وجہ سے یہاں علما، صلحا، اور مشائخ کو قدم جمانے کا موقع ملا، اور گو اُن کے درباروں کی فضا اسلامی نہیں رہی، لیکن انہی کے سہارے اس سرزمین میں اسلام پھل پھول سکا، اور گو انھوں نے تبلیغ اسلام کی کوئی کوشش نہیں کی، لیکن ان ہی کی بدولت مبلغین اسلام کی کوششیں بار آور ہوتی گئیں، اور گو وہ اوامر و نواہی کے تو زیادہ پابند نہیں رہے، لیکن جہاں حمیت اسلام کا سوال پیدا ہوتا، یا

اُن کی دینی غیرت ضرور بروے کار آجاتی، حضرت سید صاحب نے مجھکو روکتے ہوئے فرمایا جو کچھ کہتے ہو صحیح ہے، اس سے اختلاف نہیں، ایک زمانہ تھا کہ میں بھی شاہانِ اسلام کو اسلام کا نمایندہ اور اس کی شان و شوکت کا حامل سمجھتا تھا، اور ان کی مدح و ستایش کیا کرتا تھا، اب جب سے یہ نکتہ حل ہوا کہ اکثریت ان میں اُن کی ہے جن پر بدنام کنندۂ نکونامے چند کی مثل پوری ہوتی ہے، تو ان کو اسلام کا نمایندہ سمجھنے سے دل ہٹ گیا، لیکن یہ دینی جذبہ ہے اور ذوقی بات ہے، ذوق بھی یکساں ہمیشہ نہیں رہتا، یہ بھی بچہ، جوان، اور بوڑھا ہوتا ہے، میں نے بچپن میں ناول بہت پڑھے، مگر مشغلۂ علمی کے بعد یہ حال ہوگیا کہ ان کے پڑھنے کو جی نہیں چاہتا، اس کے یہ معنی نہیں کہ اب افسانے اور ناول نہ لکھے جائیں، لکھے جائیں گے، اور وہ پڑھے جائیں گے، اور لکھنے والوں کو مبارک باد بھی ملے گی یہی حال اب سلاطین کی تاریخ کا ہے، وہ ضرور لکھی جائے، اور آخر میں مجھکو مخاطب کرکے فرمایا کہ انشاء اللہ تم بھی بوڑھے ہوگے، تو تمھارا ذوق جوان ہوگا،

حضرت سید صاحب کی یہ گفتگو برابر یاد آتی ہے، اسی زمانہ میں انھوں نے اصرار کرکے میری دوسری شادی کرادی تاکہ میری زندگی میں میری تنہائی کی وجہ سے جو غمناکیاں اور تلخیاں ہیں، وہ دور ہوجائیں، میری اس نئی زندگی کے لئے انھوں نے جو دعائیں فرمائیں، وہ میری زندگی کا بہت ہی بیش بہا سرمایہ ہیں،

جون ۱۹۵۰ء میں حضرت سید صاحب بھوپال سے دارالمصنفین تشریف لائے، تو اُس وقت وہ کچھ ایسی ذہنی پریشانیوں میں مبتلا ہوگئے، جن سے نہ صرف اُن کی بلکہ دارالمصنفین کی زندگی کا بھی رُخ بدل گیا، اس مرتبہ دارالمصنفین آکر یہاں سے جو تشریف لے گئے تو دارالمصنفین کے علمی تاج کو پھر کسی نے چاندنی رات میں نہیں دیکھا،

مارچ ۱۹۵۳ء میں حضرت سید صاحب پاکستان ہسٹاریکل کانگریس کی صدارت کے بعد ڈھاکہ

سے کراچی جاتے ہوئے ہندوستان بھی آئے، اور اپنے داماد سید حسین صاحب قائم مقام کلکٹر فتح پور (یو۔پی) کے یہاں ٹھہرے، دارالمصنفین سے ایک مختصر قافلہ اُن سے ملنے گیا، یہ راقم بھی ساتھ تھا، یہ ہم لوگوں کی آخری ملاقات تھی، جہاں دارالمصنفین کے اور تمام کاموں کی تفصیل پوچھی، وہاں تاریخ ہند کے سلسلہ کا بھی ذکر آیا، کام کچھ آگے نہ بڑھا تھا، پھر بھی حوصلہ افزائی کی خاطر مجھ سے فرمایا کہ اب یہ کام تم ہی کو انجام دینا ہے، اسی زمانہ میں معارف میں "ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کی ایک ایک جھلک" کے عنوان سے میرا ایک سلسلۂ مضمون جاری تھا، فرمایا یہ دلچسپ چیز ہے، اس کو کتاب کی شکل میں شائع کر دینا، آج کل ایسی چیزوں کی ضرورت ہے، یہ ہمت افزا فقرے میری محنت کے اصلی ثمر تھے،

۲۳ نومبر ۱۹۵۳ء کو حضرت سید صاحب کی رحلت کی خبر ملی تو ایسا معلوم ہوا کہ اب میری علمی زندگی کا بھی خاتمہ ہو گیا، کیونکہ وہ دارالمصنفین سے دور بھی رہے تو بھی دارالمصنفین میں چلتے پھرتے اور ہماری کاموں کی نگرانی کرتے نظر آتے، اور ہم جو بھی تحریر لکھتے خیال چھایا رہتا، کہ اس پر اُن کی نظرِ احتساب ضرور پڑے گی، وہ خامیوں کی گرفت کریں گے، اور خوبیوں کو دیکھ کر حوصلے بڑھائیں گے، ان کے وصال سے ایسا معلوم ہوا کہ علم و فضل و کمال کا سایہ ہم پر سے جاتا رہا، حوصلے پست ہو گئے، قلم کی رفتار رک گئی لیکن جب اُن کی وصیت کا خیال آتا تو از سرِ نو حوصلہ پیدا ہوتا،

۱۹۵۴ء میں راقم کی ایک کتاب بزم مملوکیہ شائع ہوئی، جس سے اس سلسلہ کا کام کچھ تو آگے ضرور بڑھا لیکن یہ خاطر خواہ نہ تھا، "ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کا فوجی نظام" ختم تو ہو چکی تھی، لیکن پھر بھی اس کو طبع کرانے میں تامل تھا کیونکہ اس کی بعض باتیں اب بھی تشنہ تھیں، اس اثنا میں مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی اپنے خطوط میں اس سلسلہ کی تکمیل کے لئے ہر طرح کی ہمت دلاتے رہے، اور ایک جلد "گجرات کے سلاطین کی تمدنی تاریخ" لکھ کر بھیجی لیکن مئی ۱۹۵۵ء میں اُن کا یکایک انتقال ہو گیا، تو میری بڑھی ہوئی ہمت پھر چھوٹ گئی، ان سے مفید مشورے ملتے رہتے، اور ان سے

قلمی اعانت کی بھی امید رہتی، انھوں نے غزنویوں اور غوریوں پر جو جلد لکھی تھی، اس پر نظر ثانی بھی نہ کر سکے،

۱۹۵۰ء ہی میں میری ایک اور کتاب "ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کی ایک ایک جھلک" شائع کی گئی جس سے کچھ تھوڑا کام اور آگے بڑھا، ڈاکٹر سید محمود صدر مجلس انتظامیہ دار المصنفین سابق وزیر امور خارجہ حکومتِ ہند کو تاریخ ہند سے شغف رہا ہے، میری درخواست پر انھوں نے دار المصنفین کے اس سلسلہ کی تدوین میں دلچسپی لی، اور اس کی دس جلدوں کی جلد از جلد اشاعت کا ایک پروگرام بنوایا، اور مولانا ابو الکلام آزاد وزیر تعلیمات حکومتِ ہند کے سامنے پیش کیا گیا، اس کو دیکھ کر انھوں نے پسند فرمایا تو ان سے مالی امداد کی بھی درخواست کی گئی، اس وقت حکومتِ ہند کی وزارتِ تعلیمات کے سکریٹری جناب خواجہ غلام السیدین تھے، انھوں نے مفید مشورے دیئے لیکن مولانا ابو الکلام آزاد کی وزارت کی طرف سے ابھی مالی امداد کی منظوری ہونے نہیں پائی تھی کہ وہ رحلت فرما گئے، اُن کے بعد اُن کی وزارت کے جانشین جناب ہمایوں کبیر صاحب نے اس پروگرام سے دلچسپی لی، اور اپنی علم دوستی سے اپنی وزارت کی طرف سے مالی امداد دلائی جس سے ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۲ء تک حسب ذیل چھ کتابیں شائع ہو سکیں (۱) ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کا فوجی نظام (۲-۳) ہندوستان عربوں کی نظر میں جلد اوّل و دوم (۴) گجرات کی تمدنی تاریخ مسلمانوں کے عہد میں (۵) ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے، (۶) ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی کارنامے، ان میں "ہندوستان عربوں کی نظر میں" جناب شاہ معین الدین صاحب ندوی ناظم دار المصنفین نے اپنی نگرانی میں رفقائے دار المصنفین مولوی ضیاء الدین اصلاحی اور حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی سے تیار کرائی، اور اُس کے مسودہ کی نظر ثانی کرنے میں اپنا کافی وقت صرف کیا، ان کو بھی اب لگن پیدا ہو گئی ہے کہ اس سلسلہ کا کام خاطر خواہ

طور پر آگے بڑھے، اُن کے کام کا دائرہ الگ ہے لیکن ناظم دارالمصنفین کی حیثیت سے وہ میری ہمت برابر بڑھاتے رہتے ہیں، "ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی کارنامے" میں ایک باب خطاطی پر لکھ کر اس جلد کی تکمیل میں مدد بھی پہونچائی ہے،

ان جلدوں کی تدوین کے سلسلہ میں مختلف یونیورسٹیوں کے پروفیسروں کے پاس پہونچکر ان سے قلمی اعانت کا خواستگار رہا لیکن پروفیسر محمد مجیب جامعہ ملیہ کے علاوہ کہیں سے تعاون حاصل نہ ہوسکا، البتہ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نائب صدر جمہوریہ ہند سے جب جب ملنے کا موقع ملا تو اس کام کو جاری رکھنے کی ہمت برابر بڑھاتے رہے، اور اپنے ایک گرامی نامہ میں تحریر فرمایا

وائس پریسیڈنٹ

انڈیا

نئی دہلی

مورخہ ۱۶؍ دسمبر ۱۹۶۳ء

....

السلام علیکم:- مطبوعاتِ دارالمصنفین کی دو جلدیں (ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے اور ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی کارنامے) مجھے ملیں، جستہ جستہ دیکھ رہا ہوں، بہت خوب کام ہے، اس عہد کی تمدنی تاریخ پر بہت اچھی اور تفصیلی معلومات کا ذخیرہ ہے یہ دونوں کتابیں آپ جس مستعدی اور یکسوئی سے اپنے استاد مرحوم کے تفویض کردہ کام کی تکمیل کر رہے ہیں، اس پر بے ساختہ دل سے صدائے آفرین نکلتی ہے، مبارک ہو"

والسلام

مخلص" ذاکر حسین"

اس گرامی نامہ کے سرنوشت میں ڈاکٹر صاحب نے مجھکو جن الفاظ سے یاد کیا تھا، وہ میرے درجہ سے زیادہ ہے، اس لئے اُن کو حذف کر دیا ہے،

فروری ۱۹۶۵ء میں دارالمصنفین کی طلائی جوبلی کے موقع پر جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے حکومتِ ہند کی وزارت تعلیمات کی طرف سے پچاس ہزار کی گرانٹ کا اعلان فرمایا، اُس کے ساتھ شرط یہ تھی کہ یہ گرانٹ اُس وقت مل سکے گی، جب دارالمصنفین اتنی ہی رقم اپنی علمی سرگرمیوں میں صرف کرنے پر تیار ہوگا، دارالمصنفین اس کے لئے تیار ہوگیا، اس میں سے پندرہ ہزار کی جو پہلی قسط ملی تو اُس سے دارالمصنفین کی اور کتابوں دینِ رحمت اور صاحب مرأۃ المثنوی کے ساتھ تاریخ ہند کی حسب ذیل جلدوں کی طباعت و اشاعت ممکن ہو سکی؛ (۱) مقالات سُلیمان (۲) ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں، (۳) تاریخ سلاطینِ کشمیر (۴) عہدِ مغلیہ ہندو مسلمان مورخین کی نظر میں جلد اوّل

ان جلدوں کی اشاعت کے بعد یہ لکھنے میں خوشی ہو رہی ہے، کہ دارالمصنفین میں حضرت سید صاحب نے بزمِ تاریخِ ہند میں جو شمع جلائی تھی، وہ اگر بہت فروزاں اور روشن نہ ہو سکی، تو مدھم بھی نہ رہی، اور اگر اُس کے سرمایہ میں علامہ شبلیؒ کی بیش بہا کتاب مضامینِ عالمگیر اور اُن کے وہ قیمتی مضامین مثلاً ہمایوں نامہ، تزکِ جہانگیری، آثرِ رحیمی، زیب النساء، ہندوستان میں اسلامی تمدن کے اثرات، بھاشا زبان، اور مسلمانوں کی علمی بے تعصبی، اور تحفۃ الہند وغیرہ بھی شامل کر لئے جائیں، جو دارالمصنفین کی طرف سے مقالاتِ شبلی میں شائع ہو چکے ہیں، تو یہ سرمایہ خاطر خواہ کہا جا سکتا ہے، مضامین کو چھوڑ کر اس کی پوری فہرست ناظرین کے ملاحظہ کے لئے اس وقت قلم سے خود بخود نکل رہی ہے،

(۱) مضامین عالمگیر از علامہ شبلی نعمانیؒ (۲) عرب و ہند کے تعلقات از مولانا سید سلیمان ندویؒ (۳) مقالات سلیمان جو اس وقت ناظرین کے ہاتھ میں ہے؛ (۴) ہندوستان کی اسلامی درسگاہیں از مولانا ابوالحسنات ندوی مرحوم (۵) رقعات عالمگیر از سید نجیب اشرف ندوی (۶) مقدمہ رقعاتِ عالمگیر

از سید نجیب اشرف ندوی (۷) تاریخ سندھ از مولانا سید ابوظفر ندوی (۸) گجرات کی تمدنی تاریخ، مسلمانوں کے عہد میں، از مولانا سید ابوظفر ندوی (۹) مختصر تاریخ ہند از مولانا ابوظفر ندوی، (۱۰) ہندوستان کی کہانی، از مولانا عبدالسلام قدوائی (۱۱،۱۲) ہندوستان عربوں کی نظر میں جلد اول و دوم (۱۳) ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی کارنامے (۱۴) تاریخ سلاطین کشمیر از ڈاکٹر محب الحسن مترجمہ علی حماد عباسی ام اے، راقم نے حسب ذیل کتابیں لکھیں، (۱۵) بزم تیموریہ (۱۶) بزم صوفیہ (۱۷) بزم مملوکیہ، (۱۸) ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک ایک جھلک (۱۹) ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام (۲۰) ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے، (۲۱) ہندوستان کے سلاطین علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر (۲۲) ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں (۲۳) عہد مغلیہ ہندو مسلمان مورخین کی نظر میں جلد اول،

ان میں سے حضرت سید صاحب نے عرب و ہند کے تعلقات ہندوستانی اکیڈمی کے لئے لکھی لیکن وہ دارالمصنفین ہی میں لکھی گئی، اس لئے وہ درحقیقت اسی کا کارنامہ ہے، پھر اپنے مقالات کے علاوہ ہندوستان کی اسلامی درسگاہیں، رقعات عالمگیر، مقدمہ رقعات عالمگیر، تاریخ سندھ، مختصر تاریخ ہند، بزم تیموریہ، بزم صوفیہ، ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام، ہندوستان کی کہانی، اور ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی کارناموں کے بیشتر ابواب اپنی خاص نگرانی میں لکھوائے، اُن کی رحلت کے بعد تاریخ ہند پر راقم نے جو کچھ لکھا ہے، وہ انھی کی جوتیوں کا صدقہ ہے، اور اب جب کہ اتنی جلدیں شائع ہو چکی ہیں، تو جو جلدیں اب تک نہ لکھی جا سکی ہیں، اُن کے لکھنے اور لکھوانے کی فکر دامن گیر ہے، اور ہر قسم کی مجبوریوں اور دشواریوں کے باوجود حوصلہ کم ہونے کے بجائے بڑھا ہوا ہے، دعا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ حضرت سید صاحب کی وصیت کو پورا کرنے کی توفیق اور برکت عطا عطا فرمائیں کیونکہ یہی اپنی حقیر زندگی کا مشن بن گیا ہے،

حضرت سید صاحب کے مقالات کو موجودہ ذوق کے مطابق اڈٹ کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے، کیونکہ راقم کو اُن کی تحریروں سے ایسا حُسنِ عقیدت ہے کہ ان میں ترمیم و اضافہ کرنا یا حواشی میں کچھ نوٹ لکھنا سوءِ ادب تصور کیا، حوالے میں کہیں کہیں کتاب کے صفحے نہیں دیئے گئے ہیں جس کے اندراجات ناظرین کے لئے ذیل میں کئے جا رہے ہیں،

ص ۷، تذکرہ خوشنویساں ص ۹۰، تزکِ جہانگیری صفحہ ۶۵، نولکشور پریس،

ص ۵۱ ہندوستان میں علوم کی ترقی مسلمانوں کے زمانہ میں، ص ۷۷،

ص ۹۸ فرشتہ ذکر بہمن شاہیہ ص ۳۳۳ نولکشور پریس

ص ۱۱۳ بلاذری فتح سندھ ص ۴۷، ۴۴۶،

ص ۱۲۰ تاریخ الخلفاء، سیوطی ص ۲۶۰،

ص ۱۴۴، دیکھو تاریخ فرشتہ تاریخ ملیبار ص ۳۷۳

ص ۲۳۱ کامل ابن اثیر واقعات ۱۵۱ھ ص ۵۵، ۵۶

ص ۲۰۴ کتاب الہند بیرونی ص ۵۷،

ص ۲۰۴ تحفۃ الکرام جلد سوم ص ۱۳۵

ص ۲۱۴ ابن بطوطہ جلد دوم اردو ص ۷

ص ۲۴۷ عرب و ہند کے تعلقات ص ۲۰۰، ۲۰۱

ص ۵۰۳ سے ص ۶۲ تک ہند و فارسی شعراء کے ذکر میں جو فارسی اقتباسات ہیں وہ زیادہ تر صبح گلشن ۔۔ مرتبہ نواب سید علی حسن خاں صاحب سے لئے گئے ہیں،

آخر میں مولوی عبد الباری مصحح دار المصنفین کی محنت کا بھی ذکر کرنا ضروری ہے، انھوں نے اس مجموعے کے مسودہ کو نقل کرنے میں پوری دلچسپی لی، اُن کو حضرت سید صاحب کی تحریروں سے بڑی عقیدت ہے، کہا کرتے ہیں کہ وہ جب حضرت سید صاحب کی کوئی تحریر پڑھتے ہیں تو اُن کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی لذیذ مٹھائی کھا رہے ہیں۔

ہیچمدان!!

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

دار المصنفین، ۲۴ ر اگست سنہ ۱۹۶۶ء

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد

میں

ہندوؤں کی تعلیمی اور علمی ترقی

اس سے پہلے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلیمی اور علمی تعلقات کی داستان شروع کی جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں اور عربوں کے تعلقات پر گفتگو کی جائے، عربوں کا سندھ پر فاتحانہ حملہ پہلی صدی ہجری میں شروع ہوا تھا لیکن ان دونوں قدیم العہد قوموں میں اس سے صدیوں پہلے دوستانہ روابط قائم تھے، ہندوستان آرین قوم کی قدیم نسل ہے تو عرب سامی قوم کی صحیح اور اصلی یادگار ہے، یہ دونوں ملک ایک سمندر کے دو متقابل ساحل ہیں، اس کا ایک ہاتھ آریا ورت کے دامن کو چھوتا ہے تو دوسرا ارض مقدس کو پابوس ہے، ساحلی مقامات فطرۃً تجارتی ہوتے ہیں یہی پہلا رشتہ ہے جس نے ان دونوں قوموں کو باہم آشنا کیا، عرب تاجر آج سے ہزاروں برس پہلے ہندوستان کے ساحلی مقامات تک آتے تھے، اور یہاں سے خاص یہاں کی پیداوار اپنے ملک کو لیجاتے تھے، اور اُن کے ذریعہ سے تمام مغربی ممالک میں یہ چیزیں پھیل جاتی تھیں، مشرق و مغرب یا ہندوستان اور یورپ کی درمیانی کڑی اہل عرب ہی تھے، اُن کے سامان تجارت میں زیادہ تر مسالہ، خوشبو کی چیزیں، کپڑے، تلوار، اور بعض جڑی بوٹیاں اور پھل داخل تھے چنانچہ عربی میں ان چیزوں کے نام سنسکرت میں ہیں، مثلاً مشک (موشکا) کافور (کپور) صندل (چندن) قرنفل (کنشکہ پھل) فلفل (پپلی) زنجبیل (زرنجابیرا) نارجیل (نارئیل) موز (موشہ) کاذی (کیوڑا) سنسکرت کے لفظ ہیں،

تلوار کو عربی میں ہند کہتے ہیں، عود ہندی، قسط ہندی، تمر ہندی اپنی نسبت خود ظاہر کرتے ہیں

یہ تجارتی تعلقات بحری راستوں سے تھے، اس لئے کشتی اور جہازرانی کے بعض اصطلاحات بھی ہندی الاصل ہیں، مثلاً بارجہ، دبیرجہ، بیڑہ، دونیج، ڈونگی، بلیج، بلیق، (جہاز کا سقف) ہوری (چھوٹی کشتی)، جوش (کشتی کا رسا) وغیرہ یہ الفاظ عرب تیاحوں کے سفرناموں میں عام طور سے مستعمل ہیں

قبل از اسلام کچھ عرب تاجروں نے بحرین سے نکل کر بحر روم کے سواحل پر اقامت اختیار کرلی تھی، اُن کو یہود کنعانی، اور آرامی اور یونانی فینیقین کہتے ہیں، تجارتی کاروبار کے سبب سے اس قوم کو حافظہ کے استحکام اور اعانت کی ضرورت محسوس ہوئی، اور اس طرح فن کتابت کی ایجاد کا اُن کو خیال پیدا ہوا،

ان کے بحری راستہ کی مغربی منزل یونان تھی، اور مشرقی منزل ہندوستان، چنانچہ ان دونوں سروں پر اُن کی ایجاد نے حسن قبول حاصل کیا،

علمائے فن کتابت نے تمام دنیا کے خط اور طرز تحریر کو چار قسموں میں تقسیم کیا ہے، خط یونانی یہ یورپ کے تمام خطوط کا پدر اعلیٰ ہے، خط عبری جس سے سامری وغیرہ خط پیدا ہوئے، خط مسند جس سے سبائی و حمیری و حبشی خطوط نکلے ہیں، اور خط آرامی جس سے چھ خط پیدا ہوئے، ہندی، فارسی قدیم، عربی مربع، تدمری، سریانی، نبطی، اس تفصیل سے واضح ہوگا کہ قدیم ہندوستان نے علوم کی ابجد عربوں ہی سے سیکھی،[1]

عرب و ہند کے سیاسی تعلقات کا آغاز براہ راست نہیں، بلکہ ایرانیوں کی وساطت سے ہوا، یہ تفصیل[2] کا موقع نہیں، اجمالاً بیان کیا جاتا ہے کہ عرب و ایران کی سیاسی معرکہ آرائیوں کا ایک مدت سے سلسلہ جاری تھا، بنو شیبان ایرانیوں سے نبرد آزما تھے، کہ آفتاب اسلام طلوع ہوا،

---

[1] تاریخ الادب ج اص ۵ شائع کردہ جامعہ مصریہ (مصری یونیورسٹی) [2] تفصیل عرب و ہند کے تعلقات میں ملے گی، جو بعد میں شائع ہوگی،

اسلام کا معجزہ سمجھئے، یا بخت واتفاق کا اثر کہئے کہ عربوں نے میدانِ جنگ میں ایرانیوں کو شکست دی، چنانچہ اس موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا، کہ آج عرب نے اپنا انصاف فارس سے لیا، حضرت ابوبکرؓ کے عہدِ خلافت میں انہی شیبانیوں نے مملکتِ ایران پر تاخت کی، اور ایران کی کمزوری کا اچھی طرح امتحان کر کے بارگاہِ خلافت کو واقعات کی اطلاع دی، اور امداد کے لئے فوجیں طلب کیں، یہ پہلا دن تھا کہ مسلمان اور ایرانیوں میں سیاسی تعلقات پیدا ہوئے،

حضرت عثمانؓ کے عہد یعنی سنہ ۳۰ھ میں ایرانیوں کا خاتمہ ہوگیا، ایران کی حکومت کی آخری حد سندھ سے آکر مل جاتی تھی مسلمانوں کو خوف تھا کہ دریا کے راستہ سے سندھ سے ایرانیوں کو کمک پہونچے گی، اور براہِ راست ادھر عرب سے خود مرکز پر حملہ ہوسکتا ہے، اس بنا پر ان کو سندھ پر فوج کشی کرنی پڑی، اس کے بعد حضرت علیؓ اور امیر معاویۃؓ کے زمانہ میں بھی یہاں متواتر حملے ہوتے رہے، لیکن مستقل اور پائدار فتح ولید کے عہدِ حکومت میں حاصل ہوئی، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مسلمانوں کی آبادی اچھی خاصی قائم ہوگئی تھی، کیونکہ تاریخوں میں اس حملہ کی وجہ یہ لکھی ہے، کہ ہندوؤں نے مسلمان عورتوں کو زبردستی گھر میں ڈال لیا تھا، اس زمانہ میں عراق کا گورنر حجاج تھا، عورتوں نے حجاج کی دہائی پکاری، پرچہ نویسوں کے ذریعہ سے یہ خبر جب اُس کو پہنچی، تو اس ملک کی فتح اور اسلام کی عزت برقرار رکھنے کے لئے بے قرار ہوگیا، اور آخر اپنے اٹھارہ سال کے نوجوان بھتیجے محمد بن قاسم ثقفی کی سپہ سالاری میں اُس نے ایک فوج روانہ کی، جس نے سندھ فتح کر لیا، اور رفتہ رفتہ دائرۂ فتوحات ملتان تک پہنچ گیا،

اس زمانہ میں مسلمانوں میں صرف دینی اور ادبی علوم رائج تھے، یعنی قرآن، تفسیر، حدیث، فقہ اور شعر وادب چنانچہ سندھ کے نومسلموں نے ان فنون میں کامل دستگاہ پیدا کی، رجال کی کتابوں میں سندھ کے متعدد علماء اور محدثین کے نام ملتے ہیں، ابو معشر نجیح السندی، سندھ کے

ایک غلام زادہ تھے، اپنے آقاؤں کے ساتھ سندھ سے عرب گئے، وہاں آزادی پائی، اور مدینہ منورہ میں سکونت اختیار کرلی، اور بعد میں اسی نسبت سے وہ معروف ومشہور ہوئے چنانچہ ابومعشر نجیح مدنی کہلاتے ہیں، فنِ مغازی وسیر میں وہ کمال پیدا کیا کہ امام الفن کہلائے زبان سے سندیت نہ گئی، عربی مخارج ٹھیک ادا نہیں کرپاتے تھے، تاہم شاگردوں کا ٹھٹھ لگا رہتا تھا، ۱۷۰ھ میں جب وفات پائی، تو خود خلیفہ ہارون رشید اس نومسلم سندھی عالم کی نماز جنازہ کا امام تھا،

ایک اور بزرگ رجاء السندی ہیں، جو عرب کے بجائے ایران پہونچے، اور اسفرائنی ہوکر مشہور ہوئے یہ فنِ حدیث کے باکمال استاد تھے، مشہور محدث حاکم اُن کے حق میں کہتے ہیں، دکن من ارکان الحدیث اور نہ صرف یہ خود بلکہ ان کے خاندان میں اور بہت سے حفاظِ حدیث پیدا ہوئے، ۲۲۱ھ میں وفات پائی،

ابوعطاء السندی ایک ادیب گذرا ہے، جس کے فضل وکمال ادبی کا شاہد صرف یہ واقعہ ہے کہ ابوتمام نے حماسہ میں اُن کے عربی اشعار داخل کئے، سندھی بن شاہک ایک سندھی بغداد پہنچ کر بغداد کے پل پر فروکش ہوئے تھے، اُن کی نسل سے کشاجم پیدا ہوا، جو عربی کا مشہور شاعر گذرا ہے، ابونصر فتح بن عبداللہ السندی ایک سندھی غلام تھے، تعلیم پاکر نکلے، تو الفقیہ المتکلم بن گئے،

یہ ان بزرگوں کے حالات تھے، جنھوں نے اپنا ملکی مذہب بدل دیا تھا، ایسے لوگ جو اپنے مذہب پر قائم رہ کر مسلمانوں کے ساتھ علمی وتعلیمی کاروبار میں شریک ہوئے، ہندوستان کے وہ پانچ چھ اطبا بھی ہیں، جن کے نام، حالات، اور کارنامے ہماری علمی بزم کی پارینہ داستان بن گئے ہیں، وہ اسی سندھ کے تعلق سے بغداد کے دربارِ خلافت تک پہنچے تھے، ابن ندیم، اور

ابن ابی اصیبعہ نے سنسکرت کی بہت سی طبی اور فلسفیانہ کتابوں کے نام گنائے ہیں، جو اُن کے ذریعہ سے عربی زبان میں منتقل ہوئی ہیں، اس سے ہم کو یہ نتیجہ نکالنا چاہیئے کہ یا تو مسلمانوں کی مفتوحہ مملکت میں عربی زبان ہندوؤں کے علمی طبقہ تک پہنچ چکی تھی، یا مسلمان یہاں آکر ان کی زبان میں مہارت حاصل کر چکے تھے، یا بیچ کی کڑی ان دونوں کے درمیان فارسی ہوگی،

تاریخ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی علمی سفارتیں اس زمانہ میں ہندوستان آتی رہی ہیں، یحییٰ برمکی نے ایک شخص کو ہندوستان بھیجا تھا کہ یہاں جو دوائیں پیدا ہوتی ہیں، ان کو تلاش کرکے لائے، نیز اہلِ ہند کے عقائد اور مذہب وغیرہ کی تفصیل لکھ کر لائے، چنانچہ یعقوب کندی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی اس رپورٹ کی ایک نقل ۳۷۰ھ تک یعنی ابن ندیم کے زمانہ تک موجود تھی، اس تحریر پر سنہ کتابت ۲۴۹ھ مرقوم تھا، علامہ مرتضیٰ زیدی نے ملل و نحل میں لکھا ہے کہ سندھ کے ایک راجہ نے خلیفہ ہارون رشید کو لکھا تھا کہ اگر اسلام کا مذہب عقل و دلیل پر قائم ہو تو کسی عالم کو مناظرہ کے لئے یہاں بھیجا جائے، چنانچہ پہلے ایک فقیہ بھیجا گیا، اُس نے مناظرہ کے وقت فلسفیانہ اصطلاحات سے لاعلمی ظاہر کی، وہ واپس آیا، اور معمر بن عباد بغداد کا مشہور متکلم اس خدمت کے لئے نامزد ہوا، اس واقعہ سے یہ صریحی نتیجہ مستنبط ہوتا ہے، کہ یہاں عربی زبان اور فلسفہ نے ایک حد تک فروغ پالیا تھا،

جاحظ نے کتاب البیان والتبیین میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ منکہ وغیرہ حکمائے ہند جو بغداد پہونچے تھے، ان سے ابوالاشعث معمر نے دریافت کیا کہ اہلِ ہند کے نزدیک بلاغت کی تعریف کیا ہے، یہ یاد رہے کہ اہلِ عرب زبان آوری اور بلاغت میں کسی کو اپنا حریف نہیں سمجھتے تھے، انھوں نے جواب دیا کہ ہمارے ہاں اس فن پر ایک رسالہ ہے لیکن ہم اس کا ترجمہ اچھا نہیں کرسکتے، اور نہ ہم کو اس فن میں مہارت ہے، ابوالاشعث کا بیان ہے کہ

مجھکو وہ رسالہ ملا وہ لے کر میں مترجموں کے پاس گیا، اور ان سے اُن کا ترجمہ کرایا، تو اس میں یہ لکھا تھا" اس کے بعد جاحظ نے اس رسالہ کا خلاصہ نقل کیا ہے، یہ واقعہ بتاتا ہے کہ عربوں کی حکومت ہند کے زمانہ میں حاکم و محکوم کے علمی و تعلیمی تعلقات کیا تھے، سنسکرت سے عربی میں جو کتابیں ترجمہ کی گئیں، وہ آج کل کے مترجمین کی طرح ناول اور قصہ کہانی کی کتابیں نہ تھیں، بلکہ تمام تر علمی اور فلسفیانہ کتابیں تھیں، انگریزی زبان سو برس سے ہندوستان میں رائج ہے، ہر صوبہ میں کالجوں اور اسکولوں کی تعداد گذشتہ زمانہ سے بہت زیادہ ہے، ہر سال جو طلبہ اُن سے فارغ ہو کر نکلتے ہیں، اُن کی تعداد ہزاروں تک پہونچ جاتی ہے، تاہم انگریزی علوم کو اپنی مادری زبانوں میں منتقل کرنے کی ہمت نہیں پڑتی، اور ایک شور برپا ہے کہ ہماری زبان میں انگریزی کے لیے اصطلاحات نہیں ملتے، لیکن جو تعلیم عربوں کے عہدِ حکومت میں یہاں جاری تھی وہ اس لائق بنا دیتی تھی کہ اپنی مادری زبان سے وہ غیروں کی زبان میں ترجمہ کر سکتے تھے، اور مسلمان اُن کے لئے اصطلاحات وضع کر سکتے تھے، طب، ہیئت اور حساب، یہ تین علوم سنسکرت سے عربی زبان میں منتقل کئے گئے، جن کے لئے سینکڑوں اصطلاحات کی ضرورت پڑی ہوگی، اب بھی سنسکرت کے چند اصطلاحی الفاظ عربی میں موجود ہیں "جیب" اور "اوج" یہ دونوں ریاضیات کی اصطلاحیں ہیں، جیب کی اصل جیوا، اور اوج کی اوچ ہے، قبۂ ارین، اصطلاحِ ہیئت میں اس نقطہ کو کہتے ہیں، جو خط نصف النہار اور خطِ استوا کو تقاطع کرتا ہے، اس لفظ کی تاریخ عجیب و غریب ہے، یہ لفظ اصل میں "اجین" ہے، جو صوبہ مالوہ کا مشہور شہر ہے، منجمانِ ہند نے اس کو نقطۂ تقاطع فرض کیا تھا، عربی میں اجین ازین ہوگیا، بعد میں نقطہ اڑ کر ارین رہ گیا،

خلیفہ معتصم کے بعد حکومتِ عباسیہ میں ضعف آگیا، اور یہ دور دراز علاقہ مرکزِ خلافت

سے الگ ہوگیا، اس کے بعد سلطان محمود کے حملوں تک سندھ اور ملتان کی اسلامی تاریخ تاریک رہتی ہے مسلمان سیاح جو ہندوستان میں اکثر گذرتے رہتے تھے، اُن کی زبانی معلوم ہوتا ہے کہ ملک مختلف ریاستوں میں منقسم ہوگیا تھا جن میں کچھ ہندو تھیں، کچھ اسماعیلی تھیں کچھ خالص مسلمان تھیں، اور یہ نہایت امن وامان اور دوستانہ طریقہ سے زندگی بسر کرتی تھیں سلطان محمود کا ہندوستان پر حملہ اصل میں انہی اسماعیلیوں کے استیصال کے لئے شروع ہوا تھا، قدیم عرب سیاحانِ ہند جو غزنوی حملوں سے پہلے ہندوستان آئے، اور جن کے سفرنامے موجود ہیں، یہ بزرگوار ہیں،

سلیمان تاجر ۲۲۵ھ اور ابوزید سیرافی ۲۴۲ھ، یہ جنوبی دکن اور جزائر ہند سے گذرے تھے، ابوالحسن مسعودی ۳۰۳ھ میں ہندوستان آیا، ابواسحاق اصطخری ۳۴۰ھ میں اس ملک میں آیا، ابودلف مسعر ینبوعی چوتھی صدی ہجری کے اواسط میں چین ہوکر کشمیر، ملتان، سندھ اور کولم پہنچا، چوتھی صدی کے آخر میں بشاری مقدسی ہندوستان آیا، اس نے ہندوستان کو پانچ صوبوں میں منقسم کیا ہے، مکران، توران، سندھ، ملتان، قنوج، ہندوستان کا سب سے واضح جغرافی بیان ابوریحان بیرونی کی کتاب الہند میں ملتا ہے، اس نے پنجاب اودھ اور بنگال کے ممتاز شہروں کے نام لکھے ہیں، ان کا طول بلد اور عرض البلد بیان کیا ہے، بنگال وبہار کی جانب پاٹلی پتر (پٹنہ) اور مونگیر کا نام لیتا ہے. ان کے علاوہ نیپال، سنگلدیپ، سندھ، اور هنفت پہاڑ یعنی ہمالیہ کا ذکر کرتا ہے،

ان سیاحوں نے ملتان، منصورہ، کھنبایت، کے حالات لکھے ہیں، ایک سیاح جنوبی ہند کے ایک راجہ کا ذکر کرتا ہے جس نے عرب تاجروں اور سیاحوں کی مدد سے قرآن مجید کا ترجمہ اپنی زبان میں کرایا تھا مسعودی نے کھنبایت کے ذکر میں لکھا ہے کہ یہاں کا

راجہ مسلمانوں سے بہت مالوف اور ہمیشہ ان سے مذہبی مناظرے کرتا رہتا ہے، ایک اور سیاح ملتان کی یہ حالت بتاتا ہے کہ یہاں ہندو مسلمانوں میں کوئی فرق نظر نہیں آتا، اب تک ہماری علمی مجلسوں میں صرف بیرونی کا نام اس لحاظ سے ممتاز ہے کہ اس نے ہندوستان آکر یہاں کے علوم سیکھے، حالانکہ تاریخ میں اور بھی لوگ ایسے ملتے ہیں، محمد بن اسماعیل تنوخی کی نسبت ابن صاعد لکھتا ہے،

الذی دخل الی الھند وصنّ	یہ وہ شخص ہے، جو ہندوستان گیا، اور
عنھا بغرائب من علوالنجوم	وہاں سے علم ہیئت کے عجیب و غریب
ومنھا حرکات الاقبال الادبار	مسائل لے کر واپس آیا منجملہ اس کے
	حرکت اقبال وادبار کا مسئلہ ہو،

بطلیموس کی مجسطی سے پہلے حکماے ہند کے ذریعہ سے کتاب سندہند پہنچی، سندہند سب سے زیادہ مقبول ہوئی، حکماے ہند سے یہ کتاب دو عرب نژاد عالموں نے ۱۵۰ھ میں پڑھی تھی، ایک ابراہیم بن حبیب فزاری جو حضرت سمرہ بن جندب مشہور صحابی کے خاندان سے تھے، دوسرے یعقوب بن طارق، مولانا ے مرحوم نے اسی کانفرنس کے ایک سالانہ اجلاس میں تراجم کا مضمون پیش کیا تھا، اور صرف اُن کے نام لکھ کر رہ گئے، اور آگے اُن کا حال کچھ نہ معلوم ہو سکا لیکن اب کچھ تو بیرونی کی کتاب الہند اور کچھ سینور کرلونلینو جو اٹلی میں بلرم یونیورسٹی کا پروفیسر ہے، اس کے اس لکچر سے جو اس نے عربوں کے علم ہیئت پر مصر کی یونیورسٹی میں عربی زبان میں دیا تھا، یہ عقدے تمامتر حل ہو گئے ،

(۱) پہلی کتاب سندہند جس کو غلطی سے متاخرین نے السندوا لہند لکھا ہے، اصل سنسکرت نام برہمسپھٹ سدھانت ہے، قدیم علماے عرب نے اس کا آخری جز و سدھانت لیکر

سندہند کر دیا، بعد کے لوگوں نے سندہند بڑھکر السند والہند کر دیا، یہ کتاب ۱۲۵ھ مطابق ۶۶۹ء میں برہمگپتانے راجہ دیاگھر موکا کو لکھ کر پیش کی تھی، یہی دیاگھر ہے، جو عربی کتابوں میں ملک تغیر ہوگیا ہے،

سدھانت کی تعلیم نہ صرف بغداد کے احاطۂ علمی میں محدود رہی، بلکہ مسلمانوں کے فیضانِ علم کے ساتھ ساتھ اسپین تک پہنچ گئی تھی، عبداللہ بن احمد سرقسطی المتوفی ۴۳۸ھ ہندسہ، ہیئت کا امام تھا، اس نے اس کی غلطیاں دکھائیں اور اسکی تصحیح و تردید پر ایک سالہ لکھا، ابن صاعد اندلسی نے عبداللہ بن احمد کے اعتراضات کے جوابات دیئے، اور سدھانت کے طریقہ کو صحیح بتایا، ابن صاعد اندلسی کی تصنیف طبقات الامم قرون وسطی کی علمی تاریخ ہے جس میں تمام دنیا کی علمی قوموں کے علوم و فنون کی تاریخ لکھی ہے، ۴۶۲ھ مطابق ۱۰۷۰ء میں اس نے وفات پائی، علوم کی تاریخ میں مسلمانوں نے جو کتابیں لکھی ہیں کتاب الفہرست ابن الندیم کے بعد اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں، اور باوجود اس کے کہ اس کے حوالے اکثر عربی کتابوں میں آتے ہیں، تمام دنیائے اسلام میں اسکے صرف تین نسخے دستیاب ہوئے، ایک کتبخانہ لندن میں دوسرا کتب خانہ لیڈن میں، اور تیسرا دمشق کے ایک کتب فروش کے پاس ملا، اس تیسرے نسخہ کو تصحیحات ضروری کے بعد بیروت کے ایک عیسائی نے ۱۹۱۲ء میں شائع کیا، چونکہ مولانا مرحوم کے مضمون تراجم لکھتے وقت یہ کتاب عالمِ طبع میں نہیں آئی تھی، اس لئے اس مختصر تفصیل کے ساتھ اس کتاب سے چند باتیں اور بڑھا دیتے ہیں،

ابن صاعد لکھتا ہے کہ ہندوستان کی تصنیفات بعد مسافت کے سبب ہم اہلِ اندلس تک بہت کم پہونچی ہیں، صرف تین کتابیں پہونچی ہیں، ایک "سندہند" ہیئت و نجوم میں، دوسری موسیقی میں جس کا ہندی نام نافر (؟) ہے، تیسری اخلاق میں کلیلہ و دمنہ، علوم میں حساب الغبار یعنی علم ارقام اسی لئے اہل عرب ان کو ارقامِ ہندیہ کہتے ہیں، عربوں سے اہل یورپ تک یہ ارقام پہنچے، وہاں ان کا نام ارقامِ عربیہ ہے،

اب ہم اس عہد میں پہونچ گئے ہیں جب عربوں کا آفتابِ اقبال ڈوب چکا تھا، ترکوں و مغلوں

اور پٹھانوں کا نیا دور شروع ہو رہا تھا اب تک جو کچھ بیان کیا گیا ہے، وہ ہمارے مضمون کا پہلا حصہ ہے دوسرا حصہ اب شروع ہوتا ہے:

مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہندو قوم وہ تھی جو ہر غیر قوم کے سایہ تک سے گریز کرتی تھی، اور اس کو ملیچھ ناپاک اور نجس ہستی تصور کرتی تھی، کیا اس وقت میں کوئی یہ خیال کر سکتا تھا کہ کسی زمانہ میں ہندو قوم بھی اس قدر رواداری اور وسیع الخیال ہو جائے گی کہ وہ دوسری قوم کے ساتھ مل جل کر کام کرے گی، اس کی زبان سیکھے گی، اس کے علوم و فنون پڑھے گی، اس کے تمدن و معاشرت کو اختیار کرے گی، اور اس کے ساتھ شاگردی و استادی کا رشتہ قائم کرے گی، لیکن صرف دو سو برس ہی کے اندر ان خیالات میں بڑا تغیر آ گیا، اور اب وہ مسلمان سلاطین کی نوکریاں کرنے لگے، اور درباروں میں مسلمان ارباب کمال کے پہلو بہ پہلو بیٹھنے لگے، یہی ابتدائی بے تعصبی ہندوؤں کی موجودہ تعلیمی ترقی کا زینہ ہے،

اگر مسلمانوں کا درمیانی دور جس نے سو دو سو برس کے اندر اندر ہندوؤں کو اپنی قدیم تنگ خیالی کے بدلنے پر مجبور کیا، اور دوسری قوموں کے علوم و فنون سیکھنے کی اُن میں ترغیب پیدا کی، ہندوستان میں قائم نہ ہوا ہوتا، تو کیا یہ ممکن تھا کہ انگریزوں کی حکومت کے اول یوم سے وہ انگریزی تعلیم کا آغاز کر دیتے، اور ساٹھ ستر برس کے اندر اندر تمام ہندوستان میں ایک غیر قومی زبان کی تحصیل کیلئے مدارس مکاتب پاٹ شالے اور کالج کھل جاتے گوہر مقصود کی تلاش میں سمندروں میں بے محابا سفر کرتے ان کو سو دو برس تو صرف اپنی نفرتِ قومی، اور تعصبِ مذہبی کے مٹانے میں صرف ہوتے اور اس اثنا میں مسلمان کہیں سے کہیں جا نکلتے،

ہندوؤں پر مسلمانوں کا سب سے بڑا تعلیمی احسان یہ ہے کہ مسلمانوں سے پہلے ہندو دھرم کے مطابق تعلیم ہندوؤں کے ایک مخصوص طبقہ تک محدود تھی، حکم تھا کہ وید کا کوئی فقرہ اگر کسی شودر

کے کان میں پڑجائے تو اس میں سیسہ پلا دیا جائے، برہمنوں کے علاوہ ہندوؤں کے دیگر طبقوں میں یا تو علم مطلق نہ تھا، یا بہت ہی کم تھا، بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ مذہبًا ان کو تعلیم کے حاصل کرنے کی مطلقًا اجازت نہ تھی، لیکن مسلمانوں نے ہندوستان آکر تعلیم کو ہندوؤں کے ہر طبقہ تک عام کر دیا، برہمنوں سے لیکر کھتری، کایستھ، بنیے، اور اُن سے بھی نیچے درجوں تک علم اُتر آیا، آج ہندوستان میں برہمنوں سے زیادہ نہیں تو برہمنوں کے برابر غیر برہمن ہندو بھی تعلیم سے بہرہ اندوز ہیں، اور مسلمانوں کے عہد حکومت میں بھی یہی حال تھا، کہ برہمنوں سے زیادہ کایستھ اور کھتری تعلیم یافتہ تھے،

ہندوؤں پر مسلمانوں کا تیسرا سب سے بڑا تعلیمی احسان یہ ہے کہ ان کے تعلیمی علوم و فنون میں وسعت پیدا کی، قدیم ہندوستان کے شیشۂ وقار کو صدمہ پہنچائے بغیر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کے عہد سے پہلے ہندوستان میں جن علوم کی تعلیم رائج تھی، ان کی فہرست نہایت مختصر تھی، نصابِ تاریخ سے یہاں کے مدارس ہمیشہ خالی رہے، جغرافیہ کا وجود یہاں برائے نام تھا، فلسفہ، حکمت، اقلیدس، ہیئت، طب، شاعری، موسیقی وغیرہ علوم ہندوستان میں پہلے سے موجود تھے، لیکن اُن کی تعلیم اولًا تو مخصوص لوگوں کو ہوتی تھی، دوسرے یہ کہ ان علوم کے متعلق دنیا کی دوسری قوموں کی جو تحقیقات تھی، اس سے یہاں سرتاپا ناواقفیت تھی، مسلمان علماء نے اُن کے نصابِ تعلیم کو ان فروگذاشتوں سے پاک کیا،

مسلمانوں میں ہندوستان کا سب سے پہلا علمی فاتح بیرونی ہے، وہ سلطان محمود کے زمانہ میں ہندوستان آیا، یہ مسلمانوں کی ہندوستان میں عملداری کا آغاز باب تھا، اور ضرورت تھی کہ ہندوؤں نے خلافتِ بغداد کو دوسری صدی ہجری میں جو علمی قرض دیا تھا، وہ مع سود کے واپس کر دیا جائے، بیرونی کتاب الہند کے پہلے باب میں لکھتا ہے :-

"اجنبی ہونے کے سبب سے مجکو ہندو علمائے ہیئت کی پہلے شاگردی اختیار کرنی پڑی"

لیکن تھوڑی ہی مدت کے بعد جب میری زبان دانی کی واقفیت بڑھ گئی، تو میری حیثیت استاد کی ہوگئی، چونکہ ہیئت و ریاضیات میں مجکو کامل مہارت حاصل تھی، میں خود اُن کو تعلیم دینے لگا، پنڈتوں کو یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی تعجب سے پوچھتے تھے کہ تم نے یہ باتیں کس پنڈت سے سیکھی ہیں، اُن کو یقین نہیں آتا تھا کہ کسی دوسری قوم کا آدمی بھی علوم و فنون میں ان کا ہمسر ہو سکتا ہے، وہ مجکو جادوگر سمجھتے تھے اور بحر العلوم" کہتے تھے"

ہندو پنڈتوں کی واقفیت کے لئے اس نے عربی زبان سے حسب ذیل کتابیں سنسکرت میں ترجمہ کیں، رسالہ[1] اصطرلاب، مجسطی، اقلیدس کے مقالے، علاوہ ازیں ہندو پنڈتوں کے سوالات کے جواب میں بھی اُس نے کئی رسالے لکھے، ہندو ہیئت دانوں نے ہیئت کے متعلق سوالات کئے تھے، ۱۲۰ صفحوں میں اُس نے اُن کے جوابات لکھے، ایک رسالہ اس کا اس بحث پر ہے کہ اعداد کے اندارج جو عربی زبان میں ہیں، وہ باعتبار ہندی کے زیادہ صحیح طریقہ پر مقرر ہیں[1]

مسلمانوں کی فتوحات نے ہندوستان میں جب وسعت حاصل کی تو ہندو پنڈتوں کو اُن کے اندرونی حالات کے دریافت کرنے کا شوق پیدا ہوا، چنانچہ بھوجر برہمن نام بنارس کا ایک باشندہ قاضی رکن الدین کی خدمت میں پہنچا، اور ان سے مسلمانوں کے علوم کی تکمیل کی، قاضی صاحب نے بھوجر سے سنسکرت سیکھی، اور اُس کی مدد سے ابنرت کنڈ (حوض حیات) نام ایک کتاب کا سنسکرت سے عربی میں ترجمہ کیا[2]

سلطان زین العابدین جو ۸۲۶ھ میں تخت کشمیر پر جلوہ آرا ہوا تھا، اور جس کے آثار سلطنت

---

[1] فہرست تصنیفات بیرونی در آثار باقیہ [2] جامع القصص العربیہ فی الاخبار الہندیہ ص ۱۱۵ مطبوعہ فرانس (ربو)،

پر شہنشاہ اکبر نے اپنی حکومت کی بنیادیں کھڑی کی تھیں، اُس نے ہندوؤں کے لئے بہت سی عربی اور فارسی کتابوں کے ترجمے ہندی میں کرائے، فرشتہ کی عبارت یہ ہے :-

"و فرمود تا اکثرے از کتب عربی و فارسی، بزبان ہندی ترجمہ کردند"[۱]

سری بھٹ نامی ایک بید کو طبابت کی تعلیم دلا کر اپنے دربار میں یہاں تک ممتاز کیا، کہ وہ سیاسی معاملات میں بھی دخیل ہو گیا، فرشتہ لکھتا ہے :-

"و سلطان بجہت طبابت سری بھٹ را کہ طبیبے حاذق بود تربیت کرد"[۲]

ہندوؤں کو مسلمانوں سے جو بُعد تھا، اس کا اثر یہ تھا کہ کوئی ہندو مسلمان بادشاہوں کے دربار میں نوکری تک قبول نہیں کرتا تھا، رسوم و عادات کی یہ بندشیں سب سے پہلے دکن میں ٹوٹیں، مسلمان سلاطین نے ہندو فاضلوں کی قدر افزائی شروع کی، اور اس بہانہ سے وہ رفتہ رفتہ مسلمانوں سے مانوس ہونے لگے،

شہزادہ محمد تغلق کے دربار میں گنگو نامی ایک برہمن خدمتِ منجمی پر ممتاز تھا حسن بہمنی جو دکن میں بہمنی حکومت کا بانی ہوا ہے، وہ اس منجم کا نہایت ممنونِ احسان تھا، اس تقریب سے دکن کے برہمنوں کو بہمنی حکومت کے ساتھ موانست پیدا ہوئی، اور بالآخر تمام دفاتر سرکاری کے وہ مالک بن بیٹھے، فرشتہ میں ہے :-

"مشہور است کہ پیش ازیں برہمناں پیرامون عہد و عمل شہریاران اسلام نمی گردیدند (نوکری)
و در قرا یا و زوایا و سواحل انہار کسب انواع علوم خصوص علم نجوم اشتغال داشتہ متوکلانہ (گانوں)
زندگی می کردند، و ملازمت اہل دنیا خصوص مسلمانان را مزیل حسنات دانستہ در
شقاوت ابدی تصور کردہ پیرامون عہدہ عمل نمی گردیدند و اگر احیاناً بعضے از ایشاں

---

[۱] فرشتہ ص ۳۴۴، نولکشور [۲] فرشتہ ص ۳۴۲،

بوسیلۂ طبابت ونجوم ووعظ وقصہ خوانی درصحبت ارباب جاہ می بودند بانعام واحسان ایشان مخصوص گشتہ، قلادہ نوکری درگردن نمی انداختند، اول کسے کہ از فرقہ براہمہ در دور سلاطین اسلام نوکری کرد، گانگو پنڈت بود وتا حال کہ ۱۰۱۵ھ است، بخلاف سائر ممالک ہند خصوصاً دفتر بادشاہان دکن و نویسندگی ولایت ایشان بہ براہمنہ مرجوع است[51]"

شاہی دفتر کی زبان عموماً فارسی تھی، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ اہل کار فارسی زبان اب سیکھنے لگے تھے، ابراہیم عادل شاہ جو ۹۴۲ھ میں دکن کی عادلشاہی حکومت کا فرمانروا ہوا تھا، اُس نے فارسی زبان بھی دفتر سے برطرف کردی،

"دفتر فارسی برطرف کردہ ہندوی کرد و برہمنہ را صاحب دخل گردانیدہ[52]"

شمالی ہندوستان کی نسبت مشہور یہ ہے کہ سب سے پہلے سلطان سکندر لودی کے زمانہ میں، یہاں ہندوؤں نے فارسی پڑھنی شروع کی تاریخوں کے پڑھنے سے یہ صاف نظر آتا ہے کہ ہندو رعایا کی تعلیم کے لئے اس سے پہلے کوئی خاص انتظام نہیں کیا گیا تھا، بلکہ جو طریقۂ تعلیم اور نصاب تعلیم ان میں مدتوں متوارث چلا آتا تھا، اس میں کوئی دخل نہیں دیا گیا اپنے طور پر درس و تدریس کے جو انتظامات ان میں جاری تھے، اس کو علی حالہ باقی رکھا گیا، مسٹر لا اپنی کتاب "پرموشن آف لرننگ ان انڈیا ڈیورنگ دی محمڈن پیریڈ" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:-

ابھی وہ دن دور تھا، جب کہ ہم مسلمان سلاطین کو ہندو اور مسلمان دونوں رعایا کی تعلیم کی برابر سرپرستی کرتے ہوئے اور ایک ہی جوش کے ساتھ مسلمانوں کے علاوہ

---

[51] فرشتہ جلد ۱ ص ۸، ۲، [52] فرشتہ جلد ۲ ص ۳۰،

دوسری قوموں کے علوم کو ترقی دیتے ہوئے پائیں، سب سے پہلے مسلمان فاتح کے ہندوستان میں قدم جمنے کے ایک صدی یا دو صدی بعد تک ہندوؤں کی تعلیم اور اُن کے علوم اپنے (قدیم) راستہ پر اپنے حامیوں کی اعانت سے چلتے رہے"

مگر بعض قرائن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ فارسی تعلیم کا رواج ان میں اس سے پہلے پیدا ہو چکا تھا سلطان فیروز شاہ تغلق جو ۷۵۲ھ میں تخت نشیں ہوا تھا کانگرہ کی فتح کے موقع پر جوالا مکھی کی سیر میں اس کو ایک چھوٹا سا کتب خانہ ملا تھا، پنڈتوں کو بلا کر چند کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کرایا، تاریخ فرشتہ کی عبارت یہ ہے،

"بادشاہ علمائے آن طائفہ را طلب کردہ، بعضے ازاں کتب را ترجمہ فرمود"

(تاریخ فرشتہ جلد ا ص ۱۴۰)

بہرحال مورخین کا مطلب یہ ہے کہ باقاعدہ اور عمومیت کے ساتھ ہندوؤں میں فارسی تعلیم کا رواج سلطان سکندر لودی کے زمانہ سے ہوا، سلطان لودی نے ہندوؤں کے نہان کی جگہوں میں مساجد، مدرسے، اور بازار قائم کئے، سپاہیوں کو تعلیم پر مجبور کیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوؤں میں بھی عام طور پر فارسی تعلیم رائج ہوگئی، فرشتہ شہادت دیتا ہے،

بعد فرخندہ او علم رواج یافت و امراء و ارکان و سپاہیان بکسب فضائل اشتغال نمودند و کافران بخواندن و نوشتن خط فارسی کہ تا آن زمان درمیان ایشاں معمول نبود پرداختہ "

اس کے بعد شیر شاہ کا زمانہ آتا ہے، اس نے ہندوؤں کے ساتھ نہایت مہربانی کا برتاؤ کیا، بہت سے ہندوؤں نے فارسی پڑھ پڑھ کر دکن کی طرح شمالی ہندوستان میں بھی دفاتر سرکاری میں نوکریاں حاصل کیں، راجہ ٹوڈرمل جو اکبر کے نورتن میں شامل ہے وہ شیر شاہ

ہی کا تربیت کردہ تھا، اور اسکے محکمۂ مالگذاری کا دیوان تھا،

تیموریوں کے زمانہ میں ہندوؤں کی تعلیمی ترقی درجۂ کمال تک پہنچ گئی، گو اس کی تفصیلات نہ ملیں لیکن استقصائے جزئیات سے یہ نتیجہ واضح طور سے نمایاں ہوتا ہے کہ فارسی زبان کی تعلیم ان کے زمانہ میں گھر گھر پھیل گئی،

فارسی تعلیم کے علاوہ سنسکرت اور دیگر مذہبی علوم کی تعلیم کے لئے ملک کے مشہور شہروں میں بڑی بڑی درسگاہیں تھیں، جہاں دور دور سے طلبہ آآ کر شریک درس ہوتے تھے، یہ درسگاہیں ٹھٹھہ، ملتان اور خصوصاً بنارس میں زیادہ تھیں سلاطین تیموری بھی ان علوم کی دستگیری میں کمی نہیں کرتے تھے، دربار میں اُن کو مسلمان فضلائے عہد کے پہلو بہ پہلو جگہ ملتی تھی، ابوالفضل نے آئین اکبری کے ہندو فضلاء کے حسب ذیل نام لکھے ہیں:-

مہادیو، بھیم ناتھ، نارائن، سیوجی، مادھو، رام چندر، سری بھٹ، مادھو سرستی، جدروپ، بشن ناتھ، مدسودن، رام کشن، نارائن اسرم، بلبھدر، مصر، ہرجی سور، باسدیو مصر، دامودر بھٹ، بابن بھٹ، رام تیرتھ، بدھ نواس، نرسنگھ، گوری ناتھ، پرمانند، گوپی ناتھ، بجی سین سور، کشن پنڈت، نہال چند، بھٹاچارج، کاشی ناتھ، دیوی برہمن، دیوی برہمن نے مہابھارت کا فارسی میں ترجمہ کیا،

اکبری دربار میں فن مصوری و نقاشی کے جو ماہرین تھے، ان میں مسلمان استادوں کو چھوڑ کر حسب ذیل ہندو اساتذہ تھے:

وسونت کہار، دسادن، کیشو لال، مکند، مادھو، جگن ہیش، کھیم کرن تارا، سانولا، ہری بنس، رام،

ملے: ثمر عالمگیری ص ۸،

جس طرح اس عہد میں سنسکرت سے فارسی میں کتابیں ترجمہ کی گئیں، بعض کتابوں کا عربی و فارسی سے سنسکرت میں بھی ترجمہ کیا گیا، مرزا الغ بیگ کی زیچ، علم ہیئت کی آخری اور مستند کتاب تھی مسلمان اور ہندو فضلاء کی ایک مشترک مجلس نے اس کا سنسکرت میں ترجمہ کیا، ہندو علماء میں سے کشن، جوتشی، گنگا دھر، مہیش، اور مہانند اس مجلس کے ممبر تھے،

جہانگیر نے بھی ہندو فضلاء کی قدردانی میں کمی نہیں کی، اس کے عہد میں جدروپ گوسائیں نہایت مشہور ویدانت تھا، وہ پا پیادہ اس کے جھونپڑے تک جاتا، اور گھنٹوں اس کے پاس بیٹھا رہتا، راستہ چلتے کسی سنیاسی کا نام سنتا، تو اس کی ملاقات کو اتر پڑتا، ایک دفعہ وہ سفر کر رہا تھا، کہ ناگاہ ایک مقام پر اس کو بہت سے جوگی نظر آئے، تزک میں لکھتا ہے :-

"درہمیں منزل شب شیورات واقع شد جوگی بسیار جمع آمدہ بودند، ... با دانایان ایں طائفہ صحبتہا داشتہ شد"

رائے منوہر لال ولد رائے لون کرن لڑکپن سے جہانگیر کے زیر سایۂ عاطفت تعلیم پاکر جوان ہوا تھا فارسی زبان کی شاعری اور خوشخطی میں سلیقۂ خاص پیدا کیا[1] راجہ سورج سنگھ نے ایک ہندو شاعر کو دربار میں پیش کیا، جہانگیر اس کے چند ہندی اشعار سن کر نہایت محظوظ ہوا، اور ایک ہاتھی اس کو عطا کیا[2]، اس کے دربار کا مشہور نقاش بشن داس تھا، جس کو جہانگیر نے ایران بھیجا تھا[3]،

داراشکوہ کا دربار ہندو فضلاء اور شعراء سے بھرا رہتا تھا، وہ خود بھی ہندوؤں کے علوم و فنون میں مہارت رکھتا تھا، اس لئے ہندو علماء کو عزیز رکھتا تھا، اس کے دربار کا گویا ملک الشعراء ایک برہمن چندر بھان نامی تھا، اس کا تخلص برہمن تھا، فارسی میں دلپسند شعر کہتا تھا، اس کا دیوان

---

[1] تذکرہ خوشنویساں [2] تزک جہانگیری، [3] ایضاً ص ۲۸۵،

فارسی اب تک موجود تھا، دارا شکوہ کے قتل کے بعد بنارس میں آکر سکونت اختیار کرلی تھی، جہاں اُس نے ۱۰۷۳ھ میں وفات پائی۔

اس مضمون میں بدنصیب عالمگیر کا نام کسی دوستانہ حیثیت سے تو بار نہیں پا سکتا تھا لیکن دشمنانہ انداز میں بھی کیا کسی رسم محبت کا سراغ لگ سکتا ہے، آثر عالمگیری میں ہے،

"بعرض خداوند دین پرور رسید کہ در صوبہ ٹھٹھہ و ملتان خصوص بنارس برہمنان بطالت نشان در مدارس مقررہ بتدریس کتب باطلہ اشتغال دارند در اغبان وطالبان از ہنود ومسلمانان مسافتہائے بعیدہ طے نمود، جہت تحصیل علوم شوم نزد آن جماعت گمراہ می آیند، احکام اسلام نظام ناظمان کل صوبہ جات صادر شد کہ مدارس ومعابد بے دینان دستخوش انہدام سازند و بتاکید اکید طور درس وتدریس ورسم شیوع مذہب کفرانیاں براندازند"۔ (ص ۸۱)

اس عبارت سے جہاں عالمگیر کی تنگدلی ظاہر ہوتی ہے، یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت ہندوستان کے تمام صوبوں میں اُن کے مدارس قائم تھے، غالباً ان مدارس کے توڑنے کے احکام اسی اصول پر مبنی ہوں گے جس کی مثال ہم کو اس روشن عہدحکومت کی تعلیمی پالیسی میں نظر آتی ہے۔

محمد شاہ کے زمانہ میں راجہ جے سنگھ والی جے پور نے دلی، بنارس اور اجین میں رصدخانے قائم کرائے، ملا خیراللہ مہندس رصدخانہ دلی کے منتظم خاص تھے، بنارس کا رصدخانہ اب تک موجود ہے، اور ہندوؤں کے تہواروں میں، اور شادی بیاہ کی تاریخوں میں اس سے اب تک مدد لی جاتی ہے،

جے سنگھ نے مسلمان علماء کو جمع کرکے عربی زبان کی چند مشہور ہیئت کی کتابوں کا ہندی

میں ترجمہ کرایا۔[۵]

اس تمام عہد میں ہندوؤں کی تعلیم روز بروز ترقی کرتی گئی، فارسی دانی کا ذوق، علوم عربی کی تحصیل کا شوق، شاعری کا مذاق، خطاطی، خوشنویسی، حساب وغیرہ کی تعلیم نہایت عام ہوتی گئی، یہاں تک کہ اس عہد میں یہ نظر آتا ہے کہ ہر شریف ہندو کچھ نہ کچھ لکھا پڑھا تھا یہ تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہندوستان میں کتابوں کے جمع کرنے اور کتب خانوں کے قائم کرنے کا شوق نہ تھا، کانگڑہ کی فتح میں مسلمانوں کو جو کتب خانہ ملا تھا اس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے لیکن اس عہد میں مسلمانوں کی دیکھا دیکھی ہندو شرفا میں کتب خانوں کے قائم کرنے کا شوق پیدا ہو گیا تاریخی حوالوں کو چھوڑ کر آج ہندوؤں کے جو قدیم شریف گھرانے موجود ہیں، وہاں عربی اور فارسی کتابوں کی چند فرسودہ جلدیں کس مپرسی میں پڑی ہوئی ملیں گی بڑے بڑے ہندو امرا کے ایوانوں میں دیگر سامان آرایش کے ساتھ ساتھ کتب خانہ کا وجود بھی لوازم ریاست سے سمجھا جاتا تھا، لاہور، دلی، لکھنؤ، پٹنہ اور ڈھاکہ میں ایسے بکثرت گھرانے ملیں گے، پٹنہ میں اس وقت خود ایک ایسے قدیم ہندو رئیس موجود ہیں، جن کے ہاں عربی کتابوں کے نوادر نسخے اب تک موجود ہیں، اور ان کو اس قدر عزیز ہیں کہ وہ ان کو جدا نہیں کر سکتے، راجہ شتاب رائے ناظم بہار کے خاندان میں اس قسم کا ایک نادر کتب خانہ موروثی چلا آتا ہے،

اوپر جو کچھ کہا گیا، وہ جنوبی اور شمالی ہندوستان اور کشمیر کے متعلق تھا، آئندہ سطور میں اس خطۂ ہند کے متعلق ہم کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں، جو آج ہندوستان کا سرتاج اور مایۂ فخر و ناز ہے، یعنی بنگال!

بنگالی زبان آج اپنی ثروت اور تمول کے لحاظ سے تمام ہندوستان کی زبانوں میں سب

---

[۵] سبحۃ المرجان آزاد،

زیادہ دولت مند ہے لیکن یہ سن کر تعجب ہوگا کہ اس کی ترقی کا آغاز بنگال میں مسلمانوں کی ابتدائے حکومت سے ہوتا ہے، اس سے پہلے یہ زبان کاغذ کے ایک صفحہ کی بھی مالک نہ تھی، بنگالی زبان کی سرسبزی اور شادابی کی آج دھوم ہے، لیکن مسلمانوں سے پہلے اس زمین میں ایک تخم بھی بویا نہیں گیا تھا،

اس دعوے کے ثبوت میں ہم اپنی تحقیقات کے بجائے ایک فاضل بنگالی مورخ کی تاریخ "ترقی علوم در ہندوستان" کے اقتباسات پیش کرتے ہیں :-

"سلاطین بنگال کی کوششیں صرف مسلمانوں کی تعلیم کی ترقی تک محدود نہیں رہیں، کیونکہ انھوں نے اپنی دیرینہ بیدار مغزی کو ایک نئے راستہ پر علوم کو ترقی دینے میں جس کے ساتھ بنگالی بولنے والے لوگوں کو خاص طور سے دلچسپی ہونا چاہئے، متوجہ کیا، ان لوگوں کو یہ بات بے جوڑ معلوم ہوگی کہ ان کی زبان اپنی علمی سطح تک پہنچنے میں خود ان کی نہیں بلکہ ان مسلمانوں کی ممنون ہے، جن کی ابتدائی توجہ اس کی طرف صرف اس کی ندرت کی بنا پر اور اس بنا پر تھی کہ اس کو اُس سنسکرت زبان سے تعلق ہے، جو اس وسیع ہندوآبادی کا محبوب خزانہ ہے جس کے ساتھ اُن کو بہت زیادہ تعلق ہے،

سب سے پہلے مہابھارت اور رامائن کی رزمیہ نظموں نے بنگال کے مسلمان سلاطین کو اپنی طرف متوجہ کیا، جن کے اشارہ سے اُن کا بنگالی یعنی ملکی زبان میں ترجمہ ہوا، مہابھارت کا سب سے پہلا ترجمہ ناصر شاہ والی بنگال (۱۲۸۲ تا ۱۳۲۵ء) کے حکم سے ہوا، جو صوبہ کی دیسی زبان کا بہت بڑا مربی تھا، اور جس کو شاعر اعظم ودیاپتی نے اپنی نذر دے کر زندۂ جاوید بنا دیا، (اپنی ایک نظم میں) سلطان غیاث الدین

کا بھی ذکر کرتا ہے، جس سے غالباً غیاث الدین ثانی والی بنگال (۱۳۶۷ء؛ ۱۳۷۳ء) مراد ہے،

.....یہ مشکوک ہے کہ بنگال کے کسی مسلمان بادشاہ یا ہندو راجہ[۵] کانس نراین نے کرتی ولس کو بنگالی میں رامائن ترجمہ کرنے کا حکم دیا، اگر پچھلی روایت صحیح ہے تو اس میں شک نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمانوں ہی کی نظیروں نے اس کارنامے کے انجام پر اس کو آمادہ کیا،

سلطان حسین شاہ، بنگالی زبان کا بہت بڑا مربی تھا، مالادھر باسو کو اسی نے بھاگوت پران کے بنگالی ترجمہ پر مقرر کیا، حسین شاہ کا ایک سپہ سالار پرگل خاں نامی ہے، پرگل خاں اور اس کے بیٹے نے اپنے نام کو اس بنا پر بقائے دوام بخش دیا ہے کہ انھوں نے مہابھارت کا ٹکڑا بنگالی میں ترجمہ کرایا،

پرگل خاں روزانہ شام کو اپنے محل پر گلپورو اقع فینی میں اپنے اہلِ دربار کو جمع کرتا تھا کہ مہابھارت کے بنگالی ترجمہ کو مترجم یعنی کویندرا پرمیشور کی زبان سے سنیں، پرگل خاں کے زیرِ اہتمام اس رزمیہ نظم کا ترجمہ "استری پرو" تک پورا ہوا، اس کے بعد چھوٹے خاں جو اس کا چاٹگام کی گورنری پہ جانشیں ہوا، اس نے سریکرن نندی شاعر کو مقرر کر کے اس کام کو جاری رکھا، اور "اشوبدھ پرو" کا ترجمہ کرایا،

مسلمان امراء کے اشارہ سے بنگالی میں سنسکرت اور فارسی کتابوں کے ترجمہ کرنے کی مثالیں شاذ نہیں ہیں، انھوں نے سنسکرت کے عشاق برہمن اور ہندو

---

[۵] مسلمانوں کے عہد میں چند سال کے لئے یہ بنگال کا راجہ بن بیٹھا تھا، اس کا بیٹا تخت نشیں ہو کر مسلمان ہو گیا تھا،

راجاؤں کے اس مغرور جذبہ کو جس سے وہ بنگالی زبان کو دیکھتے تھے، بدل دیا۔ مسلمان امرا کی تقلید میں بنگالی مصنفین کی ہمت افزائی، اور درباروں میں بنگالی شعراء کے رکھنے کا ہندو راجاؤں میں عام رواج ہوگیا۔ اس زمانہ نے کتنے ممتاز بنگالی شعراء اور مصنفین نے ہندو راجاؤں کے درباروں کو آراستہ کردیا، جس کے سبب سے بنگالی مقبولیت عام میں بلند سطح تک ترقی کرگئی اور ان زبانوں کی جو اپنے پاؤں اس صوبہ میں گاڑ رہی تھیں حریف بن گئی۔[۵۱]

الغرض رفتہ رفتہ عربی اور فارسی زبان کی تعلیم بنگالی شرفاء کا طغرائے امتیاز بن گئی خصوصاً اُن خاندانوں کے لئے جن کو حکمرانوں کی نیابت اور سرکاری عہدوں پر سرفرازی کا موروثی حق ہوگیا تھا، مہاراجہ سورج کنتر اچارجی ٹاکی، مہاراجہ جتندر موہن ٹاگور، اور مہاراجہ نادا کرشنا کے خاندان بنگال میں عربی اور فارسی علوم و ادبیات کے مربی تھے، اور اُن کے فرزندان علوم میں عالمانہ مہارت رکھتے تھے، راجہ رام موہن رائے بانی فرقہ برہمو سماج اور راجہ کشب چندر سین، جنھوں نے آخر زمانہ میں بنگالی قوم میں مصلح اعظم کا درجہ پایا ہے، علوم اسلامیہ کے واقفین میں ان کا شمار ہے، مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی ندوہ کے اجلاس مدراس (۱۹۱۷ء) میں تقریر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"بنگال کے جدید دور ترقی کا سنگ بنیاد راجہ رام موہن رائے کے قابل ہاتھوں سے رکھا گیا، یہ واقعہ ہے کہ انھوں نے پٹنہ میں عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی، گذشتہ موسم سرما میں کلکتہ کے ایک نامور بنگالی بابو نے مجھ سے کہا کہ ان کے باپ اور چچا کے زمانہ تک کلکتہ سے بکثرت بنگالی عربی پڑھنے پٹنہ جایا کرتے تھے، چنانچہ اُن کے چچا نے ۱۵ برس میں علوم عربیہ کی تکمیل کی تھی۔"

---

۵۱ پرموشن آف لرننگ ان انڈیا، ڈیورنگ دی محمڈن پیریڈ، ص ۱۰۷ - ۱۱۱

گرش چندر گھوش نے قرآن مجید، تذکرۃ الانبیاء اور مشکوٰۃ کا بنگالی میں ترجمہ کیا،

انہی اسباب کا اثر ہے کہ بنگالی زبان میں عربی اور فارسی کے الفاظ خصوصاً آداب سلطنت اور کارروائی ہائے مقدمہ کے الفاظ بکثرت ہیں، اور اب رفتہ رفتہ ان کی جگہ انگریزی لے رہی ہے، تاہم بنگال کی ڈیڑھ دو سو برس کی انگریزی حکومت کے بعد بھی ان الفاظ کا اب تک بنگالی میں رواج پذیر رہنا، اس کے معنی یہ ہیں کہ اس زبان میں ان مفاہیم کے لئے سرے سے الفاظ ہی نہ تھے،

بنگال کے بعض ممتاز خاندانوں کا سرنام اب تک فارسی ہے، مثلاً ملک، عمدہ دار، سرکار، موزمدار، اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اُن کو اپنے حاکم وقت کی زبان سے کس درجہ محبت تھی،

یہ معلوم کر کے تعجب کی انتہا نہ رہے گی کہ مرہٹی زبان کے بنانے میں بھی مسلمانوں کے زبان و قلم نے سب سے زیادہ کام کیا ہے، مرہٹوں کو طرز و آداب شاہی سیکھنے کے لئے مسلمانوں ہی کا دست نگر ہونا پڑا، ابتداً مرہٹی زبان ایک وسیع ملک کی جہانداری کی قوت نہیں رکھتی تھی، اس لئے ناچار انہی مسلمانوں اور برہمنوں کا اس کو ممنون ہونا پڑا، جنہوں نے فارسی زبان پڑھی، اور سیکھی تھی، مرہٹہ راجاؤں کے فرامین آج بھی تم پڑھ لو تو آدھے سے زیادہ اس میں اصلی یا بگڑے ہوئے فارسی و عربی الفاظ کی آمیزش پاؤ گے، تعلیم یافتہ سے تعلیم یافتہ مرہٹہ آج قدیم مرہٹی زبان کے لٹریچر کو سمجھنے سے اپنے کو عاجز پاتا ہے،

آداب و قواعدِ سلطنت، اکاغذات سرکاری، صنعت و حرفت، خانگی زندگی ہر ایک چیز میں اس کی زبان کا اصلی راس المال عربی و فارسی زبان کے الفاظ ہیں، ہمارے دوست شیخ عبدالقادر صاحب ایم اے، پروفیسر الفنسٹن کالج بمبئی جو مرہٹی زبان و ادب میں بڑی مہارت رکھتے ہیں، د

مرہٹی زبان کی ایک ڈکشنری لکھنے والے تھے، جس سے بیک دفعہ یہ نظر آجاتا کہ عدالت، کتب خانہ، مدرسہ بازار، کارخانہ، ہر جگہ مرہٹی کے آلات تخاطب عربی و فارسی الفاظ ہیں، حلوائی کی دوکان سے بڑھئی اور لوہار کے مکان تک چلے جاؤ آلات کے نام اور تہذیب و تمدن کے الفاظ کا ماخذ مسلمانوں ہی کی زبان کو پاؤ گے تاریخ کے لئے لفظ مرہٹی میں نہ تھا اب اس کو باکھر کہتے ہیں، اس زبان کے محققین کا بیان ہے کہ کھبر کی تحریف ہی باکھر سمجھے ؟ خبر!

بیسیوں ہندو خاندان وہاں آباد ہیں، جن کا سرمایۂ امتیاز یہ ہے کہ عہد قدیم میں اُن کا خاندان فارسی کا خدمت گذار تھا، اور اب تک اُن کا خاندانی سر نام وہی فارسی زبان کا لفظ ہے مثلاً پھڑنیس یعنی فرد نویس، چٹ نیس یعنی چٹھی نویس، کلہ دار یعنی قلعہ دار، پوت دار، یعنی پوتھی دار، ایک قسم کے مرہٹہ سپاہی کا نام سلہ دار تھا، اس کی اصل سمجھے سلحدار، تگائی تم جانتے ہو ؟ تم جس کو تقاوی بولتے ہو، آج کل دکن میں مرہٹوں اور برہمنوں کی زبانوں پر حسب ذیل عہدوں کے نام عام طور سے جاری ہیں،

مقدم	چودھری	فوجدار	سب انسپکٹر
معاملہ دار	تحصیلدار	تاجر	ناظر
کارکن	محرر	سررشتہ دار	سررشتہ دار
دیوان	سکریٹری		

ملک دکن اور مہاراشٹر کی تقریب سے ہم نے حیدرآباد کا ذکر نہیں کیا سبب یہ ہے کہ اس مجسمۂ عدل وانصاف ریاست نے اپنی ہندو رعایا کی تعلیمی و علمی ترقی میں جو کارنامے انجام دیئے ہیں وہ ایک مضمون کے ضمن میں نہیں، بلکہ ایک کتاب کے سیکڑوں صفحات میں اُن کا تذکرہ ہونا چاہیئے، صرف ایک حیدرآباد کی اسلامی ریاست نے اپنی ہندو رعایا کے ساتھ جو کچھ کیا اور کر رہی ہے تمام ہندوستان کی ہندو

ریاستوں نے مل کر بھی اپنی مسلمان رعایا کے ساتھ اتنا نہیں کیا، اس وقت موضوع سخن صرف علمی اور تعلیمی حالات ہیں، اس لئے صرف اسی زاویۂ نگاہ سے اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ علاوہ عام تعلیم کے جس کی بدولت ریاست کے تمام تر دفاتر پر ہندو اہل کار قابض رہے ہیں، اعلیٰ تعلیم کے لحاظ سے بھی ہر عصر میں یہاں ہندو اہلِ قلم مصنفین اور شعرا موجود رہے ہیں، اس بیان کی تصدیق کتب خانۂ آصفیہ کی مطبوعہ فہرست کی دو جلدوں میں ملے گی،

منشی لچھمی نرائن شفیق مصنف بساط الغنائم و تاریخ دکن، لالہ گردھاری لال مصنف تاریخ دکن، رائے منا لال مصنف تاریخ دکن، لالہ لچھمی نرائن مصنف چمنستان شعرا، راجہ گردھاری پرشاد باقی صاحب دیوان و مثنوی، مہاراجہ چندو لال شاداں، صاحبِ کلیات، نند رام مصنف سیاق نامہ، جگنا تھ نجومی مصنف تقویم التواریخ، حکیم رائے بجو لال تمکین، صاحبِ دیوان و مصنف مجربات، رتن لال مصنف تخطیط البلاد، وغیرہ کے سیکڑوں نام گنائے جا سکتے ہیں، اور عجب نہیں کہ کوئی حیدر آبادی قلم ان سے بھی بہتر اشخاص کے نام پیش کر سکے،

بہار، اودھ، صوبۂ آگرہ اور دلی کے متعلق بے خطر کہنا چاہئے، کہ یہاں ہندوؤں کی تعلیم مسلمانوں کے برابر برابر تھی، ان ممالک کے بے شمار ہندو فضلا کے نام تذکروں میں محفوظ ہیں، فقط ایک لکھنؤ میں ہندو شعرا کی تعداد سیکڑوں سے متجاوز ہوئی ہو گی، لکھنؤ کے کشمیری ہندوؤں میں فارسی تعلیم کا رواج انتہائی عروج پر تھا، لکھنؤ میں راجہ الفت رائے الفت، کالی پرشاد اخلاص، لالچند آتش، راجہ گنگا پرشاد بدر، منشی خیالی رام خیالی، بختاور سنگھ راقم، میکو لال الفت، رام سہائے رونق، میڈو لال نزار، راجہ جیالال گلشن، راجہ کالکا پرشاد موجد، منشی الممالک راجہ جوالا پرشاد وقار،

دیگر اضلاع اودھ و الہ آباد میں منن لال آفرین الہ آبادی، رائے امر سنگھ خوشدل نانکپوری

گوکل چند ہند ، فرخ آبادی، راجہ مدن سنگھ موزوں اٹاوی، رائے گلاب رائے گلشن سندیلوی سکھن لال نوجد بدایونی، لالہ بیج ناتھ مشتاق بریلوی، لالہ رام بخش مطیع قنوجی، لالہ بالمکند شہود ناگپوری، منشی ایشری داس آرام فرخ آبادی، اندرمن اورنگ آبادی (علی گڑھ)۔

آگرہ میں چندر بھان برہمن، شیورام حیا، رائے منوہر ولد رائے لون کرن، . . .

عظیم آباد پٹنہ میں لالہ اوجاگر الفت، راجہ پیارے لال الفتی، راجہ بہادر راجہ، راجہ رام نرائن موزون، منی پرشاد دل وغیرہ فارسی زبان کے مشہور شاعر، سخن فہم، انشا پرداز اور فاضل گذرے ہیں،

الہ آباد کے مشہور ہندو لیڈر مالوی جی اگر اس کو یاد رکھیں تو اچھا ہے کہ ممالک متحدہ کے ہندوؤں کے سب سے پہلے لیڈر جو اسی شہر الہ آباد میں آپکے ہم پیشہ تھے، اور جن کی کوشش سے آپ "پالیٹکس" کے لفظ سے گوش آشنا ہوئے ہیں، وہ عربی اور فارسی علوم کے ایک بہت بڑے ہمہ داں فاضل تھے یعنی پنڈت اجودھیا ناتھ، وہ ایک طرف کانگریس کے پلیٹ فارم پر لکچر دیتے تھے، تو دوسری طرف اپنے گھر میں بیٹھ کر متنبی اور عرفی کا درس دیتے تھے،

پنجاب بھی مسلمانوں کے تعلیمی اثر سے خالی نہیں، مل سیالکوٹی متخلص بہ وارستہ جو فارسی کے مشہور لغت مصطلحات الشعراء کا مصنف ہے، واتن کھتری شاگرد ملا عبد الحکیم سیالکوٹی، منشی چھمی نرائن دبیر گنج دی لاہوری پنجاب کے نامور ہندو فضلا ہیں، چھمی نرائن کو معقولات میں بھی بہت بڑی مہارت حاصل تھی، مصطلحات فارسی کی تحقیق میں وارستہ نے ۳۰ برس ایران میں گذارے تھے،

دلی میں منشی مادھورام منشی، رائے منوہر لال منوہر، مرزا راجہ کدارناتھ نسیم، مرزا کوذرہ دکھینے لگا، راجہ گوپال ناتھ غلام، پورن لال رنگین، بہادر سنگھ دلخوش، لالہ جنی داس ذرہ،

شیو سنگھ بیتاب، لالہ نرائن داس ہنجو، سکھراج سبقت، منشی گوہر لال تفتہ وغیرہ سیکڑوں فضلاء گذرے ہیں۔[1]

دیہاتوں میں تعلیم کا طریقہ وہی تھا جو مدت دراز سے ہندوستان میں جاری ہے، گرو جی دیہات کے زمینداروں کے ہاں نوکر ہوتے تھے، یا تمام گانوں کی طرف سے اُن کو تنخواہ ملتی تھی، لڑکے کسی کچے مکان کے برآمدہ میں یا سایہ دار درخت کے نیچے لپی ہوئی زمین پر بیٹھ جاتے تھے، ہاتھ میں لکڑی کا سیاہ رنگا ہوا تختہ ہوتا تھا، اس پر کھریا کی سفید روشنائی سے لکھتے تھے یا کھریا مٹی کے ڈھیلے سے زمین پر لکھتے تھے، ہندی لکھنا پڑھنا اور پہاڑا اور حساب اُن کو سکھایا جاتا تھا، یہ گویا پرائمری تعلیم تھی،

عام تعلیم تو یہیں ختم ہو جاتی تھی، جو لڑکے آگے بڑھنا چاہتے تھے، وہ یا سنسکرت اس کے بعد سیکھتے تھے، اور پنڈت بنتے تھے، اور یا سرکاری زبان فارسی کی تعلیم حاصل کر لیتے تھے، قصبوں میں فارسی کے مکتب ہوتے تھے، ہندو اور زیادہ تر مسلمان "میاں جی" پڑھاتے تھے، فارسی کی ابتدائی تعلیم میں بول چال، خط و کتابت، اور اخلاقی حکایات کی کتابیں داخل ہوتی تھیں، ہندو مسلمان لڑکے ایک ساتھ نہایت میل جول، اور یک جہتی کے ساتھ پڑھتے تھے، گلستاں، بوستان، یوسف زلیخا، انشائے خلیفہ، بہار دانش، اخلاق ناصری، انوار سہیلی، سکندر نامہ، شاہنامہ وغیرہ کتابیں داخل درس تھیں، خوشخطی اور فارسی نویسی سکھائی جاتی تھی، فرامین اور دیگر مراسلات سرکاری اور خط شکست کے پڑھنے کی عادت دلانے کے لئے پرانے لیے خطوط کا ایک طومار" میاں جی" اپنے پاس رکھتے تھے، جس میں سو دو سو خطوط لمبے جڑے ہوتے تھے، مکتب کے طالب العلم ان کو پڑھتے تھے، اس کو اسکول کی تعلیم سمجھنا چاہیئے۔

---

[1] یہ تمام نام مختلف فارسی تذکروں سے التقاط کئے گئے ہیں،

اس کے بعد یا تو لڑکے نوکری کر لیتے تھے، اور تکمیل کے لئے مشہور اساتذہ کی خدمت میں بڑے بڑے شہروں میں چلے جاتے تھے، ان سے فارسی کی اعلیٰ تعلیم، شاعری، علوم، اور کچھ عربی کی کتابیں پڑھتے تھے، بعض بعض طلبہ تمام علوم مروجہ کی تکمیل کرتے تھے،

ابوالفضل نے آئین اکبری میں اپنے زمانہ کا نصاب تعلیم یہ بتایا ہے، اخلاق، ریاضیات، حساب، زراعت، اقلیدس، مساحت، ہیئت، رمل، قواعد مال، آئین سلطنت، طب، طبعیات، الٰہیات، اور تاریخ، ہندوؤں کو ان علوم کے علاوہ ویاکرن (سنسکرت صرف و نحو) ویدانت (ہند و تصوف و اخلاق) پاتنجلی (ہند و فلسفہ) بھی پڑھنا پڑتا تھا، ابوالفضل کا بیان ہے کہ اس تعلیم کی بدولت تمام سلطنت آراستہ و مرصع ہو گئی تھی، اس کو اس عہد کے کالج کی تعلیم سمجھنا چاہئے،

سطور بالا میں تحصیل کمال اور طلب علم کے لئے جابجا اساتذہ کی خدمت میں سفر کا جو نقشہ میں نے کھینچا ہے، فارسی تذکروں کے پڑھنے سے یہ خود بخود سمجھ میں آجاتا ہے، ذیل میں منشی لچھمی نرائن دبیر کے حالات تعلیم کی چند سطریں ایک فارسی تذکرہ سے نقل کرتے ہیں:۔

"جد و پدرش در دہلی بوکالت امرائے عالمگیری و محمد شاہی عز امتیاز داشت:
دبیر در طفلی از مولوی شیخ محمد گرفت در سن دوازدہ سالگی بشوق نظم و نثر در مجلس
استفادہ سراج الدین علی خاں آرزو جا گرفت و برائے تحصیل صرف و نحو نزد لالہ
ٹیک چند بہار می رفت بعد رشد خدمت علمائے اسلام را التزام نمود و مشغول کتب
علم طب و دیگر علوم عقلیہ بود (در ۱۲۰۵ء مرد)

ہندو اور مسلمان طلبہ ان اساتذہ کی خدمت میں جس محبت و یک جہتی کے ساتھ مل کر تعلیم پاتے تھے، اور "استاد بھائی" بن کر جو رشتہ اتحاد باہم قائم کر لیتے تھے وہ آجکل کے شاندار ایوانوں کے

تاریخی زمانہ میں مفقود ہے، محمد حفیظ خاں المتوفی ۱۹۲۷ء ایک نامور استاد تھے، اُن کے شاگردان باخلاص کے نام سنیئے، امیر ابوالحسن، منشی لچھمن سنگھ، میر کلن، قادر بخش، پنڈت لچھمی رام، محمد اسمٰعیل، لالہ سکھرام، منشی کشن سنگھ، محمد تقی، منشی محبوب رائے، دیکھا، منشی محبوب رائے" کتنا پیارا نام ہے، کیا یہ ہندو مسلمانوں کے باہمی اتحاد کی عملی دلیل نہیں،

لالہ حنی داس ذرہ دلی کے ایک مشہور معلم تھے، جن کے مکتب میں ہندو مسلمان لڑکے پڑھتے تھے، ہندوستان کے خاتمۃ العلماء مولانا مفتی محمد لطف اللہ صاحب مرحوم کے استاد فارسی منشی سوہن لال تھے، اور مولانا ئے مرحوم کے تلامذہ میں جے بہاری لال کایستھ تھے، مولانا کے ایک تلمیذ رشید گواہی دیتے ہیں کہ میں نے خود دیکھا ہے کہ مولانا کے دوسرے رشید تلامذہ اُن کے ساتھ برادرانہ برتاؤ کرتے تھے[1]

تمدن ہند کا مصنف موسیو لیبان اپنی کتاب کے تیسرے باب میں ہندوؤں کے علوم وفنون پرحسب ذیل تنقید کرتا ہے:-

"ہم نے تمدن عرب میں جتنے باب علوم وفنون پر لکھے ہیں، اُن کی توقع اس کتاب میں نہیں ہوسکتی، چونکہ عربوں نے یونان وروم کے قدیم علمی ذخیرے کو خود بہت ترقی دی، اور اس کے بعد اس کو یورپ کے دارالعلوموں تک پہنچایا، اس لئے ہمیں ان کے زمانہ حکومت کی علمی ترقیوں میں ایک خاص دلچسپی تھی، اور اس وجہ سے ان ترقیوں کا بیان بھی تفصیل سے کیا گیا تھا، ہندوستان کے علوم کی یہ حالت نہیں ہے، برخلاف اس کے اُن کے علوم کے متعلق جو قدیم رائے تھی، اس میں بہت کچھ ترمیم ہوگئی ہے، اور ہمیں معلوم ہوگیا ہے کہ ان کے علمی خیالات ان اقوام سے لئے گئے ہیں، جن کے ساتھ

---

[1] خطبۂ صدارت ندوہ مدراس ۱۹۱۶ء از مولانائے شروانی،

اُن کو تعلق پیدا ہوا، اور خود ہندوؤں نے اس میں کچھ اضافہ نہیں کیا، پس کسی خاص زمانہ کے ہندی علوم کی تحقیقات کرنے کے یہ معنی ہوں گے کہ ہم ان اقوام کے علوم کی تحقیق کریں جن کا تعلق اس وقت ہند سے تھا، اور یہ ایک ایسی بحث ہے جو ہماری کتاب کے مقاصد سے خارج ہے، جو کچھ ہم ہندوؤں کی دماغی حالت کے متعلق لکھ چکے ہیں، اس سے بآسانی سمجھ میں آئے گا کہ انھوں نے کیوں ان علوم میں جو انھیں باہر سے حاصل ہوئے، کوئی ترقی نہیں کی، ہندو دماغ جو فلسفہ میں نکتہ رس اور فنون میں تیز فہم ہے، اس خاصیت سے جس کا نام مادۂ تحقیق ہے، اور جس کے اوپر علوم کا دارومدار ہے، بالکل عاری ہے، ہمیشہ سے ہندوؤں میں اصلی علوم کی کمی رہی ہے، ان میں دوسروں کی تحقیقات کو حاصل کر لینے کا تو پورا مادہ ہے لیکن اس درجہ سے یہ کبھی آگے نہ بڑھ سکے، وہ دو قومیں جن سے ہندوؤں نے اپنے علوم اخذ کئے، یونانی اور عرب معلوم ہوتے ہیں، یہ نہیں معلوم ہو کہ یونانی علوم ہند میں کیونکر پہونچے لیکن شمال و غربی ہند کی عمارات کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ ہندوستان کے تعلقات بیکیٹریا کے ساتھ مدت دراز تک قائم رہے، بہت ہی قرین قیاس ہے کہ اسی ذریعہ سے یونانی علوم ہند میں آئے، "وراہ مہر" جو نہایت قدیم ہندو مہندس ہے، اور جو اجین میں چھٹی صدی عیسوی میں تھا، اپنی ہیئت کی کتاب میں یونانی اصطلاحیں استعمال کرتا تھا، اور یونانیوں کی طرف اشارہ کرتا ہے، عربوں کا علم کس طرح ہند میں آیا، اس کا سمجھنا زیادہ آسان ہے، سنہ مسیحی سے بہت پہلے عربوں کے تجارتی تعلقات ہندوستان سے قائم تھے، اور عرب ہی مشرق اور مغرب کے باہم ملنے کے ذریعہ تھے، اس کے بعد جب مسلمانوں نے تمام قدیم دنیا کو فتح کر لیا تو یہ تعلقات مثل سابق کے قائم رہے، اور ہمیں عربی مورخین سے معلوم ہوتا ہے کہ خلفائے بغداد کے

دربار میں متعدد ہندو علما موجود تھے، اس سے بھی مابعد زمانہ میں جب مسلمانوں نے ہندوستان پر حکومت حاصل کی تو علمائے اسلام علوم کو برابر ملک میں پھیلاتے رہے، مثلاً گیارہویں صدی عیسوی میں البیرونی نے جس کا زمانہ محمود غزنوی اول فاتح ہندوستان کا ہے تمام ملک میں سفر کیا، اور علوم عربی کو جو اس وقت بہت وسیع ہو گئے تھے، کیونکہ ان میں نہ صرف قدیم دنیا کے علوم موجود تھے، بلکہ خود عربوں کی تحقیقات شامل ہو گئی تھیں ہندوستان میں پھیلایا، گیارہویں صدی عیسوی کے بعد سے کہنا چاہئے کہ ہندی علوم سے مراد عربی علوم ہیں، پس ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہندی علوم جن کی ابتدا پانچویں صدی عیسوی میں آریہ بھٹ کی ریاضیات سے ہوئی، اور پھر ساتویں صدی میں برہم گپت نے اس پر اضافہ کیا اس زمانہ سے لے کر آج تک انہی مسائل سے بحث کرتے ہیں، جو ہند میں ان دو ذریعوں سے آئے، اس وقت ہمارے پاس ہندو علوم کی مشہور تصانیف موجود ہیں، اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں نے خود ان علوم میں زیادہ ترقی نہیں کی کسی زمانہ میں خیال کیا جاتا تھا کہ ہندوؤں کا علم ہیئت بہت کچھ کامل ہے، اور قدیم ہے، لیکن اب یہ خیالات قائم نہیں رہے، اور ان پر بحث کرنا بے فائدہ ہوگا، اگر ان تصانیف میں کوئی نیا مسئلہ بیان کیا گیا ہے، تو محض اشارۃً اور بلا دلیل، مثلاً آریہ بھٹ چند سطروں میں زمین کی محوری حرکت روزانہ کا ذکر کرتا ہے لیکن کسی قسم کا ثبوت نہیں دیتا، اسی طرح بارہویں صدی عیسوی میں بھاسکر چاریہ نے اس طریقۂ حساب کی طرف جس کو کیلکیولس کہتے ہیں، اشارہ کیا ہے لیکن اس سے آگے نہ بڑھا،

جو کچھ اوپر بیان ہوا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں نے علوم میں کسی قسم کی جدت نہیں پیدا کی، جب اُن کی ذاتی تحقیقات کچھ نہیں ہے تو پھر اُن کے علوم سے بحث کرنا

اور محض ایسے مسائل پر ذکر ناجو عربوں اور یونانیوں کی تحقیقات سے لئے گئے ہیں، محض لاحاصل ہے، اگرچہ ہندو علوم میں کم ہیں لیکن عملی طور پر انھوں نے بہت بڑی ترقی کی"

عبارتِ بالا میں عربوں سے مانسیو موصوف کی مراد "مسلمان" ہیں، یہ غلط اصطلاح دوسرے یورپین مصنفوں کی زبان و قلم پر بھی چڑھی ہوئی ہے، ہندوستان کے ساتھ قدیم عرب تعلقات کا جو ذکر مصنف نے کیا ہے، اس سے اس کا اشارہ اس زمانہ قبل اسلام کی طرف ہے، جب مشرق و مغرب یا ہندوستان وچین اور روم ویونان کے درمیان عرب تاجر سفیر اور متوسط کی خدمت انجام دیتے تھے، یورپ کا مال وہی ہندوستان اورچین لے جاتے تھے، اور وہی ہندوستان کی مصنوعات کو یورپ کے ہاتھوں میں دیتے تھے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہئے تھا کہ قدیم ہندوستان، قدیم عرب کے تمدن سے کسی نہ کسی قدر متاثر ہو،

اس تاثر کے آثار و علامات ہندوستان کے سنگی کتبات اور تحریری اوراق دونوں میں ملتے ہیں، ہندوستان کی پرانی سے پرانی تحریر اس وقت وہ خطوط اور کتبے (انسکرپشن) ہیں، جو مگدھ (بہار) کے موریہ خاندان کے راجہ اسوکا (۲۵۳ ق م) کے مذہبی فرامین کی صورت میں ہندوستان کے پورے طول و عرض میں پشاور سے گجرات و دکن تک پہاڑوں پر اور لاٹوں پر کندہ ملتے ہیں، محققین فن خط (کیرکٹر) کا بیان ہے کہ ہندوستان کا یہ قدیم خط سامی خطوط کی شاخ آرامی خط سے ماخوذ ہے، لیکن خطوط کی زبان پالی ہے، یعنی قدیم بہار کی زبان جو بودھ کی مذہبی زبان تھی،

تمام آرین تحریریں بائیں سے دائیں طرف لکھی اور پڑھی جاتی ہیں لیکن عجیب بات یہ ہے

کہ یہ کتبے سامی تحریروں کی طرح داہنے سے بائیں طرف لکھے ہوئے ہیں، اور اسی طرح سے پڑھے جاتے ہیں، یہ اس بات کا دوسرا ثبوت ہے کہ ہندوستان کا قدیم سرمایۂ تحریر اپنے وجود و بقا میں عربوں کا ممنونِ کرم ہے۔[1]

ہمارے دعویٰ کے ثبوت کے لئے اس سے زیادہ عجیب تر اور نادر تر دستاویز ہے جو مہابھارت[2] کی عدالت عالیہ سے ہم کو مل سکی ہے، ستھیارتھ پرکاش کے گیارہویں سمولاس میں سوامی دیانند لکھتے ہیں:۔

"مہابھارت میں جب کوروں نے لاکھ کا گھر بنا کر پانڈوں کو اس کے اندر پھونک دینا چاہا تو بدر جی نے یدھشٹر کو عربی زبان میں بتایا، اور یدھشٹر نے اسی عربی زبان میں اُن کو جواب دیا"۔

سوامی جی کا بیان اگر صحیح ہے کہ ہم کو نہایت خوشی ہے کہ ہم ملچھیوں کی زبان کسی زمانہ میں اس قدر مقدس بھی تھی کہ دیوتاؤں کے بڑے بڑے اوتار اُس کو بولتے تھے، اور اس میں ایک دوسرے سے راز کی باتیں کہتے تھے،

بہرحال یہ قصے تو تاریخ کی یاد سے پہلے کے ہیں، خدا جانے اب کی بدگمان دنیا ان کہانیوں کو سچ بھی مانے گی یا نہیں، اس لئے ہم کو وہ داستان چھیڑنی چاہئے جو تاریخ کے ہوش کی باتیں ہیں مسلمانوں کے آفتاب دولت نے ہندوستان کے افق سے طلوع ہو کر ملک میں جو روشنی پھیلائی، ہم چاہتے ہیں کہ تاریخ کے منشوری شیشہ کے ذریعہ سے اس کی تحلیل کردیں تاکہ ہر صاحب بصیرت کو نظر آجائے کہ واقعہ کیا ہے؟ مسلمانوں نے ہندوستان آکر جن علوم کو پھیلایا، اور جس تعلیم کو

---

[1] تاریخ الادب ج ۱ ص ۵ شائع کردہ جامعہ مصریہ (ایجپشین یونیورسٹی) انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ج ۲۴ ص ۱۵۹، طبع ۱۱۔ [2] پہلا پرپ ادھیائے ص ۱۴۲

رائج کیا، ترتیب وار ہم اس کی تشریح کرنی چاہتے ہیں، اس کی بہتر اور آسان صورت یہ ہے کہ اس عہد کے ہندو مصنفین کا جائزہ لیا جائے، اور دکھایا جائے کہ مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں اُن کی کیا تعداد تھی، کیا حیثیت تھی، اور کیا نوعیت تھی، اس پچھلے زمانہ کی تعلیمی حالت کی تشریح کے لئے اُس کے سوا کوئی اور تدبیر نہیں،

ہم کو اس سے انکار نہیں کہ مسلمانوں کے عہد سے پہلے ہندوستان میں مصنفین موجود تھے اور اُن کی خاصی تعداد تھی، اُن کی ابتداء بودھ مت کے زمانۂ عروج سے ہوتی ہے، قدیم ہندوستان میں کہیں کہیں جو مدارس قائم تھے، اُن کا ذکر چینی سیاحوں نے کیا ہے، وہ اسی مذہب کی درسگاہیں تھیں، شنکر اچاریہ نے بدھ اور جین مت کو مٹا کر جب ویدک دھرم کا دوبارہ پرچار کیا، اور سنسکرت نے بدھ والوں کی پالی کو مٹا کر خود اُس کی جگہ لینی شروع کی، تو اس جوش و ہیجان نے طبیعتوں کو تصنیف و تالیف کی طرف رجوع کیا، اور سنسکرت زبان جو پہلے صرف عاؤں بھجنوں اور منتروں پر مشتمل تھی، وہ علوم و فنون پر بھی حکمراں ہوئی، تاہم مذہبی کتابوں سے قطع نظر کرکے اس کا خالص سرمایہ تحریر اتنا بھی نہیں جو چند الماریوں کی زینت بن سکے[1] ہر علم پر بیشتر جو کچھ اور افسانوں سے ملی جلی دو تین کتابیں تھیں، اس دعویٰ کی دلیل سنسکرت دان علمائے اسلام[1] اور مستشرقین یورپ[2] کے بیانات ہیں اور سنسکرت کی سرزمین کی موجودہ پیمائش علمی[3] ہے۔ مسلمانوں نے اُن کو بتایا کہ افسانہ اور کہانی سے الگ کرکے علوم و فنون پر خالص علمی کتابیں بھی لکھی جا سکتی ہیں، اکثر قدیم تصنیفات صرف برہمنوں کی ملکیت تھیں، وسعتِ تعلیم نے برہمنوں کو چھوڑ کر ہندوستان کے دوسرے طبقوں کو بھی یہ علمی آزادی بخشی، اولاً جیسا کہ ہر نئی چیز کا

---

[1] بیرونی کی کتاب الہند اور ابوالفضل کی آئین اکبری کا دفتر سوم [2] مثلاً تمدنِ ہند، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا لفظ انڈیا [3] دکن کالج پونہ میں سنسکرت کی مطبوعہ اور قلمی کتابوں کا سب سے بڑا ذخیرہ ہے، مذہبی کتابوں اور مکرر نسخوں کو ملا کر ۲۰۰۰ کتابوں کی تعداد ہے،

قاعدہ ہے مسلمانوں کی زبان سیکھنا برہمنوں نے ناجائز قرار دیا تھا، اشلوک بنائے گئے کہ مسلمانوں کی زبان سیکھنا، اور جینیوں کے مندر میں جانا مست ہاتھی کے آگے پڑ جانے سے زیادہ خطرناک ہے[1]، تاہم جیسا کہ ہم نے اوپر بہ تفصیل بیان کیا ہے کہ رفتہ رفتہ یہ تعصب ہندوؤں سے کیونکر دور ہوا، اور سینکڑوں برس کے بعد سکندر لودی کے زمانہ سے فارسی تعلیم نے اُن میں عام اشاعت پائی

اسلامی علوم میں سب سے پہلے ہم تاریخ کا ذکر کرتے ہیں،

ہندو مؤرخین

تاریخ وہ فن ہے جس کی طرف قدیم ہندو دماغ نے کبھی توجہ ہی نہیں کی، لیبان توکہتا ہے کہ اُس کے لئے ہندوؤں کا دماغ ناموزوں معلوم ہوتا ہے[2] آریہ ورت انسانیت کا نہایت قدیم گہوارہ ہے، اگر یہاں انسانوں کے پچھلے تاریخی کارناموں کو محفوظ رکھنے کی لیاقت ہوتی تو بہت سے قدیم عقدے آج ہمارے لئے پیچیدہ نہ ہوتے، ہندوستان کی پُرانی داستان سننے کے لئے ہم کو یونان اور چین کے سیاحوں کے پاس جانا پڑتا ہے، خود ہمارے گھر میں اپنی دنیا کی پچھلی زندگی سے واقفیت حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے، ویدوں کے کہنہ اوراق منوشاستر کے قانونی دفعات مہابھارت کے رنگین صفحات، رامائن کی پُردرد کہانیاں اور اپنشد کی پیاری پیاری باتیں اُن میں سے کوئی چیز قدیم ہندوستان کی تاریخ کا ہم کو پتہ نہیں دیتی،

آغاز عالم سے زمانہ اسلام تک ہندوستان میں جو سیاسی انقلابات ہوئے، ملک کے صوبہ صوبہ پر جو حکمراں فرماں روائی کر رہے تھے، بڑے بڑے جو عالم فاضل اور پنڈت پیدا ہوئے

---

[1] ستیارتھ پرکاش سمولاس ۱۱، [2] تمدن ہند ص ۳۳۹)

اُن کے تاریخی حالات کا آج پتہ لگانا۔ چاہو صحیح تاریخ ولادت، وفات اور سوانح حیات جاننا چاہو تو قیاس کے سوا کوئی روشنی تمھاری رہ نمائی نہ کرسکے گی، پرانوں سے صرف رشیوں اور منیوں کے کچھ کچھ حالات معلوم ہوتے ہیں، لیکن وہ تاریخ نہیں،

لیکن اسی غیر تاریخی ملک میں جب مسلمانوں کا قدم آتا ہے، تو یہاں کا زمین و آسمان بدل جاتا ہے "آبہ ورت" کا ذرّہ ذرّہ چمک اُٹھتا ہے، مسلمان سلاطین امرا، علما، شعرا، اور دوسرے اکابر رجال کو چھوڑ کر مسلمان مورخوں اور تذکرہ نویسوں نے خود ہندو راجاؤں، پنڈتوں، شاعروں اور امیروں کے حالات اس قدر لکھے ہیں۔ کہ بہ آسانی دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہزار ہا سال جو ہندو قوم پر گذرے، اس زمانہ کے (میتھالوجیکل) تمام ہندو علماً اور امرا کی فہرست جتنی طویل بنائی جاسکتی ہے، مسلمانوں کی آمد کے بعد صرف آخری ۵۰۰ برس کے عرصہ میں اس سے دو چند بلکہ سہ چند بڑی فہرست مع احوال تاریخی پیش کی جاسکتی ہے' صرف تیموریوں کے زمانہ میں جو ہندو امرا اور علمار گذرے ہیں اُن کے حالات و بیانات دو تین جلدوں میں سما سکتے ہیں، ہندو فارسی شعرا کے نام و سوانح باایں ہمہ قومی بیگانگی ہمارے فارسی تذکرے جو خاص مسلمانوں کے قلم سے نکلے ہیں، اس قدر سُنا سکتے ہیں کہ آپ سنتے سنتے گھبرا اٹھیں گے،

آج یورپ کے دعوائے آزادی و مساوات کے شور و ہنگامہ نے دنیا کو چھا لیا ہے، ممالک مفتوحہ میں اشاعت تعلیم کی یہ کثرت ان کا بیان ہے کہ صرف ہمارے دور حکومت کی خصوصیت ہے ہم کہتے ہیں بجا ہے، اور درست ہے، جاؤ اور انگریزی قلم کی تصنیفی فہرست کا ایک ایک ورق پڑھ ڈالو، ان کی انسائیکلو پیڈیائیں الٹ ڈالو، ان کی تاریخ اور تذکروں کو چھان ڈالو، اس تفحص، اس تلاش اور اس محنت کے بعد ہم کو بتاؤ کہ مغرور انگریزی قلم کے آب حیات نے تمھارے

کتنے علما، فضلا اور شعرار کے نام زندہ کئے ہیں، اور کتنے اس قابل سمجھے گئے ہیں کہ حکمراں قوم اپنی شاہی زبان میں اور اس پریس کے عہد میں اُن کے تذکرے لکھے؟ پھر کیا ظالم، بُت شکن، اور میچھ مسلمانوں کی یہ علمی آزادی و مساوات نہ سمجھی جائیگی کہ انھوں نے مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں قوموں کے فضلار کو ایک نظر سے دیکھا، اور اس حکمراں قوم نے اپنی شاہی زبان کے علمی درباروں میں دونوں کو پہلو بہ پہلو جگہ دی،

علاوہ ازیں مسلمانوں کے تاریخی ذوق نے ہندوؤں میں اس فن کی تعلیم و ترقی کا وہ جوش پیدا کیا کہ آج بھی اگر یورپ اور ہندوستان کے کتب خانوں کا جائزہ لیا جائے تو ایک بڑا گراں قیمت سرمایہ فراہم کیا جاسکتا ہے، ہمارے سامنے تو اس وقت یورپ اور ہندوستان کے مادی کتب خانے نہیں، صرف حیدرآباد، بانکی پور، ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ، اور لندن کے کتب خانوں کی فہرستوں کے معلومات ہیں تاہم انھوں نے ہندو زبان کے فارسی مصنفین کے (جو عہد اسلامی کی علمی و تعلیمی کوششوں کے نتائج عملی ہیں) حالات بہم پہنچائے ہیں، وہ کس قدر حیرت افزا ہیں، سب سے پہلے ہم کو اس عہد کے ہندو مورخین کا تذکرہ کرنا ہے،

راج ترنگنی | پیش نظر مواد جہاں تک ہماری اعانت کرتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی سب سے پہلی تاریخ جو کسی ہندی قلم نے لکھی، وہ کشمیر کی تاریخ راج ترنگنی ہے، یہ کتاب ہندی میں سلطان زین العابدین والی کشمیر کے زمانہ میں لکھی گئی تھی؟ (سلطان ۸۲۶ھ میں تخت نشین ہوا تھا) مصنف کا نام کلہانا ہے، اکبر جب کشمیر گیا، تو یہ کتاب اس کے دربار میں پیش کی گئی، اور اس کے حکم سے اس کا فارسی میں ترجمہ ہوا، ابوالفضل کا بیان ہے کہ اس میں کشمیر کے متعلق پانچ ہزار برس کا حال لکھا ہے، والیانِ کشمیر کے درباروں میں تاریخ نویسی کا خاص

لے گذشتہ تاریخ سے بحث نہیں بلکہ زمانۂ رواں کا سوال ہے، ۲ے تاریخ فرشتہ نولکشور ج ۲ ص ۳۴۴،

عمدہ تھا، اور یہ کتاب اسی کوشش کا ثمرۂ نورس تھی،[۵]

اصل متن کتاب فرانس، اور ہندوستان میں چھپ گئی ہے، اور فارسی نسخہ بھی مطبوع ہے،

لال جی داس | بابا لال گرو شاہجہاں کے زمانہ میں ایک عارف جوگی تھے، شہزادہ داراشکوہ انہی کا مرید تھا، لال جی داس بابا لال گرو کا چیلا تھا، بابا کا سنہ پیدائش ۱۰۱۴ھ ہے، ۱۰۵۹ھ تک وہ زندہ تھے، لال جی داس نے ۱۰۵۸ھ میں گرو کے حالات وملفوظات کو فارسی میں جمع کیا، گورنمنٹ کلیکشن لائبریری میں اس کا ایک نسخہ ۱۴ سنہ جلوس عالم شاہی کا لکھا ہوا موجود ہے،

بنوالی داس | شہزادہ داراشکوہ کا میرمنشی تھا، بعضوں نے اس کا نام بھوانی داس لکھا ہے، کتب خانۂ آصفیہ کے فہرست نویس نے ولی رام گوسائیں داراشکوہی نام بتایا ہے، بنوالی اور بھوانی تو کتابت کی تصحیف ہے، ولی اس کا تخلص نام میں داخل ہوگیا ہے، اس نے شاہانِ دہلی کی تاریخ لکھی ہے، کتاب کا نام راجاولی ہے، کتاب مستند ہے، اور بہت سی معتبر کتابوں میں اس کے حوالے ہیں، اس کے قلمی نسخے اکثر کتب خانوں میں موجود ہیں،

رائے بندرابن | رائے بہارامل کا لڑکا تھا، بہارامل نے ۲۰ سنہ جلوس شاہجہانی میں، حسنِ خدمات کے صلہ میں رائے کا خطاب پایا تھا، داراشکوہ نے اس کو اپنا دیوان مقرر کیا تھا، اس کے بیٹے بندرابن کو عالمگیر نے تربیت دی، اور رائے کا خطاب بخشا، بندرابن نے لب التواریخ کے نام سے ایک بہترین کتاب یادگار چھوڑی ہے،

ایسر داس | قوم ناگر، پٹن کا باشندہ تھا، وہ خود کہتا ہے کہ بچپن سے ۳۰ سال کی عمر تک وہ قاضی شیخ الاسلام ابن عبدالوہاب المتوفی سنہ ۱۰۹۶ھ کی خدمت میں حاضر ہوکر تحصیل علم

---

[۵] آئین اکبری نولکشور جلد ۲ ص ۱۰۱ و ۵۲ دکن کالج لائبریری کیٹلاگ ص ۱۹۹،

کرتا رہا ہے، امرا و اعیانِ دولت جو قاضی صاحب کی خدمت میں آیا کرتے تھے، اُون کے مُباحثات اور گفتگوؤں کو بغور سنتا تھا، اور اُن سے فوائد حاصل کرتا تھا تکمیلِ علم کے بعد ایسر داس شجاعت خاں حاکم گجرات کی وساطت سے جودھپور کا امین مقرر ہوا، وہ ہاتھ جو تیس برس تک صرف قلم سے مانوس رہا تھا تلوار کے قبضہ سے بھی مانوس ہوگیا، اُس نے میدانِ جنگ میں کامیابی حاصل کی، بادشاہ کی طرف سے میرٹھ میں اُس کو جاگیر عنایت ہوئی، اور دو بست و نیم صدی افسر مقرر ہوا، عہد عالمگیری کے امن و امان میں ہمارا یہ فوجی افسر پھر وہی ۳۰ سال کا جوان طالب علم نظر آتا ہے، اور فتوحاتِ عالمگیری نام ایک بڑی تصنیف اپنی یادگار چھوڑتا ہے،

بھیم سین کایستھ | رگھونندن داس اس کے باپ کا نام تھا ۲۳ سنہ جلوس شاہجہانی (۱۰۵۹ھ) میں برہان پور دکن میں پیدا ہوا تھا، اس کا ایک عزیز بھگنداس عالمگیر کے دربار میں دیوان تھا، اور دیانت رائے کے خطاب سے ممتاز تھا، بھیم سین نے بندیلہ کے حاکم راؤ دلپت کی سرکار میں نوکری کی، راؤ دلپت دکن کی لڑائیوں میں نہایت کارآمد سردار ثابت ہوا تھا، عالمگیر نے راؤ کے خطاب کے ساتھ تین ہزار فوج کا افسر بنا دیا،

بھیم سین گو کایستھ تھا لیکن قلعہ ناگرک کی قلعہ داری اُس نے نہایت خوبی سے کی، سنہ ۱۱۲۰ھ میں نوکری سے مستعفی ہو کر اپنے وطن میں گوشہ نشین ہوگیا، اور اب موقع آیا کہ تلوار کے بجائے قلم کا حق ادا کرے، دلکشا کے نام سے عہد عالمگیری کی تاریخ لکھی ہے، جو اب تک موجود ہے،

نرائن کول عاجز | باشندۂ کشمیر اپنی تصنیف کے دیباچہ میں لکھتا ہے، کہ ایک مدت سے شرفاے کشمیر کا تقاضا تھا کہ اُن کے وطن کی ایک تاریخ لکھدوں، بالآخر بزرگانِ وطن

کے اصرار سے مجبور ہوکر میں نے یہ بار امانت اٹھالیا، اسی زمانہ میں عارف خاں کشمیر کے دیوان اور نائب صوبہ دار کے حکم سے ملک حیدر نے سنسکرت سے کچھ مواد فراہم کیا تھا، وہ میرے حوالہ کیا گیا، میں نے اُس کو دیکھا، تو قابل اصلاح نظر آیا، بالآخر اصل سنسکرت سے مقابلہ کرکے اسکو بھی اپنی کتاب میں شامل کرلیا، ۱۱۲۲ھ میں تاریخ کشمیر تکمیل کو پہونچی،

منشی ہیرامن گردھرداس | معتمد خاں کے منشی تھے، معتمد خاں نے بھائیوں کی لڑائی میں عالمگیر کا ساتھ دیا تھا، امن و امان کے بعد ۱۰۷۱ھ میں وہ گوالیار کا حاکم مقرر ہوا، منشی ہیرامن نے اس تقریب سے اسی زمانہ میں گوالیار نامہ کتاب لکھی، جس میں راجہ بکرماجیت کے ۳۳۲ برس بعد سے لیکر معتمد خاں کی حکومت کے زمانہ تک گوالیار کی تاریخ مرتب کی،

جسونت رائے | جسونت رائے ولد بھگوت رائے ولد سندرداس منشی، لاہوری فارسی زبان کا فاضل اور شاعر تھا، پہلے پردل خاں کے یہاں نوکر تھا، ۱۱۵۸ھ میں کرنال گیا، اور نواب سعادت اللہ خاں کے دربار میں رسائی پیدا کی اور ایک جیبہ قصیدہ پیش کیا، نواب نے قدردانی کی، اور جسونت رائے نے وہیں سکونت اختیار کرلی، اور سعید نامہ کے نام سے نواب سعادت اللہ خاں اور اُن کے خاندان کی تاریخ لکھی،

منشی ٹھاکرلال | ولد بھوج داس کایستھ ماتر ضلع برہان پور کا رہنے والا تھا، ۱۱۳۵ھ میں اس نے ایک کتاب لکھی، جس کا نام "دستور العمل شہنشاہی" رکھا، اس میں اُس نے ہندوستان اور دکن کے واقعات بطور فہرست ترتیب دیئے ہیں،

منشی سوجان رائے کھتری | شہنشاہ عالمگیر کے زمانہ میں تھا، خلاصۃ التواریخ کے نام سے ایک نہایت ضخیم اور مفصل تاریخ ابتدائے عالم سے لے کر شہنشاہ اورنگزیب کے عہد تک لکھی، اور اس کوشش اور محنت سے لکھی کہ وہ مستند کتابوں کی فہرست میں داخل ہے، منشی موصوف اپنے کو

پٹیالہ کا رہنے والا بتاتے ہیں، اس کتاب کا قلمی نسخہ حیدرآباد اور لندن کے کتب خانہ مشرقی میں موجود ہے
سنہ ۱۱۵۳ھ میں وفات پائی،

بندرابن داس | بندرابن داس بہادر شاہی، بہادر شاہ اول کے درباری متوسلین میں تھا ۴۲ جلوس عالمگیری مطابق سنہ ۱۱۰۵ھ میں اس نے لب التواریخ نام کتاب لکھی، اس میں ہندوستان کی تاریخ آریوں کے قدیم زمانہ سے لیکر عہد عالمگیری تک ترتیب دی ہے، عربی آمیز فارسی عبارت اس خوبی سے لکھی ہے کہ ایرانی قلم کا اس پر دھوکا ہوتا ہے، مقدمہ میں اپنے ماخذ گنائے ہیں، واقعات کا نہایت استقصار کیا ہے، اس کتاب کا ایک نادر نسخہ سنہ ۱۲۳۸ھ کا لکھا ہوا، وینہ (بہار) کی اصلاح لائبریری میں موجود ہے،

جگجیون داس | ولد منوہر داس باشندۂ گجرات، محمد معظم شاہ کی سرکار میں ڈاک کا مہتمم تھا، چونکہ خفیہ سرکاری کاغذات اس کی نظر سے گذرتے تھے، اس لئے اُس کو واقعات کے جمع کرنے کا شوق پیدا ہوا، سنہ ۱۱۱۹ھ میں بہادر شاہ اول نے لاہور کے دربار میں باریابی بخشی، اور وقائع نگاری کی خدمت پر اس کو مامور کیا، سنہ ۱۱۲۰ھ میں اس نے اپنی محنتوں کا ثمرہ منتخب التواریخ کے نام سے لکھ کر پیش کیا، اُس کے صلہ میں دربار شاہی سے خطاب خلعت و انعام حاصل ہوا،

کامراج | ولد نین سنگھ بھیچپوند ضلع اٹاوہ اس کا وطن تھا، شہزادہ محمد اعظم کی سرکار میں مالوہ میں اس کو حاضری کا موقع ملا، اعظم الحرب کے نام سے اس نے شہزادہ کی لڑائیوں کے حالات لکھے، کامراج دیباچہ میں لکھتے ہیں: کہ بہت سے واقعات خود شاہی وقائع نگار نے اس کے لئے بہم پہنچائے، مصنف نہایت اخلاص اور عقیدت مندی کے ساتھ اپنے کو تیموری دربار کا پشت در پشت سے نمک خوار بتاتا ہے،

کشن چند اخلاص کھتری | شاہجہان آبادی، شاگرد مرزا عبد الغنی قبول کشمیری، اس کا باپ جیون داس

فارسی کا شاعر تھا، کشن چند نے ہمیشہ بہار کے نام سے ۱۱۳۶ھ میں تذکرۂ شعرا لکھا، اس میں اکبر سے لیکر محمد شاہ کے عہد تک کے فارسی شعراء کے حالات و سوانح ہیں، یہ تذکرہ اس قدر مستند ہے کہ علامہ آزاد بلگرامی خزانۂ عامرہ کی تالیف میں اس کو اپنا ماخذ قرار دیتے ہیں، اور علانیہ اس سے استفادہ کا اعتراف کرتے ہیں، اس کتاب کے نسخے بانکی پور اور حیدرآباد کے کتب خانوں میں ہیں،

لال رام | باپ کا نام دولہ رام اور دادا کا نام رائے کنجن، رائے کنجن، عالمگیر کے عہد حکومت میں کسی عہدہ پر ممتاز اور رائے کے خطاب سے مشرف تھا، دولہ رام بھی رائے کے خطاب سے مخاطب اور عہدہ داران شاہی میں داخل تھا، خود لالہ رام محمد شاہ کی سرکار میں نوکر تھا، ۱۱۴۰ھ میں تحفۃ الہند ایک مستند تاریخی کتاب لکھ کر دربار شاہی میں تحفۃً پیش کی،

خوشحال چند | کسی زمانہ میں شاہ عالمگیر کے شاہی دربار کا دیوان تھا، ۱۱۶۴ھ اسکی تاریخ وفات ہے، اس کی وفات کے بعد اس کی جگہ اس کے بیٹے کو ملی، تاریخ نادر الزمانی خوشحال چند کی بہترین تصنیف ہے،

ہیرالال خوشدل | یہ غالباً دکن کا باشندہ ہوگا، قطب شاہیۂ دکن کی اُس نے منظوم تاریخ لکھی ہے، زمانۂ وجود معلوم نہیں، دسویں صدی ہجری کے آخر میں یا گیارہویں صدی کے اوّل میں اس کو ہونا چاہئے، قطب شاہیہ کا زمانۂ حکومت یہی ہے، یہ کتاب بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانہ میں موجود ہے،

مہاراجہ کلیان سنگھ | کلیان سنگھ کا دادا رائے ہمت سنگھ دہلی کا ایک کایستھ، امیرالامراء صمصام الدولہ کی سرکار میں دیوان تھا، اس کے بیٹے شتاب رائے نے بڑا عروج حاصل کیا، دربار شاہی سے ممتاز الملک مہاراجہ شتاب رائے بہادر منصور جنگ کے نام سے مخاطب تھا، اور سلطنت کی طرف سے صوبہ بہار کا ناظم (گورنر) مقرر ہوا تھا، خود بھی فاضل تھا، اور فضلائے وقت کا قدرداں بھی تھا، ۱۱۸۷ھ میں

اُس نے وفات پائی، تو اس کا لڑکا انتظام الملک ممتاز الدولہ مہاراجہ کلیان سنگھ بہادر تہور جنگ کے نام سے صوبہ کی نظامت (گورنری) پر مامور ہوا، یہ بھی اپنے باپ کی طرح علم دوست تھا۔ خلاصۃ التواریخ اس کی تصنیف ہے، جس میں امیر تیمور سے لے کر اپنے زمانہ تک کے حالات لکھے ہیں، اس کی دوسری تصنیف واردات قاسمی ہے، جو نظامت بنگالہ کی تاریخ ہے،

شیو داس لکھنوی | شیو داس نے شاہنامۂ منور کلام کے نام سے فرخ سیر (۱۱۲۴ھ) اور محمد شاہ (۱۱۳۱ھ) کے زمانہ تک کے حالات لکھے ہیں، دربار شاہی میں یہ بہت دنوں تک منشی (سکریٹری) کے عہدہ پر ممتاز رہا ہے،

روپ نرائن | ولد ہری رام کھتری متوطن سیالکوٹ، اُس نے ۱۱۲۹ھ میں ہندوؤں کے مقدس مقامات کے حالات و کیفیات لکھی، کتاب کا اصلی نام برج مہاتم اور تاریخی نام مخزن العرفان ہے،

رائے چترمن | قوم کا ئستھ سکینہ، اُس نے وزیر الممالک نازی الدین خان کی فرمائش سے ہندوستان کی تاریخ لکھی، اور اس کا نام چار گلشن رکھا، یہ کتاب چار گلشنوں پر منقسم ہے، گلشن اول بادشاہان ہند کے حال میں، گلشن دوم صوبوں کے حال میں، گلشن سوم دہلی سے چاروں طرف بڑے بڑے شہروں تک جو سڑکیں گئی ہیں اُن کی پیمایش، اور ایک ایک منزل کا حال (یہ باب اس کتاب کا سب سے اہم حصہ ہے) گلشن چہارم میں ہندو فقیروں اور جوگیوں کے حالات اور سلسلے، ۱۱۷۳ھ میں یہ کتاب اتمام کو پہونچی،

درگاداس | باپ کا نام شیو شنکر داس، سفینۂ عشرت ایک فارسی تذکرہ کا مصنف ہے، ۱۱۷۵ھ میں یہ تذکرہ تالیف پایا، عجب نہیں کہ یہ حزیں کا شاگرد ہو،

انند روپ | ضلع نارنول (مدراس) کا ایک برہمن تھا، کھانوجی بھونسلا کے دربار میں کچھ دنوں نوکر رہا تھا، نصیر الملک نصیر جنگ کے معاملہ میں ناگپور سے الٰہ آباد آیا، یہاں اُس نے ۱۱۲۲ھ میں

میزان دانش لکھی، "جوگ" کے اعتبار سے چار حصوں میں منقسم ہے،

منا لال | ولد بہادر سنگھ اس نے شاہ عالم کے دور حکومت کی تاریخ لکھی ہے، کتاب کا آغاز ۱۱۸۴ھ سے شروع ہوتا ہے، جب شاہ عالم نے الہ آباد سے دلی کا رخ کیا ہے،

رائے کیول رام | ولد رگھو ناتھ داس اگروال، اطراف دلی میں قصبہ کسنا اس کا وطن تھا ۱۱۹۴ھ میں اس نے تذکرۃ الامرا نام ایک کتاب لکھی، دیباچہ میں بیان کیا ہے کہ یہ کتاب شاہی روزنامچوں اور وقائع ناموں سے مرتب کی گئی ہے،

دلپت رائے | مخاطب بہ راؤ دلپت سنگھ، اس کا مولد احمد آباد گجرات ہے، اس کا باپ گلاب رائے یہاں متصدی تھا، دلپت رائے عربی، فارسی، سنسکرت، پراکرت اور بھاکا زبانوں میں کامل دستگاہ رکھتا تھا، ۵ برس کی عمر میں جے نگر (جے پور) آیا، اور مہاراجہ مادھو سنگھ کے حکم سے ملاحت مقال لکھنی شروع کی، اور ۱۱۸۱ھ میں مہاراجہ کے مرنے کے بعد اس کو تمام کیا،

بندرابن خوشگو | قوم ویش، باشندہ متھرا، اپنے زمانہ کے مشہور اساتذۂ سخن کا شرف تلمذ اسکو حاصل تھا، سراج الدین علی خان آرزو، مرزا عبدالقادر بیدل، محمد افضل سرخوش، اور شیخ سعد اللہ گلشن کی صحبتیں اٹھائی تھیں، نظم و نثر دونوں میں کمال حاصل تھا، سفینۂ خوشگو اور تذکرۃ المعاصرین دو تذکرے لکھ کر، نواب عمدۃ الملک امیر خاں کی سرکار میں پیش کئے، نواب نے قدر دانی کی، اور دو روپیہ روزانہ وظیفہ مقرر کیا، نواب کی وفات کے بعد ترک دنیا کرکے عظیم آباد پٹنہ میں اقامت اختیار کی، ۱۱۷۰ھ میں وفات پائی کتب خانہ بانکی پور میں اس تذکرہ کا جو نسخہ ہے، وہ علامہ آزاد بلگرامی کا مملوکہ ہے، اور انہی کی فرمایش سے ۱۱۶۳ھ میں نقل کیا گیا ہے،

گل رعنا کے مولف نے اس تذکرہ سے فائدہ اٹھایا ہے،

پنڈت کرشنانند | پنڈت انند گھن کا بیٹا تھا، اُس نے تاریخ شاہان ہند کے نام سے ایک کتاب لکھی، اس کا متعین زمانہ نہیں معلوم لیکن سنہ ۱۸۰۳ء یعنی تقریباً سنہ ۱۲۱۷ھ میں موجود تھا،

سنگھ | قوم کھتری، اس نے سکھ فرقہ کی تاریخ سنہ ۱۱۷۰ھ سے اپنے زمانہ تک لکھی ہے، اس کو اس کتاب کی تالیف میں لالہ عجائب سنگھ سے بہت مدد ملی، کتاب کا نام رسالہ نانک شاہ ہے سنہ تالیف معلوم نہیں۔

رگھوناتھ | غالباً مرہٹہ ہے اُس نے سنہ ۱۷۸۴ء میں حالاتِ مرہٹہ کے نام سے مرہٹوں کی تاریخ لکھی

شیو پرشاد | نواب فیض اللہ خاں روہیلہ کی سرکار میں نوکر تھا، سنہ ۱۱۹۰ھ میں اس نے تاریخ فیض بخش کے نام سے روہیلہ پٹھانوں کی تاریخ لکھی،

ٹکندرائے | اُس نے راجہ ہلکر کے سیاسی خطوط کا فارسی میں ترجمہ کیا، ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں ہے، خط ہلکر نام ہے، سنہ ۱۱۹۰ھ تالیف ہے،

موہن لال انیس | ولد رائے تولارام قانون گو، قوم کایستھ، باشندۂ لکھنؤ، فارسی شاعری میں مرزا فاخر مکین کا شاگرد تھا، انیس الاخبار کے نام سے سنہ ۱۱۹۳ھ میں اس نے مرزا مکین اور اُن کے تلامذہ کا ایک دلچسپ تذکرہ لکھا، اس تذکرہ میں مرزا مکین کے چند ہندو شاگردوں کے بھی حالات ہیں،

ہرنام سنگھ | ولد کور داس سنگھ، ملانوہ، نواح لکھنؤ کا باشندہ سرسوتی برہمن تھا، محبت اللہ خان حاکم بریلی کے زیرِ سایہ رہا، تاریخ سعادت جاوید اس کی بہترین یادگار ہے، عین الدین خان کا زمانۂ حکومت بریلی سنہ ۱۱۹۵ھ سے سنہ ۱۱۹۹ھ تک ہے۔

رنچھوڑ جی | ولد امرجی دیوان رنچھوڑ جی نے سنہ ۱۸۲۴ء مطابق سنہ ۱۲۴۰ھ میں تاریخ سورت لکھی ہے اس میں جوناگڑھ اور ناگر قوم کے حالات درج کئے ہیں،

لچھمی نرائن شفیق | لاہور وطن تھا، اس کا دادا عالمگیر کے ساتھ مہم دکن میں گیا، اور اورنگ آباد دکن میں سکونت اختیار کر لی، اس کا باپ رائے منسارام نواب آصف جاہ کا دیوان تھا، لچھمی نرائن شفیق ان ہندو فضلا میں سے ہے جن کی قابلیت اور علم پر زمانہ فخر کر سکتا ہے، علامہ آزاد بلگرامی کا شاگرد، اور عالیجاہ بہادر کے سلک ملازمین میں داخل تھا، تاریخ کا ذوق استاد آزاد سے وراثت میں پایا تھا، چنانچہ اس فن میں اس کی متعدد تالیفات ہیں، گل رعنا اور شام غریبان دو شعرا کے تذکرے ہیں، ۱۲۰۴ھ میں حقیقتہائے ہندوستان لکھی، خلاصۃ الہند بھی اسی کی تصنیف ہے، تواریخ آصفی، اس کی پانچویں تالیف ہے، لیکن سب سے بہتر اور عمدہ تصنیف بساط الغنائم ہے، جس میں اُس نے مرہٹوں کی تاریخ قلم بند کی ہے،

ہرسکھ رائے | جیون داس کا بیٹا اور بسنت رائے کا پوتا، قوم کھتری، وطن لاہور، اس نے اپنے ماموں سری نارائن کے مشورہ سے ۱۲۱۲ھ میں مجمع البحار لکھنی شروع کی، اور ۱۲۲۰ھ میں اس کو اختتام کو پہنچایا، اس سے چند سال پیشتر ۱۲۱۱ھ میں زبدۃ القوانین نام ایک نہایت کارآمد اور پُر معلومات کتاب لکھ چکا تھا، اس کا ذکر آگے آئے گا،

منشی مُنالال | ولد منشی بہادر سنگھ، دفتر خالصۂ شاہی کے منشی تھے، شاہ عالم کے روزنامچہ لکھنے پر مامور تھے، یہ روزنامچہ شاہی، کتب خانۂ بانکی پور میں موجود ہے، اس سے منشی موصوف کی لیاقت تحریر اور قوت مشاہدہ ثابت ہوتی ہے، روزنامچہ کا آخری ورق شاہ عالم کے صحیفۂ حیات کے اختتام (۱۲۲۱ھ) پر تمام ہوتا ہے

رائے امرسنگھ خوشدل | ولد جیون رام کائستھ، اصلی وطن کٹرہ مانک پور تھا، نواب شجاع الدولہ کے عہد میں سرکار غازی پور کا ناظم (حاکم اعلیٰ) تھا، امرسنگھ نہایت لائق اور فاضل تھا، تعلیم سے فارغ ہوکر مہاراجہ اجیت سنگھ، راجۂ بنارس کی سرکار میں نوکر ہوا، اور آخر سرکار کمپنی کی طرف

سے علی گڈھ کا ناظم مقرر ہوا، اس نے تاریخ فرمان روایانِ ہنود لکھی ہے، جو آغاز سے لیکر سلطان علاء الدین غوری کے زمانہ پر ختم ہوئی ہے، اس کی دوسری تاریخی تصنیف بزمِ خیال ہے جس میں خاص مشاہدات اور احوال موجودہ کی بنا پر، اپنے ملک کے حالات لکھے ہیں، اس کتاب کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ۱۲۱۱ھ تک ساتھ ساتھ انگریزوں کے حالات بھی لکھا گیا ہے، ۱۲۲۵ھ میں وفات پائی،

دولت رائے | منشی دولت رائے کائستھ، بھاول خان المتوفی ۱۲۲۴ھ بانی ریاستِ بھاولپور کے مصاحبِ خاص تھے، بھاولپور کا خاندان عباسی ہے، اس مناسبت سے مرآۃ دولتِ عباسیہ کے نام سے بھاولپور کی تاریخ لکھی، ۱۸۵۰ء میں یہ کتاب چھاپی گئی تھی،

رائے بھگوان داس | کائستھ متخلص بہ ہندی، ولد دولت داس ساکن کالپی تعلیم و تربیت لکھنؤ میں ہوئی، مولوی سید یوسف سہارنپوری سے تحصیل علم کی، نواب آصف الدولہ کی سرکار میں معزز عہدہ پہ ممتاز ہوئے، پھر معتمد الدولہ مہاراجہ ٹکیت رائے نائب دیوانِ شاہ اودھ کے مصاحبوں میں داخل ہوگئے، دو تذکرے اُن کی علمی زندگی کی یادگار ہیں، حدیقۂ ہندی اور سفینۂ ہندی، حدیقہ میں گذشتہ شعراء اور سفینہ میں معاصرین کے حالات ہیں، اس کی تالیف کا زمانہ ۱۲۱۹ھ ہے،

موہن سنگھ | موہن رائے ہولکر کی سرکار میں ملازم تھا، عربی و فارسی علوم میں بہرۂ وافر رکھتا تھا، آقا کی فرمائش سے وقائع ہلکر کے نام سے ملہر راؤ ہلکر (ریاست اندور) کے حالات لکھے، ۱۲۲۳ھ میں یہ کتاب ختم ہوئی،

منشی چھجمل | ولد رائے بیان چند، اُس کی سب سے نادر تصنیف تو دیوان پسند ہے جس میں مالیاتِ ہند پر اُس نے بحث کی ہے، لیکن اسکی تاریخی تصنیف عماراتِ اکبری نام سے معلوم ہوتا ہے

کہ اکبرآباد کی عمارتوں کا حال ہوگا، اس کی پہلی تصنیف ۱۲۲۵ھ کی لکھی ہوئی ہے، اس سے زمانہ معلوم ہوسکتا ہے،

بسادن لال شاداں | بلگرام کا باشندہ، امیرالدولہ محمد امیرخاں کے دربار میں نائب میرمنشی تھا، اور اسی کے حکم سے ۱۲۴۰ھ میں امیرنامہ لکھا، یہ درحقیقت امیرخاں کی سوانحعمری ہے،

سندرلال کول | ولد نوبت رائے، متھرا کا باشندہ، دفتر خالصہ میں میرمنشی تھا، ۱۲۴۲ھ میں اس نے گل بے خزاں لکھی، جو چار ابواب پر منقسم ہے، تین پہلے ابواب میں دہلی، متھرا، اور بندرابن کے حالات ہیں، اور چوتھے میں افسانہ ہے،

منشی سداسکھ لال | متخلص بہ نیاز، نجف خاں کے زمانہ میں یہ آگرہ کے سررشتہ دار تھے، ۱۲۳۴ھ میں ۶۵ برس کی عمر میں دلی چھوڑ کر الہ آباد آگئے تھے، مرزا قتیل، میرتقی و خواجہ میر درد وغیرہ کے معاصرین میں تھے، الہ آباد میں منتخب التواریخ نام ایک کتاب لکھی، سرہنری ایلیٹ اپنی تاریخ میں اس کا حوالہ دیتا ہے،

بہادر سنگھ | ہزاری مل کا بیٹا اور لچھمن چند کا پوتا تھا، اصل وطن گو شاہجہان آباد تھا لیکن الہ آباد میں سکونت اختیار کرلی تھی، یہاں عربی، فارسی اور ہندی کی تاریخی کتابوں سے مواد فراہم کرکے یادگار بہادری کے نام سے تمام دنیا کی تاریخ لکھی، اس کا سال اختتام ۱۲۲۹ھ ہے،

رتن سنگھ | منشی الملک فخرالدولہ دبیرالملک راجہ رتن سنگھ زخمی، جائے پیدائش لکھنو، قوم کایستھ، اس کا خاندان تین پشت سے دربار اودھ میں معزز عہدوں پر ممتاز تھا، رتن سنگھ بہت بڑا فاضل اور علامۂ وقت تھا، اس کے اصلی کمالات فلسفہ کے زیرعنوان ظاہر ہوں گے، اس کا دادا راجہ بھگوان داس آصف الدولہ کا ایام شاہزادگی میں اتالیق تھا، اور عہدِ حکومت میں دیوان تھا، رتن سنگھ نے منجملہ اور تصنیفات کے سلطان التواریخ نام کتاب شاہانِ اودھ کی تاریخ میں لکھی، ۱۲۵۰ھ میں

ساٹھ برس کی عمر میں یہ کتاب اُس نے ختم کی،

رام سیتا سنگھ | متخلص بہ فکرت، اس نے منشی ستیل سنگھ بیخود کے حالات میں حقیقتہاے بے خود کے نام سے ایک کتاب لکھی، جو ۱۸۴۳ء میں چھپ کر شائع ہوئی،

پنڈت بشن نرائن | مؤلف نظارۃ السند، فن تاریخ میں ہی، زمانہ نہیں معلوم لیکن ایشیاٹک سوسائٹی میں اس کا جو نسخہ ہے، وہ ۱۸۵۹ء کا لکھا ہوا ہے،

لالہ ستیل چند | آگرہ میں رہتے تھے، غدر سے بہت پہلے مدرسۂ آگرہ میں مدرس تھے، انھوں نے تعریف العمارات کے نام سے نہایت محنت، کاوش اور تحقیق سے اکبرآباد آگرہ کی ایک ایک عمارت کا حال لکھا، اور اُس کے نقشے شامل کئے، یہ کتاب نہایت مفید اور پُر از معلومات ہے،

منشی مہتاب سنگھ | قوم کایستھ، متوطن کانپور، مؤلف تاریخ ہزارہ، اس کا قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں ہے،

گردھاری لال | مؤلف تاریخ ظفر دکن، اس کا قلمی نسخہ کتب خانۂ آصفیہ میں ہے، حال وسنہ نہیں معلوم فلسفی کے لقب سے مشہور تھے،

راجہ کندن لال | اپنے زمانہ کے مشہور فاضل تھے، فلسفی کے لقب سے مشہور تھے، دہلی وطن تھا، ۱۲۳۷ھ میں قسطاس لکھی، اُن کی ایک تاریخی تصنیف تنقیح الاخبار ہے جس میں زیادہ تر خود اپنے حالات لکھے ہیں،

اوپر، ہم ہندو مورخوں کا تذکرہ ہوا، اُن کے زمانوں پر نظر ڈالنے سے معلوم ہو سکتا ہے، کہ یہ صرف ڈھائی سو برس کی مدت کے اندر پیدا ہوئے ہیں، یہ تعداد ابھی بہت کچھ بڑھ سکتی ہے، کیونکہ ہندوستان کے سینکڑوں ہزاروں ذاتی کتب خانوں کے معلومات حاصل کرنے کے

ذرائع ہمارے پاس نہیں ہیں، بہت سی ایسی کتابیں ہیں، جو جاہل خاندانوں کی غفلت کی نذر ہوگئی ہیں تاہم اتنی مختصر تعداد سے بھی ہم کو تسلی ہے، جب ہم یہ دیکھتے ہیں، کہ اس اسکولوں اور کالجوں کے دور میں سوا سو برس کے اندر انگریزی کے ہندو مورخین اتنے بھی پیدا نہ ہوسکے،

پھر اس نکتہ کو بھی فراموش نہ کرنا چاہئے، آج انگریزی تاریخ کی کچھ کتابیں جو بنگالی یا دکنی برہمن مصنفوں کے قلم سے نکلی ہیں وہ صرف یونیورسٹیوں کے سہارے پر لکھی گئی ہیں، کہ وہ کورس میں داخل ہوسکیں، اور ان سے کچھ تاجرانہ منافع حاصل ہوں لیکن گذشتہ شاہی زمانہ کے مصنفوں کی یہ حالت نہ تھی، ان کا محرک یا محض شوقِ علمی تھا، یا سلاطین اور امرائے ملک کی قدرشناسی،

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ باایں ہمہ آج کل تاریخ کی جو کتابیں ہندوستانیوں نے لکھی ہیں، یا لکھی جارہی ہیں، وہ زیادہ تر کتابوں کی ورق گردانی اور اگلے مصنفوں کی دانائی کے ساتھ نقل صورت ہیں، وہ صحیفۂ فطرت کے مطالعہ کے بعد نہیں، بلکہ محض کتب خانوں کی الماریوں کی تلاش کے بعد لکھی گئی ہیں، وہ دنیا کی وسیع فضا میں چل پھر کر نہیں، بلکہ لندن یا ان لائبریریوں کے قید خانوں میں بیٹھ کر ترتیب پائی ہیں، اپنی آنکھوں سے مشاہدۂ حقائق اور استنباطِ نتائج کی بنا پر نہیں لکھی گئی ہیں، بلکہ صرف اپنی دماغی محنت و کاوش اور کتابی تلاش و تفحص کی مدد سے، لیکن جن اگلے ہندو مورخوں کا ہم نے تذکرہ کیا ہے، اُن کی تصنیفات زیادہ تر مشاہدۂ فطرت، معائنۂ حقیقت اور مطالعۂ واقعات کے نتائج ہیں،

ان مصنفین کے حالات پر، ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوسکتا ہے، کہ ان میں زیادہ تر ایسے تھے، جو شاہی دفاتر کے ذمہ دار افسر تھے، ان میں بہت سے دفتر شاہی کے منشی، وقائع نویس، دیوان تھے، اُن کی نگاہ سے سلطنت کا کوئی راز چھپا نہ تھا، سیاسی، انتظامی، اور مالی ایک

ایک جزئی واقعہ پر اُن کو عبور تھا، اس لئے وہ جو کچھ دیکھتے تھے، وہی لکھتے تھے، اور یہی سبب ہو کہ اُن کو اپنے تاریخی اوراق کے مُرتّب کرنے کا سب سے بہتر موقع ملتا تھا،

ہندو فارسی شعراء

محکوم قوموں کو حاکم قوم کی زبان سے کسی طرح استغنا نہیں ہو سکتا، مسلمانوں کے عہد حکومت میں فارسی ہندوستان کی سرکاری زبان تھی، اور اب انگریزی ہے، اس زمانہ کے طرز حکومت کے لحاظ سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ فارسی زبان کے سیکھنے کے لئے محکوم قوم کو کبھی مجبور نہیں کیا گیا، اور آج جس معاشی مجبوری سے ہم کو انگریزی پڑھنی پڑتی ہے کل بھی یہی حالت تھی، بہرحال کسی سبب سے بھی ہو سکندر لودھی کے زمانہ سے ہندوؤں کو فارسی کی جانب توجہ ہوئی، اور اس میں اس درجہ انھوں نے ترقی کی کہ ایک انگریز مورخ کے بقول "ہندوؤں اور مسلمانوں میں فارسی زبان دانی میں کوئی فرق نہیں رہا"[1]

آج بھی انگریزی تعلیم اسی سُرعت اور تیزی کے ساتھ پھیل رہی ہے، جہاں تک گذشتہ اور موجودہ زمانہ کے مقابلہ سے ثابت ہوتا ہے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ باایں ہمہ نظم و اہتمام، جد و جہد، سعی و کوشش اور زرپاشی و اسراف، جدید تعلیم کا وہ نتیجہ نہیں پیدا ہوا، جو پہلے پیدا ہوا، یہ ممکن ہے کہ مکتب اور تعداد کے لحاظ سے آج کل کی سرکاری زبان کے جاننے والے زیادہ ہوں لیکن کیفیت اور اثر کے لحاظ سے گذشتہ تعلیم زیادہ مفید کارآمد اور موثر تھی، اس کے

[1] "ہندوستان میں علوم کی ترقی مسلمانوں کے زمانہ میں" مسٹر لا نے یہ قول نقل کیا ہے،

اسباب میرے خیال میں حسب ذیل ہیں ؛

۱ - تعلیم مفت تھی ، صرف طلب نہ تھی ،

۲ - اساتذہ شفیق باپ اور مرشد کی حیثیت رکھتے تھے ، آج کل کی طرح "اجرت گیر اور پیشہ ور معلین" نہ تھے ،

۳ - زبان تعلیم سے نہیں ، بلکہ اہلِ زبان کی صحبت اور مجلس سے حاصل ہوتی ہے ، اس زمانہ میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی معاشرت ، صحبت اور سوسائٹی میں کوئی امتیاز نہ تھا ' روز و شب کی صحبتیں رہتی تھیں ، مجلسیں تھیں ، ایک سوسائٹی تھی ، نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ان کو فارسی زبان باتوں باتوں میں آجاتی تھی ، اسی کا یہ اثر ہے کہ اب تک اسکولوں اور کالجوں میں ہندو طلبہ فارسی کو سہل و آسان سمجھکر اختیار کرتے ہیں ، اور سنسکرت کے مقابلہ میں اس کو ترجیح دیتے ہیں ، گو رفتہ رفتہ قومی تعصب کا رنگ اب تعلیمی تفریق و امتیاز بھی پیدا کرتا جاتا ہے ،

بہرحال یہ واقعہ ہے ، جس کی کوئی تکذیب کی جرأت نہیں کر سکتا ، کہ ادبی حیثیت سے فارسی تعلیم نے ہندوؤں پر جو اثر ڈالا ، وہ انگریزی تعلیم با ایں ہمہ گیری نہ ڈال سکی ، سو ڈیڑھ سو برس کے عرصہ میں کتنے ایسے انگریزی کے باکمال شاعر گذرے ہیں ، جن کا نام تاریخ کے صفحات میں زندگی حاصل کر سکا ہو یا کرے گا ، جو نام سامنے ہیں ، اُن کی تعداد ۵ یا ۶ سے زیادہ نہیں ' اور یہ بھی زیادہ ہے ، لیکن دیکھو کہ صرف تیموریوں کے آخر زمانہ میں صرف دو ڈھائی سو برس کے اندر فارسی زبان کے کتنے ایسے ہندو شعراء گذرے جن کے نام اب تک ہمارے تاریخی تذکروں کیلئے فخر و مباہات کے باعث ہیں ، جن کے اشعار سُن سُن کر اہلِ زبان سر دھنتے تھے ، اور مزے لیتے تھے ، آج انگریزی کے دو تین ہندوستانی شاعر ہیں جنکی اہلِ زبان نے کچھ تعریفیں کر دی ہیں ،

یا ان کو کوئی انعام مل گیا ہے، فرنگی مدح و ستایش کے گیت گاتے گاتے ہماری زبانیں خشک ہو گئی ہیں لیکن ذرہ اپنے اسلاف کو دیکھو کہ اُن کے کیا کارنامے تھے؟ میں نے چند فارسی تذکروں کو سامنے رکھ کر حسب ذیل اشخاص کا انتخاب کیا ہے، ان کی ترتیب زمانہ اور دور پر نہیں، بلکہ حروف تہجی پر ہے، ان میں سے ہر ایک نے سلاطین و امرا و ابنائے عصر سے اپنی زبان آدری کی داد آج سے بہتر طریقہ پر پائی تھی،

اس احتیاط کی بنا پر کہ تذکرہ نویسوں کے اصلی الفاظ محفوظ رہیں، اور زیادت و نقص اور کمی و بیشی کا شبہ نہ ہو، اصل عبارت فارسی ہی کا اس مقام پر نقل کرنا زیادہ مناسب ہے،

آرام | منشی ایشری داس، قوم کایستھ، در زمرۂ منشیان سرکار امیر الامرا نواب غضنفر جنگ رئیس فرخ آباد انسلاک داشت نظم و نثر فارسی بفصاحت و بلاغت مشتمل بر لطائف و صنائع و بدائع لفظی و معنوی می نگاشت، از نثرش بعض وقائع و سوانح بنظر گذشتہ حق آنست کہ بکمال لطف و خوبی می نگاشت، در مدح نواب عماد الملک نیز نظام الملک آصف جاہ باستیصال سورج مل جاٹ گفتہ،

بفرِ کوکبۂ بختیِ ممالکِ ہند | سزد کہ باج ز خوارزم و زختن گیرند
شہاں ز صولتِ آن جم وقار آصف جاہ | رکاب توسنِ شاہنشہ زمن گیرند
جوان و صاحب بخت جواں نظام الملک | کہ باد ہمت از دوم دکن گیرند
برید گردن بلوے فتنہ ساز نخست | چنانکہ صبح سرِ شمع در لگن گیرند

آفریں | چمن لال، قوم کایستھ، ساکن الہ آباد، در رنگینیِ مضمون آفرینی سحر کاری می نمود،

مُبارک باد مرغانِ چمن را | نواسنجانِ رنگیں انجمن را
کہ عید نو بہار آمد طرب جوش | نوی گل کرد و دورانِ کہن را

اخلاص | کالی پرشاد، قوم کائستھ، متوطن حوالیِ لکھنو، مشق نظم و نثر فارسی از مولوی احسان اللہ ممتاز امامی می نمود، بعد مرگش کلام منظوم و منثور را و پریشان گردید، قصیدہ در مدح محمد علی شاہ اودھ بر شتہ نظم کشیدہ کہ بصنعت توشیح از ہشت جا محمد علی شاہ بادشاہ زمان خلد اللہ ملکہ برآوردہ واز خزانۂ شاہی ہزار روپیہ بجائزہ بردہ۔

الفت | راجہ الفت رائے بخشی ممالک اودھ، دستگاہش بر اصناف نظم و قصیدہ و غزل و رُباعی و مثنوی قوی بسکہ موزون طبع بود۔

نیست اہل آسمان را بر درت بے اذن بار | می کند گردون طواف روضات لیل و نہار
ہر چہ نا ممکن بود آید ز تو بر روے کار | از غبار در گہ عرش احترامت آشکار

الفت | لالہ اُجاگر، قوم کائستھ عظیم آبادی است، برای اصلاح سخن بخدمت میر محمد علیم سمرقندی می رسید،

درآمد شام غم در سینۂ حسرت نام نمانی | ز داغ دل کشیدم بے تکلف پیش او خوانی

الفتی | راجہ پیارے لال قوم کائستھ از موزونان عظیم آباد است، مثنوی نیرنگ تقدیر و دیوان اشعارش مطبوع طباع، میر منشی بادشاہ اکبر ثانی بود و با ارباب کمال طریقۂ الفت و خلق مرعی می نمود،

چون غنچہ جز سکوت نباشد بیان ما | پیچیدہ شد زبان سخن در دہان ما
اندیشۂ مال نیا مد ز ما درست | در دست دیگریست چو سود و زیان ما
در دشت پر بلای جنون نیست الفتی | جز موج ریگ اشک روان کاروان ما

امانت | لالہ امانت رام، از شاگردان مرزا بیدل و در انداز سخن سنجی بہنجار استاد خود مائل

نمی گردد بلند از خاک ہم با د مزار ما | کہ بنشیند مبادا بر دل خوبان غبار ما

شکر للہ نقش پای مہ جبینے یافتم　　آرزوے سجدہ می کردم زمینے یافتم

اندرمن | پسر کنول رام، مولدش قصبۂ اورنگ آباد، از اعمال علی گڈھ، استفادۂ علم فارسی از شیخ نظام الدین سکندر آبادی کردہ در موزونیِ طبع و سخن سنجی نام برآوردہ، ہر چند در عین جوانی نابینا شد، مگر قوتِ حافظہ اش چنداں افزود کہ سائر نظم و نثر خودش نوک زباں بود،

صد جلوہ در کرشمۂ آن ماہ پارہ است　　ایں ماہ نو ز ابروی او یک اشارہ است

انس | لال چند کایستھ، لکھنوی، از و دیوانے مختصر یادگار، ۱۲۶۳ھ

روحِ جمشید بر د رشک بمے نوشیِ ما　　کہ لب یار بود مایۂ بے ہوشی ما

جامے رحم است خدارا نتواں کرد دریغ　　ہست وابستۂ تیغ تو سبکدوشی ما

انیس | موہن لال، شاگرد مرزا فاخر مکین، نام پدرش راے تولا رام کائستھ : صاحب دیوان فارسی،

بدر | راے گنگا پرشاد بہادر، از زمرۂ کایستھانِ فہمیدہ و سنجیدۂ شہر لکھنو است بحضور واجد علی شاہ عہدۂ سررشتہ دار در علم سیاق و سباق سر بہ می آرد،

می کنم سجدۂ بتے کہ کند　　ہر نفس دعوے خدائیہا

از خمِ طرۂ اش معاذ اللہ　　من و اندیشۂ رہائیہا

برہمن | چندر بھان آگرہ در سرکار دارا شکوہ منشی داشت، بعد قتلِ وے ترکِ نوکری ماند بشہر بنارس رفت بسنہ ۱۰۷۳ھ مرد

کنم زساد و دلی بند دیدہ مژگاں را　　بمشت خس نتواں بست راہ طوفاں را

بہار | ٹیک چند کلامش دل پسند، تتبع زبان فارسی بدرجۂ قصوی رسانیدہ، کتاب بہار عجم (لغت) و جواہر الحروف از وست، از ارشد تلامذۂ سراج الدین علی خان آرزو،

جانبِ او دل ببالِ اضطرابم می پرد　　ذرہ ام بے طاقتی تا آفتابم می پرد

بہجت | لکھن لال صاحب دیوان بہجت،

تفتہ | منشی گوہر لال تفتہ، برہمن، خیلے پرگوست، کلام منظومش بسیار، پنج دیوانِ شعر دارد، ابیات ہر یکے ازان قریب سیزدہ ہزار، کل ۶۵ ہزار،

چند گوئی کہ نشان نیست ز خونین کفنان　　نگر ایں لالہ کہ مبنی ز شہیدان تو نیست

تمنا | لکھن لال کایستھ، از شکوہ آباد است، دیوان و مثنویش ہمگی ۱۵ ہزار بیت است،

ثاقب | مہاراجہ شیو پرشاد پردہان جی گوپال سنگھ بہادر، از کائیتھان سری باستب است، پدرش منشی بینی پرشاد، سررشتہ دار دیوان عام سلطانی اودھ بود، شیو پرشاد سرکار دربار ولی شہزادہ صاحب جنرل فریدون قدر مرزا ہزبر علی اودھ بود، تاریخ اودھ کہ نام تاریخی اودفتر ثاقب و نسخۂ تاریخ دہلی کہ نام تاریخش حقیقت تیموریہ تالیفِ آن سخندان و مجموعہ نادرات الثاقب و مثنوی مجزبہت از منظوماتِ آن است،

حیا | شیو رام اکبرآبادی کایستھ، پدرش بھگوتی مل از متصدیانِ سرکار نواب اسد خان وزیر عالمگیر بادشاہ، مشق شعر و سخن از مرزا بیدل می نمود، نسخۂ گلگشت بہار ارم بطرز حیا ز عنصر مرزا بیدل مستعدی تمام نگاشتہ، سنہ ۱۱۴۴ھ وفات یافت،

بیاد چشم تو داریم مے پرستیہا　　رسانده ایم بگردون دماغ مستیہا

خوشدل | راے امر سنگھ ولد جیون رام کایستھ، از کٹرہ مانک پور، جیون رام در سرکار وزیر الممالک نواب ابو المنصور خان صفدر جنگ در زمان نواب شجاع الدولہ، بہ نظامت سرکار غازی پور، مامور گردید، راے امر سنگھ بعد تحصیل علوم و فنون اولاً در سرکار مہاراجہ جیت سنگھ راجۂ بنارس و آخر در سرکار انگریزی بدایون علی گڑہ کامران گشت در سنہ ۱۲۲۵ھ درگذشت،

بہار دانش نظم نسخۂ تاریخ فرماں روایانِ ہنود تا سُلطان علاءالدین غوری ازوے یادگار است، اشعار دیوانش تخمیناً پنج ہزار است

گرم است بسکہ کہ نالۂ آتش فشانِ ما سوزد برنگ شمع زباں در دہانِ ما

خیالی | منشی خیالی رام لکھنوی در نظم و نثر فارسی قدرتش علی وجہ الکمال و تالیفاتش کہ زاید از یک صد و از انجملہ شرح اعجاز خسروی، در ۱۲۸۹ھ سنہ گذشت، قصیدہ در مدحِ واجد علی شاہ وصفت نور منزل نوشتہ کہ از حروف اوائل مصاریع اولی سنہ ہجری و از حروف اوائل الفاظ آخر سنہ فصلی و از مصاریع ثانیہ سنہ عیسوی و سمت ہندی،

خاموش | رام صاحب المتوفی ۱۲۲۹ھ سنہ اُس کے فارسی دیوان کا قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں ہے،

راقم | بختاور سنگھ لکھنوی، بشیریں گفتاری از ممتازانِ گروہ ہندو، پسرش جواہر سنگھ جوہر از پدر خود خوشگو،

رحمتی | کنور سکھراج سنگھ بہادر، خلف کنور ہیرالال ضمیر، نبیرا جہ پیارے لال الفتی،

گر ہجرش دل بسوز از دہ غمناک شود جامۂ صبر بتابی من چاک شود

رفعت | میکولال لکھنوی، طبعش بشعر و سخن مائل و مشق این فن از مولوی نذیر احمد می نمود،

رفیق | واذارام، طبعش با موزون توام ولب ولہجہ اش با خوش بیانی ہمدم،

نگارمن برُخِ خویش چون نقاب گرفت فتادشور کہ امروز آفتاب گرفت

رونق | منشی رام سہائے لکھنوی، نظم و نثر فارسی بلطافت می نوشت، ۱۲۹۰ھ سنہ وفات، دیوان شعر و مثنویات ازوے یادگار غزلے نوشتہ در چہار بحر،

زار | منشی مینڈولال در شہر لکھنو، در نظم و نثر فارسی شاگردانش بسیار، دیوان فارسی در رسائل

عروض معنی دبحر العلوم وہفت صحیفہ بطرز پنج رقعہ و نادر بازار بہ تتبع مینا بازار و جاوید بہار،

سبقت | سکھراج پدرش بلازمت عمدۃ الملک بہادر وزیر بادشاہ عالمگیر معزز است، از مستعدان روزگار بود، و در علوم ادبیہ و حکمیہ و حساب و طب و تصوف از اقران گوے سبقت برد، بر انواع نظم و معما و تاریخ قدرت داشت، شاگرد بیدل، در سرکار سید حسین علی خان کار دیوانی و میر سامانی سرانجام دادہ بمنصب پانصدی رسیدہ، جنگ نامہ حسین علی خاں قریب ہفت صد اشعار ازوے یادگار،

سروری | راے منبی دھر، نواسۂ بخشی الممالک راجہ لال جی بہادر، نظم و نثر فارسی را پیش مولوی احسان اللہ بشتی رسانید،

نامم بمعنی و سخن امروز سروری ست   مداح آں سرور و شیداے سرورم

شاداں | مہاراجہ چندولال دیوان دولت آصفیہ حیدرآباد، بزمش مجمع اہل کمال مطلع ارباب سخن، در ہر شب مجلس شعر و سخن برپا می ساخت، در فن شعر پایہ بلند داشت (فارسی دیوان چھپ گیا ہے یہ مہاراجہ کشن پرشاد کے پردادا تھے، ۱۲۵۴ھ میں وفات پائی)

شفیق | منشی لچھمی نراین کھتری اورنگ آبادی شاگرد میر آزاد، دو تذکرۂ شعراء وارد، گل رعنا و شام غریباں، صاف گو، خوش بند است، اصلش از لاہور است، پدرش بھوانی داس ہمراہ عالمگیر وارد دکن گردید، در اورنگ آباد سکونت گزید، شفیق در سلک ملازمان عالیجاہ خلف نظام علی خاں منتظم گردید، در ۱۲۰۰ھ مرد،

شوق | منشی دولت راے نبیرہ راجہ بھولا ناتھ، از زمرۂ منشیان بیت الانشاء شاہی اودھ ممتاز، قصیدۂ بلیغہ گفتہ، در صنعت عکس و سجع دروے گفت، بہمراہی شاہ واجد علی مع اہل و عیال کلکتہ بیامد، ۱۲۷۰ھ مرد،

از حسن فروغ از در حسن تو جہاں را   داغ تو چراغ است دل پیر و جواں را

شہرؔ | لال بالمکند مانکپوری، در ۱۲۵۰ھ بگذشت، طبع نکتہ سنجی و نظم گوئے داشتند،

کمن آشکِ مرا بندید راہِ مژگانِ ترحّمے | برین طفل غذا پرورده خونِ جگر رحمے

صاحب رامؔ | سخن سنج فارسی در تاریخ گوئی ملکہ داشت، در عہدِ سلطنت شاہ غازی الدین حیدر علم شہرت می افراشت، در تاریخ وفات غازی الدین حیدر بادشاہ کہ در مقام نجف شہر لکھنؤ مدفون است، می گوید،

چوں رفت شہ زمن ز دنیا | اتم دلِ خاص و عام گرفت

از روے بکا و آہ گفتم | حیدر بہ نجف مقام گرفت

ضیائیؔ | راجہ گوبند بخش ضیائی، المتوفی ۱۲۴۵ھ (ان کا نہایت عمدہ ۱۲۴۳ھ فارسی دیوان کتب خانہ آصفیہ میں ہے)

عشرتؔ | بے کشن از برہمنہ کشمیر، در سخن طرازی سلیقہ اش نیکو بود، تے بملازمت نواب نجم الدولہ امیر خاں دیوانِ خالصہ شریفہ بقانون گوئی تمام خطہ کشمیر سرافراز،

دشت از لالہ بسکہ رنگین است | پائے دیوانہ دست گلچین است

گلشنؔ | راجہ جیالال بہادر، خوش فکر صاحبِ دیوان، بدیوان انشای ابوالفتح محمد علی شاہ اودھ سر دفتر منشیان،

گلشنؔ | رائے گلاب رائے سندیلوی، شاگرد قتیل، در ریاست اودھ متعہد عہد ہائے جلیلہ، در استعداد علمی بے عدیل، در فنون سپہ گری، نا قدالمثال، تذکرۂ شعرا ضخیم و دیوانے جحیم، یادگار،

آنکس کہ از زبانِ تو حرفِ جفا شنید | گویا پیامِ خضر ز آبِ بقا شنید

مشتاقؔ | لالہ بیج ناتھ بریلوی،

مطیع | لالہ رام بخش قنوجی،

ممتاز | لالہ سیتل داس، در نازک خیالی ممتاز بلب ولہجہ اہل زبان پردازبود،

منشی | منشی مادھورام شاہجہان آبادی، در سرکار نواب لطف اللہ خان بن سعد اللہ خان شاہجہانی بعہدۂ انشا امتیاز داشت، رفتہ رفتہ امیر الانشاء معز الدین جہاندار بن بہادر شاہ مشرف،

نمی رسد بمیان صنم ز باریکی | ہزار بار بدقت شگافتم مو را

منشی | لالہ فتح چند برہان پوری، کایستھ، طبع نظم دارد وخوشگو است،

نیست آسائش بمنزل جان ازخود رستہ را | ہر قدم دام است نقش پاشکار جستہ را

بسکہ از شرم تو در پرواز رنگ گلشن است | رشتۂ نظارہ بندد در ہوا گلدستہ را

منوہر | رائے منوہر لال از امرائے سلطنت اکبر بادشاہ است، طبع متین ورائے رزین داشت،

رباعی

روزے کہ سموم حشر افزوں گردد | در آتش غم چو چہرہ گلگوں گردد

ما در دوزخ چناں بذوقے سوزم | کز رشک دل بہشتیاں خوں گردد

موجد | سکھن لال بدایونی

چہ شکیبم چہ کنم چوں بزنم سر بر سنگ | مدتے شد کہ زجاناں خبرے پیدا نیست

موجد | کالکا پرشاد لکھنوی بموزونی طبع ورسائی ذہن امتیاز داشت وخط نستعلیق خوشتر وشیریں می نگاشت باصطلاحات ومحاورات زبان فارسی بخوبی ماہر،

رسائی نیست تا سر منزل او کفر وایماں را

کہ دیر وکعبہ سنگ رہ بود گبر ومسلماں را

موجی | لالہ موجی رام،

موزون | راجه رام نرائن عظیم آبادی، پدرش بدیوانی سرکار نواب مهابت جنگ عزت داشت، بعد او باین عهدهٔ موروثی رسید، در جنگ پامردی نهاد، دیوان اشعارش، شاگرد شیخ محمد علی حزین، سنه ۱۱۷۱ه،

موزون | راجه مدن سنگه اتاوی، پدرش راجه جگت سنگه، دست توسل، بدامن دولت نواب غازی الدین خان آویخت و بمنصب سه هزاری و بخطاب راجگی و بعهدهٔ دیوانی نواب ممدوح، مدن سنگه در سرکار نواب آصف جاه دکن مستوفی الممالک بود و در عهد ناصر جنگ منصب هزاری و علم و نقاره و خطاب راجگی یافت و مامور بحراست قلعه مصطفی نگر گردید، تا آنکه افواج انگریزی محاصره دیورش برآن قلعه نمود، راجه تا توانست پائے برجا ماند، بصدمهٔ تفنگ بعمر ۵۰ سال سنه ۱۱۷۹ه جان داد، در نظم و نثر فارسی استعدادے نیکو داشت،

کرد گلشن جلوهٔ رنگین یار آئینه را — می رسد عرض قدمبوس از بهار آئینه را

نفاذ | پنڈت جی گوپال کشمیری، از آشنایان قاضی محمد صادق اختر بوده شاگرد قتیل،

واثق | کھتری بود، به برکت صحبت مولوی عبدالله بن مولوی عبدالحکیم سیالکوٹی مشرف باسلام شده به محمد اخلاص خان مخاطب گردید، و بملازمت اورنگزیب رسید و بوکالت بعضے امرا، می شناخت، نظم و نثر فارسی چنان خوب تر می نوشت که اورنگزیب زبان باحسنت و آفرین می کشود، در جوانی میل بشعر و شاعری داشت، بعد ازاں بافادهٔ علوم و فنون طبیعت گماشت سنه ۱۱۴۳ه مرد،

محتسب می کشی از دست تو مشکل شده است

شیشه ام به بغل آبلهٔ دل شده است

وفا | پنڈت دیاناتھ ولد مت رام کشمیری، شاگرد مرزا علی اکبر عارف شیرازی می نمود،

وقار | مدیر الدولہ، منشی الممالک راجہ جواہر لال بہادر محکم جنگ، میر الانشار امجد علی و واجد علی شاہان اودھ، باوجود چندیں اقتدار حرف درشتے نسبت کسے گفتہ، در نظم و نثر فارسی صاحب استعداد است، دیوانش مطبوع،

ہندو | شیو سنگھ لکھنوی

ہندو | گوکل چند، قوم کھتری فرخ آبادی،

ہندو ادبائے فارسی

ہندو ادبائے فارسی اس کثرت سے گذرے ہیں کہ ان کا شمار بھی حیطۂ امکان سے باہر ہے ان میں بہت سے اچھے لکھنے والے انشار پرداز تھے، اور ایسے بھی تھے، جو محض دفتری ضرورت کے مطابق اس زبان میں نوشت و خواند کر سکتے تھے، ہندوؤں کے دوسرے فرقوں کی بہ نسبت کایستھ ذات کے لوگوں نے فارسی زبان کی تحصیل میں کثرتِ تعداد کے لحاظ سے زیادہ ناموری حاصل کی، لیکن اصل زبان دانی اور جوہر سخن کے لحاظ سے برہمنوں نے زیادہ کمال پیدا کیا خصوصًا آخر زمانہ میں کشمیری برہمنوں نے جس طرح آجکل بنگالیوں کی انگریزی زبان کو "بابو انگریزی" کہتے ہیں، اسی طرح مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں کایستھوں کی فارسی "اُدُلاؤں کی فارسی" مشہور تھی،

دفاتر میں زیادہ تر ہوتے تھے، محکمۂ انشار (سکریٹریٹ) اور مال کے صیغے تمام تر ہندوؤں کے ہاتھ میں تھے، آخر زمانہ میں انشار کے اعلیٰ افسر بھی ہندو ہونے لگے تھے، جن کو عمومًا میر منشی اور از روے خطاب "منشی الممالک" کہتے تھے، ان عہدوں پر جو ہندو سرفراز ہوتے تھے، وہ فارسی زبان کے

لائق ادیب ہوتے تھے، بادشاہ کی طرف سے ہر قسم کے احکام و فرامین ان ہی کی زبان و قلم سے ادا ہوتے تھے، وقائع نویسی کی خدمت پر بھی زیادہ تر مامور ہوتے تھے،

ہندو ادباء کے یہ فرامین منشآت اور رقعات جب زیادہ جمع ہو جاتے تھے، اور اُن کی مقبولیت عام ہو جاتی تھی، تو وہ بطور کتاب کے یکجا جمع کر دیئے جاتے تھے، ان میں سے بعض مجموعے اس درجہ مقبول اور پسندیدہ ہوتے تھے کہ وہ طالب علموں کے نصاب تعلیم میں داخل کرئے جاتے تھے، چنانچہ نخشآت برہمن، منشآئے مادھورام، منشآتِ جواہر مل خطاط، خیالاتِ نادر، دستور الصبیان وغیرہ اسی قسم کی کتابیں ہیں،

اس واقعہ کا بتکرار اظہار کیا جا چکا ہے، کہ ہندوؤں نے فارسی تعلیم لودھیوں کے زمانہ سے شروع کی، چنانچہ فارسی کا سب سے پہلا ہندو ادیب بھی اسی زمانہ میں ہم کو ملتا ہے،

پنڈت ڈونگرمل | ایک بزرگ لکھتے ہیں کہ پنڈت ڈونگرمل سکندر لودی کے زمانہ میں تھے، اُن کی فارسی زبان دانی پر مسلمان بھی تعجب کرتے تھے کبھی کبھی فارسی شعر بھی کہتے تھے، چنانچہ ان کا یہ ایک شعر ارباب تذکرہ نقل کرتے ہیں،

دل خون نشدے چشم تو خنجر نشدے گر　　　　رہ گم نشدے، زلفِ تو ابتر نشدے گر

ٹوڈرمل | کھتری تھا، شیر شاہ کے عہد میں فارسی تعلیم حاصل کی، اور دربار تک رسائی پائی، شیر شاہی کاروبار کے انقلاب کے بعد اکبری نورتن میں شامل ہوا، جہاں مال کا صیغہ اس کے ہاتھ آیا، ٹوڈرمل فارسی کا خوشخط کاتب بھی تھا تذکرۂ خوشنویسان میں ہے،

"نویسندۂ چابکدست و خطوط بخوشخطی و نکی می نوشت"

اس عہد کے دیگر ادبار کا تذکرہ اس لئے قلم انداز کرتے ہیں کہ ان کا ذکر دوسرے سلسلوں میں آچکا ہے،

رائے منوہر لال | رائے لون کرن کا خلف الرشید تھا، شہزادہ سلیم (جہانگیر) کے آغوش تربیت میں پل کر جوان ہوا، اور فارسی زبان میں یہ سلیقہ پیدا کیا کہ اہل تذکرہ اسکی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہیں

چندربھان برہمن | اس کا ذکر پہلے بھی گذر چکا ہے، یہ عہد شاہجہانی کا سب سے بڑا ہندو ادیب تھا، یہ پنجابی برہمن تھا، لاہور میں پیدا ہوا تھا، ملا عبد الکریم کی شاگردی میں اسکے فضل وکمال نے نشو و نما حاصل کیا تھا، فارسی زبان کا شاعر تھا اور برہمن تخلص کرتا تھا، اسکا فارسی دیوان اب تک کتب خانوں میں موجود ہے، فارسی ادب میں بڑی دستگاہ حاصل کی تھی، افضل خاں امیر الامرائے شاہجہانی نے اس کی لیاقت و قابلیت کو دیکھ کر اس کو اپنا منشی خاص (پرائیویٹ سکریٹری) بنایا، ۱۰۴۸ھ میں افضل خاں نے وفات پائی، تو دربار شاہی کے سلک ملازمین میں داخل ہوا، اور دربار شاہجہان کا وقائع نویس یعنی شاہی تاریخ و روزنامچہ کا چیف ایڈیٹر مقرر ہوا، اس عہدۂ جلیلہ کے باعث وہ روزانہ بارگاہ شاہی میں حاضر ہوکر، ہر روز کے مرتبہ واقعات وحالات سناتا تھا، ۱۰۵۵ھ میں چندربھان نے چہار چمن برہمن لکھ کر نوروز کے موقع پر سرہند میں دربار شاہجہانی میں نذر گذرانی، اس کی لیاقت ادب دانی کو دیکھ کر شہزادہ داراشکوہ نے جو خاص طور پر ہندوؤں کے جوہر کمال کا قدرداں تھا، اس کو اپنے اعیان دربار میں داخل کرلیا، اور اپنا میر منشی (چیف سکریٹری) مقرر کیا، داراشکوہ کی تباہی کے بعد حوادث زمانہ سے تنگ آکر بنارس میں گوشہ نشیں ہوگیا، اور یہیں ۱۰۷۳ھ میں راہی عدم ہوا، تذکرۂ عمل صالح کا مصنف اس کو اپنے زمانہ کے فضلائے ادب میں شمار کرتا ہے، اس نے اپنے رقعات و منشآت کا مجموعہ بھی فراہم کیا، اس کا نام منشآت برہمن ہے، خوشخطی میں آقا عبد الرشید کا شاگرد تھا،

ہرکرن داس | دل متھرا داس، قوم کنبوہ، باشندۂ ملتان، ۱۰۳۱ھ میں زندہ تھا، فارسی علم و ادب میں جو دستگاہ اس نے حاصل کی تھی، اس کی شہادت یہ ہے کہ وہ امرائے جہانگیری میں سے

اعتبار خاں صوبہ دار اکبرآباد کا میر منشی تھا، انشاے ہرکرن کے نام سے اُس نے فارسی ادب کی ایک کتاب لکھی تھی، جو اب تک بعض کتب خانوں میں موجود ہے،

واثق کھتری | امراے عالمگیری میں سے ایک کا وکیل (ایجنٹ) تھا، اس کے نظم و نثر اور ادب فارسی کی یہ دھوم تھی، کہ شہنشاہ عالمگیر جو خود ایک بلند پایہ ادیب تھا، احسنت و آفرین کہتا تھا،

شیورام کایستھ | اکبرآباد کا باشندہ تھا، اُس کا باپ نواب اسد خاں وزیر عالمگیر کا متصدی تھا، مرزا بیدل کا شاگرد تھا، مرزا کی چہار عنصر کا جواب گلگشت بہار ارم کے نام سے اُس نے لکھا تھا ۱۱۴۴ھ میں وفات پائی،

کنور پریم کشور | راجہ جگل کشور کا پوتا، شاعر، لطیفہ گو، سخن فہم، خوشنویس تھا، چند مثنویوں کا مصنف ہے،

منشی لچھمن سنگھ | قوم کے بقال تھے، نہایت ہوش مند، عاقل، اور عربی و فارسی کے ادیب تھے، ایرانیوں کی صحبتیں اٹھائی تھیں، اور مشہور ایرانی انشاپردازوں کے طرز پر لکھتے تھے، صاحب تذکرۂ خوش نویساں لکھتا ہے،

"مرد دانا قابل، در علم و ہنر فارسی و عربی و عبارت پردازی خیلے مہارت داشت و در صحبت مرزایان ایران بسیار ماندہ دل و دماغ دیگر پیدا کردہ و طور انشا بردیۂ طاہر وحید و طاہر دکھنی و جلالا اختیار کردہ،"

خوشخطی میں محمد حفیظ خاں کے خط شفیعہ میں مرزا آغا کے شاعری میں میر شمس الدین فقیر (المتوفی ۱۱۸۰ھ) کے شاگرد تھے، شعلۂ آہ وغیرہ اُن کی تصنیفات ہیں، ظہوری کے اشعار اُن کی نوکِ زبان رہتے تھے:

پنڈت لالہ لچھمی رام | ذوالفقار الدولہ مرزا نجف خان (المتوفی ۱۱۹۶ھ) جو شاہ عالم کا وزیر تھا، اُس کی سرکار میں یہ ملازم تھا تذکرۂ مذکور کا مصنف اُس کی نسبت لکھتا ہے،

"منشی بے نظیر بود، در علم عربی و فارسی و انشا پردازی و مصوری نصیب وافر داشت ..... ایں چنیں انساں با سلیقہ و صاحب کمال کم پیدا می شد"

خوش وقت رائے شاداب | کھتری، یہ ایک مشہور اور معزز خاندان کا فرزند تھا، بچپن ہی سے لکھنے پڑھنے کا شوق تھا، آخر اس درجہ کمال حاصل کیا۔ کہ اپنے زمانہ کے کبار علما ر میں سمجھا جانے لگا، تذکرۂ مذکور میں ہے۔

"از ابتدائے عمر طبع را بہ تحصیلِ علم و ہنر راغب و مائل داشت و در اندک زماں در جمیع علم و ہنر آراستہ شد، در خصائل نیکو از ہمچشمانِ خود سبقت بردہ در خوشنویسی کمال داشت۔ ایں چنیں شخص دریں قوم صاحب استعداد و فیاض و قدرشناس کم شدہ باشد"

رائے پریم ناتھ | اس کا خاندان ایک مدت سے شاہی دفتر کا عہدہ دار چلا آتا تھا، یہ خود شاہ عالم کے سرکاری دفتر کا مالک کل تھا، خوشخطی و ادب دانی میں اپنے زمانہ کا استاد یگانہ تھا، شاگردوں کا بڑا مجمع اس نے یادگار چھوڑا،

سکھ رام داس | ولد ٹلیکنٹھ، زمانہ متعین نہیں، آمدنامۂ بدیع اس کی ایک تصنیف ہے، دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے، کہ اطرافِ لکھنؤ کا باشندہ تھا، اور عہد شاہی میں قانون گوئی کے عہدہ پر مامور تھا،

بینی نرائن | ولد جیون رائے، قوم کھتری، عرف سودھی، پنجاب کا رہنے والا تھا، فرخ سیر کے عہد میں، محکم سنگھ اس کو منشی (سکریٹری) کے عہدہ پر سرفراز کر کے اپنے ساتھ مارواڑ لے گیا،

اثنائے سفر میں اس کو محمد طاہر کشمیری کی کتاب "ہوش افزا" ملی، اُس نے اُس کو بغور پڑھا، اور اس کی بنا پر اس کو قدیم ہندو عہد کے عجائبات، اور مذہبی معجزانہ قصص کو فارسی زبان میں لکھنے کا خیال پیدا ہوا، چنانچہ راماین مہا بھارت، بھاگوت، ہری بنس وغیرہ سے انتخاب کرکے سنہ ۱۱۲۵ھ سے گلشن اسرار ربانی کے نام سے ایک کتاب لکھنی شروع کی، جو سنہ ۱۱۳۴ھ میں اختتام کو پہنچی،

منشی موہن لال منعم | اکبر ثانی کے عہد میں تھے، اُن کی تین مثنویاں مثنویات منعم کے نام سے فارسی میں موجود ہیں، یہ ترتیب ان کا نام بہار عشق، شاہرخ، اور دلبر جہاں ہے، اور غالباً یہ تینوں افسانے ہیں، شاہرخ اور دلبر جہان کو اُس نے اکبر ثانی کے نذر کیا تھا،

کشن سنگھ | دلد رائے پران ناتھ کھتری، قوم منگل، ساکن سیالکوٹ، یہ فارسی زبان کا ایک چابک دست انشا پرداز تھا، پنج کروشی اور غریب الانشار وغیرہ کتابوں کا مصنف ہے غریب الانشا سنہ ۱۲۱۵ھ میں اُس نے لکھی،

بنوالی داس دلی | آپ اس سے ہندو مورخین کی بزم کمال میں مل چکے ہیں، اس کا ادبی کارنامہ یہ ہے، کہ بھاشا زبان سے ایک ناٹک پربودھ چندر رودیا" کا فارسی زبان میں ترجمہ کرکے شراب شیراز کے متوالوں کو ہندوستان کی "رام رنگی" کا متانہ بنایا، سنہ ۱۰۷۳ھ میں موجود تھا،

درتی چند | سنہ ۱۱۳۷ھ میں اُس نے گیان گوہر نامہ کے نام سے فارسی زبان میں ایک افسانہ لکھا، دیوان غلام محمد خاں جو بہادر شاہ اول کے عہد میں ایک امیر تھا، اس کا مربی اور محسن تھا،

شنبھو لال | یہ مہاراجہ جیت سنگھ والی بنارس کا منشی (سکریٹری) تھا، سنہ ۱۱۹۷ھ میں اُس نے مفتاح خزائن نام کتاب لکھی، جو بہت سے خطوط کا مجموعہ ہے، جن میں سے بعض نہایت اہم ہیں،

منشی تہوری مل تمکین | بارہویں صدی ہجری کے اوائل میں فارسی کا یہ ایک مشہور ادیب تھا، اُس کے پوتے پران چند سرشار ولد بخت مل نے اپنے دادا کے فارسی خطوط اور رقعات کو گلدستۂ رفیق کے نام سے ایک رسالہ کی صورت میں مرتب کیا، یہ خطوط ۱۱۳۹ھ کے زمانہ کے لکھے ہوئے ہیں،

منشی بمن رائے پوری | شجاع الدولہ کے عہد میں ۱۱۷۶ھ میں ماجہ رائے پور کے دربار میں نوکر تھے منشی تخلص تھا، اور قلم کے بھی منشی تھے، فن انشار پر انھوں نے ایک کتاب لکھی ہے، انشائے نیاز نامہ نام رکھا ہے، کتاب کے تین حصے کئے ہیں، (۱) عرائض (۲) رقائم (۳) فقرہائے متفرق،

منشی جسونت رائے | عالمگیر ثانی کے عہد میں تھے، گلشن بہار کے نام سے انھوں نے ایک چمن ادب کھلایا ہے مختلف لوگوں کے خطوط اس میں جمع کئے ہیں، جن میں بکثرت سیاسی اور جنگی معلومات ہیں، شاعر بھی تھے، منشی تخلص کرتے تھے، اور اسی نام سے ایک دیوان فارسی بھی چھوڑا ہے، سنہ ۱۱۷۲ھ میں تھے،

منسارام | منشی تخلص تھا، سرزمین پنجاب کے مجنون و لیلیٰ، ہیرا ور رانجھا کا افسانۂ حسن و عشق نظم کرکے ابنِ فارس کو سنایا، ۱۱۵۷ھ میں یہ نغمہ سرائے محبت، سرائے فانی سے کوچ کر گیا،

عوض رائے | مسرت تخلص، قصیدۂ مسرت کہہ کر شاہ عالم کے دربار میں پیش کیا، اس میں کمال یہ کیا ہے کہ ہر شعر میں بادشاہ کو نئے طور سے خطاب کیا ہے، بنگال ایشیاٹک سوسائٹی میں اس کا قلمی نسخہ ہے،

نہال چند لاہوری | یہ ایک افسانہ کا جس کا نام مذہب عشق ہے مصنف ہے، مذہب عشق میں نام و نشان ننگ ہے، اسلئے اس ادیب کے حالات نامعلوم ہیں،

لالہ بھویت رائے | فن بلاغت کی ایک کتاب دستورشگرف کا مصنف، تصنیف تو حیدرآباد اور بنگال ایشیاٹک سوسائٹی میں قلمی موجود ہے، لیکن صاحب تصنیف کا تذکرہ مفقود ہے، حیدرآباد کا نسخہ سنہ ۱۱۹۲ھ کا لکھا ہوا ہے،

لالہ بھیک رائے | فیض آباد کا باشندہ تھا، اس نے سعدی کی گلستاں میں پھول کھلائے یعنی اس کی شرح لکھی، جو بنگال ایشیاٹک سوسائٹی میں موجود ہے،

منشی ایشری داس | کایستھ، امیرالامرا نواب غضنفر جنگ والی فرخ آباد کے منشی تھے، ایک فارسی تذکرہ کا مصنف اُن کی نسبت لکھتا ہے،

"نظم و نثر فارسی بہ فصاحت و بلاغت مشتمل بر لطائف و صنائع و بدائع لفظی و معنوی می نگاشت ازنظرش بعض وقائع و سوانح بنظر گذشتہ، حق آنست کہ بکمال لطف و خوبی می نگاشت"

منشی ٹیک چند بہار | ان کا تذکرہ آگے آئے گا، یہاں صرف اس حیثیت سے اُن کو جگہ ملتی ہے کہ یہ بوستان سعدی کے شارح اور بہار بوستان کے مصنف ہیں،

اننند رام | زمانہ متاخر کا ایک فارسی ادیب ہے، سنہ ۱۱۵۹ھ کے قریب میں اس دنیا سے چل بسا، لیکن اس کے چمنستان کی بہار اب تک باقی ہے، یہ ایک فارسی افسانہ ہے، سنہ ۱۲۹۴ھ میں یہ کتاب چھپ چکی ہے،

ماتا پرشاد | صحیفۃ الشوق نام ایک فارسی افسانہ کا مصنف ہے، اس کا قلمی نسخہ سنہ ۱۲۸۲ھ کا لکھا ہوا کتب خانۂ آصفیہ میں موجود ہے،

دین دیال | عجیب القصص معروف بہ شبستان عشرت ایک افسانہ فارسی زبان میں اس نے لکھا ہے، سنہ ۱۲۹۶ھ میں یہ کتاب طبع ہوئی ہے،

امرسنگھ | رامائن امر پرکاش کے نام سے فارسی میں پاربتی۔ مہادیو، رام چندرجی، اور راجہ بسرت کے قصّوں کو نظم کر گیا،

سیالکوٹی مل | اس کا ذکر آگے آتا ہے، یہ زمانۂ متاخر کا بہت بڑا ادیب تھا، صفاتِ کائنات کے نام سے فارسی علم بلاغت میں اس کی ایک کتاب ہے، جو ۱۲۹۵ھ میں چھپ گئی ہے، اس کی دوسری کتاب رجم الشیاطین ہے، جو سراج آرزو کی تنبیہ الغافلین کا جواب ہے، یہ دونوں کتابیں ادبی مطارحات پر مشتمل ہیں،

چھمی نرائن | باپ کا نام مانی رام، سراج الدین آرزو کا شاگرد تھا، لاہور اپنا وطن چھوڑ کر دلی میں آکر ڈیرے ڈالے، دُرانی کے حملوں نے دلی سے نکال کر بریلی اور اورنگ آباد کی سیر کراتے ہوئے لکھنؤ پہنچایا، یہ فارسی کا نامور انشا پرداز تھا، اس کے فارسی رقعے بہت مشہور ہیں، ۱۲۰۵ھ میں اس نے ان رقعوں کو ترتیب دیکر رقعات چھمی نرائن نام رکھا،

چھمی نراین | یہ حاجی پور (بہار) کا رہنے والا تھا، عالمگیر کے عہد میں شہزادہ بیدار بخت کی سرکار میں پیشکاری کے عہدہ پر تھا، اور سہ صدی منصب رکھتا تھا، ۱۱۱۰ھ میں اس نے شاہنامہ کا انتخاب کیا، اس انتخاب کے دیباچہ کا پہلا شعر یہ ہے،

شکر و سپاس نعمت و منت خدائے را　　پروردگارِ خلق و خداوند کبریا

راجہ رام نرائن | چھمی نرائن کا لڑکا، عظیم آباد، پٹنہ میں اُس نے بڑا سیاسی عروج حاصل کیا تھا، اور مدت تک اس کا خاندان معزز رہا، شیخ حزیں کا شرف تلمذ اس کو حاصل تھا، خود صاحب ادب اور ادبائے زمانہ کا مربی تھا، نواب قاسم کی معرکہ آرائی کا نشانہ بنا، نہایت وسیع النظر اور کتب بینی کا شائق تھا،

کیول رام | شاہ عالم کے عہد میں تھا، اور اودھ کے بیت الانشاء میں منشی تھا، ۱۱۹۷ھ

یں منشی کیول رام نے پچاس جز میں فن انشار پر ایک کتاب لکھی۔ اور طلسمات خیال اس کا نام رکھا،

پنڈت کرپان دھان	پنڈت جی کا جنم پتہ معلوم نہیں، مثنوی دل پسند کے مصنف ہیں، بنگال ایشیاٹک سوسائٹی میں ۱۲۴۳ھ کا لکھا ہوا اس کا قلمی نسخہ موجود ہے،
منشی خیالی رام	لکھنو وطن، خیالی تخلص، نظم و نثر فارسی کے استاد، واجد علی شاہ کے دربار سے تعلق تھا، اُن کی تصنیفات کی تعداد ۱۰۰ سے زیادہ ہے، امیر خسرو کی سب سے مشکل کتاب اعجاز خسروی کی شرح لکھی،
منشی مادھورام	دلی کے رہنے والے تھے، اور فارسی زبان کے استاد تھے، انشائے مادھورام اُن کا نتیجہ فکر ہے جس میں بادشاہوں، شہزادوں، اور امرا کے نام خطوط ہیں، یہ پہلے نصاب فارسی میں داخل تھا،

ذیل کی سطروں میں چند اور نشآت کا نام نقل کرتے ہیں، اُن کے مزید حالات سے واقفیت نہ ہوئی،

کامتا پرشاد	انشائے بے نقط کا مصنف،
منشی کالی رائے	انشائے تمیز کا مصنف، اس انشار میں ایک خاص صنعت بدیع (ترک حرف مسلسل) ملحوظ ہے،
دولت رام	کتاب کا نام انشائے دولت رام،
منشی جے سنگھ رائے	انشائے راحت جان کا مصنف ہے، اس کتاب میں سخاوت و عدالت وغیرہ مختلف عنوانات پر مضامین ہیں،
ہر سہائے	انشائے ہر سہائے اس کی کتاب کا نام ہے، اس میں منشی گری کے قوانین نظم و نثر فارسی

یہا بیان ہوئے ہیں،

منشی ہرنراین | دہلی کے باشندہ تھے، خیالات نادر ان کے فارسی رقعات کا مجموعہ ہے،

لالہ نوندرائے | دستورالصبیان کے نام سے فارسی مکتوبات کے جامع ہیں،

پچھمی داس | پچھمی داس بن نراین داس رقعات نظامیہ اس کا سرمایۂ کمال ہے چھپ گئی ہے،

خوشحال رائے | دستورالامتیاز کے نام سے قوانین انشاء کا مدون ہے نسخہ موجودہ کتب خانۂ آصفیہ ۱۲۰۳ھ کا نقل کیا ہوا ہے،

نندرام | باپ کا نام ہیرانند، قانونچۂ انشاء اس کی تالیف ہے، موضوع کتاب نام سے ظاہر ہے قلمی نسخہ آصفیہ میں ہے،

رام سنگھ | گلشن عجائب انشاء میں اس کی کتاب ہے، نسخۂ موجودہ آصفیہ ۱۲۲۳ھ کا چھپا ہوا ہے،

کشن جی پنڈت | شاید دکھنی ہوں، ان کی نادرالانشاء قلمی آصفیہ میں ہے،

رنجھور داس | جونپور کا رہنے والا تھا، دقائق الانشاء کا مؤلف ہے،

(۲)

ہندو لغت نویس

کسی زبان کے جاننے کے صرف یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ اس زبان کی عبارت کو بخوبی سمجھ سکتا ہے، اور اس میں لکھ پڑھ سکتا ہے، یہ تو نہایت ادنیٰ درجہ ہے، اصلی زبان دانی یہ ہے کہ وہ اہل زبان کی طرح اس زبان پر قابو رکھتا ہو، اور اس کے ذخیرۂ الفاظ کے ماخذ و اشتقاق کا علم اور غلط و صحیح کی تمیز اور خواص کے طرز ادا، ترکیب الفاظ، ادائے مطلب اور محاورات پر اس کو دسترس ہو، ہندوستان میں جو ہندو ادبائے فارسی گذرے ہیں، غور کرنا چاہیے کہ

کیا اُن کی واقفیتِ زبان، ہماری آج کل کی بیرونی زبان کی واقفیت کے معیار سے کچھ بلند تر تھی یا نہیں،

اکبر کے زمانہ تک فارسی زبان کے چھوٹے بڑے سب سے زیادہ لغت موجود تھے لیکن یہ تمامتر قدما اور اہل زبان کے لکھے ہوئے تھے، جو اہلِ ہند کے ضروریات کے مطابق نہ تھے، بہت سی چیزیں ایسی ہیں، جن کو ایک صاحب زبان لغت نویس مشکل اور قابلِ حل نہیں سمجھتا، حالانکہ غیر زبان دان کے نزدیک وہ سخت مشکل اور قابلِ حل ہیں، لغات سے زیادہ محاورات کا معاملہ سخت ہے، اہلِ زبان اُن کے ایک ایک نکتہ کو جانتا ہے، اور یہ سمجھتا ہے کہ تمام دنیا ان کو اسی طرح سمجھ لے گی، حالانکہ دوسری قوموں کو جن کی وہ زبان نہیں ہی مرحلہ دشوار نظر آتا ہے، غرض یہی اسباب تھے کہ جن کی بنا پر ہندوا دبا نے فارسی کو، فارسی زبان کے لغات لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی،

ٹیک چند بہار | قوم کا کھتری، سراج الدین علی خاں آرزو اکبرآبادی کے ارشد تلامذہ میں تھا، فارسی زبان کی گرہ وبند پر اُسے کامل عبور تھا، اہلِ زبان کی مدت تک صحبتیں اٹھائی تھیں، اُس نے فارسی زبان کے کئی لغت لکھے، بہار عجم، نوادر المصادر اور جواہر الحروف وغیرہ، زیادہ مشہور بہار عجم ہے، اس کے مقدمہ میں وہ لکھتا ہے کہ بدر طفولیت سے ۳۵ سال کی عمر تک فارسی زبان کی تحقیق و کاوش میں لگا رہا، ۲۰ برس متصل اس نے لغت کی تالیف و ترتیب میں بسر کئے، اور سات دفعہ خود اپنے ہاتھ سے مسودہ کانٹ چھانٹ کر صاف کیا، یہ عمر کی آخری کمائی تھی، اور اسی پر جان دی، بہار کے شاگرد منشی اندر من نے آٹھویں دفعہ مرتب کیا، اور خطبہ اور خاتمہ لکھ کر شاہ عالم کے زمانہ میں ۱۱۸۲ھ میں ختم کیا، بہار عجم اس قدر مقبول ہوئی کہ تمام ارباب علم میں متداول ہوگئی، اور لوگ اس کی سندیں پیش کرتے ہیں،

ہر فارسی داں اس کے نام سے واقف ہے، محاورہ کے لئے اس نے اہلِ زبان کے شعر سند میں پیش کئے ہیں،

سیالکوٹی مل وارستہ | نام سے زیادہ بیا تپنے تخلص کے ساتھ مشہور ہے، شیخ حزیں پر سراج آرزو نے جو اعتراضات کئے تھے، ان کے جواب میں رجم الشیاطین اُس نے لکھی تھی یہیے کہ اہلِ زبان اور اساتذۂ فن کے مناظرات اور رد و کد میں جو صاحبِ نظر حملہ آور انہ اور خصوصًا مدافعانہ حصّہ لے، وہ کس درجہ اس زبان پر عبور کامل اور وقوفِ تام رکھتا ہوگا، وارستہ نے اسی فارسی زبان کے عشق میں ایران ملک کی خاک چھانی، اور کامل تیس برس اس ملک میں بسر کئے، اس سفر کے نتائج علی مصطلحات الشعراء اور صفات کائنات ہیں مصطلحات الشعراء گو صرف ۴۰۰ صفحے کی ضخامت کا لغت ہے لیکن پندرہ برس کی محنتوں کا صلہ ہے، وارستہ دیباچہ میں لکھتا ہے:

"اکثر محاورات غریبۂ فارسی زباناں در اشعار فصاحت بار دیدم بہ تحقیق آں کمر سعی مستحکم بربستم ہر چند گرد کتب لغات گردیدم نفخۂ حلِ معانی بعضے ازاں نشنیدم ناچار رجوع بزباندانانِ ایران دیار آوردم و پانزدہ سال دریں تلاش بسر بردم آنچہ از زبان آں جماعت شنیدم بروفق استفاع جمہور سخن پردازاں خواستم، در حیز کتابت آوردم"

پنڈت گنگا بش | حال نہیں معلوم، اس نے فرہنگِ شیر و شکر کے نام سے عربی و فارسی الفاظ کا لغت لکھا ہے،

کاشی راج کھتری | لغت پنجابی کے نام سے فارسی زبان میں لغت لکھا ہے، اس کا قلمی نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی میں ہے،

گردھاری لال | دکن کا باشندہ ۱۲۴۱ھ میں گنج اللغات فارسی کے نام سے کتاب لکھی

قلمی نسخہ آصفیہ میں ہے۔

فرہنگ آنندراج اس فرہنگ کا ذکر اس سلسلہ میں مناسب نہ تھا، کہ اوّلاً تو یہ ایک مسلمان کی تصنیف ہے، اور ثانیاً یہ کہ مسلمانوں کے عہد حکومت کے بعد لکھی گئی ہے لیکن صرف اس لئے اس کا تذکرہ مقصود ہے کہ اس سے ادائے احسان کا موقع پیدا ہو، فرہنگ آنندراج چالیس پچاس برس ہوئے کہ مدراس کے ایک ہندو راجہ آنندرام کی فرمائش سے ترتیب پائی، یہ فارسی زبان کا سب سے ضخیم اور معقول لغت ہے، جو کئی جلدوں میں، اور لمبی تقطیع کے کئی ہزار صفحات میں تمام ہوا ہے، اس میں صرف خالص فارسی الفاظ نہیں ہیں جیسا کہ دیگر لغت نویسوں نے کیا ہے، بلکہ اُن عربی الفاظ کو بھی لے لیا ہے، جو فارسی میں مستعمل ہیں، مُصنّف کے مقدمہ سے معلوم ہوتا ہے، کہ راجہ نے اس پر ہزاروں روپیے صرف کئے ہیں، اس کے لئے دور دور سے کتابیں منگوائیں، کتب خانہ قائم کیا، مصنف کا وظیفہ مقرر کیا، اور خود چھپوا کر شائع کیا،

اس موقع پر ایک نکتہ کی بات ہم کہنا چاہتے ہیں، اگرچہ ہندوستانیوں نے انگریزی پڑھکر مرہٹی، بنگالی، اور اردو میں انگریزی ڈکشنریاں آج بھی لکھی ہیں لیکن درحقیقت انھوں نے اس میں صرف مترجمی کی خدمت انجام دی ہے یعنی کسی مستند انگریزی ڈکشنری کو سامنے رکھ کر اُس کے مقابل کے معنی اپنی زبان میں لکھ کر خانہ پُری کر دی ہے، لیکن جو خدمت کہ ٹیکچند بہار اور وارستہ نے اپنے زمانہ کی سرکاری زبان کی ادا کی، اور مثل ایک اہل زبان کے بذات خاص تحقیق و کاوش سے شعراء کے کلام پڑھ کر، ایرانیوں کی صحبتیں اٹھا کر، خود اہل زبان سے مطالبات اور چھیڑ چھاڑ کر کے انجام دی، اس کی نظیر اب تک تو پرانے "منشی" کے نوجوان "مسٹر" نہ دکھا سکے"

منشی کاشی پرشاد | نادان تخلص، وطن دکن ہوگا، انھوں نے فارسی قواعد کی کتاب "ہفت گل" لکھی، آصفیہ میں اس کا نسخہ ہے،

مینڈو لال | زار تخلص، بہار علوم کے نام سے فارسی قواعد کی کتاب تصنیف کی، قلمی نسخہ آصفیہ میں ہے،

مترجمین

دو مختلف قوموں کے متضاد عناصر کو متحد کرنے کے لئے بہترین کیمیا وہی مسالہ دونوں قوموں کے لٹریچر کو متحد کر دیتا ہے، ڈاکٹر تیج بہادر سپرو نے صبح امید لکھنو کے پہلے نمبر میں اس مقصد پر بڑا زور دیا ہے، ہم کہتے ہیں کہ ہاں اس جدید زمانہ میں از سر نو کوشش کی ضرورت ہے لیکن پرانے عہد کے بزرگوں نے اپنے دور عمل میں اس خیال کو پیش نظر رکھا اور انکو کامیابی ہوئی، اس وقت میرا موضوع سخن یہ نہیں ہے، کہ مسلمانوں نے کیا کیا، بلکہ یہ ہے کہ اس عہد کے ہندوؤں نے کیا کیا،

اس خیال کی اصلی کامیابی ملک کے مترجم طبقہ کے ہاتھ میں ہے، جو ایک قوم کے خیالات کو دوسری قوموں کے سامنے پیش کرتا رہتا ہے کہ ان دونوں میں کچھ بیر نہیں، بلکہ ایک ہی حقیقت کے مختلف مظاہر ہیں، اگرچہ ترجمہ کا سلسلہ مسلمانوں کے آغاز عہد سے قائم تھا لیکن وہ صرف علمی ذوق کا نتیجہ تھا، قوموں کی باہمی بے گانگی اور اجنبیت کا دور کرنا اس کا مقصد نہ تھا،

اکبری عہد میں حکومت کی خواہش کے مطابق مسلمان علماء اور ہندو پنڈتوں نے مل کر رامائن، مہابھارت، سنگھاسن بتیسی، لیلاوتی، نلدمن، تاجک، ہری بنس، اتھربن وید

وغیرہ کتابوں کا ترجمہ کیا، وہ پنڈت جو ان میں سے بعض کتابوں کے ترجمہ میں شریک غالب رہے، یہ تھے، گنگا دھر، مہیش، مہا نند، کشن جوشی بھاون، افسوس ہے کہ ان ناموروں کے حالات نہیں معلوم،

اب وہ زمانہ بھی آیا جب کہ بادشاہوں کی خوشی کے لئے نہیں، بلکہ اپنی خوشی کے لئے فارسی داں ہندو پنڈتوں نے اس کام کو از خود انجام دینا شروع کیا،

گردھرداس | قوم کایستھ، متوطن دہلی شہنشاہ جہانگیر کے عہد میں تھا، ۱۰۳۳ھ میں اس نے رامائن کا ترجمہ فارسی نظم میں کیا، یہ کتاب برٹش میوزیم لندن میں موجود ہے،

بنوالی داس | ولی تخلص، شہزادہ داراشکوہ کا میر منشی (چیف سکرٹری) تھا، ۱۰۶۳ھ میں اس نے بھاکا سے پربودھ چندرودیا نام ایک افسانہ کا فارسی میں ترجمہ کیا،

پنڈت لچھمی نرائن | انھوں نے شنکر آچاری کی پوتھی، اپروکھا نوبتی کا ترجمہ حدائق المعرفت کے نام سے فارسی میں کیا،

منشی لکھن لال | جہاں ظفر کے نام سے رامائن کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا،

امر سنگھ | رامائن امر پرکاش کے نام سے بادتی، مہادیو، رام چندر، راجہ دسرتھ کے حالات زبان دانان فارس کو سنائے،

پنڈت امرناتھ | شیدا تخلص، چاروں یدوں کے مطابق دنیا کے جو احوال تھے، وہ فارسی میں خیالات شیدا کے نام سے بیان کئے ہیں، یہ کتاب کتب خانہ آصفیہ میں ہے،

رام پرشاد | اودھ کا باشندہ تھا، نواب ناظم محمد داراب خاں کا خزانچی تھا، اس نے ۱۲۲۶ھ میں نواب مذکور کی فرمائش سے امت جہ تر کا فارسی نظم میں ترجمہ کیا، اور مخزن العرفان اس کا نام رکھا،

گوپال | خلف سری گوبند، اُس نے سری بھاگوت دادھیا ہمارا این کا ترجمہ فارسی میں کیا، ۱۸۳۵ء کا لکھا ہوا نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی میں ہے،

انندگھن گوشائیں | متخلص بہ خوش. اُس نے پوتھی کاشی کھنڈ اس کو فارسی زبان میں منتقل کیا، بنگال ایشیاٹک سوسائٹی میں جو نسخہ ہے اذہ ۱۲۰۸ھ کا لکھا ہوا ہے،

انندکنوار | حالات نہیں معلوم، پوتھی موجہ دھرم گیان ساگر کا قلمی نسخہ جو اُس نے فارسی میں ترجمہ کیا تھا سوسائٹی مذکور کے کتب خانہ میں ہے،

زورآور سنگھ | اُس نے پوتھی بیاارنبہ کو فارسی زبان میں منتقل کیا،

مرلی دھر | پوتھی سری بھاگوت کا فارسی میں مترجم، قلمی نسخہ سوسائٹی میں ہے،

راؤدیت سنگھ | اہلِ تاریخ کے سلسلہ میں اس کا حال گذر چکا ہے، مہاراجہ حکمت سنگھ والی اوڑچھہ کی سرکار میں نوکری کے زمانہ میں اُس نے ایک بہت بڑا ادبی کارنامہ انجام دیا، بادۂ شیرازہ کو سفالِ ہندی میں بھر کر ملک کے سامنے پیش کیا یعنی دیوان حافظ کا ہندی زبان میں ترجمہ کیا،

(۷)

علومِ عقلیہ کے ہندو علماء

علومِ عقلیہ سے میری مراد طبیعیات، الٰہیات، ریاضی، ہیئت، طب، وغیرہ جملہ علوم حکمت ہیں، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندوستان بھی ان ممالک میں سے ایک ہے جن کو علومِ عقلیہ کا جنم بھوم کہنا چاہیے، یہ بحث دوسری ہے، کہ یہ علوم یہاں ہیں پیدا ہوئے جیسا کہ اہلِ ہند کا دعویٰ ہے، یا سکندر کے بعد یونانیوں کے ذریعہ سے یہ علوم یہاں منتقل ہوئے، جیسا کہ اہلِ یورپ

کا بیان ہے، بااین ہمہ یہ ماننا پڑے گا، کہ اہل ہند نے ان علوم میں کافی دستگاہ حاصل کرلی تھی، اور ریاضیات و ہیئت میں ایک حد تک استادی کے رتبہ کو پہونچ گئے تھے،

ہندوؤں کے دماغ کو ریاضیات سے ہمیشہ ایک خاص مناسبت رہی ہے، مسلمانوں کے عہد حکومت میں علوم عقلیہ کے جو ہندو نامور یہاں پیدا ہوئے، ان میں مہندسین اور علمائے ریاضیات کی تعداد زیادہ ہے،

بیرونی کے ذریعہ سے جن برہمنوں نے عربوں کی تحقیقات سے فائدہ اٹھایا تھا، افسوس کہ ان کے حالات ہم کو نہیں معلوم اور نیز بعد کی صدیوں میں جن ہندو بزرگوں نے ادھر توجہ کی، اُن کے نام سے بھی ہم واقف نہیں، تاہم اتنا معلوم ہے کہ سنسکرت میں عربوں کی تحقیقات عقلی کی کافی آمیزش موجود ہے، چنانچہ تمدن ہند کا فرنچ مصنف شہادت دیتا ہے، "کہ گیارہویں صدی عیسوی کے بعد سے کہنا چاہئے کہ ہندی علوم سے مراد عربی علوم ہیں، پس ہم کہہ سکتے ہیں، کہ ہندی علوم جن کی ابتدا پانچویں صدی عیسوی میں آریہ بھٹ کے ریاضیات سے ہوئی، اور پھر ساتویں صدی میں برہم گپت نے اُن پر اضافہ کیا، اس زمانہ سے لیکر آج تک انہی مسائل پر بحث کرتے ہیں، جو ہند میں (یونانی اور مسلمان) ان دو ذریعوں سے آئے"

عہدِ اکبری کے ہندو علمائے معقولات

ابوالفضل تنہا مورخ ہے جس نے اپنے بادشاہ کے عہد کے جزئی سے جزئی واقعہ کو قلم انداز نہیں کیا، آئین میں "دانش آموزانِ دولت" کے عنوان سے ہر فن کے ۱۴۲ علماء کے نام لکھے ہیں، اس کا غذی دربار میں بلا تفرق ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کے اکابر علم اور اساطین فلسفہ دوش بدوش بٹھائے گئے ہیں، "شناسائے عقلی کلام" کے عنوان میں ابوالفضل نے اپنے زمانہ کے حسب ذیل اشخاص کے نام لکھے ہیں،

نارائن، مادھو بھٹ، سری بھٹ، بشن ناتھ، رام کشن، بلبھدر مصر، باسدیو مصر

باہن بھٹ، بدیا ونواس گورہی ناتھ، گوپی ناتھ، کشن پنڈت، بھٹا چارج، بھاگیرت، کاشی ناتھ بھٹا چارج،

جن ہندو پنڈتوں نے مرزا الغ بیگ کی زیج جدید جو مسلمان علمائے ہیئت کی تحقیقات اخیر کا مجموعہ ہے مسلمان علمار کی زیر نگرانی فارسی سے ہندی میں ترجمہ کیا تھا، اُن کے نام یہ ہیں، کشن جوتشی، گنگا دھر جیتس، مہا آنند،[1]

جے سنگھ کے رصدخانے | مسلمان سلاطین نے دنیا کے ہر گوشہ میں جہاں اُن کے تمدن نے فروغ پایا، تحقیقات فلکیہ کی تکمیل کے لئے رصدخانے قائم کئے، ۱۹۰۹ء کے الندوہ میں میں نے متعدد نمبروں میں ان رصدخانوں کے حالات و تحقیقات، کی تفصیل لکھی ہے، اس وقت سلسلۂ سخن کے طور پر یہ کہنا ہے کہ ہندوستان میں متعدد مسلمان سلاطین نے رصدخانے قائم کرنے چاہے، فیروز شاہ بہمنی اور شاہجہاں نے کام کو شروع کرایا لیکن مختلف وجوہ سے ناتمام چھوڑنا پڑا، یہ مہم درحقیقت محمد شاہ کے عہد حکومت کے لئے اُٹھ رہی تھی،

راجہ جے سنگھ سوائی کچھواہا امبیر کا راجہ تھا، اورنگزیب عالمگیر اور اس کے جانشینوں کے ایام سلطنت میں ایک فوجی افسر کی حیثیت سے نمایاں عزت حاصل کی، محمد شاہ کے عہد میں وہ آگرہ اور مالوہ کا گورنر مقرر ہوا، اس نے اپنی ریاست کا نیا مرکز جے پور کے نام سے آباد کیا، اور اب اسی نام سے یہ پوری ریاست موسوم و معروف ہے، جے سنگھ ایک نہایت علم دوست، اور عالم راجہ تھا، عربی علوم و فنون میں وہ اچھی دستگاہ رکھتا تھا، اور علم ہیئت سے اس کو ایک خاص ذوق تھا،

راجہ جے سنگھ نے الغ بیگ کی زیج جدید ملا چاند اکبری کی تسہیلات اور ملا فرید شاہجہانی

---

[1] آئین اکبری، آئین تصویر خانہ،

کی زیچ شاہجہانی کے اصول پر زیچ محمد شاہی ترتیب دی، اور بادشاہ کے حضور میں پیش کی، یہ وہ زمانہ تھا، جب اہل یورپ کے فضل و کمال کی طرف اہل ہند کی نگاہیں اُٹھ رہی تھیں، بادشاہ کے حکم سے مسلمان، برہمن اور فرنگی علمائے ہیئت جمع کئے گئے، اور دلی میں ایک جدید رصد خانہ کی تعمیر کا کام ۱۱۳۷ھ میں شروع ہوا، مرزا خیر اللہ مہندس اس کے مہتمم تھے، اس رصد خانہ میں بعض آلات ایسے تھے، جو سمرقند کے الغ بیگی رصد خانہ میں استعمال ہو چکے تھے، اور بعض بالکل نئے تھے اور خود ان کے ایجاد کردہ تھے،

راجہ نے اس غرض سے کہ رصد خانہ کی تمام تحقیقات پوری اتریں، اور ان کی تصدیق ہوتی جائے، رصد خانۂ دہلی کے نمونہ پر جے پور، متھرا، بنارس اور اجین میں بھی رصد خانے بنوائے، دلی اور بنارس کے رصد خانوں کی ٹوٹی پھوٹی یادگاریں تو اب تک باقی ہیں، اور میں نے دیکھی ہیں، باقی شہروں کا حال معلوم نہیں،

بہرحال ان رصد خانوں میں ہندو مسلمان اور فرنگی علمائے ہیئت نے سات برس تک کام کیا، اور اس کے بعد کچھ لوگ پادری مینوئل کی ماتحتی میں، یورپ بھیجے گئے، وہاں سے یہ علمی جماعت جو معلومات لے کر آئی، اُن کا اپنے اصول کے مطابق یہاں مقابلہ کیا گیا، یہ مشرق کا پہلا رصد خانہ ہے جس نے مغربی تحقیقات کی موافقت کی، اس رصد خانہ کی تحقیقات فلکی سے زیچ محمد شاہی تیار کی گئی، جو تین مقالات پر مشتمل ہے، اوّل در معرفت تقویم، دوم در معرفت طالع ہر وقت، سوم در معرفت رفتار سیارات و ثوابت،[1]

راجہ نے اس راہ میں ایک اور اہم خدمت انجام دی، عربی زبان کی مستند علم ہیئت کی کتابوں کا ہندی میں ترجمہ کرایا، اور اس پر ہزاروں روپیے صرف کئے،[2]

---

[1] مقدمۂ زیچ محمد شاہی [2] سبحۃ المرجان آزاد بلگرامی،

بہادر خاں والی ٹکاری | احتشام الدولہ، مبارز الملک راجہ خان بہادر نصرت جنگ، ہمارے اس عہد کے ہندو دوست سمجھتے ہوں گے کہ یہ کسی مسلمان امیر کا نام ہوگا لیکن اُن کو سننا چاہیئے کہ یہ مہاراجہ سترجیت سنگھ راجہ ٹکاری (صوبہ بہار) کے فرزند دلبند کا نام ہے، یہ راجہ غدر سے ۳۰ برس پہلے تھا، راجہ مذکور تمام علوم و فنون عربی و فارسی میں ماہر تھا، اس کا دربار مسلمان اور ہندو فضلائے عصر سے بھرا ہوا تھا، اس زمانہ میں مولانا غلام حسین جونپوری ایک نامور ریاضی داں تھے، وہ بھی اس راجہ کے دامنِ دولت سے وابستہ تھے، مولانا راجہ کے فضل و کمال کا ذکر ان الفاظ میں فرماتے ہیں :۔

"چنانچہ فنے از فنونِ متداولہ و علمے از علومِ متداولہ مطروح نشدہ کہ در ذات شریف آں یگانہ جمع نیامدہ باشد"

راجہ نے ایک دن اپنی بزم علم میں تذکرہ کیا، کہ روز بروز علم کا نقصان ہو رہا ہے اور اس کے متعدد وجوہ ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ علوم و فنون کی زیادہ تر کتابیں عربی زبان میں ہیں جن سے فارسی خواں فائدہ نہیں اٹھا سکتے، اس لئے مناسب ہے کہ فارسی میں ایک ایسی جامع کتاب لکھی جائے، جو ہر قسم کے اصول و فروع پر مشتمل ہو، تین سو برس ہوئے کہ علامہ عبدالعلی برجندی کے زمانہ سے اس وقت تک کوئی ایسی کتاب نہیں لکھی گئی، اس تقریر کے بعد راجہ نے مولانا غلام حسین کو حکم دیا کہ اس مجوزہ تصنیف کا کام شروع کریں،

مولانائے موصوف نے جامع بہادر خانی کے نام سے ایک ایسی مکمل اور جامع کتاب ریاضیات پر فارسی میں لکھی، جس سے زیادہ مکمل اور جامع کتاب شاید عربی میں بھی نہ ہوگی، اس کو علوم ریاضیہ کی انسائیکلوپیڈیا کہنا زیادہ موزوں ہوگا علم ہندسہ، علم الابصار، علم المناظر، علم حساب، جبر و مقابلہ، جومیٹری، علم ہیئت، علم آلات رصد و قواعد رصد وغیرہ اصلی ابواب کے تحت میں

بیسیوں فروعی مباحث اور فصول ہیں، پوری کتاب لنبی اور چوڑی تقطیع کے ۱۴۰ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور ہر صفحہ میں ۲۵ لنبی اور باریک سطریں ہیں، ۱۲۴۲ھ میں شروع ہوئی، اور ۱۲۴۹ھ میں تمام ہوئی اکبر ثانی کا یہ زمانہ تھا، کتاب میں جہاں کہیں ستاروں کے طلوع وغروب کا وقت دیا گیا، ہی قلعہ بخاری کے مطالع ومغارب کے حساب سے دیا ہے، مصنف جا بجا قدیم تحقیقات کو یورپ کے جدید معلومات سے موازنہ بھی کرتا گیا ہے،

راجہ رتن سنگھ زخمی | قوم کایستھ، سکینہ، ۱۱۹۷ھ میں لکھنو میں پیدا ہوا، اس کا خاندان تین پشتوں سے دربار اودھ کے معزز عہدوں پر ممتاز چلا آتا تھا، لکھنو کی درسگاہوں کے آغوش میں اس کے فضل وکمال نے نشو ونما پایا، عربی، فارسی، ترکی، سنسکرت اور کسی انگریزی ہی زبان سے واقفیت تھی، علم ہیئت میں اس کو استادی کا رتبہ حاصل تھا، فارسی شعروسخن سے بھی ذوق رکھتا تھا، کچھ دنوں ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت کی، اس کے بعد اودھ میں اپنے خاندانی عہدہ پر ممتاز ہوا، محمد علی شاہ کے زمانہ میں دیوان شاہی مقرر ہوا، اور فخر الدولہ دبیر الملک ہوشیار جنگ کے خطاب سے مخاطب ہوا،

۱۲۵۳ھ میں محمد علی شاہ کے حکم سے ہیئت میں حدائق النجوم نام ایک جامع کتاب فارسی زبان میں لکھی، جو ۶۵ جزء میں جاکر ختم ہوئی ہے، جدید مغربی تحقیقات کو پرانے عربی معلومات سے اس نے پیوند دیا ہے، یہ کتاب اپنے باب میں نہایت مستند اور معرکۃ الآراء سمجھی جاتی ہے، اور اب علمائے اسلام میں ہیئت کی اعلیٰ کتابوں میں اس کا شمار ہوتا ہے،

روپا نرائن | ۱۱۲۹ھ میں وفات پائی، علم ہندسہ میں ششش جہات نام ایک کتاب لکھی، جو ارباب فن میں نہایت دقیع خیال کی جاتی ہے، قلمی نسخہ موجود ہے،

اندمن | منشی ٹیک چند بہار کا شاگرد تھا، اصل وطن حصار تھا لیکن توطن شاہجہان آباد میں

اختیار کرلیا تھا، بہار عجم کو اسی نے آخر میں مرتب کیا تھا، ریاضیات میں اس کو ید طولی حاصل تھا، عربی و فارسی کا عالم تھا، ۱۲۱۱ھ میں دستور الحساب نام کتاب علم الحساب (میتھمٹکس) میں تالیف کی کتبخانہ بانکی پور میں اس کا قلمی نسخہ ہے، کتاب ۱۲۱۱ھ میں تمام ہوئی ہے،

میدنی مل | قوم کا ئیستھ، اورنگ زیب عالمگیر کے عہد حکومت میں تھا، علوم عقلیہ کا واقف کار تھا، ۱۰۸۱ھ میں بدائع الفنون کے نام سے ریاضیات میں ایک عمدہ کتاب لکھی، بنگال ایشیاٹک سوسائٹی اور کتب خانہ آصفیہ میں اس کے قلمی نسخے موجود ہیں،

رام پرشاد | عظیم آباد پٹنہ وطن تھا، علم ہندسہ میں مفتاح الناظرین اس کی تالیف ہے، ۱۲۵۰ھ میں اس کی یہ کتاب کلکتہ میں چھپی تھی،

دیوان کاشی | یہ بھی عظیم آباد پٹنہ کے باشندے تھے، ریاضیات و ہندسہ میں خزانۃ العلم ان کی کتاب ہے، ۱۸۳۷ء میں یہ کتاب کلکتہ کے چھاپہ خانہ میں طبع ہوئی تھی،

رام منوں لال فلسفی | علوم حکمت اور فلسفہ میں ممتاز و معروف تھے، شاعر بھی تھے فلسفی تھے، اور فلسفی بننے کے مدعی تھے، اس لئے فلسفی تخلص کرتے تھے، ان کے بیٹے کندن لال نے اپنی ایک تصنیف میں اپنے خاندان کا حال لکھا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ علم و کمال کا پورا مطلع تھا، شاہجہاں کے زمانہ سے اس خاندان میں علم و دولت ساتھ ساتھ تھی، سندیلہ کے برہمن تھے، رائے منوں لال کی نسبت لکھا ہے،

"پدر فقیر رائے منوں لال فلسفی تخلص کہ در علوم حکمیہ یادگار رنگار سلف بودند و صاحب تصانیف کثیرہ"

رائے منوں لال پہلے نواب فیض اللہ خاں کی سرکار میں تھے، اس کے بعد نواب آصف الدولہ کے دربار میں گئے، اور یہاں سے نکل کر ایسٹ انڈیا کمپنی میں آئے، اور غالباً یہیں کسی قدر انگریزی

حاصل کی، ۱۲۴۳ھ میں وفات پائی، اور گیارہ کتابیں مختلف علوم وفنون میں اپنی یادگار چھوڑیں،
گلستان ارم، بوستان حیرت، شارستان نور، دیوان اشعار، تنقیح الاخبار، جغرافیہ، یہ کتابیں ادب
وتاریخ میں ہیں، خالص فلسفہ کی تصنیفات حسب ذیل ہیں:

سدید الاستخراج، کتاب احکام، عجائب در علم حساب، ہیئت، حکمت انگریزی، مفردات طب،

کندن لال اشکی، یہ اسی ناموربا پ کا فرزند تھا، باپ اور چچا کے زیر عاطفت عربی، اور فارسی علوم
کی تحصیل کی، ۲۲ سال کی عمر تک بریلی، رام پور، دہلی، اور بنارس کی درس گاہوں میں عمر گذاری
سنسکرت میں سری کب اندرجھا کے شاگرد تھے، کچھ سال ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت میں
بسر کئے، اور آخر نواب منتظم الدولہ ناظم الملک مہدی علی خان کی وساطت سے محمد علی شاہ اودھ
کے دربار میں پہونچے، چار صدی منصب پایا، دفتر انشار میں کسی عہدہ پر ممتاز ہوئے، منتظم الدولہ
کی وفات کے بعد خدمت سلطانی سے مستعفی ہوکر بنارس میں گوشہ نشینی اختیار کی،

کندن لال عربی اور نیز اسلامی علوم میں استادی کا درجہ رکھتے تھے، حدیث وتفسیر بھی اُن
کی نظر تھی، فلسفہ وریاضیات سے اُن کو خاص ذوق تھا، ہیئت میں انھوں نے زیچ اشکی
ترتیب دی، فلسفہ میں حکمت ہندیہ، اکسیر سعادت، اور قسطاس تین کتابیں فارسی زبان میں
لکھیں، اخیر کتاب درحقیقت تمام علوم وفنون کی انسائیکلو پیڈیا ہے، کندن لال نے اس کو
چار حصوں پر منقسم کیا ہے، پہلے حصہ میں ہندوؤں کا فلسفہ ہے، دوسرے میں یونانیوں کا، تیسرے
میں عربوں کے علوم اور چوتھے میں یورپ کی جدید سائنس، کہیں سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ
کسی علم وفن سے بے گانہ ہے، کتاب ۱۲۲۵ھ میں مطبع محمدیہ لکھنؤ میں چھپی،

——……❦……——

انتظاماتِ مالی

اس فن پر ہندو مصنفین کی تین کتابیں ملی ہیں، جن کا ذکر بہ ترتیب آتا ہے، اس فن پر اُن کی توجہ اس لئے مبذول ہوئی، کہ زیادہ تر یہ عہدے ان ہی کے زیرِ اقتدار رہتے تھے،

چھتر مل | ولد رائے پران چند اُس نے اس فن میں ایک نادر کتاب یادگار چھوڑی ہے، جس کا نام دیوان پسند ہے، دیوانِ زراعت، محاصل زراعت کے اعلیٰ عہدہ دار کو کہتے تھے، دیوان پسند یعنی وہ کتاب جو ہر دیوان کے لئے اس کے ادائے فرائض میں معین ہے، مصنف نے باب کے لئے اس میں دستور کا لفظ پسند کیا ہے، دیوان پسند چار دستوروں پر منقسم کیا ہے،

۱۔ دربیان درستی زمین ہائے کاشتکاری وتعین جمع سرکار و بعضے حساب در پیداواری اجناس (۲) سیاق دشمار در بعضے انتظام مہمات (۳) مزروعہ در بعضے وست (۴) مالی و ملکی دستاویزات معاملہ،

دیباچہ میں مصنف اپنی معاملہ فہمی اور انتظامی مہارت پر بے انتہا فخر کرتا ہے، زمانہ وجود نہیں معلوم، بنگال ایشیاٹک سوسائٹی میں اس کی یہ تصنیف ۱۲۲۵ھ کی لکھی ہوئی ہے،

جگیت رائے | حالات و زمانۂ وجود نہیں معلوم، سیاق یعنی کاغذات وحسابات مالی کے قواعد ترتیب میں سیاق فارسی اس کی تصنیف ہے،

مدن لعل | مجموعۂ سیاق (فارسی) کا مصنف، یہ دونوں رسالے قلمی کتب خانۂ آصفیہ میں ہیں،

نند رام | سیاق نامہ (فارسی) کتب خانۂ آصفیہ میں ۱۸۷۹ء کا مطبوعہ نسخہ موجود ہے،

نجوم

بیربل | یہ نہیں معلوم کہ یہ کون بیربل ہے، رسالہ نجوم فارسی میں اس کی تصنیف ہے،

خوش وقت رائے | ولد بھوپت رائے، خاص النجوم کا مصنف،

سداسکھ کول | باپ کا نام کیول رام کول کاشف الدقائق، نجوم میں اس کی تصنیف ہے،

جواہر سنگھ | جواہر افلاک، وجواہر ادراک کا مصنف،

یہ تمام قلمی رسالے کتب خانہ آصفیہ میں ہیں،

(۸)

طب اور دیگر علوم متفرقہ

ہندوؤں کے یہاں مسلمانوں کی آمد سے پہلے طب میں دو کتابیں مشہور تھیں، چرک اور سشرت کی کتابیں، مسلمانوں کا علم طب، عرب، یونان، ایران، اور ہندوستان کے تجربات کا خلاصہ تھا، اور خود انھوں نے بہت کچھ اس پر اضافہ کیا تھا اس لئے یہ نیا علم طب ہندوستان کے قدیم طب پر امتیاز خاص رکھتا تھا، ہندوستان کے علم طب میں مسلمانوں کی آمد کے بغیر جو ترقیاں و نما ہوئیں، وہ حسب ذیل ہیں،

(۱) حاکم قوم اپنے علوم وفنون کو محکوم قوم کے علوم وفنون سے بہت بالا دست سمجھتی ہے اور اس سے استغنا برتتی ہے، چنانچہ اسی علم طب کے متعلق دیکھئے، کہ گذشتہ کونسل میں جب بعض ممبروں نے دیسی طب کی سرکاری حمایت اور اس کو مستند تسلیم کرنے کا رزولیوشن پیش کیا، تو بے التفاتی کے ساتھ رد کر دیا گیا لیکن مسلمانوں نے اپنے عہد حکومت میں ایسا نہیں کیا، ہندی

علم طب کی بیسیوں کتابیں انھوں نے اپنی زبان میں منتقل کیں، اور نیا علم طب ہندوستان میں پھیلایا، خاص اہل ہند کے مزاج اور طبیعت کا خیال کر کے خود انہی کے علم طب کو فارسی میں منتقل کیا، اور شاہی حیثیت سے اس کو مستند قرار دیا، سلطان سکندر لودی سے خواص خان ایک درباری امیر نے عرض کی کہ جہاں پناہ! یونانی طب ہندوستان کی آب و ہوا کے موافق نہیں ہے، حکم ہوا کہ سنسکرت سے ہندی طب کو فارسی میں منتقل کیا جائے، چنانچہ میاں ہوہ بن خواص خاں نے اس کام کو انجام دیا، اور کتاب کا نام معدن الشفا سکندر شاہی رکھا، قاسم فرشتہ نے اکبری عہد سے پہلے اختیاراتِ قاسمی کے نام سے ہندی علم طب کو زندہ کیا، ہندوستان میں اس وقت فارسی میں جو علم طب ہے، اور خصوصاً خاندانی اطبا کے سفینوں میں اور مجربات ناموں میں سیکڑوں نسخے اور دوائیں ہندوستان زا ہیں، اسی طریقہ سے بیدوں نے مسلمانوں کے سیکڑوں نسخے، دوائیں، اور اصول علاج اپنے ہاں لے لئے، اور اس طرح مل ملا کر ایک ایسا طرز علاج رائج ہوا، جو ہندوستان کے حالات کے مطابق تھا،

(۲) پہلے بیدوں میں وہ دوائیں، متداول تھیں، جو ہندوستان میں پیدا ہوتی تھیں، طب اسلامی نے تمام دنیا میں جو دوائیں اور جڑی بوٹیاں زیر تجربہ آچکی تھیں، اُن کو ہندوستان میں رواج دیا، اُن کے فوائد و منافع لوگوں نے سیکھے، مفردات کے ذخیرہ کو بیحد بڑھا دیا،

(۳) دواؤں کی ترکیب میں عرق، معجون، قیروطی، سفوف وغیرہ مختلف طریقوں کو پھیلایا،

(۴) چیچک وغیرہ متعدد بیماریاں جن کو یہاں وہم پرستی سے دیوتاؤں، دیبیوں اور بھوت پریت کا اثر سمجھا جاتا تھا، اور اس لئے ان کا طبی علاج نہیں کیا جاتا تھا، ان کو لائق علاج بتایا، چیچک کی بیماری پر سب سے پہلی کتاب عربوں ہی نے لکھی،

اب ہم ذیل میں بعض ہندو طبیبوں کا حال لکھتے ہیں۔

ہندو اطبّار

یہ سلسلہ اس قدر پھیلا کہ اہلِ بزم گو زبان سے تو نہ کہیں لیکن ان کے تیور سے پہچانتا ہوں کہ وہ گھبرا اٹھے ہیں لیکن،

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

پچھلی داستان میں ہم طب تک پہونچے تھے، اب ہماری کہانی کا سلسلہ آگے چلتا ہے،" عہدِ اسلامی کے بعض ہندو طبیبوں کا حال سناتے ہیں،

دربار شاہی میں مسلمان اطبا کے ساتھ ہندو طبیبوں کا رہنا بھی ضروری تھا، چنانچہ ہندو علمار کے مختلف طبقوں میں سے جو طبقہ شاہانِ اسلام کی جانب پہلے رجوع ہوا، وہ ہندو طبیب تھے، مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں ہندو اطبار میں سے جس سے ہم پہلے واقف ہوئے، وہ سری بھٹ ہیں،

سری بھٹ یہ حکیم سلطان زین العابدین ([illegible]) والیِ کشمیر کے دربار میں تھا، بادشاہ نے اس کی خود تربیت کی تھی، فرشتہ میں ہے،

"سلطان بجہت طبابت سری بھٹ را کہ طبیبِ حاذق بود تربیت کرد"[1]

اطبائے عہدِ اکبری اکبر کے عہدِ حکومت کے نامور ہندو اطبا کے چند نام ابوالفضل نے آئینِ اکبری[2] میں لکھے ہیں، جو یہ ہیں، مہادیو، بھیم ناتھ، نراین، شیوجی، افسوس کہ ان کے حالات ہم کو نہیں معلوم،

۱؎ فرشتہ ذکر بہمن شاہیہ، ج۲ ص ۱۶، نولکشور،

سکھراج | اس کا باپ اسدخاں وزیر عالمگیر کی سرکار میں تھا، سکھراج علاوہ دیگر علوم عقلیہ کے فن طب میں کامل دست گاہ رکھتا تھا، سید علی حسین خاں کی سرکار میں پانصدی منصب پر ممتاز تھا،

منشی بھمی نراین گنجاوی | ان کا ذکر زمرۂ شعرا میں بھی گذر چکا ہے، یہ بھی مسلمان طبیبوں کی درسگاہ سے فن طب کے ماہر بن کر نکلے تھے، ان کا خاندان عالمگیری و محمد شاہی درباروں کے متوسلین میں تھا،

منشی رام پرشاد عظیم آبادی | خلف گنگا پرشاد، گو طبیب تھے لیکن طبابت کا پیشہ نہیں کرتے تھے، کمپنی کے زمانہ میں پٹنہ کی صدر امینی قبول کرلی تھی، پنڈت داتارام کی فرمائش سے ۱۲۷۰ھ میں معیار الامراض نام ایک کتاب فن طب میں تالیف کی، جس میں سر کے بال سے پاؤں کے ناخون تک کی کل بیماریوں کے قوانین کلیہ لکھے ہیں، یہ کتاب اسی زمانہ میں چھپ بھی گئی تھی،

رائے منوہر لال فلسفی | المتوفی ۱۲۳۰ھ دیگر علوم عقلیہ کے ساتھ طب کا بھی ماہر تھا، مفردات طب میں اس کی ایک تصنیف ہے، علوم عقلیہ کے ذیل میں اس کا نام آچکا ہے،

لالہ سوہن لال | سوہن لال سندیلوی رائے منولال کا بھائی تھا، فارسی کا ادیب اور طب میں یگانۂ عہد تھا، اس کا بھتیجا کندن لال قسطاس کے خاتمہ میں لکھتا ہے،

"عمویم لالہ سوہن لال کہ طبیب حاذق و ادیب کامل بودند"

بچولال تمکین | حیدرآبادی، اس نے اپنے طبی مجربات دو جلدوں میں لکھے ہیں، یہ دونوں جلدیں قلمی کتبخانۂ آصفیہ میں ہیں،

پنڈت لالہ چند | اس کی ایک تصنیف کحل الابصار کا ایک قلمی نسخہ آصفیہ میں ہے، نام سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید مخصوص آنکھ کی بیماریوں کے علاج میں ہے،

جیاناتھ | اس نے ویدک سے باکا ہری کالی کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا، قلمی نسخہ

آصفیہ میں ہے،

منشی مہتاب نرائن، | قرودی الطب کا مصنف ہے، اس کا موضوع ادویہ کے خواص ہیں،

یہاں ہندو طبیب مصنفوں کی مختصر فہرست ہے، جنھوں نے فارسی زبان کو اپنے اظہار خیال کا آلہ بنایا، بیسیوں مصنفین اس کے علاوہ ہیں، جنھوں نے اسلامی طب کو ہندی مرہٹی بنگالی، اور تلنگی میں منتقل کیا، تلنگی کی بعض طبی کتابوں کے نام کتب خانہ آصفیہ کی فہرست میں موجود ہیں یہ اسی وسعت کا اثر تھا، کہ شہروں کو چھوڑکر دیہات اور قصبوں تک کے ہندو بنیے طبی دواؤں کے بڑے بڑے عطار بن گئے، اور عرب وایران وترکستان کی دوائیں، اُن کی دکانوں پر بکنے لگیں، اور زمانہ کی شدید مخالفتوں کے باوجود اُن کے آثار اب تک باقی ہیں،

اخلاق وتصوّف

اس مضمون پر مفصل بحث تو ایک مستقل عنوان" اسلام کا اثر ہندو مذاہب پر" میں ہوگی، یہاں علمی حیثیت سے صرف چند ہندو مصنفین کا تذکرہ مقصود ہے، جنھوں نے ان مسائل پر اظہار خیال کیا ہے،

بابا نانک | جو سکھ فرقہ کے بانی ہیں، وہ فارسی میں بہت اچھی دستگاہ رکھتے تھے، اُن کے گرنتھ میں فارسی کے سیکڑوں اشعار اور الفاظ ہیں، اور مولوی رومی اور حافظ وغیرہ صوفی شعراء کے تو وہ دلدادہ تھے، فارسی میں اُن کی دو کتابیں تصوف میں ہیں، الٰہی امداد طلب ایک اور مناجات بحر طویل میں ان کی ہے، یہ تینوں رسالے آصفیہ میں ہیں،

راس ستی داس | عالمگیر ثانی کے عہد میں تھے، محیط معرفت تصوف میں اُن کی کتاب ہے، ۱۸۶۵ء میں چھپ بھی گئی ہے،

لال جی داس | بابا لال گرو (دارا شکوہ کا مرشد) چیلا تھا، بابا لال کے ملفوظات ۱۰۵۶ھ میں اُس نے فارسی میں جمع کئے ہیں، گورنمنٹ کلیکشن لائبریری میں ۱۲۰۱ ؁ھ جلوس عالم شاہی کا لکھا ہوا نسخہ موجود ہے،

بھیرو مل | رسالہ علم جوگ فارسی کا مصنف،

بشن سنگھ | شیو پران فارسی میں اس کی تصوف پر تصنیف ہے، یہ دونوں نسخے قلمی آصفیہ میں ہیں،

رائے کھن لال | اخلاق نامہ فارسی منظوم کا مصنف، اس کا قلمی نسخہ موجودہ آصفیہ ۱۱۹۳ھ کا لکھا ہوا ہے،

سوامی بیاس | شارق المعرفۃ کے نام سے جوگ نشسٹ کا فارسی ترجمہ کیا، حال و زمانہ نہیں معلوم،

ان کے علاوہ اکبری دور کے ان خدا پرستوں کے نام بھی ملاحظہ ہوں جن کو ابوالفضل نے خدیونشناس، خداوند باطل اور خوانائے نقلی معال کی فہرست میں جگہ دی ہے، یعنی مادھو سرستی، مدھو سودن، بابا بلاس، نارائن آسرم، بابا کپور، بھان چند، ہرجی سور، دامودر پرست، رام تیرتھ، نرسنگھ، پرم اندر، آدت، رام بھدر، جی سین سور، اور جہانگیری دور میں چدروپ گسائیں، اور دوسرے ہندو صوفیہ تھے، جن کا ذکر تزک میں متعدد مقامات پر کیا ہے،

موسیقی

فن موسیقی کے جاننے والے اس کثرت سے اس عہد میں پیدا ہوئے ہیں کہ استقصا بھی مشکل ہے، شاہان ہند کی فیاضیوں نے اس فن کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا، ہندوستان میں یہ فن نہایت قدیم زمانہ سے ہے، اور اس میں اس کی استادی مسلّم ہے لیکن مسلمانوں کی آمد کے بعد

ایران و توران کی موسیقی نے مل کر ایک نیا عالم پیدا کر دیا، پٹھانوں کے عہدِ حکومت میں بھی اس فن کے جاننے والے ہند دموجود تھے، اور سلاطین دلی کا دستِ کرم اُن کو دارالحکومت کی طرف ہمیشہ کھینچتا رہتا تھا، جہاں خسرو کے سے ہمہ داں سے ان کو مقابلہ کرنا پڑتا تھا، ان میں سے سب سے مشہور نایک گوپال تھا، اس کے فن موسیقی میں، بارہ سو شاگرد تھے، جو اس کے جلو میں ساتھ ساتھ چلتے تھے، وہ اسی شان سے سلطان علاء الدین خلجی کے دربار میں آیا تھا[1]،

کشمیر ایک مدت سے فنِ موسیقی کا گہوارہ ہے، لیکن کیا آپ کو علم ہے کہ یہاں کس دایۂ کرم نے اس کی پرورش کی، سلطان زین العابدین شاہ کشمیر (۸۲۶ھ) وہ خود اس فن کا بہت بڑا ماہر تھا، اور موسیقی دانوں کا مُربی تھا، ایران اور ہندوستان کے موسیقی دان اس کے دربار میں کھچے چلے آتے تھے، فرشتہ کہتا ہے:۔

"آوازۂ وجودِ اوچوں انتشار یافت، سازندہا و گویندہا کہ در علم موسیقی یگانۂ زماں بودند، از اطراف و نواحی رو بکشمیر نہادند، چنانکہ کشمیر از کثرتِ ہندیاں ایں فن رشکِ ملکِ فرنگ شد" (۳۴۴ جلد دوم)

بودی بٹ (شاید صحیح دیوی بٹ ہو) وہ ایک طرف فارسی کا ادیب تھا، تمام شاہنامہ اس کو بر زبان تھا اور دوسری طرف فنِ موسیقی میں کامل دستگاہ رکھتا تھا، بادشاہ کے نام کی مناسبت سے زین نام اُس نے اس فن میں ایک کتاب لکھ کر دربار میں پیش کی، بادشاہ نے اس کو نہایت پسند کیا، اور اس کے حال پر نوازش فرمائی،

ہندوستان کی موجودہ موسیقی کی نسبت میں نے کہا ہے کہ وہ تنہا ہندوستان زا نہیں ہے، بلکہ مسلمان بادشاہوں کی خوش مذاقی نے ایران و توران و ہندوستان کو ملا کر ایک کر دیا تھا، علاوہ

---

[1] شعر العجم میں راگ درپن کے حوالہ سے امیر خسرو گوپال کا حال پڑھئے، (جلد دوم ص ۱۳۵)

قیاس کے ابوالفضل کی اس عبارت سے بھی یہ اشارہ سمجھنا چاہئے

"نادرہ کارانِ ہندی و ایرانی و تورانی وکشمیری از مرد و زن عشرت افزای

بزم ہمایوں" (آئین ۱۸۳)

دربارِ اکبری میں مسلمان اساتذۂ فن کے ساتھ حسب ذیل ہندو مشاہیر کے نام بھی ہم دوش بدوش پاتے ہیں، بابا رام، سور داس، اور رنگ سین، میاں تان سین، اور میاں چند کا کو جو چاہیے سمجھیے۔[1] میاں تان سین کی نسبت ابوالفضل نے لکھا ہے کہ ایک ہزار برس میں کوئی اس کے برابر پیدا نہیں ہوا،

مسلمانوں نے تو ہندوؤں کی موسیقی پر راگ درپن، انجندرکا، اور مدھیا نایک سنگار وغیرہ کئی کتابیں لکھی ہیں، مگر بھوپت رائے کے علاوہ جس نے ۱۹ سنہ جلوس محمد شاہی میں رسالہ علم موسیقی لکھا، اس فن کے دوسرے ہندو مصنف کا نام ہم کو نہیں معلوم،

ذیل میں چند نام اخیر زمانہ کے استادوں کے آثار شعراے ہنود سے اضافہ کرتے ہیں،

پنڈت اجودھیا پرشاد | کشمیری لکھنوی، حیرت تخلص، استاد جرأت کے شاگرد تھے، کئی دیوان اور مثنویاں اُن سے یادگار رہیں، فنِ موسیقی میں اپنے عہد کے مسلم الثبوت استاد تھے، ۳۵ برس کی عمر میں سنہ ۱۲۳۳ھ میں وفات پائی،

مٹھن لال | دہلوی ولد بخشی سلطان سنگھ کایستھ، فارسی وسنسکرت وطبابت وشاعری کے علاوہ موسیقی کے ماہر تھے، ایک خاص ساز کے موجد ہیں،

روشن لال | شوق تخلص، موسیقی کے استاد تھے،

تلسی داس | دہلوی، تصیم تخلص، سنسکرت کے عالم تھے، اور فارسی سے واقف تھے، فقیرانہ

---

[1] لفظ میاں نو مسلم ہونے کی علامت کو ظاہر کرتا ہے،

بسر اوقات کرتے تھے، طبابت کے علاوہ فنِ موسیقی کے استادِ یگانہ تھے، دلی کے شاہزادہ مرزا قادر بخش طاہر اپنے تذکرۂ گلستانِ سخن میں لکھتے ہیں:۔

"زبان فارسی سے بقدر ضرورت آگاہ، اور کتب نحو و علی الخصوص فنِ موسیقی کی پوتھیوں سے صاحبِ انتباہ، ستار بجانے میں میں ہوش سر سے، اور جان تن سے نکال لیتا تھا، میں نے اُس کے نغمۂ دلنواز کو اپنے کانوں سے سُنا ہے، اور اس کیفیت سے حظ وافر اٹھایا ہے، گاہ گاہ ریختہ کی طرف التفات کرتا تھا"

موسیقی ہندوستان کی چیز تھی، لیکن مسلمانوں نے اپنا سرمایہ ملا کر اس کو اپنا کر لیا، ہندو موسیقی داں بھی ان کا تلمذ خوشی سے قبول کرتے تھے، اس اخیر عہد میں استاذنا المرحوم مولانا محمد فاروق صاحب چریا کوٹی کے بڑے بھائی مولانا **عنایت رسول** صاحب چریا کوٹی جو اپنے وقت کے جامع فاضل تھے، بلکہ بعض حیثیات سے کہا جا سکتا ہے، کہ ہندوستان کی خاک نے اُن کی نظیر نہیں پیدا کی، وہ علاوہ دیگر علوم کے فن موسیقی کے بھی ماہر یگانہ تھے، اور علمی حیثیت کے علاوہ عملاً بھی اُس کو جانتے تھے، اُن کے کئی ہندو شاگرد اس فن میں اب تک موجود ہیں، اور اُن کے نام کی عظمت کو اب تک برقرار رکھے ہوئے ہیں،

مصوّری

ہندوستان میں سنگ تراشی تو یقیناً قدیم زمانہ سے موجود تھی، اور اس کی بہترین زندہ مثالیں بودھوں، اور جینیوں کی عمارتوں اور معبدوں میں مل سکتی ہیں، ایلورا اور اجنتا وغیرہ کے غارات تک دنیا کے لئے تماشائے حیرت ہیں، لیکن شبیہ کشی، طرّاحی، اور رنگ آمیزی اور مصوّری کی نسبت نہیں کہا جا سکتا، کہ ہندوستانِ قدیم نے اس فن کو کہاں تک سیکھا تھا،

اور نہ کسی ہندی مصور کا نام معلوم ہے جس نے اس فن میں کمال حاصل کیا ہو،

مسلمانوں کی آمد کے بعد دیگر فنونِ لطیفہ کی طرح اس فن میں بھی ہندوؤں نے کمال پیدا کرنا شروع کیا، اور چند روز میں یہ حال ہو گیا کہ بقول ابوالفضل ہندوستان کے صفحۂ خیال میں بھی جن نقشِ کمال کا تصور نہ ہوا ہوگا وہ واقعاً ہو گیا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شہنشاہ اکبر جیسے ہند پرست کے عجائب خانہ میں قدیم ہندوستان کی صنعتِ مصوری کی کوئی یادگار نہ تھی ابوالفضل کی عبارت یہ ہے :-

"ہندوراچہ گویم کہ تصویر ایں معنی (مصوری میں کمال) بصفحۂ خیال نکردہ بودہما از بتاقالیم جہاں کمتر نشان دہند" (ص ۷۷)

یعنی جس ہندوستان کو اس فن کا کبھی خیال بھی نہ آیا تھا، اب دنیا میں بہت کم اس فن میں کوئی اس کا حریف نکلے گا. دربار اکبری کے مشہور ہندو مصورین کے نام یہ ہیں:- کیسو لعل، مکند، مادھو، جگن، مہیش، کھیمکرن، تارا، سانولہ، ہربنس، اور رام لساون، ایک ہندو مصور کی نسبت ابوالفضل لکھتا ہے :-

"بساون در طراحی وچہرہ کشائی ورنگ آمیزی و مانند نگاری و دیگر کارہائے ایں فن یگانۂ زمانہ شد" (ص ۷۷)

دسونتھ ایک کہار کا بچہ تھا، اس کو اس فن سے فطری مناسبت تھی، وہ محل شاہی کی دیوار دل پر ادھر اُدھر بچپن سے لکیریں کھینچا کرتا تھا، ایک دن اکبر کی نظر اس پر پڑ گئی، جوہر قابل پا کر خواجہ عبدالصمد شیریں قلم کے سپرد کیا، تھوڑے ہی زمانہ کی تعلیم میں وہ اس فن کا بے نظیر استاد ہو گیا'

جہانگیر تمام شاہانِ تیموری میں اس فن کا سب سے بڑا مربی اور قدردان تھا، بشن داس اس کے دربار کا مشہور مصور تھا، خود بادشاہ تزک میں اس کی تعریف میں لکھتا ہے :

"بشن داس مصورے کہ در شبیہ کشی از یکتایانِ روزگار است"

سنہ ۱۳ جلوس میں جہانگیر نے خان عالم کو عراق بھیجا تھا، بشن داس کو بھی اس کے ساتھ بھیجا کہ شاہ عباس صفوی اور اس کے دربار کی تصویریں کھینچ کر لائے، یہ تصویریں اس قدر عمدہ کھینچی گئی تھیں کہ جن لوگوں نے ان اشخاص کو دیکھا تھا، وہ کہتے تھے کہ اصل سے سر مو فرق نہیں، خود بادشاہ بھی بشن داس کے اس کارنامہ کو تزک میں فخریہ لکھتا ہے، اور مصور کے قلم کو داد دیتا ہے،

عبدالرحیم خانخاناں کا کتب خانہ ایک عجائب خانہ تھا، اس عجائب خانے کی سب سے حیرت انگیز چیز ایک ہندو مصور راد مقو تھا، (شاید یہ وہی ہو جس کا نام ایک دفعہ اوپر بھی آیا ہے) جس کی نسبت مآثر رحیمی کا مصنف لکھتا ہے، کہ مصوری کی طراحی اور شبیہ سازی میں نادرۂ روزگار تھا، اور اس کتب خانے کی اکثر باتصویر کتابیں اسی کے ہاتھ کی بنی ہوئی تھیں،

محمد شاہ کے زمانہ میں گوردھن دلی میں ایک مصور تھا، آنند رام مصنف مرآۃ الاصطلاح[1]، اُس کی نسبت لکھتا ہے کہ:-

"نرگس کی ایک پتی پر پورے شہر کی تصویر وہ کھینچتا تھا،

افسوس کہ ان استادوں کو تاریخ کی زندگی نصیب نہیں ہو سکی، اس لئے بجز ان لوگوں کے جو سلاطین اور امرا کے دامن سے لپٹے رہتے تھے، اور دل کے نام تک تاریکی کے پردہ میں گم ہیں، ورنہ سینکڑوں اساتذۂ وقت ہوں گے، جن کو گو قسمت نارسائی ہو گی لیکن دست و دماغ کی نارسائی کے وہ شاکی نہ ہوں گے،

اخیر زمانہ کے چند ہندو طبیب

پورن سنگھ | قوم کائستھ، دہلی وطن، سعادت یار خاں رنگین کے شاگرد تھے، اور پورن تخلص کرتے تھے

---

[1] قلمی نسخہ پٹنہ خدا بخش خاں لائبریری میں ہے، نہایت نادر کتاب ہے،

علم سنسکرت اور طبابت ہندی میں مہارتِ کامل رکھتے تھے، مگر بد مزاجی اور وارستگی کے سبب بیماروں کی طرف کم التفات کرتے تھے، فارسی میں بھی دخل تھا،

لالہ لچھمی نرائن کھتری | مہاراجہ ٹکیت رائے لکھنوی کے رفقاء میں تھے، اخیر عمر میں نوابی کے بعد کلکتہ جاکر رہ گئے تھے، فارسی کے شاعر تھے، طب میں بہت اچھا دخل رکھتے تھے، مولوی حفیظ الدین شہید کے شاگردوں میں تھے،

مٹھن لال | قوم کایتھ سکسینہ، ولد بخشی سلطان سنگھ دہلوی، فارسی اور سنسکرت کے عالم تھے، ایک لغت کے مصنف ہیں، طبابت میں شہرت رکھتے تھے،

تلسی داس | سادھو تھے، فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے، دلی وطن تھا، قلعہ کے شہزادوں سے ارتباط رکھتے تھے، کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے، حکیم تخلص تھا، طب ہندی میں امام تھے، اور مجربات بیدک سے اکثر امراض مزمنہ کا علاج کرتے تھے، کشتوں کے استعمال میں اور جذام اور وجع مفاصل وغیرہ کے علاج میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے، موسیقی میں کمال پیدا کیا تھا، فارسی زبان سے واقف تھے،

سکھانند | قوم کایتھ، دلی وطن تھا، شاہ نصیر دہلوی کے شاگرد، شاعری کے علاوہ فنِ طبابت میں "وحید العصر" تھے،

(معارف از جنوری تا دسمبر ۱۹۴۱ء)

سلطان ٹیپو کی چند باتیں

کچھ چشم دید مشاہدات اور کچھ تاریخی حقائق

اللہ اکبر! سو ڈیڑھ سو برس میں مسلمان کیا سے کیا ہو گئے! ایک زمانہ تھا کہ ہر مسلمان سپاہی فرمانروائی کے لئے پیدا ہوتا تھا! اور اب یہ حال ہے کہ ہمارے بادشاہ اور سلاطین بھی محکومی اور غلامی کے لئے پیدا ہو رہے ہیں! ابو مسلم خراسانی ایک شخص تھا جس نے بنو امیہ کی تاریخ کا ورق الٹ دیا، عبدالرحمٰن تنہا عباسیوں سے بھاگ کر اندلس میں قدم رکھتا ہے! اور ڈھائی سو برس کے لئے ایک عظیم الشان حکومت قائم کر دیتا ہے، یعقوب صفار ایک ٹھٹھیرا ہاتھ میں تلوار لے کر کھڑا ہوتا ہے، تو عباسیوں کی دل بادل فوج میں ہل چل پڑ جاتی ہے،

خود ہندوستان میں دیکھو کتنے سپاہی دم کے دم میں تاج و تخت کے مالک بن گئے! غلاموں کے نخاس سے چند روپیوں میں خرید کر آئے، سپاہیوں میں داخل ہوئے، اور آگے بڑھ کر منصب وزارت تک پہنچے، اور پھر وہ بادشاہ تھے، تیموریوں سے پہلے کی تاریخ اس قسم کے واقعات سے لبریز ہے تیموریوں کے آخر عہد میں ٹونک، بھوپال، رام پور وغیرہ ریاستیں انہی مسلمان سپاہیوں کی تلواروں کی پیدا کی ہوئی ہیں، اور کتنی ریاستیں جو اس عہد میں پیدا ہوئیں، ناموافق آب و ہوا میں پرورش نہ پا سکیں انہی میں جنوبی ہندوستان کی دو نامور ریاستیں کرناٹک اور میسور ہیں،

کرناٹک تو انگریزوں کی دوستی کے باوجود مٹ گیا لیکن میسور اب تک زندہ ہے لیکن وہ

اسلامی ریاست کے بجائے ایک ہندو ریاست ہے، یہ ریاست درحقیقت پہلے سے ایک ہندو ریاست تھی، سلطان ٹیپو کا باپ حیدر علی ایک معمولی سپاہی کی حیثیت سے اس ریاست کی فوج میں داخل ہوا، چند ہی روز میں غیر معمولی جنگی قابلیت کی بناء پر مناصب میں ترقی کر تا گیا، سپاہیوں میں بے پناہ ہر دلعزیزی اس کو حاصل ہوگئی، یہ دیکھ کر دیگر ارکان ریاست ڈر گئے، اور آخر حیدر علی کی معزولی کی تدبیریں ہونے لگیں لیکن یہ پھندا الٹ کر انہی کی گردنوں میں پڑ گیا، اور راجہ عملاً معزول ہوگیا، حیدر علی نیابۃً اس کی جگہ فرمانروا ہوا،

یہ اٹھارہویں صدی عیسوی کی پُراسرار تاریخ کے آخری ابواب تھے، اس وقت یورپ کی سرزمین میں نپولین کی آتش فشانی زلزلہ ڈال رہی تھی، انگریز یورپ اور ہندوستان دونوں علاقوں میں فرانسیسیوں سے برسرپیکار تھے، حیدرآباد اور کرناٹک نے انگریزوں کا اور میسور نے فرانسیسیوں کا ساتھ دیا، باہم وہ وہ معرکہ آرائیاں ہوئیں کہ اگر قسمت انگریزوں کے پرچم پر سایہ افگن نہ ہوتی، تو آج ہم کو یونین جیک سارے ملک پر لہراتا نظر نہ آتا،

بہر حال حیدر علی اور سلطان ٹیپو دونوں باپ بیٹوں نے بمشکل ۳۵ برس حکومت کی ہوگی لیکن ان ۳۵ برسوں میں اُن کیلئے ہر برس کا ختم کرنا گویا رستم کا ہفتخواں طے کرنا تھا، ایک طرف کرناٹک، دوسری طرف حیدرآباد، تیسری طرف مرہٹے، چوتھی طرف انگریز، ایک بہادر بیک وقت ان چار پہلوانوں سے نبرد آزما تھا، کبھی کبھی ایسا ہوتا، کہ ان میں سے کوئی ٹوٹ کر ادھر آجاتا، لیکن پھر شہ پاکر الگ ہو جاتا، اور اُدھر چلا جاتا، علاوہ ازیں اندرونی سازشوں کا جال الگ بچھا ہوا تھا، جس میں یہ اسلامی سلطنت پھنسی ہوئی تھی۔

ان تمام فتنوں کے باوجود جن سے ایک بڑی سے بڑی سلطنت بھی بمشکل عہدہ برآ ہوسکتی ہے، حیدر علی اور ٹیپو اُن پر کیوں کر غالب آسکے، وہ اُن کی تاریخ زندگی کا ایک عظیم الشان کارنامہ ہے،

جب ہم ان کی حکومت کی تاریخ پڑھتے ہیں، تو ہم پر حیرت واستعجاب کا عالم طاری ہو جاتا ہے، ایسے دور میں جب کہ اس کا ایک ایک دن، اور ایک ایک رات گردشِ آسمانی کے نذر تھی، کیوں کر وہ اتنے بڑے انتظامات اور اصلاحات ملک میں رائج کر سکے، اگر صرف اُن کے جنگی کارناموں ہی پر نظر ڈالی جائے، تو معلوم ہوگا کہ ان کے جنگی شعبہ بالکل یورپین طرز کا تھا، فوج میں فرانسیسی بھی تھے جس کا نظام یورپین تھا، اور تمام سپاہی جدید قواعد اور جدید اسلحے سے لیس تھے، توپوں اور بندوقوں کے ڈھالنے اور گولی بارود کے بنانے کے کارخانے بھی تھے، اور وہ اتنے کامیاب تھے، کہ ۳۰ برس کی جنگ میں ان کو کبھی غیروں کا دست نگر ہونا نہ پڑا،

ہندوستان کے اس نپولین کے فرانس کے نپولین سے براہِ راست تعلقات تھے، نپولین میدان مارتا ہوا یورپ سے مصر تک چلا آیا تھا اور خیال تھا کہ اب وہ ہندوستان میں داخل ہی ہونا چاہتا ہے کہ دفعتہً دونوں کے بخت واقبال نے کنارہ کشی اختیار کرلی، اس موقع پر ایک خاص واقعہ یاد آگیا،

انگریزوں نے سلطان ٹرکی کے پاس ایک سفیر بھیجا تھا، کہ سلطان ٹیپو کے نام ایک فرمان لکھوا لائے، کہ وہ فرانسیسیوں کا ساتھ چھوڑ دے، چنانچہ سفیر مذکور سلطان کا ایک خط لایا، جس میں فرانسیسیوں کی دغابازی، نپولین کی شرارت، فرنچ لوگوں کی مذہب سے نفرت، اور ان کا اتحاد، اور سلطان کا انگریزوں کو اپنا دوست سمجھنا، اور ٹیپو کو ہدایت دینا کہ وہ بھی انگریزوں کا دوست بن جائے، اور مصر پر فرانسیسیوں کے قبضہ کو اسلام کی عداوت اور دین کے لئے ایک بڑے خطرہ کا سبب سمجھنے وغیرہ کو بہت تفصیل سے بیان کیا گیا تھا، ٹیپو نے بھی سلطان کے اس خط کا بہت مفصل جواب دیا[1]،

---

[1] خاندان میسور کے ایک عالی ہمت نے اپنے خاندان کی ایک ضخیم تاریخ فارسی زبان میں ہندوستانی

بہرحال اس خط میں جو نقشہ کھینچا گیا تھا، اس کو سامنے رکھ کر اس وقت کی جنگ کا نقشہ دیکھا جائے، تو عبرتوں اور بصیرتوں کا عجیب و غریب ذخیرہ مورخ کو نظر آتا ہے،

میسور کی اس اسلامی حکومت کا دارالسلطنت شہر سرنگا پٹم تھا، ۱۹۱۲ء میں مجھ کو دراس ایجوکیشنل کانفرنس کی شرکت کی غرض سے بنگلور جانا پڑا، تو میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا، اور کانفرنس سے فرصت پاکر میسور، سرنگا پٹم، اور کرشنا آم پور کی بھی سیر کی، اور ان تمام مقامات کو جہاں بڑے بڑے سیاسی انقلابات رونما ہوئے تھے، عبرت کی آنکھوں سے دیکھا میں نے دوران سیر میں اس ندی کو بھی عبور کیا، جو دکن اور میسور کی حد فاصل تھی، مجھے وہ سلسلۂ کوہ بھی نظر آیا جس کے دامن میں ٹیپو کی فوج پناہ گیر تھی، اور جب موقع پاتی تھی، پہاڑ کو قطع کرکے کمپنی کی فوج پر بجلی بن کر گرتی تھی، اور وہ اس اچانک حملہ سے گھبرا جاتی تھی، میں ایک پہاڑ پر بھی چڑھا، جو کرشنا آمپور کے قریب تھا، اور جس پر ٹیپو کے جنگی استحکامات کے نشانات تھے، پتھر کی وہ دو عظیم الشان چٹانیں بھی دیکھیں، جن کو بجائے خود پہاڑ کہنا چاہئے، اور وہ اس طرح آکر ایک دوسرے سے مل گئی تھیں، کہ ایک قلعہ سا بن گیا تھا اُن کے دہانے پر ایک بڑا سوراخ تھا، جس میں ایک آدمی سکڑ کر داخل ہوسکتا تھا، اندر نہایت کشادہ جگہ تھی، بیچ بیچ میں گولی چلانے کے لئے سوراخ تھے؛

اسی کے دامن میں وہ عظیم الشان معرکہ پیش آیا تھا، جس میں کرناٹک اور حیدرآباد کی قسمت کا فیصلہ ہوا تھا یعنی ارکاٹ کے چندا صاحب اور حیدرآباد کے محی الدین خان دونوں نے فرانسیسیوں کے ساتھ مل کر انورالدین خان شہامت جنگ نواب ارکاٹ کے خلاف

(بقیہ حاشیہ ص ۱۰۱) اور انگریزی مواد سے لکھوائی ہے، اور نہایت اہتمام سے سرکاری طور پر شائع ہوئی ہے، یہ دونوں خط بعینہٖ اس میں درج ہیں، بڑی تقطیع پر چھپی ہے، کارنامۂ حیدری نام ہے،

فوج کشی کی، ۱۱ شعبان سنہ ۱۱۶۲ھ کو فریقین میں وہ معرکۂ جنگ برپا ہوا جس میں انورالدین خاں نے میدان کارزار میں شہادت پائی، اس میدان میں جہاں نواب شہید نے شہادت پائی تھی ایک بڑا چبوترہ بنا دیا گیا ہے، قریب ہی ایک فرسودہ مسجد ہے، جس پر حسب ذیل کتبہ ہے،

"میر مقدر عز شانہ، بحر جود و کرم | ساخت مسجد بہر طاعت فی المثل بیت الحرم

گفت رضوانم بگو تاریخ ایں عالی بنا | ختم شد از فضل رب مسجد کبیت محترم

سنہ ۱۱۲۰ھ سنہ ۱۱۲۰ھ

محمد قانع کتبہ ابوتراب باہتمام میر محمد حسین عرف سید کریمی"

یہاں سے سرنگا پٹم جانے کا اتفاق ہوا، سرنگا پٹم کا قلعہ عجیب موقع پر تعمیر ہوا ہے، کاوری ندی میں ایک جگہ دو شاخیں ہوگئی ہیں، کچھ دور کے بعد یہ شاخیں مل کر پھر ایک ہوگئی ہیں، اس طرح بیچ میں ایک جزیرہ سا ہوگیا ہے اسی جزیرہ پر سرنگا پٹم کا قلعہ بنایا گیا ہے، چاروں طرف سے دریا سے گھرا ہوا ہے جس وقت میں اس کی سیر کے لئے گیا تھا، دریا کی موجیں آآ کر قلعہ کی دیواروں سے ٹکرا رہی تھیں، سلطان ٹیپو کی زندگی کا آخری کھیل یہیں ہوا، وہ کمپنی کی فوج کے مقابلہ میں اسی قلعہ میں محصور ہوگیا تھا، فوج کی گولہ اندازی سے قلعہ کی ایک طرف کی دیوار میں رخنہ پڑ گیا، سلطان کے نوکروں نے غداری کی، اور دشمن کو پوشیدہ طور پر اس کی اطلاع دیدی، بیچارہ سلطان اسی معرکہ میں سنہ ۱۷۹۹ء میں کام آگیا،

پورے صوبہ مدراس میں سلطان ایک ولی اور خدا رسیدہ کی حیثیت سے مانا جاتا ہے، فرط احترام سے اس کا نام نہیں لیتے، سلطان شہید کہہ کر یاد کرتے ہیں، سلطان شہید، اس کی ماں اور حیدر علی تینوں کی قبریں اسی سرنگا پٹم میں ایک ویران باغ کے اندر ہیں، صدر دروازہ پر ایک نقارہ خانہ ہے، جہاں صبح و شام اب تک نقارہ بجتا ہے، روضہ ایک متوسط درجہ کا بنا ہوا ہے،

اس کا دروازہ چھوٹا ہے جس کے اوپر اور پہلو میں اشعار کندہ ہیں، دروازہ کے اندر قدم رکھتے ہی پہلو بہ پہلو تین قبریں نظر آتی ہیں، خود سلطان شہید ٹیپو کی، حیدر علی کی اور بیگم یعنی سلطان ٹیپو کی ماں کی، پہلی قبر پر سرخ چادر، اور دوسری اور تیسری پر سیاہ چادر پڑی ہوئی ہے، سامنے قرآن پاک رکھا ہے، سرخ چادر دیکھ کر سلطان ٹیپو کی شہادت کا پورا منظر میری نگاہوں کے سامنے آگیا، آنکھیں نم ہوگئیں، جذبات میں تلاطم پیدا ہوگیا، اور خون میں ہیجان آگیا، اور زبان نے فرخی کے الفاظ میں شیر میسور کے خاکی جسم کو اس طرح خطاب کیا،

خیز شاہا! کہ رسولان شہاں آمدہ اند — دشمنے روے نما داست دریں شہر دیار[۵۱]
کہ تواند کہ برانگیز دازیں خواب ترا — خفتنی خفتی کز خواب نگردی بیدار
خفتنِ بسیار اے خواجہ نہ خوے تو بود — ہیچ کس خفتہ ندیداست ترا زیں کردار
یکدمکے باری درخانہ ببایست نشست — تا بدیدندے[۵۲] روی تو عزیزان و تبار
بجہاں از فزع و بیم تو رفتند شہاں — تو شہا از فزع و بیم کہ رفتی بہ حصار

روضہ کے اندر میں نے قدم رکھا اور اوپر نگاہ اٹھی تو ان شعروں پر نظر پڑی،

در شاہے کہ شہر الاسلام — باب شیرے کہ کسترالاصنام
اوست سلطانِ دین و ہم دنیا — بندۂ بارگاہ او غلام[۵۳]
بسم اللہ الرحمن الرحیم — اللہ محمد ابوبکر عثمان علی،
زہے گنبدے کز شکوہ بنا — فلک زیر دستش بود در علو
تو خواہی مہ و خواہ خورشید خواں — فلک داغ گردید از رشک او
بود شمسہ اش نور چشم فلک — قمر یافتہ نور تعلیم از د

---

[۵۱] یہ مصرع دوسرے شعر کا ہے [۵۲] سکتہ قدما کے یہاں جائز ہے، [۵۳] مشکوک،

ترا دش کناں بجز رحمت ز خاک — گرد ہے ذکر و بیاں گر داد
سحر گہ بے کسب فیض و شرف — گذشتم ازیں خواب گاہ بگو
چو ایں مضجع تازہ آمد بچشم — نمودم چو رو حانیاں جستجو
کہ ایں شاہ آسودہ را نام چیست — چہ تاریخ رحلت نمودہ است او
یکے زاں میاں گفت تاریخ و نام — کہ حیدر علی خاں بہادر بگو

(۱۱۹۵ھ)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مقبرہ حیدر علی خاں کے مرنے کے بعد غالباً خود سلطان ٹیپو نے بنوایا تھا، اور جب وہ شہید ہوا تو اس کو بھی اسی میں دفن کیا گیا، دروازہ کے داہنی طرف کی دیوار پر یہ شعر بعد کو لکھے گئے ہیں :۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم — رب ارحم السلطان الکریم
ٹیپو سلطان شہید شد آگاہ — خون خود ریخت فی سبیل اللہ
بود ذی قعدہ بست و ہشتم آں — شدہ در روز شنبہ حشر عیاں
بیرسالانش بہ نیم ماہ بگفت — نور اسلام و دین ز دنیا رفت

تاریخ کشتہ گشتن سلطان حیدری — ٹیپو بوجہ دین محمد شہید شد

چوں آں مرد میداں نہاں شد ز دنیا — یکے گفت تاریخ شمشیر گم شد

روح قدسی بعرش گفت کہ آہ — نسل حیدر شہید اکبر شد

ان اخذت مصر کما قد ذکرو | السرنج فتن اخذت وبہا
مصیبۃ ما مثلہا ازخبتہا | ذہب عز الروم والہند کلہا
سال تاریخ او شہید گفت | حامی دین شہ زمانہ برفت

عربی کے شعروں سے ظاہر ہوتا ہے، کہ نپولین نے مصر کو اور انگریزوں نے سرنگاپٹم ساتھ ہی ساتھ فتح کیا، اس توافق کو کیا کہا جائے،

سرنگاپٹم میں ایک مسجد بھی نظر آئی، اس کی تعمیر بھی متوسط ہی درجہ کی تھی، اور ویران پڑی تھی، اس کی محرابوں پر چند شعر لکھے تھے، اُن میں سے اول کے شعر یہ ہیں:-

گر حضرت سلیماں اندر زمان ماضی | تعمیر کرد مسجد نامش نہاد اقصیٰ
مانند زر چو جو یا گشتم برائے تاریخ | طاعت سرائے ثابت ہاتف نمود القا ۱۲۲۵ھ

تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ مسجد فتح سرنگاپٹم کے بعد بنی ہے،

وہاں کی تعمیرات میں دو چیزیں عجیب نظر آئیں، ایک پل جو پتلا سا لنبا بنایا گیا ہے، اور ہلانے سے ہلتا ہے، دوسری دولت دریا باغ کی ردکار، یہ ایک عمارت ہے جس کا طرز تعمیر ہندوانہ ہے، دروازے پست ہیں، جن میں کواڑ نہیں لگے ہیں، بہت زیادہ بلند بھی نہیں ہے مجھکو تو ایسا معلوم ہوا، کہ لکڑی کی عمارت ہے، سامنے کے رُخ کی دیوار مصور ہے، اس پر سلطان ٹیپو کی مختلف حالتوں اور معرکوں کی تصویریں بنی ہیں کوئی جنگ کا مرقع ہے، اور سلطان گھوڑے پر سوار ہے، کسی میں بزم رقص وسرود برپا ہے، اور وہ اس میں بیٹھا ہوا ہے، کسی میں جانماز پر بیٹھا تلاوت قرآن میں مصروف ہے، آخری تصویر اس وقت

لہ ہکذا الا یخفی ما فیہ،

کی ہے، جب وہ میدانِ جنگ میں زخمی پالکی پر بیٹھا ہوا ہے، اور فوج کو بڑھا رہا ہے، ایک طرف فرانسیسی، اور میسور کی ہندوستانی فوج ہے، دوسری طرف انگریزی، اور ہندوستانی لشکر ہے، دونوں طرف فوجوں کا پرا لگا ہوا ہے، نمک حرام وزیر ہاتھ جوڑے سلطان کے آگے ہے، لیکن آنکھوں کا اشارہ دشمنوں کی طرف ہے، بڑا دردناک نظارہ ہے،

اسی سفر میں مدراس کی سرکاری لائبریری میں ایک بڑا پُر درد مرقع میں نے دیکھا، لائبریری کے ایک ستون کے پاس ایک گول سطح پتھر پر یہ مرقع ہے جس میں نظر آتا ہے کہ ایک طرف کمپنی کے فاتح افسر کھڑے ہیں، دوسری طرف سلطان شہید ہے، اور صلح کی ضمانت میں شہزادوں کو اُن افسروں کے سپرد کر رہا ہے، اور پیچھے کچھ بیگمات کھڑی رو رہی ہیں، فاعتبروا یا اولی الابصار،

حیدر علی اور سلطان ٹیپو کی چند سالہ حکومت جس پریشان حالی، پراگندگی، اور افراتفری میں ختم ہوئی، اس سے یہ امید رکھنا کہ اُن کے نظامِ سلطنت، اصلاحات، اور رعایا پروری وغیرہ کے متعلق کوئی مفصل معلومات ملیں گے، بیکار ہے تاہم جہاں میدانِ جنگ میں اُن کی بہادری اور دلیری کے کارنامے ملتے ہیں، وہاں درباروں میں اُن کے لطف و احسان، بے تعصبی، اور رحم دلی و انصاف کے بکثرت واقعات بھی ملتے ہیں، عام طور سے مشہور ہے کہ یہ دونوں نہایت بے رحم، سفاک، سنگ دل، متعصب اور ہندوؤں کے دشمن تھے، لیکن ان زبانی روایتوں کی جو بار بار کی تکرار سے واقعہ بنتی جا رہی ہیں، کوئی اصلیت نہیں ہے، اور نہ تاریخی سند سے اُن کا کوئی تعلق ہے، لیکن اس زمانہ میں جب تاریخ کا معصوم ہاتھ پالٹیکس کا جہنمی آلہ بن

سکتا ہے، کوئی عجیب بات نہیں،

ہمارے ہم وطن ہندو دوست جو عالمگیر کے بعد ٹیپو کا نام لینے کے عادی ہیں، کبھی پولیٹیکل میدان سے نکل کر تاریخ و تحقیق کی راہ اختیار کریں گے، تو اُن کو خود اپنے پچھلے خیالات پر ہنسی آئے گی، حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ہندوؤں کا زبردستی ختنہ کرا کے مسلمان بنا لیتے تھے، لیکن پریچنگ آف اسلام کے مصنف مسٹر آرنلڈ بمبئی گزیٹیر جلد ۲۲ کے حوالہ سے ان بادشاہوں کے ہندوؤں کو زبردستی مسلمان کرنے کی تردید ان الفاظ میں کرتے ہیں:-

انہی حیدر علی اور ٹیپو سلطان نے جو ہمارے زمانہ سے بہت قریب گذرے ہیں اس بات میں شہرت حاصل کی کہ انھوں نے بہت سے ہندو خاندانوں اور ہندو رعایا کے بعض حصّوں کو زبردستی مسلمان کر لیا، حالانکہ ان کا مسلمان ہونا، ان بادشاہوں کے عہد سے پہلے کا واقعہ ہے، جس کے تاریخی حالات ہم تک مطلق نہیں پہونچے۔"

اس سفر مدراس میں اس واقعہ کی حقیقت ظاہر ہوئی، وہاں میرے دوستوں نے مجھ سے بیان کیا، کہ جنوبی ہند خصوصاً سواحل کی بے شمار ہندو قومیں عموماً برہنہ رہتی ہیں، اور کپڑا پہننا بے دینی سمجھتی ہیں، آج بھی اُن کا یہی عالم ہے، اور جا بجا اُن کے مرد عورت بچے عریانی کے طبعی لباس میں نظر آتے ہیں، سلطان شہید نے اُن کو زبردستی کپڑا پہننے کا حکم دیا تھا جس کی سختی سے تعمیل کی گئی ہو گی، اس کو انھوں نے جہل کی وجہ سے ظلم پر محمول کیا، اور سمجھا کہ اُن کو کپڑا پہنا کر مسلمان بنا لیا گیا ہے، حالانہ اس واقعہ کا اُن کے مسلمان بنا لینے سے سرے سے کوئی تعلق نہیں ہے، آج اُن قوموں کے جسم پر جو کپڑا نظر آ رہا ہے، وہ سلطان ٹیپو کے اسی حکم

کا فیض ہے،

یہ تاویل معقول ہو یا غیر معقول. لیکن اس میں شک نہیں کہ اگر بنظر انصاف دیکھا جائے، تو حیدر علی اور ٹیپو تعصب اور مذہبی عناد کا مجسمہ نہیں. بلکہ محبت آشتی. اور بے تعصبی کے فرشتے نظر آئیں گے، اُس کے متعلق اگر ہم خود کچھ کہیں گے، تو اُس کو مذہبی اور قومی طرفداری پر محمول کیا جائے گا، اس لئے بہتر ہے کہ ہم اس موقع پر ان جدید تاریخی اکتشافات کو پیش کر دیں جو ابھی بمبئی کرانیکل نے شائع کئے ہیں، اور اُن کو ہمارے الٰہ آباد کی معاصر لیڈر نے ۱۹ جنوری ۱۹۱۶ء کی اشاعت میں نقل کیا ہے،

"ٹیپو کی تصویر ہمارے سامنے اس طرح کھینچی گئی ہے کہ وہ ایک سخت مطلق العنان بادشاہ تھا جس کو کوئی اسے پوری طرح خوش نہیں کر سکتی تھی جس قدر ایک غیر مسلمان کا خون جس کا اگر بس چلتا تو ہندو مذہب کو جنوبی ہند سے معدوم کر دیتا لیکن اب ہم نے ایسی سندیں پائی ہیں کہ جن کا تعلق شرینگر مٹھ[له] سے ہے، جو ان باتوں کو بے قدر ٹھہراتی ہیں، جو پہلے مصنفین ہمارے طالب علموں کو اس موضوع سے متعلق سکھاتے رہے ہیں، یہ مراسلات جو شنکر اچاریہ کے جانشینوں کے مذہبی دفتر اور حیدر علی کے اور سلطان ٹیپو کے درمیان ہوئے ہیں، اس امر کے مستحق ہیں کہ اُن کو علٰحدہ چھاپا جائے، اور اُن کی توضیح کی جائے، ان مراسلات کی روشنی میں یہ ممکن ہو جاتا ہے. جیسا کہ ضروری ہی ہے، کہ ان تعلقات کا ایک صحیح

[له] ہندوستان سے بودھ مذہب کو ہٹا کر ویدک دھرم کو ہندوستان میں جس ہندو معلم اور مبلغ نے رواج دیا وہ شنکر اچاریہ تھے، ان کے نام سے ہندوستان کے چار گوشوں میں چار مٹھ قائم ہیں، سرینگر مٹھ جنوبی ہند میں ہندوؤں کا عظیم الشان مذہبی مرکز ہے،

شیشۂ تصویر میں فیصلہ کیا جائے، جو مسلمان بادشاہوں اور ان ہندو رہناؤں کے درمیان تھے جن کا زمانہ بہت زیادہ نہیں گذرا، ہم ان ہندو مذہبی مقدسین کے شکر گذار ہیں جنھوں نے ٹیپو کے ۳۰ خطوط کے جانچنے اور ترجمہ کرنے کی اجازت دی ہے، ان میں سے ہر خط اس قدر و عزت کی شہادت دیتا ہے، جو "مطلق العنان" بادشاہ کی نظر میں ان مذہبی ہندو رہناؤں کی تھی، بعض خطوط میں یہ مسلمان بادشاہ ہندو پروہت سے درخواست کرتا ہے کہ اس کی اور اس کی سلطنت کے لئے دعائے خیر کرے، اور اس کو برکت دے، یہ تحریری یادداشتیں ایک اور لحاظ سے بھی نہایت اہم ہیں، یہ نہ صرف اس بات کی مستحکم دلیل بیان کرتی ہیں، کہ ہندوستان میں ان دونوں مذہبوں کے پیروؤں کے باہمی تعلقات کم خوشگوار نہ تھے، بلکہ یہ بھی کہ ان دونوں کے درمیان صلح کی شکست غیر مذہبی اسباب سے ہوتی تھی، جو مذہبی سمجھوتوں پر سبقت لیجاتے تھے، واقعہ یہ ہے کہ اگر ایک ہندو کسی مسلمان سے متفق نہ تھا تو اسی بنا پر جس بنا پر وہ خود اپنے ہم مذہب سے مختلف تھا، اگر مرہٹوں نے مسجدوں کو نقصان پہنچایا، تو اس وجہ سے نہیں کہ وہ مسلمانوں کے مذہبی مقامات ہیں، بلکہ اس بنا پر کہ یہ وہ عمارتیں ہیں جن کو دشمن عزیز رکھتے ہیں، مرہٹوں نے ہندوؤں کے مندروں کو بھی اسی زور اور قوت کے ساتھ توڑا جو انھوں نے مسلمانوں کے مقدس مقامات کی بے حرمتی میں ظاہر کی، شری سنگر مٹھ کا سوامی ٹیپو سے مرہٹوں کے اس وحشیانہ پن اور سفاکی کی شکایت کرتا ہے، جو مٹھ کے لوٹنے میں انھوں نے دکھائی، اور بادشاہ سے دیوتا کی مورتی کی دوبارہ درستی کے لئے روپیہ اور سامان کی درخواست کرتا ہے، جس کو مرہٹوں نے توڑ دیا تھا، ٹیپو نہ تو اس درخواست کو ٹھکراتا ہے اور نہ کافروں کی مذہبی جنگ و جدال پر خوشی ظاہر کرتا ہے؛

ٹیپو اپنے شاہی جواب میں سنسکرت کا ایک ٹکڑا اقتباساً نقل کرتا ہے،

" وہ تبسّم اور ہنسی ہوتے ہیں، لیکن آنسو کاٹیں گے،

اور اپنے مسلمان عہدیداروں کو حکم دیتا ہے کہ وہ نقد اور غلہ ٹھاکر کی دوبارہ تعمیر اور مرمت

اور ان کے پوجا پاٹ کے لئے سامان کر دیں "

ہم نے اوپر کہا ہے کہ ہندو قوم جب جوان ہو گی تو مسلمان سلاطین کی نسبت اپنے طفلانہ خیالات پر اس کو خود ہنسی آئے گی، کیا اس کی جوانی کا وقت آپہنچا؟

(معارف، فروری ۱۹۱۸ء)

خلافت اور ہندوستان

خلافتِ راشدہ امویہ اور عباسیہ

آج کل مسئلہ خلافت نے ہندوستان میں جو اضطراب اور ہیجان پیدا کر رکھا ہے، کوتاہ بین سمجھتے ہیں کہ یہ صرف موجودہ زمانہ کی آزادی طلبی اور جنبش سیاسی کی ایک لہر ہے، اس مضمون میں یہ دکھانا ہے کہ خلافتِ اسلامیہ سے ہندوستان کا تعلق کس قدر پُرانا اور گہرا ہے، اور ہمیشہ سے اس کو آستانہ خلافت سے کس درجہ عقیدت مندی اور ارادت رہی ہے، اور سلاطینِ ہند خلفائے اسلام کو کسی عظمت دینی اور وقعتِ مذہبی کی نگاہ سے دیکھتے تھے،

خلافت راشدہ عرب اور ہندوستان کا تجارتی تعلق تاریخ کی عمر سے بھی زیادہ قدیم ہے، اسلام جب عرب کی سرزمین میں رونما ہوا، تو اس کے آس پاس کے دوسرے ملکوں کی طرح ہندوستان بھی غیر متأثر نہیں رہا، تحفۃ المجاہدین کی روایت کے مطابق سواحلِ ہند تک اسلام کی مصالحانہ دعوت خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں پہونچ چکی تھی، ملیبار کے راجہ نے مذہب اسلام کی تحقیق کے لئے عرب میں جو وفد بھیجا تھا، وہ خلافت اولیٰ یعنی حضرت ابوبکرؓ صدیق کے عہد خلافت میں مدینہ پہنچا تھا، اور وہاں سے پرتو اسلام سے منور ہو کر ملیبار واپس آگیا تھا، یہ روایت اگر صحیح ہو تو ہندوستان و خلافت کے باہمی تعلق کا یہ پہلا دن تھا،

سندھ کا علاقہ ایران کے زیر اثر ہونے کے باعث، ایران کے فتح ہونے کے بعد خود بخود مسلمانوں

کے زیر اثر آگیا، اس سے کہ سواحل مسلمان تاجروں اور مسافروں کے رہ گذر اور سیستان و بلوچستان کے علاقے مسلمان فوجوں کے معسکر تھے، بہرحال حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت سے ہندوستان اور خلافتِ اسلامیہ کے درمیان ایک ایسا مضبوط رشتہ قائم ہوگیا، جو آج تک بدستور باقی ہے،

عہدِ بنو امیہ | خلافتِ راشدہ کے بعد بنو امیہ جب خلافتِ اسلامیہ کے مالک ہوئے تو مسلمانانِ سندھ نے بھی دوسرے ملک کے مسلمانوں کی طرح اون کو خلیفہ تسلیم کیا، حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ اموی جب مسند آرائے خلافت ہوئے، تو انھوں نے یہاں کے رؤسار کے نام دعوتِ اسلام کے خطوط لکھے، چنانچہ اون کی ذاتی نیکی، زہد و اتقا، اور عدل و انصاف کو دیکھ کر بہت سے راجہ مسلمان ہوگئے، اور عربوں کے جیسے اپنے نام انھوں نے رکھنے شروع کئے[1]

آغازِ خلافتِ راشدہ سے لے کر خلفائے بنی امیہ کے اخیر عہد تک دربارِ خلافت کی طرف سے جو لوگ وقتاً فوقتاً نائب ہوکر، یہاں آتے رہے، اُن کے نام حسب ذیل ہیں،

شمار	نائبینِ خلافت	خلفار	سنہ
۱	حکیم بن جبلۃ العبدی	حضرت عثمانؓ	
۲	حارث بن مرہ عبدی	حضرت علیؓ	۳۹ھ
۳	مہلب بن ابی صفرہ	امیر معاویہؓ	۴۴ھ
۴	عبداللہ بن سوار العبدی	"	
۵	راشد بن عمرو الجدیدی الازدی	"	
۶	سنان بن سلمۃ الھذلی	"	
۷	زیاد المنذر بن جارود العبدی		

[1] بلاذری، فتح سندھ

سنہ	خلفاء	نائبین خلافت	شمار
	رر	عبید اللہ بن زیاد الباہلی	۸
		سعید بن اسلم الکلابی	۹
		مجاعہ بن سعر التمیمی	۱۰
		محمد بن ہارون النمری	۱۱
		عبید اللہ بن نبہان	۱۲
		محمد بن القاسم الثقفی	۱۳
	سلیمان بن عبدالملک	یزید بن ابی کبشہ السکسکی	۱۴
	رر	حبیب بن مہلب	۱۵
	حضرت عمر بن عبدالعزیز	عمرو بن مسلم الباہلی	۱۶
	ہشام بن عبدالملک	جنید بن عبدالرحمن المری	۱۷
		تمیم بن زید العتبی	۱۸
		حکم بن عوانہ کلبی	۱۹
		منصور کلبی،	۲۰

عہدِ خلافت عباسیہ اس کے بعد بنو عباس کا دور شروع ہوا، بنی امیہ کے اخیر عہد میں تمیم کی نیابت کمزور اور ضعیف ثابت ہوئی، اور مسلمانوں کو اس کے دور میں سخت تکلیفیں پہنچیں، محفوظ نام ایک شہر بسا کر اس میں محصور رہے، لیکن بنو عباس کے تخت نشین ہونے کے ساتھ مسلمانوں میں از سر نو قوت پیدا ہوئی، خلیفہ منصور عباسی نے مغلس عبدی کو یہاں نائب بنا کر بھیجا، اور اس نے خلیفہ کے نام سے سندھ میں منصورہ شہر آباد کرایا، اُس کے بعد اُس کے دوسرے نائب موسیٰ بن کعب تمیمی نے نئے سر سے

سے خلافتِ عباسیہ کی قوت کو یہاں نمایاں کیا، منصورہ کی مرمت کرائی، یہاں کی جامع مسجد کو وسیع کیا، خلیفہ مامون کے عہد میں بشر بن داؤد یہاں کا نائب مقرر ہو کر آیا، لیکن وہ یہاں آکر باغی ہو گیا، اس کی سرکوبی کے لئے غسان بن عباد دوسرا نائب بھیجا گیا، غسان کے بعد آل برمک میں سے موسیٰ بن یحییٰ یہاں نائب ہو کر آیا، یہاں اُس نے شہر بیضا آباد کیا، خلیفہ معتصم آخری طاقت ور عباسی خلیفہ ہے، اس کے عہد میں موسیٰ برمکی کا بیٹا عمران نائب مقرر ہوا، اس کے بعد خلفائے عباسیہ کے سیاسی ضعف نے ہندوستان کو سیاستہً مرکزِ خلافت سے الگ کر دیا، تاہم مذہبًا وہ ہمیشہ خلفائے عباسیہ کا مطیع و فرماں بردار رہا، اور انہی کے نام کے خطبے یہاں پڑھے جاتے تھے،

خلفائے عباسیہ کے عہد میں جو نائبینِ خلافت وقتاً فوقتاً یہاں آئے اُن کے نام بہ ترتیب یہ ہیں:-

شمار	نائبینِ خلافت	خلفاء
۲۱	مغلس عبدی	خلیفہ منصور
۲۲	موسیٰ بن کعب تمیمی	"
۲۳	ہشام بن عمر تغلبی	"
۲۴	عمرو بن حفص	
۲۵	داؤد بن یزید بن حاتم	
۲۶	بشر بن داؤد	خلیفہ مامون
۲۷	غسان بن عباد	"
۲۸	موسیٰ بن یحییٰ برمکی	"
۲۹	عمران بن موسیٰ برمکی	خلیفہ معتصم

خلیفہ معتصم کے بعد سیاسی حیثیت سے سندھ کی حیثیت ایک خودمختار ریاست کی ہوگئی، ملک کا بڑا علاقہ مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا تاہم وہ ملک کے چھوڑنے پر مجبور نہیں ہوئے، سندھیوں نے مسلمانوں کی مسجدوں کو ہاتھ نہیں لگایا، اور ان کی مذہبی آزادی کو برقرار رکھا، اور مذہباً وہ ہمیشہ خلفائے بغداد کے ماتحت رہے، چنانچہ وہ جمعہ کے خطبہ میں خلیفۂ وقت کا نام لیتے تھے، مورخ بلاذری جس نے ۲۷۹ھ میں وفات پائی ہے، فتوح البلدان میں شہادت دیتا ہے،

ثم ان اہل الهند غلبوا علی السندان	پھر اہل ہند اسندان پر غالب آگئے لیکن
فترکوا مسجدها للمسلمين	وہاں کی مسجد کو مسلمانوں کے لئے چھوڑ دیا،
يجمعون فيه ويدعون للخليفة	جس میں وہ جمعہ کی نماز پڑھتے ہیں اور
(فتوح السند)	خلیفہ کے لئے دعا کرتے ہیں،

اس کے بعد سندھ کی تاریخ پر ایک سیاہ پردہ پڑ جاتا ہے، صرف مسلمان سیاحوں کے متفرق بیانات سے اس پردہ میں کبھی کبھی کوئی روزن ہو جاتا ہے جس سے اندر کا ایک آدھ حال ہم کو معلوم ہو جاتا ہے، اس سے بہرحال یہ بات پایۂ وثوق کو پہونچتی ہے، کہ مسلمانوں کی جو کچھ آبادی

.. ..

.. .. یہاں رہ گئی تھی، وہ برابر کسی نہ کسی خلافت کے دامن سے اپنے کو وابستہ سمجھتی رہی، بعد کو یہاں کے مسلمانوں میں دو فرقے ہوگئے تھے، ایک اہلِ سنت اور دوسرے باطنیہ شیعہ، اہلِ سنت کا مرکز بدستور خلافت عباسیہ تھی لیکن باطنی شیعہ مصر کے فاطمی سلاطین کو اپنا خلیفہ جانتے تھے، بشاری مقدسی جو چوتھی صدی میں ہندوستان آیا تھا، منصورہ پایۂ تخت سندھ کے حال میں لکھتا ہے،

واما المنصورة فعليها سلطان	منصورہ میں ایک مستقل بادشاہ ہے جو

من قریش یخطبون للعباسی	نسلاً قریشی ہے، یہاں کے مسلمان خلیفہ
(صفحہ ۴۸۰ مطبوعہ یورپ)	عباسی کا خطبہ پڑھتے ہیں،

ملتان کے تذکرہ میں کہتا ہے،

واما بالملتان فیخطبون للفاطمی	لیکن ملتان میں خلیفہ فاطمی کے نام کا
ولا یحلون ولا یعقدون الا	خطبہ پڑھتے ہیں، اور اسی کے احکام
بامرہ وابدا رسلھم وھدایا ھم	کی تعمیل کرتے ہیں، یہاں کے مسلمانوں
تذھب الی مصر،	کے ایلچی اور تحائف ہمیشہ مصر جاتے
	رہتے ہیں،

جو مسلمان افغانستان کی راہ سے ہندوستان آئے، اُن میں سب سے پہلا نام سُلطان محمود غزنوی کا ہے، سُلطان کی سیاسی طاقت اور فوجی قوت کا یہ حال تھا کہ وسط ایشیا میں اس سے کوئی بڑی طاقت اور قوت موجود نہ تھی، بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ یہ اپنے زمانہ میں سب سے بڑا طاقت ور مسلمان حکمران تھا، اور فوجی و سیاسی حیثیت سے خلافت عباسیہ درحقیقت بزرگوں کی مقدس ہڈیوں کا ایک ڈھانچ رہ گئی تھی لیکن تم کو معلوم ہے کہ یہ دنیا کا طاقتور انسان اس ڈھانچ سے کتنا ڈرتا تھا، اور اپنی پوری جنگی قوت و طاقت کے باوجود وہ خلیفۂ عصر القادر باللہ کی اطاعت کو اپنے لئے کتنا ضروری سمجھتا تھا، ہر نئی کامیابی کا اطلاع نامہ دیوان خلافت میں معمولاً بھیجا جاتا تھا کسی نئے ملک پر قبضہ و تصرف کرنے کے لئے اوسی دربار سے باقاعدہ اجازت چاہتا تھا، دربار خلافت سے فتوحات کے موقع پر اُس کے لئے جو خلعت آتے تھے، اُس کی خوشی کسی نئے ملک کی فتح سے کم اس کو نہیں ہوتی تھی، اس کو دنیا کی بڑی سے بڑی عزت، بڑی سے بڑی عظمت اور بڑا سے بڑا فخر حاصل تھا، تاہم اس کی سب سے بڑی عزت، سب سے بڑی عظمت اور سب سے بڑا فخر یہ تھا،

کہ ایوانِ خلافت سے اس کو یمین الدولہ کا خطاب عطا ہو، سلطان نے گو ایران و ترکستان کے تمام ممالک اپنے زور بازو سے حاصل کئے تھے لیکن وہ اُس وقت تک ان ممالک کا جائز بادشاہ نہ ہوسکا جب تک ۴۱۵ھ میں خلیفہ نے اس کے لئے فرمان جاری نہ کیا، چنانچہ طبقاتِ اکبری اور تاریخ فرشتہ وغیرہ کی عبارت ہے،

"خلیفۃ القادر باللہ عباسی الثانی بہ سلطان محمود نوشتہ لوائے خراسان و ہندوستان و نیمروز و خوارزم فرستاد"

خود سلطان کا لقب جو محمود سے پہلے کسی دوسرے بادشاہ نے اختیار نہیں کیا تھا، اور سب سے پہلے محمود ہی کے لئے یہ بادشاہی کے استعمال میں آیا ، یہ بھی خلیفہ کی جانب سے اس کو عطا ہوا تھا، ہندوستان کے باطنی اسماعیلیوں کے استیصال پر خلیفہ نے اس کو کہف الدولہ والاسلام (سلطنت اور اسلام کی جائے پناہ) کا خطاب دیا،

۴۱۰ھ میں ہندوستان کی عظیم الشان فتح پر دربارِ خلافت میں اُس نے جو عریضہ بھیجا، اُس کی کیفیت سُنو،

"سلطان در ۴۱۰ھ فتح نامہ کہ مشتمل بود بر جمیع فتوحات کہ او در ممالکِ ہندوستان روے نمودہ بود، بہ بغداد فرستاد، خلیفۃ القادر باللہ عباسی آں روز مجلسے عظیم ساختہ فرمود تا آں فتح نامہ را بر رؤس منابر پیش خلائق بآواز بلند بخوانند و مردم بواسطہ اعلائے معالم اسلام شکرہا کردہ و زبان بستائش سلطان محمود کشادہ نصرت و ظفر او از حق سبحانہ تعالیٰ مسئلت نمودند آں روز در بغداد آنچناں سرور و خوشحالی انتشار یافت کہ گوئی یکے از عیدہائے مقررۂ اسلام است" (فرشتہ)

سلطان پر سب سے بڑی عنایت خلیفہ کی یہ تھی کہ اُس نے لکھا کہ تم جس کو اپنا ولی عہد بناؤ

میں بھی اس کو قبول کروں گا؛ اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ سلاطین کی جانشینی کا مسئلہ بھی خلفاؒ کے ہاتھ میں تھا،

سلطان محمود کے دو بیٹے تھے، امیر مسعود اور امیر محمد، سلطان امیر محمد کو چاہتا تھا،

"تا بحدے کہ از خلیفۂ عباسی التماس نمودکہ اسم امیر محمد را بر سلطان مسعود مقدم نویسد"[1]

لیکن ایسا نہ ہوسکا، سلطان محمود کے بعد امیر مسعود بادشاہ ہوا، اور امیر محمد نے بھائی سے شکست کھائی، امیر مسعود کو دربار خلافت سے جلال الدولہ جمال الملۃ کا خطاب پہلے ہی عطا ہوچکا تھا؛

تخت نشینی کے بعد خلیفہ قادر باللہ نے اس کے تقرر سلطنت کی منظوری کا فرمان اور خلعت بھیجا، سلطان اوس وقت نیشاپور میں تھا، اہل نیشاپور نے اپنے شہر کے لئے اس حسن اتفاق کو عزت اور فخر کا موجب جانا، تمام شہر آراستہ کیا گیا، اور فوجی جلوس کے ساتھ علماء و مشائخ کے حلقہ میں آکر قاصد نے فرمان پیش کیا، سلطان نے بے حد مسرت کا اظہار کیا، اور اہل دربار کو انعامات تقسیم کئے،

خلیفہ قادر باللہ کی وفات کے بعد جب قائم بامر اللہ خلیفہ ہوا، تو نئے خلیفہ کی طرف سے بیعت لینے کے لئے سلطان کے پاس دوسری دفعہ قاصد آیا، خلیفہ نے سلطان کو جن شرائط کے ساتھ سلطنت موجودہ پر بحال رکھا، اور سلطان نے جن الفاظ میں خلیفہ کی اطاعت و بندگی کا عہد کیا، وہ اصل خطوط تاریخوں میں اب تک محفوظ ہیں[2] اور پڑھنے کے قابل ہیں، ان میں خلیفہ نے سلطان کو عدل و انصاف کی تاکید کی ہے، اور سلطان نے لکھا ہے کہ اگر میں کسی حال میں ان شرائط سے تجاوز کروں تو مجھ پر خدا کا عذاب ہو، اور میری بیویاں مجھ پر حرام ہو جائیں،

---

[1] تاریخ آل سبکتگیں بیہقی ص ۵۱ - ۲۵۳ - مطبوعہ کلکتہ؛

غزنوی سلاطین کے بعد غوریوں کا دور آتا ہے، اس خاندان میں سے بھی اکثر سلاطین نے دربارِ خلافت سے خطابات حاصل کئے ہیں، جو تاریخوں میں مذکور ہیں،

افسوس ہے کہ ہمارے ہندوستانی مؤرخین نے اس قسم کے واقعات بہت کم قلمبند کئے ہیں، اور خود عرب مورخین نے یہ واقعات شاذ و نادر ہی لکھے ہیں، ۵۷۵ھ میں الناصر لدین اللہ خلیفہ تھا، (یہ زمانہ ہندوستان میں غوریوں کی حکومت کا تھا) اُس نے خبر رسانی اور جاسوسی کے محکمہ کو اس قدر وسعت دی تھی کہ دنیائے اسلام کا کوئی گوشہ اُس کے خبر رسانوں اور جاسوسوں سے خالی نہ تھا، مورخین نے اس کے عجیب و غریب حالات لکھے ہیں، منجملہ اس کے ایک ہندوستانی تاجر کا قصہ سننے کے لائق ہے، ہندوستان میں ایک تاجر کے پاس ایک طوطا تھا جس کو "قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَد" سکھایا گیا تھا، تاجر نے یہ نادر تحفہ دربارِ خلافت کے لئے مناسب سمجھا، چنانچہ وہ یہ تحفہ لے کر بغداد روانہ ہوا، اتفاق سے جب وہ بغداد پہنچا تو طوطا مر گیا، سخت حیران ہوا کہ طوطا کیا کیا جائے اسی اثنا میں ایک شخص نے فراش کے بھیس میں اس کے پاس پہنچا اور طوطے کو طلب کیا، تاجر رونے لگا، اور واقعہ بیان کیا، فراش نے کہا کہ ہم کو یہ معلوم ہو چکا تھا تم وہ مرا ہی طوطا دیدو، لیکن یہ بتاؤ کہ اس تحفہ کے انعام میں تم خلیفہ سے کتنی رقم کی اُمید رکھتے تھے، اُس نے کہا کہ مجھے ۵۰۰ اشرفیوں کی توقع تھی، فراش نے کہا "یہ ۵۰۰ اشرفیوں کا توڑا لو یہ خود خلیفہ نے تمھارے پاس بھیجا ہے، جب تم ہندوستان سے اس ارادہ سے نکلے تھے، تب ہی خلیفہ کو اس کی اطلاع مل چکی تھی"[1]

علامہ سیوطی خلیفہ الناصر کے حال میں لکھتے ہیں :-

کان الناصر قد ملاء القلوب	ناصر نے لوگوں کے دلوں کو اپنے خوف و دبدبہ

---

[1] تاریخ الخلفاء سیوطی،

هيبة دخيفة فكان يرهبه	ہیبت سے مرعوب کر دیا تھا، اس سے
اهل الهند ومصر كما كان	ہندوستان اور مصر کے لوگ ویسے ہی
يرهبه اهل بغداد فاحيٰ	ڈرتے تھے، جیسے بغداد والے، اس نے
هيبة الخلافة وكانت	خلافت کی اوس ہیبت وجلال کو
قد ماتت بموت المعتصم،	زندہ کیا، جو معتصم کے مرنے سے مرگیا تھا،

سلطان شہاب الدین غوری بڑے جاہ وجبروت کا بادشاہ تھا، لیکن اُس کے تاج فخر کا طُرّہ یہ ہے کہ وہ قسیم امیرالمومنین اور ناصر امیرالمومنین (امیرالمومنین کا مددگار) تھا، (طبقات ناصری ص ۱۱۴ و ۱۲۶) قطب مینار دہلی اور مسجد قطبی کے دروازہ پر سلطان کے نام کے جو کتبے ہیں ان میں سلطان کے یہ القاب پتھروں پر منقوش ہیں،

ہندوستان کے خودمختار سلاطین میں سلطان شمس الدین التمش کا نام پہلے آتا ہے جس نے باقاعدہ ہندوستان کی مملکت کو ایک مستقل سلطنت کے قالب میں ڈھال دیا، وہ ۶۰۷ھ میں تخت نشین ہوا تھا، ۶۲۶ھ میں خلیفہ نے اس کو خلعت بھیجا، اس کے یہ معنی تھے کہ ایوان خلافت نے ہندوستان کے استقلال اور خودمختاری کو تسلیم کر لیا، سلطان نہایت ادب و احترام کے شرائط بجالایا، اور اس کو اس خلعت سے اس قدر خوشی ہوئی کہ اس کے لئے تمام دارالسلطنت میں جشن منایا گیا، سلطان نے افسروں کو انعام دیا خلعت تقسیم کئے، صاحب طبقات اکبری کا بیان ہے (ص ۶۰)

" در ۶۱۶ھ رسولان عرب جامۂ خلافت جہت سلطان شمس الدین آوردند، سلطان آنچہ شرط اطاعت وادب بود، بجا آوردہ، جامۂ دار الخلافت پوشیدہ واز پوشیدن آں خلعت فرحت وبہجت بے نہایت در احوال سلطان محسوس می شد

سلطان اکثر امرا را خلعتہا داد .... و در شہر قبہا بستند و کوس شادیانہ زدند"

خلیفہ کا نام ہندوستان کے مورخوں نے نہیں لکھا ہے، مگر یہ زمانہ مستنصر باللہ کا تھا، شمس الدین التمش کا لقب بھی ناصر امیر المومنین (امیر المومنین کا مددگار) تھا، اور یہی لقب اس کے سکوں پر منقوش پایا جاتا ہے، اسی زمانہ میں الناصر لدین اللہ نے وفات پائی اور مستنصر باللہ نے مسند خلافت کو زینت بخشی سلطان شمس الدین التمش، سلطانہ رضیہ، سلطان ناصر الدین محمود اور سلطان علاء الدین محمد کے سکوں پر خلیفہ مستنصر باللہ کا نام سلطان کے پہلو بہ پہلو کندہ ہے بلکہ ان سلاطین کے بعض ایسے سکے بھی ہیں جن پر صرف خلیفہ کا نام منقوش ہے، رضیہ کے سکہ پر رضیہ کے بجائے یہ الفاظ کندہ ہیں "المستنصر امیر المومنین" مستنصر باللہ کے بعد آخری خلیفہ بغداد مستعصم باللہ جلوہ آرائے خلافت ہوا، سلطان علاء الدین ابو المظفر مسعود، سلطان ناصر الدین ابو المظفر محمود، سلطان غیاث الدین بلبن، سلطان معز الدین کیقباد، سلطان جلال الدین فیروز شاہ، سلطان رکن الدین کیکاؤس کے سکوں پر خلیفہ مستعصم باللہ کا نام کھدا ہوا ملتا ہے،

خلافت اور ہندوستان کا تعلق سب سے زیادہ محمد شاہ تغلق کے زمانہ حکومت میں نمایاں نظر آتا ہے، سلطان جس طرح اپنے اور کارناموں میں بے مثال اور عدیم النظیر معلوم ہوتا ہے اسی طرح اس مسئلہ خلافت میں بھی اس کا اعتقاد اور طرز عمل تمام سلاطین اسلام میں بے مثال ہے، سب جانتے ہیں کہ معتصم باللہ کے عہد میں تاتاریوں کے ہاتھوں بغداد کی خلافت عباسیہ کا پیراہن تار تار ہو گیا تھا، اس کے بعد مصر میں دوبارہ خلافت عباسیہ نے از سر نو ایک دوسری زندگی حاصل کی، چونکہ پہلے زمانہ میں آمد و رفت کے طریقے اس قدر آسان نہ تھے، اس لئے ایک ملک میں دوسرے ملک کی خبریں سالہا سال کے بعد پہونچتی تھیں، اس لئے خلافت بغداد

کی تباہی کے بعد ہندوستان میں کئی سال تک یہ معلوم نہ ہو سکا کہ مسلمانانِ عالم نے خلافت کا دوبارہ کیا نظام قائم کیا ہے، چنانچہ تاجروں اور مسافروں کی زبانی اس کی تفتیش ہوتی رہتی تھی، اس موقع پر ہم خود کچھ کہنا نہیں چاہتے، بلکہ ایک معاصر مورخ کے بیان کو لفظ بلفظ نقل کر دیتے ہیں۔ تاریخ فیروز شاہی کا مصنف ضیاء برنی لکھتا ہے:۔

درخاطر افتاد کہ سلطنت و امارت
سلاطین بے امداد ن خلیفہ کہ از آلِ
عباس بود، درست نیست، و ہر بادشاہے
کہ بے منشاے خلفاے عباسی بادشاہی
کردہ است و یا بادشاہی کند متغلب
بودہ است و متغلب بود؛ و از خلفاء
عباسی سلطان بسیا تتبع می کرد
تا از بسیار مسافران شنید کہ خلیفہ
از آلِ عباس در مصر بر خلافت
متمکن است، و سلطان محمد با اعوان
و انصار دولتِ خود بآں خلیفہ کہ در
مصر است بیعت کردہ، و در سر
کدو داری عرض داشت بجانب
خلیفہ سوار می کرد و از ہر بابت چیزہا
دراں می نوشت و چون در شہر آمد

سلطان کے دل میں آیا کہ خلیفہ عباسی
کی اجازت کے بغیر سلطنت و حکومت
جائز نہیں، جن بادشاہوں نے خلفائے
عباسی کے فرمان کے بغیر حکومت کی ہے
یا آئندہ کریں، وہ غاصب تھے، اور
غاصب ہوں گے، سلطان خلیفۂ عباسی
کے حالات دریافت کرتا رہتا تھا،
یہاں تک کہ بہت سے مسافروں
سے، اس نے سنا کہ خلیفۂ عباسی مصر
میں متمکن ہے، سلطان نے یہ سن کر
خود مع تمام ارکانِ دولت کے خلیفۂ
مصر کی بیعت کی، اور ایک مدت کے
ساتھ خلیفہ کی خدمت میں عرض داشت
بھیجا کرتا تھا، اور اس میں تمام باتیں
لکھا کرتا تھا، جب دار السلطنت میں

نماز جمعہ و نماز اعیاد را در توقف داشت
و از سکہ نام خود در کنانید و فرمود
تا در سکہ نام و لقب خلیفہ نویسند و
در اعتقاد خلافت آل عباس مبالغہا
کرد، کہ در تحریر و تقریر نتواں گنجانید
(ص ۴۹۲)

پہنچا تو جمعہ اور عیدین کی نماز (خلیفہ
کے جواب آنے تک) بند کرا دی،
اور سکہ سے اپنا نام مٹا کر خلیفہ کا نام
اور لقب کندہ کرایا، سلطان کو
خلفائے عباسیہ کی خلافت کے
ساتھ اس قدر عقیدت تھی کہ تقریر
و تحریر میں وہ نہیں سما سکتی،

۷۴۴ھ میں حاجی سعید صرصری کی سرکردگی میں مصر کے دربارِ خلافت سے سلطان کے لئے خلعت اور لوائے سلطنت اور فرمان آیا، سلطان نے تمام ارکانِ دولت، علما، سادات اور مشائخ کے ساتھ شہر سے باہر نکل کر استقبال کیا، سواری سے اتر کر فرمان و خلعت کو سر پر رکھا، قاصدِ خلافت کے پاؤں کو بوسہ دیا، تمام شہر میں جشن منایا گیا، جمعہ و عیدین کی نمازیں شروع ہوئیں، اس کے بعد سلطان اور خلیفہ کے ما بین نامہ و پیام اور تحفہ تحائف برابر جاری رہے، ابن بطوطہ مغربی جو اسی زمانہ میں ہندوستان آیا تھا، وہ بھی شہادت دیتا ہے کہ سلطان کو خلیفۂ وقت کے ساتھ حد درجہ عقیدت تھی، اور بہت سے واقعات اور وفد خلافت کے حالات لکھے ہیں، منجملہ اون کے ایک واقعہ یہ ہے جس سے معلوم ہوگا کہ سلطان کو خاندانِ خلافت سے کس درجہ عقیدت تھی، اور اس سے عام ہندوستانی مسلمانوں کی عقیدتمندی کا اندازہ لگایا جائے، خلیفہ مستنصر باللہ کے سلسلہ کا ایک عباسی خلیفہ زادہ جس کا نام غیاث الدین تھا کسی سبب سے بغداد سے ترکستان چلا آیا تھا، اور وہاں حضرت قثم بن عباس رضی اللہ عنہما کے مزار پر سالہا سال مجاور رہا، جب سلطان کی عقیدت مندی کا آوازہ پھیلا، تو غیاث الدین نے

ترکستان سے اپنے دو سفیر سلطان کے پاس بھیجے، بغداد کے جو لوگ ہندوستان میں مقیم تھے انہوں نے خلیفہ زادہ کی صحیح النسبی کی شہادت دی، سلطان نے عریضہ بھیجا، اور بڑی منت سے خلیفہ زادہ کو ہندوستان آنے کی دعوت دی، جب خلیفہ زادہ ہندوستان کی سرحد پر پہنچا تو وہاں کے امرار کو استقبال کے لئے بھیجا، جب سرستی تک سواری پہونچی تو قاضی القضاۃ صدر جہاں کمال الدین غزنوی اور دوسرے علما استقبال کے لئے آئے، اور جب دلی کے قریب مسعود آباد میں موکب ہمایوں پہنچا، تو خود سلطان اکابر دربار کو ساتھ لے کر استقبال کے لئے نکلا، اور ایک معمولی آدمی کی طرح پیدل چل کر، خلیفہ زادہ کی رکاب تھامی، اور عرض کیا کہ "اگر میں خلیفہ ابوالعباس ... ... کی بیعت نہ کر چکا ہوتا تو آپ کی بیعت کر لیتا" خلیفہ زادہ نے جواب دیا کہ "میں بھی اُن ہی کی بیعت پر ہوں" غرض بڑے تزک و احتشام کے ساتھ یہ سواری دلی پہنچی اور ایک ایوانِ شاہی قیام و سکونت کے لئے خاص کیا گیا، اور "مخدوم زادہ" خطاب دیا گیا، جب خلیفہ زادہ دربار میں آتا تو سلطان تخت شاہی سے اٹھ کر تعظیم دیتا اور اپنے برابر تخت پر بٹھاتا، اسی اثنا میں یہ واقعہ پیش آیا کہ غزنی کا ایک امیر جس سے مخدوم زادہ کا دل صاف نہ تھا، دلی آیا، سلطان نے اُس کے رہنے کے لئے جو مکان متعین کیا، وہ مخدوم زادہ کے قبضہ میں تھا، مخدوم زادہ نے اس کو اپنی توہین سمجھا، اور فوراً وزیر سے آکر کہا کہ "سلطان سے کہہ دو کہ اس کے تمام ہدایا اور نذرانے میرے پاس بدستور رکھے ہیں، وہ واپس منگوا لے"، اتنا کہا، اور آزردگی، اور کبیدہ خاطری کے ساتھ دربار سے اٹھ کر چلا آیا، سلطان نے جب یہ سُنا تو اُس کے ہاتھ کے طوطے اُڑ گئے، دوڑا ہوا مخدوم زادہ کی اقامت گاہ پر آیا، اور عام آدمیوں کی طرح اجازت لے کر سواری سے اُتر کر پیادہ اندر داخل ہوا، اپنے قصور کی معافی چاہی، مخدوم زادہ نے معاف کر دیا، لیکن سلطان کے اس جوشِ عقیدت کو دیکھو، عرض کرتا ہے، اے گوہرِ کانِ خلافت! مجھے اس وقت تک اپنی

برأت کا یقین نہ آئے گا جب تک پائے مبارک میری اس حقیر گردن پر نہ ہو، خلیفہ زادہ نے کہا مجھ سے تو یہ نہیں ہو سکتا" لیکن سلطان کسی طرح راضی نہ ہوا، اور زبردستی اپنا سر زمین پڑ ال دیا، آخر ایک امیر نے خلیفہ زادہ کے پیر کو اٹھا کر آہستہ سے سلطان کی گردن پر رکھ کر اٹھا لیا، سلطان نے کہا کہ اب مجھے حضور کی خوشنودی اور رضامندی کا یقین آیا، ابن بطوطہ اس واقعہ کو لکھ کر کہتا ہے کہ یہ ایسا عجیب و غریب واقعہ ہے جو کسی بادشاہ کے متعلق سننے میں نہیں آیا۔"

بادشاہوں کے مذاق کا اندازہ دربار کے شعراء کی زبان سے ہوتا ہے مشہور شاعر بدر چاچ سلطان کے دربار کا شاعر تھا، اس کے قصائد کا دیوان ہر جگہ ملتا ہے تم اس کا کوئی صفحہ کھولو، سلطان وقت کی مدح کے ساتھ ساتھ خلیفۂ وقت کی تعریف و ستایش تو ہم پاؤ گے، شاید خشک تاریخی واقعات سنتے سنتے طبیعت گھبرا اٹھی ہو بدر چاچ کے یہ چند اشعار کچھ دیر کیلئے مجلس کا رنگ بدل دیں گے شروع سے چلو؛

او شہنشاہ شریعت بود و منشورش کتاب (آنحضرت صلعم) (قرآن)	این زماں قائم مقام او امام اکبر است (بحنیفہ)
شاہ ابن احمد ابوالعباس امیرالمومنین	آنکہ آل دودۂ عباس را سر دفتر است
آفتاب شرع و ملت آسمان ملک و دیں	انکہ بر تخت خلافت را جمالش زیور است
آنکہ از جان بیعت فرمان او بر دل نوشت	بادشاہ شرق و غرب و عالم بحر و بر است
بوالمجاہد ظل حق سلطان محمد کز جلال	دود شمع بزم او شمع روان اختر است
مولی امیر المومنیں سلطان محمد شاہ دیں	ہم بر و آب آتیں ہم فر و دار ریختہ
چون از خلیفہ شاہ را منشور آمد با لوا	شد باز نور والضحی بر فرق طرہ ریختہ
شاہ محمد آں ولی عہد خلیفۂ زماں	کو چو امام چار میں (حضرت علی) شہر علوم را درست

جب سلطان کے نام خلیفہ نے مصر سے فرمان سلطنت اور خلعت بھیجا، تو شاعر نے اس تقریب میں حسب ذیل قصیدہ دربار میں پیش کیا،

جبرئیل از طاق گردوں آبشرُوا گویاں رسید — کز خلیفہ سوے سلطاں خلعت و فرماں رسید

شاہ را بر کل عالم حکم مطلق داد: امام — ایں خبر در ہفت کشور بر ہمہ شاہاں رسید

جاہ حاسد را چو چاہ یوسفی بے آب کرد — خلعت مصری کہ از کنعان تا ہندستاں رسید

ملک را بازو قوی شد، دیں سرفرازی نمود — شرع را حرمت فزوں شد و رونق ایماں رسید

راست عید مومناں آمد کہ در سالے دو مہ — از امیر المومنیں خلعت بروے سلطاں رسید

ہم بتاریخ ماہ از سال ہفصد شد فزوں — زیں سفر ماہ محرم سابق شعباں رسید

یعنی محرم ۷۴۲ھ میں سابق شعبان یعنی رجب پہنچا، رجب قاصد کا نام تھا،

در دار اسلامی کہ در سر داشت شاہنشاہ عصر — از ولی المسلمیں ایں در روا درماں رسید

آسمان تا خلعت عباسیاں (سیاہ) در بر کشید — شاہ مشرق (سلطان) را چو مہ یک نوبت ہلال رسید

سلطان نے سفرائے خلافت کی پیشوائی کس طرح کی اس کا حال سنو،

باستقبال فرمانے کہ از پیش امام آمد — برہنہ پا و سر کردہ چو ایماں شد ز اسلامش

خلائق پیش و پس پویاں ملائک گرد حق گویاں — ز جزع شہ شدہ غلطاں گہر (اشک) بر نقرہ (رخسارہ) خامش

گدا از شکر و ثنا و حق شکر می ریخت یاقوتش (لب) — گہے بر لعل می بارید مروارید، بادامش (چشم) (قطرہائے اشک)

چو شہ پوشید خلعت را بہ رنگ مردم دیدہ (سیاہ) — میان روز می دیدیم شب را با مہ تامش

ز آئینہا کہ شد بستہ ندیدم یکسر موے — سر ہر قبہ را فرقے ز ہفتم طاق تا بامش

امیر المومنین فرمود تا ہر جمعہ بر منبر — بہفت اقلیم می خوانند شاہنشاہ اسلامش

ایک اور قصیدہ میں کہتا ہے۔

دوش آں زماں کہ خسرو زریں قبای خور (آفتاب) — در می کشید خلعت عباسیاں (سیاہ) ببر

یعنی رسید خلعت و فرمان سلطنت — از حضرت خلیفہ بدار الے بجر د بہ

والی عصر احمد عباس، امام حق، / دارائے دہر، وارث پیغمبر بشر
این جشن شادیست که از حضرت امام / آورده اند خلعت و فرمان معتبر
مضمونش آنکه در کنف حفظ شاد باد / بر روے خاک آبی و بادی خشک و تر
اقلیم ترک و روم و خراسان چین و شام / مامور امر شاه بد و نیک و خیر و شر
القاب شه که بر سر منبر برد خطیب / سلطان شرق و غرب شہنشاه بحر و بر
خلعت برنگ مردمک چشم داد امام / تا نور شرع در دل مردم کند اثر
سیاه

جشن خلعت کی تقریب میں لکھا ہے،

بلے جہاں خرم آباد آنجہان شاہیست / که او متابع امر خلیفهٔ دنیاست
ابو الربیع سلیمان، خلیفهٔ برحق / که آستان درش آسمان عز و علاست
امام امت احمد که خسرو هندش (سلطان) / بجان غلام و بتن چاکر و بدل مولاست

اس اخیر شعر کو پھر پڑھو، سلطان ہند خلیفہ برحق کے ادنیٰ غلام و چاکر ہونے پر فخر کرتا ہے،

بتن متابع شرع محمد مرسل / بدل متابع امر خلیفهٔ دنیا
ابو الربیع سلیمان عہد مستکفی / مدار شرع نبی شمع دودهٔ خلفا
امام حق که شد او را محمد تغلق / بدل غلام و بتن چاکر و بجان مولا
آن بندهٔ خلیفه در پیش تخت بخت / نائب ہزار خاقان حاجب ہزار قیصر
شاه محمد لقب حیدر احمد نسب / زان با امام زمان بیعت او استوار
حاکم روے زمین سلطان محمد شاه دین / اے امامت برہمه آفاق والی ساخته
کبریاے بخت تو نه طارم شش روزه را / گوشهٔ دهلیز دار الملک والی ساخته

غرض تمام قصائد اسی قسم کے اعترافات اور خلافت کی عقیدت مندی سے معمور ہیں، سلطان نے خرم آباد کے نام سے ایک قلعہ مع مسجد تعمیر کرایا تھا، اس پر جو کتبے لگائے گئے تھے، اُن میں ایک خلیفہ کے نام کا تھا،

می کند از کتابہائے درت نظم مدح خلیفہ را تکرار
آں امام بحق کہ کردش بطوع شاہ عالم بہ بندگیش قرار

سلطان محمد تغلق کو مسئلہ خلافت سے جو عقیدت خاص تھی، اس کا اثر یہ ہے کہ اس چھوٹے سے مضمون میں بھی اوس کے بیان کی وسعت اتنی پھیل گئی، بہرحال اس تمام داستان کو سمیٹ کر اُن کے ترتیبی نتائج پر نگاہ ڈالو،

۱- ادنیٰ مسلمانوں کو چھوڑ کر سلاطین تک خلافت کے باب میں کیا اعتقاد رکھتے تھے،

۲- ہر مسلمان بادشاہ جو اطرافِ عالم میں کہیں حکمران ہو اُس کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ خلیفۂ وقت کا مطیع و فرماں بردار ہو، بلکہ اصلی حکومت درحقیقت خلیفۂ عصر کی ہوتی ہے اور دیگر سلاطینِ زمانہ اُس کے نائب اور قائم مقام کی حیثیت رکھتے ہیں،

۳- جب تک خلافت و بیعتِ امام نہ ہو جمعہ و عیدین تک روا نہیں،

اس سے معلوم ہوگا کہ آج کل علما نے جو فتوے دیئے ہیں، وہ محض سیاسی نہیں بلکہ اُن کی مذہبی حیثیت ہے، اور یہ خود سر و مجنوں و گستاخ مسلمان آج سے پہلے بھی ہندوستان کی سرزمین میں موجود تھے،

اسی زمانہ میں ایک اور مسلمان سپاہی سرزمین دکن میں ایک نئی قوت کی تعمیر میں مصروف تھا، اس نئی قوت کا نام سلطنتِ بہمنیہ تھا، علاء الدین حسن کی سعی و کوشش سے آخر کار بہمنی سلطنت دکن میں قائم ہوگئی لیکن تم کو معلوم ہے کہ اس عظیم الشان سلطنت کے مراسم تاجپوشی

کیونکر انجام پائے،

"درمسجد بادشاہ قطب الدین صبح روز جمعہ ۲ ربیع الثانی ۷۴۸ھ تاج شاہی بر سرتارک او گذاشتند و چتر سیاہ کہ نشان خلفائے عباسی بود تیمناً و تبرکاً بر سرش گرفتند"

(فرشتہ جلد اول ص ۲۷۷)

دلی میں محمد تغلق کی وفات کے بعد فیروز شاہ تخت نشین ہوا، اور اوپر سُن چکے کہ اس وقت دکن میں بہمنی سلطنت قوت پکڑ رہی تھی، اور اس لئے دلی اور دکن میں رقابت پیدا ہوگئی تھی، خلیفہ نے سلطان کو ہندوستان کی حکومت کا فرمان اور خلعت بھیجا، اور لکھا کہ سلاطین بہمنیہ کے ساتھ رفق و مدارات کا برتاؤ کرے، فرشتہ کی عبارت ہے،

"در ماہ ذیحجہ سنہ مذکور (۷۵۹ھ) خلعت و منشور خلیفۂ عباسی مصر الحاکم[۱] بامر اللہ ابوالفتح بن ابی ربیع سلیمان متضمن تفویض ممالک ہندوستان و سفارش بادشاہان بہمنیہ دکن آمد" (ج ۱ ص ۲۶۴)

سنہ ۷۶۰ھ میں علاء الدین حسن نے وفات پائی، اور اس کا بیٹا سلطان محمد تخت نشین ہوا، اس کے لئے خلیفہ معتضد باللہ عباسی نے غالباً ۷۶۱ھ یا ۷۶۲ھ میں خلعت اور بہمنیہ کے خطبہ و سکہ کی منظوری کا فرمان بھیجا، سلطان خلعت کو سر پر رکھ کر تیامگاہ تک لایا، اور شادیانے بجوائے، گویا یہ بہمنیہ خاندان کی فرمان روائی اور دکن کی خود مختاری کا دربارِ خلافت کی طرف سے اعلان تھا، ظاہر ہے کہ اس اعلان سے فیروز شاہ کے اقتدار شاہی میں کس قدر تزلزل آگیا ہوگا، اس لئے

---

[۱] فرشتہ نے حاکم بامر اللہ ابوالفتح بن ابی ربیع سلیمان نام غلط در غلط لکھا ہے ۷۵۹ھ میں معتضد باللہ ابوالفتح ابوبکر بن ابی الربیع سلیمان خلیفہ تھا، حاکم بامر اللہ ابوالعباس احمد بن ابی الربیع سلیمان تھا جس نے ۷۵۳ھ میں وفات پائی،

ضرورت تھی کہ دربارِ خلافت کی طرف سے ہندوستان خاص کی بادشاہی کا خاندانِ تغلق سے متعلق ہونا ظاہر کر دیا جائے، چنانچہ اس کے بعد ہی خلیفہ نے فیروز شاہ کے لئے دوسرا فرمان اور خلعت بھیجا، اس کا اثر یہ ہوا کہ فیروز شاہ کی سلطنت میں سکون اور قرار پیدا ہو گیا، چنانچہ خود اس کے دربار کا مورخ ضیاے برنی لکھتا ہے،[1]

" مقدمہ نہم در بیان آنکہ از حضرت امیر المومنین خلیفۂ عباسی دو کرت خلعت اولی الامری و منشور اذن ولوار بادشاہی بر سلطان عصر و زمان فیروز شاہ السلطان رسید و بادشاہی وا اولوالامری خداوند عالم بدان استحکام گرفتہ

در مدت شش سال... دو کرت از امیر المومنین خلیفہ عباسی منشور اولوالامری و خلعت بادشاہی ولواے سلطنت بدو رسید و حق جل وعلیٰ بادشاہ دین پرور و دین پناہ ارا در عزت واشت منشور و خلعت و فرستادگان امیر المومنین توفیق بخشید و شرائط حرمت مراحم امیر المومنین بانحاً ابلغ بجا آورد و ہم چنیں وانست کہ منشور و خلعت امیر المومنین از آسمان منزل شدہ است واز درگاہ مصطفیٰ صلعم رسیدہ، عرضداشتے با تحفہ ہدایا در نہایت تواضع، بندگی امیر المومنین روان کرد"

اس فرمان و خلعت کے آنے کا اثر کیا ہوا اُس کو سُنو،

از میامن مناشیر و برکات خلعتہاء خلیفہ عباسی جمعات وا عیاد عامۂ اہل اسلام تزاید پذیرفت واز تاثیرات اذن و اجازت عم زادۂ مصطفےٰ صلعم فیض آسمانی دریں دیار متواتر منزل می گردد، و ابواب بلا ہائے آسمانی از قحط و دبا مسدود گشتہ است واز حسن اعتقاد دین پروری و دین پناہی بادشاہ اسلام شر طغاۃ از ممالک وکلی

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۵۹۰، کلکتہ۔

دفع شدہ است ودلہاے خواص وعوام اہالی مملکت باطاعت وانقیاد واخلاص ودولتخواہی

درگاہ گرد آمید وامن وامان تمام پیدا شد وتشتت وتفرق وتردد وترس از باطنہا رفتہ

تم نے اس اثر کو دیکھا صرف ایک کاغذ کی چند سطروں نے پورے ملک کے ہیجان میں سکون پیدا کر دیا، بادشاہ کا مذہبی وقار اس کی مسلمان رعایا کے دلوں میں پیدا ہو گیا، لوگوں میں مذہبی سرگرمی آگئی، باغیوں کی سازشوں کا جال دفعۃً ٹوٹ گیا،

علامہ سیوطی تاریخ الخلفاء میں لکھتے ہیں کہ خلیفہ المستعین باللہ عباسی کے عہد خلافت میں ۸۱۳ھ میں غیاث الدین اعظم شاہ بن سکندر شاہ بادشاہ ہندوستان نے خلیفہ کے پاس قاصد بھیجا، اور فرمان حکومت کی درخواست کی، اس نام کا بادشاہ نہ دلی میں نظر آتا ہے، اور نہ دکن و بنگالہ[1] میں، یہ وہ زمانہ ہے جب تیمور کے حملوں سے ہندوستان چور چور تھا، اور ملک میں کوئی باقاعدہ حکومت قائم نہیں تھی ممکن ہے کسی امیر نے اس موقع سے خلیفہ کا فرمان حاصل کر کے فائدہ اٹھانا چاہا ہو،

۸۳۹ھ میں سلطان محمود خلجی نے مالوہ میں اپنی ایک مستقل حکومت قائم کی، اور اجین کے قریب منڈو کو اپنا دار السلطنت قرار دیا اور چونتیس[۳۴] سال نہایت عدل و انصاف اور شہرت و نیک نامی کے ساتھ حکومت کر کے ۸۷۳ھ میں وفات پائی، سلطان کی فتوحات اور کارناموں نے گو بڑی وسعت حاصل کی تاہم ابھی شاہانہ اعزاز و احترام کے سب سے بڑے رتبہ سے وہ محروم تھا یعنی دربار خلافت سے اوس کو استقلال و خود مختاری کا فرمان نہیں ملا تھا، ۸۶۰ھ میں آخر وہ دن بھی آگیا' مستنجد باللہ خلیفہ' عباسی نے مصر سے شرف الملک حاجب کے ساتھ خلعت شاہانہ اور فرمان سلطنت

---

[1] بنگالہ میں سلطان غیاث الدین بن سکندر شاہ ایک بادشاہ گذرا ہے، مگر اس کا زمانۂ وفات ۷۷۵ھ ہے، اس لئے سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کون بادشاہ تھا، میں نے کسی امیر کا شبہہ ظاہر کیا ہے، مگر اس کے لئے کوئی سند میرے ہاتھ میں نہیں،

کے لئے بھیجا، سلطان نے مع اہلِ دربار کے اس کا استقبال کیا، اور خلعت پہنا، اور منبروں پر سلطان کے نام کے ساتھ خلیفہ کا نام بھی خطبہ میں پڑھا گیا،

اس واقعہ کے چند روز کے بعد سلطان نے خواب دیکھا کہ ایک بہت بڑا جلوس ہے، اور میں بھی یہی خلعت پہنے ایک گھوڑے پر سوار اس جلوس میں شریک ہوں، حاجب نے کہا کہ گھوڑے سے اُتر جائیے، اُتر گیا، آگے بڑھا تو ایک ابلق رنگ گھوڑا آسمان سے نیچے اُترا، حاجب نے مجھ کو اُس پر سوار کیا، اور اب دیکھتا ہوں کہ دلّی کے دروازے پر ہوں، ایک عرب نے آگے بڑھ کر کہا کہ آپ اندر تشریف لیجائیے، اندر جاکر دیکھا تو دربار لگا تھا تخت پر کچھ عرب سیاہ کپڑے پہنے بیٹھے تھے، جن کا رنگ میرے خلعت ہی کے رنگ کا تھا، اوسی عرب نے مجھ سے کہا کہ یہ خلفائے عباسیہ ہیں، یہ منصور ہیں، یہ رشید ہیں، میں نے سلام کیا، انھوں نے دریافت کیا کہ یہ کون ہے، عرب نے کہا یہ ہمارا دوست محمود شاہ[۱] ہے،

یہ خواب ایک معمولی واقعہ ہے لیکن اس کے نقل کردینے سے مقصود یہ ہے کہ اس سے معلوم ہوگا کہ سلاطینِ ہند کے دل ودماغ اور نفسیات پر خلفائے اسلام کا کس درجہ اثر تھا، اور اُن کو خلافتِ اسلامیہ سے کس درجہ عقیدت تھی،

چند صفحے پہلے ہندوستان کے قدیم مورخوں کی کوتاہ قلمی کی شکایت قلم سے نکل چکی ہے کہ وہ تاریخوں میں اپنے اپنے عہد کے اس قسم کے واقعات کو عام اور معمولی سمجھ کر قلم انداز کرتے آئے ہیں، انھیں یہ گمان نہ تھا کہ مسلمانوں پر ایک زمانہ آئے گا جب یہی عام اور معمولی واقعات محتاجِ ثبوت وتصدیق ہوجائیں گے، لیکن ایک عیسائی مورخ ایڈورڈ ٹامس Edward Thomas کی کوششیں ہم مسلمانوں کے شکریہ کی مستحق ہیں، جس نے بہت حد تک ہمارے بزرگوں کے ادھورے کارناموں کو پورا کردیا ہے۔ ایڈورڈ ٹامس آج سے پچاس برس پہلے انگلستان میں

---

[۱] یہ پورا واقعہ تاریخ گجرات ظفر الوالہ میں ہے صفحہ ۲۱۴، مطبوعہ لندن،

ایک مشہور مستشرق گذرا ہے، اس نے ۱۸۸۱ء میں سلاطین ہند کی تاریخ اُن کے عہد کے سکوں کے نقوش اور کتبات سے مرتب کی ہے، اس نے سلاطین اور بادشاہوں کے سکے فراہم کئے ہیں ان کے کتبے پڑھے ہیں، اور ان پر پوری بحث کی ہے، میں نے پہلے اس کتاب کے ایک ایک کتبہ کو پڑھا اور پھر ان تمام کتبوں کو عہد بعہد کی ترتیب سے یکجا اکٹھا کیا، ان کتبوں کو پڑھ کر سخت حیرت ہوئی کہ جو باتیں تاریخ کے کرم خوردہ اوراق میں بہت کم ملتی ہیں، وہ ان سونے چاندی کے پتروں میں کس بہتات کے ساتھ موجود ہیں

(۱) ان میں سے ہر سکہ اور ہر کتبہ پر ہندوستان کے سلطان وقت کے نام کے ساتھ بالکل برابر خلیفۂ وقت کا نام بھی ثبت ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ سلطان محمد تغلق کی طرح ہندوستان کے تمام سلاطین عملاً یا اعتقاداً رکھتے تھے کہ وہ مستقل بادشاہ نہیں ہیں، بلکہ ان کی حیثیت اپنی مملکت میں خلیفہ کے ایک نائب اور قائم مقام کی ہے، چنانچہ آپ خود سکوں میں اس کی تصریح پائیں گے، دیکھو نمبر (۱ – ۲ – ۴ – ۸ – ۷)

۲ - یہ دیکھ کر اور حیرت ہوتی ہے کہ نہ صرف سلاطین دہلی خلفا سے عقیدت رکھتے تھے، بلکہ اطرافِ ہند میں دہلی کی مرکزی سلطنت سے ہٹ کر جو حکمراں بھی اپنی مستقل اور خود مختار حکومتیں قائم کرتے تھے، وہ بھی ہزاروں کوس دور پڑے ہوئے خلیفہ کی اطاعت سے باہر نہیں ہوتے تھے، چنانچہ سلاطین گجرات، مالوہ، اور مشرق و بنگالہ کے سکوں سے آپ کو اس کا اندازہ ہوگا،

۳ - ایک اور لطیف تر بات یہ ہے کہ ان میں سے بہت سے سکوں پر سلاطینِ وقت کے بجائے صرف خلفائے عصر کے نام ہیں، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان سلاطین کی نیت یہ تھی کہ وہ خلفا کے مقابلہ میں اپنے کو مجازی بادشاہ بھی کہلانا پسند نہیں کرتے تھے،

۴۔ یہ ایک عجیب بات یہ ہے کہ بعض سکوں پر سنسکرت خط میں "سری ہمیرا" اور "سری خلیفہ" اور "سری تلیفہ" منقوش ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نا مسلمان رعایائے ہند تک کو یہ سمجھانا منظور تھا کہ ملک کا اصل حکمران خلیفہ ہے، انگریز محقق کہتے ہیں کہ "ہمیرا" امیرالمومنین کی اور "تلیفہ" خلیفہ کی خرابی ہے،

(۵) ان سکوں میں ایک اور بات آپ پائیں گے جب کسی خلیفہ کا متعین نام و لقب نہیں معلوم ہوا ہے تو صرف مطلق خلیفہ یا امیرالمومنین کا لفظ لکھ دیا ہے، اور اگر کوئی ایسا زمانہ آیا ہو کہ کوئی خلافت قائم نہیں ہوئی، تو خلفائے اربعہ کے نام لکھدیئے گئے ہیں مثلاً نمبر ۴۶ میں کہ یہ بغداد کی تباہی کا زمانہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بہرحال کسی نہ کسی قسم کی خلافت کا ذکر وہ ضروری سمجھتے تھے،

۶۔ یہ سکے معزالدین غوری سے لیکر بہ ترتیب ابراہیم شاہ سکندر لودی تک کے ہیں، اس کے بعد تیموریہ سلطنت شروع ہوتی ہے، اور مصر میں خلفائے عباسیہ کا بھی خاتمہ قریب قریب ہو جاتا ہے، ان میں ہر سکہ "ہندوستان اور خلافت" کے دعوی کے لئے دلائل کا ایک دفتر ہے،

ذیل میں ہم بہ ترتیب ان سکوں کو درج کرتے ہیں،

سلاطینِ ہند کے سکوں کے کتبے

(۱)

الله	لا اله الا الله	ابو المظفر محمد	محمد بن سام
محمد رسول الله	الناصر لدین الله السلطان	بن سام	هو الذی ارسل
السلطان المعظم	الاعظم غیاث الدنیا	غزنة فی شهور سنة	رسوله علی الدین
معزالدنیا والدین	والدین ابوالفتح	اثنی وتسعین وستمائة	کله ولو کره المشرکون

(۲)

هُوَ الذی ارسل رسوله بالهدی ودین الحق
لیظهرهٗ علی الدین کلّه ولو کره المشرکون
لا اله الّا الله محمد رسول الله السّلطان
المعظم غیاث الدّنیا والدین ابوالفتح
محمد بن سام
ضرب هذا الدرهم فی بلدة غزنة سنة
ست وتسعین وخمسمائة الناصر لدین الله
السّلطان المعظّم معز الدنیا والدین
ابوالمظفّر
محمد بن سام

(۳)

السلطان الاعظم لا اله الا الله
معز الدنیا و محمد رسول الله
الدّین ابوالمظفّر الناصر لدین الله
محمد بن سام امیر المومنین
(ہندی میں) سری همیر سری محمد سام پرتھوی

(۴)

قطب مینار دہلی کا کتبہ

السلطان المعظم شہنشاہ الاعظم مالک رقاب
الامم مولیٰ ملوک العرب والعجم سلطان
السّلاطین فی العالم غیاث الدّنیا والدّین
معز الاسلام والمسلمین محی العدل فی
العالمین علاء الدولة القاهرة ملک الملة
الطاهرة جلال الامة الباهرة شهاب الخلافة
باسط الاحسان والرّأفة فی الثقلین ظل الله
فی الخافقین الحامی لبلاد الله الراعی
لعباد الله محرز ممالک الدّنیا و مظهر
ممالک الدنیا و مظهر کلمة الله العلیا
ابوالمظفّر محمد بن سام قسیم امیر المومنین
خلد الله ملکه

(۵)

مسجد قطبی کے شمالی جانب کے داخلہ کے دروازہ پر
تاریخ ۵۹۲ھ

بسم الله الرحمن الرحیم
یدعوا الی دار السّلام و یهدی من یشاء
الی صراط مستقیم فی شهور ثنتی و تسعین
جرت هذه العمارة العالی امر السلطان المعظم

معزالدنیا والدین محمد بن سام ناصر امیر
المومنین

(۶)

السلطان المعظم لا الہ الا اللہ
معزالدنیا والدین محمد رسول اللہ
ابوالمظفر الناصر لدین اللہ
امیر المومنین

محمد بن سام ضرب ہذا الدینار
لا الہ بلدۃ غزنۃ فی شہور
سنۃ ثلث وستمایۃ

(۷)

لا الہ الا اللہ السلطان المعظم
محمد رسول اللہ عبدہ مولانا تاج الدین
الناصر لدین اللہ یلدز السلطانی
امیر المومنین

ضرب ہذا الدرہم ببلدۃ غزنۃ
فی شہور سنۃ عشر وستمایۃ

(۸)

القادر (ہندی میں)

لا الہ الا اللہ ابیا کتیمک
محمد رسول اللہ محمدا وتر زیپا
یمین الدولہ فی محمود
و
امین الملۃ

بسم اللہ
ضرب ہذا الدرہم بمحمود پور
سنۃ ثمان عشرۃ واربعمایۃ

(۹)

فی عہد الامام لا الہ الا اللہ
المستنصر محمد رسول اللہ
امیر المومنین

(۱۰)

ہندی میں
مستنصر باللہ سری خلیفہ

(۱۱)

السلطان المعظم لا الہ الا اللہ
شمس الدنیا والدین محمد رسول اللہ
ابوالمظفر التمش المستنصر بامر اللہ
السلطان ناصر امیر امیر المومنین
المومنین اثنین وثلثین وستمایۃ

(۱۲)

السلطان المعظم ضرب

شمس الدنیا والدین نکور

ابو المظفر التمش محمد رسول اللہ

القطبی لدار الشمس

بزمان امیر المومنین ثمن و ستمایۃ

(۱۳)

قطب مینار کی دوسری منزل کے دروازہ پر

امر باتمام ھذہ العمارۃ الملک المؤید

من السماء شمس الحق والدین ایلتمش

السلطانی ناصر امیر المومنین

(۱۴)

تیسری منزل کے دروازہ پر

امر بہذہ العمارۃ فی ایام الدولۃ السلطان

شہنشاہ المعظم

مالک رقاب الامم مولی ملوک الترک

والعرب والعجم شمس الدنیا والدین

معز الاسلام والمسلمین ذو الامن

والامان وارث ملک سلیمان ابو المظفر

ایلتمش ناصر امیر المومنین

(۱۵)

فی عہد الامام السلطان الاعظم

المستنصر باللہ ناصر الدنیا والدین

امیر المومنین ابو المظفر محمود شاہ

بن سلطان

(۱۶)

رضیہ کے سکوں پر

المستنصر امیر المومنین

(۱۷)

السلطان الاعظم لا الہ الا اللہ

علاء الدنیا والدین محمد رسول اللہ

ابو الفتح الناصر لدین اللہ

محمد بن السلطان

بسم اللہ ضرب امیر المومنین

ھذا الدینار بلدۃ غزنۃ فی شہور ثلاث عشرۃ

ستمائۃ

(۱۸)

الناصر جلال الدنیا والدین

لدين الله منكبرنی
امیرالمومنین بن السلطان

(۱۹)

الناصر لدين الله العادل الاعظم
امیرالمومنین چنگیز خان

(۲۰)

سیف الدنیا والدین لا اله الا الله
ابوالمظفر الحسن محمد رسول الله
قرلغ المستنصر بالله
امیرالمومنین
هذا الدرهم فی شهور سنة ثلث وستمائة

(۲۱)

السلطان الاعظم فی عهد الامام
جلال الدنیا والدین المستنصر
امیرالمومنین
ملكة ابنة التمش السلطان
مهرة امیرالمومنین
ضرب هذه الفضة بلكنوتی سنة

...

(۲۲)

السلطان الاعظم فی عهد الامام
معز الدنیا والدین المستنصر
ابوالمظفر امیرالمومنین
بهرامشاه بن السلطان
ناصر امیرالمومنین
ضرب بحضرة دهلی فی سنة ثمان وثلثین وستمائة

(۲۳)

السلطان الاعظم فی عهد الامام
علاء الدنیا والدین المستنصر امیرالمومنین
ابوالمظفر مسعود شاه
بن السلطان ضرب دهلی

(۲۴)

السلطان الاعظم فی عهد الامام
علاء الدنیا والدین المستعصم امیر
ابوالمظفر مسعود شاه المومنین
بن السلطان
ضرب سنة احدی واربعین وستمائة

...

(۲۵)

ہندی میں

سری شیفہ سری لطان سری علاؤ دین

(۲۶)

السلطان الاعظم فی عہد الامام

ناصر الدنیا والدین المستعصم امیر المومنین

ابو المظفر محمود

بن السلطان

ضرب ہذہ الفضۃ بحضرۃ دہلی

فی سنۃ اربع وخمسین وستمائیۃ

(۲۷)

السلطان الاعظم فی عہد الامام

ناصر الدنیا والدین المستعصم امیر المومنین

ابو المظفر محمود بن

السلطان

خمسین

(۲۸)

السلطان الاعظم الامام

غیاث الدنیا والدین المستعصم

ابو المظفر امیر المومنین

بلبن السلطان

ضرب ہذہ السکۃ بحضرت دہلی

فی سنۃ ثمانین وستمایۃ

(۲۹)

کتبہ جامع مسجد گڑ مکتسر ضلع میرٹھ

مبنی ہذہ العمارۃ فی عہد السلطنۃ (؟)

السلطان الاعظم شہنشاہ المعظم

غیاث الدنیا والدین

ابو المظفر بلبن السلطان ناصر امیر المومنین

سنۃ اثنی وثمانین وستمایۃ

(۳۰)

السلطان الاعظم الامام المستعصم

معز الدنیا والدین امیر المومنین

ابو المظفر کیقباد

السلطان

ضرب ہذہ الفضۃ بحضرۃ دہلی

فی سنۃ سبع وثمانین وستمائۃ

.....ہ:ہ:ہ.....

(۲۱)

السّلطان الاعظم الامام

جلال الدنیا والدین المستعصم

ابو المظفر فیروز شاه امیر المومنین

السّلطان

ضرب هذه الفضة بحضرة دهلی

فی سنة احدی وتسعین وستمایة

(۳۲)

السّلطان الاعظم الامام

رکن الدنیا والدین المستعصم

ابو المظفر امیر المومنین

کیکاؤس

سلطان بن سلطان بن سلطان

ضرب هذه الفضة بحضرة لکهنوتی

فی سنة خمس وتسعین وستمائة

(۳۳)

السّلطان الاعظم السّلطان الاعظم

رکن الدنیا والدین جلال الدنیا والدین

ابو المظفر فیروز شاه

ابراهیم شاه السلطان ناصر امیر المومنین

بن

ضرب هذه الفضه بحضرة دهلی

سنة خمس وتسعین وستمایة

۳۴

السّلطان سکندر الثانی

علاء الدنیا والدین یمین الخلافة

ابو المظفر ناصر امیر المومنین

محمد شاه

السلطان

ضرب هذه السکة بحضرة دهلی

سنة تسع سبعمایة

(۳۵)

محراب قطب دہلی پر مورخہ ارشوال سنہ

حضرت علیا خدایگان سلاطین مصطفی جاالصادع

لامر الله المخصوص بعنایة

اکرم الاکرمین

علاء الدنیا والدین غوث الاسلام والمسلمین

معز الملوک والسّلاطین القانون بتأئید الرحمان

ابو المظفر محمد شاه السلطان

سکندر ثانی یمین الخلافة ناصر امیر المومنین

خلد الله ملکه

بنا این خیرات سنت جماعت است عمارت فرمود

(۳۶)

الامام الاعظم السلطان بن السلطان

خلیفة رب العالمین الواثق بالله

قطب الدنیا والدین امیر المومنین

ابو المظفر مبارک شاه

ضرب هذه السکة بقلعة قطب آباد

فی سنة ثمان عشر وسبع مائة

(۳۷)

السلطان الاعظم اسکندر الزمان

قطب الدنیا والدین یمین الخلافة

ابو المظفر مبارک شاه ناصر امیر المومنین

السلطان بن السلطان

ضرب هذه الفضة بحضرة دهلی

فی سنة سبع عشر وسبع مائة

......۰۵۱۷۰......

(۳۸)

الامام الاعظم السلطان ابن السلطان

خلیفة رب العالمین الواثق بالله

قطب الدنیا والدین امیر المومنین

ابو المظفر مبارک شاه

ضرب هذه السکة بحضرة دار الخلافة

فی سنة ثمان عشر وسبعمایة

(۳۹)

الامام الاعظم مبارک شاه

قطب الدنیا والدین السلطان بن السلطان

ابو المظفر الواثق بالله

خلیفة الله امیر المومنین

ضرب هذه الفضة بحضرة دار الخلافة

فی سنة سبع عشر وسبعمائة

(۴۰)

السلطان الاعظم خسرو شاه

ناصر الدنیا والدین السلطان الواثق

ابو المظفر بخیر الرحمن ولی

امیر المومنین

ضرب هذه الفضة . . . . . .

. . . . . . عشرين وسبعماية

(٤١)

السلطان الاعظم خسرو شاه

ناصر الدنيا والدين السلطان

ولى امير المومنين

(٤٢)

السلطان الغازى سكندر الثانى

غياث الدنيا والدين يمين الخلافة

ابو المظفر ناصر امير المومنين

(٤٣)

السلطان الغازى تغلق شاه

غياث الدنيا والدين السلطان

ابو المظفر ناصر امير المومنين

ضرب هذه السكة بحضرة دهلى

فى سنة احدى وعشرين وسبعماية

(٤٤)

السلطان الغازى تغلق شاه السلطان

غياث الدنيا والدين ناصر امير المومنين

ابو المظفر

ضرب هذه السكة بقلعة ديوگير

فى سنة احدى وعشرين وسبع ماية

(٤٥)

السلطان الاعظم الامام

شمس الدنيا والدين المستعصم

ابو المظفر امير المومنين

فيروز شاه السلطان

ضرب هذه الفضة بحضرة لكهنوتى

سنة عشرين وسبعماية

(٤٦)

الامام السلطان الاعظم

المستعصم شمس الدنيا والدين

امير المومنين ابو المظفر بهادر شاه

السلطان بن السلطان

ضرب هذا . . .

(٤٧)

الامام السلطان الاعظم

المستعصم غياث الدنيا والدين

امیرالمومنین ابوالمظفر بهادر شاہ
ضرب هذه الفضة بحضرة لکهنوتی
سنة احد عشر وسبع مایة

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں خلافت عباسیہ درہم برہم ہوگئی تھی، اور خلافت مصر قائم نہیں ہوئی تھی، اس لئے اس عہد کے سکوں میں خلفائے اربعہ کے نام ملتے ہیں،

(۴۸)

ابوبکر لا اله الا الله
المجاہد محمد
فی رسول الله
سبیل الله
محمد بن تغلق شاہ
۷۲۷ھ

ضرب هذه السکة بدار الاسلام
فی سنة سبع وعشرین وسبع مایة

ایک اور ایسا ہی سکہ اسی کتبہ کا ۷۳۰ھ تک کا ملتا ہے، جو سنگاؤں میں مضروب ہوا تھا،

(۴۹)

ضرب هذا الدینار فی زمان الامام
الخلیفة الدهلی المستکفی بالله
فی شهور سنة امیر المومنین
احدی واربعین ابو الربیع سلیمان
وسبعمایة خلد الله خلافته

(۵۰)

خلیفة الله المستکفی بالله
فی شهور ۷۴۳ھ

(۵۱)

الامام الاعظم خلیفة الله فی العالمین
المستکفی بالله
امیرالمومنین
ضرب هذه السکة دولت آباد
سنة اربع واربعین وسبعمایة

(۵۲)

فی زمان الامام العباس احمد
امیرالمومنین خلد ملکه
الحاکم بامر الله

(۵۳)

خلیفة الله المستکفی بالله

فی شهور سنة ۷۴۳

(۵۴)

الله الکفی والخلیفة المستکفی

فی شهور سنة ۷۴۳

(۵۵)

الحاکم بامر الله ابو العباس احمد

سنة ۷۴۳

(۵۶)

واثق بتائید یزدانی فیروز سلطانی

ضربت هذه السکة

فی زمان الامام ابو العباس الامام ابو العباس

احمد خلد ملکه

(۵۷)

السلطان الاعظم فی زمن الامام

سیف امیر المومنین امیر المومنین

ابو المظفر ابو الفتح

فیروز شاه السلطانی خلدت خلافته

خلد ملکه

ضربت هذه السکة بحضرة ... ین وسبعمائة

(۵۸)

۱- السلطان الاعظم سیف امیر المومنین ابو المظفر فیروز شاه

السلطانی خلد ملکه

۲- ضربت هذه السکة فی زمن الامام امیر المومنین

ابی الفتح المعتضد بالله خلد ملکه

(۵۹)

۱- السلطان الاعظم سیف امیر المومنین ابو المظفر فیروز شاه

السلطانی خلد ملکه

۲- فی زمن الامام امیر المومنین ابی عبد الله

خلدت خلافته ضرب هذه

(۶۰)

فیروز شاه سلطانی

نائب امیر المومنین

(۶۱)

فیروز شاه سلطانی ضرب بحضرة دهلی

الخلیفة امیر المومنین خلدت خلافته

(۶۲)

فیروز شاه سلطانی خلد ملکه

الخلیفة ابو الفتح خلدت خلافته

(۶۳)

الخلیفة ابو عبد الله خلدت خلافته ۷۸۴

(۶۴)

فیروز شاه سلطانی

ابو العباس احمد

(۶۵)

فیروز سلطانی

خلیفة ابو الفتح

(۶۶)

فیروز شاہ

ابو عبد اللہ خلدت خلافتہ

(۶۷)

شاہ   فی زمن الامام

فتح خان فیروز   امیر المومنین

خلد اللہ   ابو الفتح

ظلالہ وجلالہ   المعتضد باللہ

خلد خلافتہ

(۶۸)

السلطان الاعظم   فی زمن الامام

فیروز شاہ ظفر   امیر المومنین

بن فیروز شاہ   ابو عبد اللہ

السلطانی   خلدت خلافتہ

(۶۹)

فیروز شاہ ظفر السلطانی .... دہلی

الخلیفة امیر المومنین خلدت خلافتہ

(۷۰)

فیروز شاہ ظفر سلطانی

ضربت بحضرت دہلی

الخلیفة ابو عبد اللہ خلدت خلافتہ ۷۹۱

(۷۱)

فیروز شاہ   ابو عبد اللہ

ظفر ابن   خلدت خلافتہ

فیروز شاہ

(۷۲)

فیروز شاہ ظفر   الخلیفة ابو عبد اللہ

السلطان   خلد خلافتہ

(۷۳)

تغلق شاہ   نائب

سلطانی   امیر المومنین

ضربت بحضرت دہلی   ۷۹۰

(۷۴)

تغلق شاہ   ابو عبد اللہ

سلطانی   ۷۹۰

(۷۵)

ابوبکر شاہ — الخلیفۃ ابو

بن ظفر بن — عبد اللہ

فیروز شاہ — خلدت خلافتہ ۷۹۱

سلطانی

(۷۶)

ابوبکر شاہ

ظفر بن فیروز شاہ سلطانی

نائب امیر المومنین ۷۹۱

(۷۷)

ابوبکر شاہ — نائب امیر المومنین

ظفر بن فیروز شاہ — خلدت خلافتہ

سلطانی — ۷۹۲

(۷۸)

محمد شاہ فیروز شاہ سلطانی

ابو عبد اللہ خلدت خلافتہ

ضربت بحضرۃ دھلی سنہ ۷۹۰

(۷۹)

السلطان الاعظم ابو الحامد محمد شاہ فیروز شاہ سلطانی

فی زمن الامام امیر المومنین خلدت خلافتہ ۷۹۳

(۸۰)

سلطانی — الخلیفۃ

فیروز شاہ — ابو عبد اللہ

محمد شاہ — خلدت خلافتہ ۷۹۳

(۸۱)

محمد شاہ

ضربت بحضرۃ دھلی

نائب امیر المومنین ۷۹۲

(۸۲)

السلطان الاعظم — فی زمن امیر المومنین

ابو المجاہد — خلدت خلافتہ

محمد شاہ — ۸۱۸(؟)

فیروز شاہ سلطانی

(۸۳)

سکندر شاہ محمد شاہ سلطانی

الخلیفۃ ابو عبد اللہ خلدت خلافتہ

(۸۴)

السلطان الاعظم — فی زمن الامام

ابو المحامد محمود شاہ — امیر المومنین

محمد شاہ فیروز شاہ خلدت خلافتہ
سلطانی

(۸۵)

محمود شاہ محمد شاہ سلطانی

الخلیفۃ ابو عبد اللہ خلدت خلافتہ
۷۹۶

(۸۶)

محمود شاہ سلطان

ضربت بحضرت دھلی نائب امیر المومنین
۸۱۳

(۸۷)

نصرت شاہ سلطانی

نائب امیر المومنین

(۸۸)

فی عہد السلطان الغازی المتوکل

علی الرحمان مبارک شاہ سلطان

فی زمن الامام امیر المومنین خلدت

خلافتہ ۸۳۵

(۸۹)

مبارک شاہ

سلطان ضربت بحضرۃ دھلی

نائب امیر المومنین سنہ ۸۳۳

(۹۰)

السلطان ابو المحامد محمد شاہ فرید شاہ خضر شاہ
سلطانی

فی زمن الامام امیر المومنین خلدت خلافتہ
۸۴۶

(۹۱)

سلطان محمد شاہ بن فرید شاہ بحضرت دھلی

الخلیفۃ امیر المومنین خلدت خلافتہ

(۹۲)

سلطان عالم شاہ بن محمد شاہ بحضرۃ دھلی

الخلیفۃ امیر المومنین خلدت خلافتہ ۸۵۳

(۹۳)

عالم شاہ

نائب امیر المومنین ۸۵۳

(۹۴)

المتوکل علی الرحمان فی زمن امیر المومنین

بہلول شاہ سلطان خلدت خلافتہ

بحضرت دھلی

(۹۵)

بہلول شاہ سلطان بحضرت دھلی

الخلیفۃ امیر المومنین خلدت خلافتہ

(۹۶)

بهلول شاہ السلطان

نائب امیرالمومنین ۸۷۷

(۹۷)

المتوکل علی الرحمٰن فی زمن امیرالمومنین

سکندر شاہ

بہلول شاہ سلطان

بحضرت دہلی خلدت خلافتہ

(۹۸)

سنہ ۹۰۵

المتوکل علی الرحمٰن سکندر شاہ بہلول شاہ

امیرالمومنین خلدت خلافتہ

(۹۹)

المتوکل علی الرحمٰن فی زمن امیرالمومنین خلدت خلافتہ

ابراهیم شاہ سلطان

(۱۰۰)

ابراهیم شاہ سلطان

امیرالمومنین خلدت خلافتہ

(۱۰۱)

ابراهیم شاہ سکندر

امیرالمومنین خلدت خلافتہ ۹۲۶

سلاطینِ بنگالہ

(۱۰۲)

سُلطان الاعظم یمین خلیفۃ اللہ

فخرالدنیا والدین ناصرامیرالمومنین

ابوالمظفر مُبارک شاہ السلطان

ضربت ہذہ السکۃ بحضرت جلال

سنارگاؤں

سنۃ سبع وثلثین وسبع مائۃ

(۱۰۳)

السلطان الاعظم سکندرالزمان

علاءالدنیا والدین المخصوص

بعنایۃ الرحمٰن

ابوالمظفر علی شاہ ناصر امیرالمومنین

السلطان

ضربت ہذہ الفضۃ السکۃ فی البلدۃ فیروز آباد

سنۃ اثنی اربعین وسبعمائۃ

(۱۰۴)

السلطان الاعظم یمین الخلافۃ

اختیار الدنیا والدین ناصر امیر المومنین

ابوالمظفر غازی شاہ

السلطان بن السلطان

ضرب ہذہ السکۃ بحضرۃ جلال ستارگاؤں

سنۃ احدی وخمسین سبعمائۃ

سلاطین مالوہ

(۱۰۵)

الخلیفۃ امیر المومنین خلد اللہ خلافتہ ۸۴۰

ابوالمظفر محمود شاہ خلجی

ضرب بحضرت شادی آباد

(۱۰۶)

بہمنیہ دکن

السلطان الاعظم سکندر الثانی

علاء الدنیا والدین یمین الخلافۃ

ابوالمظفر بہمن شاہ ناصر امیر المومنین

السلطان

(۱۰۷)

جونپور

نائب	بادشاہ
امیر المومنین بشہر جونپور	السلطان
۸۹۲	

اس آخری سکہ کے معنی پر ذرا تامل کرو، سلطان بادشاہ جونپور میں امیر المومنین کا نائب ہے۔ نمبر ۶۳ میں فیروز شاہ دہلی میں اپنے کو امیر المومنین کا نائب کہتا ہے، اس کے بعد تغلق شاہ (۷۷) ابوظفر بن فیروز شاہ (۷۹) محمد شاہ (۸۴) محمود شاہ (۸۹) نصرت شاہ (۹۰) مبارکشاہ (۹۲) عالم شاہ، (۹۶) بہلول شاہ سب اپنے کو مستقل بادشاہ و سلطان نہیں، بلکہ اپنے کو خلیفہ وقت کا محض نائب کہتے ہیں، ملوک و سلاطین کے اس اعتقاد پر عام مسلمانوں کی عقیدہ کو قیاس کرنا چاہیے، اور سمجھنا چاہیے کہ آج خلافت کا جو شور و غل ہے، وہ بے حقیقت نہیں، بلکہ اس کی پشت پر ایک تاریخ ہے،

نمبر ۱۰۶ سکہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی جرنل ۱۸۷۳ء صفحہ ۳۰۰ میں چھپا ہے جو بہمنیہ سلطنت کا پہلا بادشاہ تھا ۷۴۸ھ سے ۷۵۹ھ تک اس کا زمانہ ہے،

خلافت آلِ عثمان

گذشتہ صفحات میں مسئلۂ خلافت اور تیموریوں سے قبل کے ہندوستان کے تاریخی پہلو نمایاں کئے گئے ہیں، اور آغازِ خلافت سے مصر کی آخری عباسی خلافت تک کے واقعات لکھے گئے ہیں، اب اس کے بعد وہ وقت آتا ہے، جب ایک طرف سلطان سلیم پہلا خلیفۂ عثمانی مصر، شام وعرب کو اپنے احاطۂ اقتدار میں لاتا ہے، اور دوسری طرف فرزندانِ تیمور ہندوستان کی مغربی سرحد میں قسمت آزمائی کرتے ہیں، اسی اثنا میں اُدھر سلطان سلیمان اعظم قسطنطنیہ کے تخت پر قدم رکھتا ہے، اور اِدھر بابر ہندوستان کا میدان جیت لیتا ہے، ۹۲۳ھ میں مصر و شام وغیرہ عثمانی اقتدار میں داخل ہوئے ۹۲۶ھ میں سلطان سلیم نے وفات پائی، اور سلطان سلیمان اس کا جانشین ہوا، اور ۹۳۲ھ میں بابر ہندوستان کے فرمانروائے مطلق کی صورت میں ظاہر ہوا،

عثمانی اور تیموری دونوں خاندان نسلاً ترک تھے، دونوں اپنا سلسلۂ نسب چنگیز اور ہلاکو سے ملاتے تھے، نویں صدی ہجری کے وسط میں تیمور اٹھا، اور ایشیا میں ایک نئی سلطنت کی بنیاد ڈالی: بایزید یلدرم اس وقت یورپ کے خرمنوں پر برق وصاعقہ بن کر گر رہا تھا، عین اس وقت طرابزون کی یونانی ریاست کی دعوت پر ۱۴۰۲ء میں تیمور بایزید کے مقابلہ کو نکلا، اب بایزید کو دفعۃً اپنے رُخ کو مغرب سے مشرق اور یورپ سے ایشیا کی طرف موڑنا پڑا، اور اس میں اس کو ناکامی ہوئی، اور تیموریوں کے ہاتھوں گرفتار ہو کر مرگیا، سلطنت عثمانیہ اس جھٹکے سے جو اُسی کے ایک ہم خاندان اور ہم مذہب فرمانروا کے ہاتھ سے اس کو لگا تھا: بہت جلد سنبھل گئی، تاہم دونوں خاندانوں میں ایک رقابت کی صورت پیدا ہوگئی ترکانِ عثمان تو اس اتفاقی حادثہ کو

فوراً بھول گئے، مگر تیموریوں سے اپنے بانیِ خاندان کے اس فخر و ناز کے کارنامہ کا نشہ ایک مدت تک اتر نہ سکا، اور اخیر اخیر تک آلِ عثمان کے جاہ و حشم، زور و قوت، نیکی و شہرت کا حریفانہ کانٹا اُن کے دلوں میں چھبتا رہا،

اس حکایت کو یہیں نا تمام چھوڑ کر ناظرین کی عنانِ توجہ اب دوسری جانب موڑتا ہوں، یہ وہ زمانہ تھا، جب اندلس کے مسلمانوں کا خاتمہ کر کے اسپینوں اور پرتگالیوں کے حوصلے بہت بڑھے ہوئے تھے، قسطنطنیہ اور مصر کے راستہ پر مسلمانوں کے مضبوط قبضہ کے باعث وہ مشرق خصوصاً ہندوستان کیلئے ایک نئے راستہ کی تلاش میں تھے، اسوقت یورپ و ہندوستان کی تجارت مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھی، اسپینی ملاح تو ہندستان کے سُراغ میں بھٹک کر نئی دنیا (امریکہ) پہونچے، لیکن پرتگالی واسکوڈی گاما کے زیر ہدایت افریقہ ہو کر ہندوستان کے سواحل پر نمودار ہوگئے، اور پھر بار بار کی آمد و رفت سے اس تمام بحری راستہ پر قبضہ مالکانہ جمالیا، جہاں جہاں بیچ میں مسلمانوں کی بحری تجارتی منڈیاں ملیں اُن کو تہ و بالا کر دیا،

اکتشافِ ارضی اور توسیعِ تجارت کے نام سے یہ بحری لوٹیرے بحرِ ہند میں ادھر ادھر اپنے جہازی گھوڑے دوڑاتے پھرتے تھے، عرب اور ہندوستان کے ساحلی مقامات اُن کی لوٹ مار سے برباد ہو رہے تھے، ساحلوں اور جزیروں میں مسلمانوں کا قتلِ عام ہو رہا تھا، اور مسجدیں ٹوٹ کر کلیسا بن رہی تھیں، موپلہ جو عرب، مصر اور ہندوستان کے درمیانی بیوپاری تھے، اور کالیکٹ (مدراس) اُن کا مرکز تھا، اُن کے تجارتی کاروبار توڑے پھوڑے جارہے تھے، کالیکٹ کے راجہ کو اس پر مجبور کیا گیا کہ وہ مسلمانوں کو عرب آنے جانے سے روک دے، اُس نے اس کو نامنظور کیا، اور اُسکی خاطر اس کو لڑائی لڑنی پڑی، پرتگالیوں نے کوچی (ساحلِ سندھ) پر قبضہ کیا، اور مسلمانوں کو قتل کیا، اور مسجد کو کلیسا بنالیا، پھر رفتہ رفتہ عرب کے سواحل پر عدن، ہرمز، بریم وغیرہ کو اور ہندوستان کے سواحل میں سے گوآ، چیول، دابل، دیو،

اور دمن وغیرہ کو تاخت وتاراج کرنے لگے، ۹۱۵ھ میں کالیکٹ پر حملہ کرکے شہر کو لوٹ لیا، اور وہاں کی جامع مسجد کو جلا کر خاک سیاہ کردیا، یہی حال انھوں نے عرب کے ساحلی شہروں کا کر رکھا تھا، حاجیوں کے جہازات اُن کے حکم اور اجازت اور محصول کے بغیر ہندوستان کے ساحلوں سے جنبش نہیں کرسکتے تھے،[۱]

بہرحال یہ پر درد داستان بہت طویل ہے، اور کبھی فرصت سے سننے کے قابل ہے، اس وقت ہندوستان کی مرکزی حکومت لودیوں کے کمزور ہاتھوں میں تھی، دکن اور گجرات میں طوائف الملوک حکمراں تھے، انہی بیچاروں نے مل ملا کر اپنی بحری قوت کو یکجا کیا، عرب کی طرف سے مصر کی آخری عباسی خلافت کے قائم مقام سلطان قانصو غوری نے اپنے جہازات بھیجے سلطان محمود گجراتی، سلطان محمود بہمنی، سلطان یوسف عادل شاہ اور راجہ ملیبار نے بھی اپنے بیڑوں کو شامل کیا، لیکن بدقسمتی سے اس متحدہ قوت نے بھی اُن سے شکست کھائی، یہ سب کچھ ہو ہی رہا تھا کہ سلطان سلیم نے مصر و عرب کی حفاظت کا بار اپنے مضبوط کندھوں پر اٹھالیا،

سلطان سلیم اپنے اعلان خلافت کے بعد صرف تین برس زندہ رہا، ۹۲۶ھ میں سلطان سلیمان اعظم اس کا جانشین ہوا، جس نے اپنے باپ کی مذہبی بلند حوصلگیوں کے خواب کو پورا کردیا، دنیائے اسلام کے دوسرے ملکوں کی طرح ہندوستان نے بھی اس کی خلافت، اور

[۱] یہ واقعات ہندوستان کی انگریزی تاریخوں میں یورپین تاجروں کی آمد ہند کی تمہید میں مذکور ہیں لیکن دوسری طرف کا بیان تم بنگال و گجرات اور یمن کی پچھلی تاریخوں میں پڑھ سکتے ہو، اس وقت ریاض السلاطین (تاریخ بنگالہ) ظفر الوالہ (تاریخ گجرات عربی) تاریخ گجرات میر ابوتراب فارسی، اور کتاب روح الروح فی الفتوح (قلمی تاریخ یمن موجودہ کتب خانہ دار المصنفین) میرے پیش نظر ہیں،

مذہبی عظمت کو تسلیم کیا، اس کا اثر سب سے پہلے گجرات کے سلاطین پر پڑا جن کے عرب اور دیگر ممالکِ اسلامیہ سے براہِ راست تعلقات تھے،

گجرات کے ایک محدث و عالم محمد بن عمر آصفی الغانی جن کی آمد و رفت مکہ معظمہ میں رہا کرتی تھی، اور جو سلاطین گجرات کے درباروں میں بھی معزز تھے، انھوں نے عربی میں ظفرالوالہ کے نام سے گجرات کی ایک تاریخ لکھی ہے، اور جس کو گورنمنٹ آف انڈیا شاید اب اپنی بدبختی سمجھے کہ اُس نے چھاپ کر شائع کیا ہے، اس تاریخ میں گجرات کے بلکہ ہندوستان کے مایۂ ناز محدث شیخ علی متقی مہاجر صاحبِ کنز العمال کے حالات میں ہے کہ جب وہ ہندوستان چھوڑ کر عرب گئے اور سلطان سلیمان کے کانوں تک اُن کی شہرت پہونچی تو سلطان نے اُن سے دعا کی آرزو کی، اس تقریب سے شیخ محمد آصفی سلطان سلیمان کا نام اپنی زبان پر لاتے ہیں، اور اس کے بعد لکھتے ہیں:-

وکان فی وقتہ سلطان الاسلام	اس وقت ٹرکی کا بادشاہ اسلام کا
علی الاطلاق والخلیفۃ للّٰہ	سلطان علی الاطلاق تھا، اور تمام دنیا
فی الآفاق وھو سلیمان خان[1]	میں خدا کا خلیفہ تھا، اور وہ سلیمان تھا

علامہ قطبی نہروالی (گجراتی) نے جو مکہ میں سلطان گجرات کے مدرسہ میں مدرس تھے، اپنی تاریخ اعلام بیت اللہ الحرام میں جو چھپ گئی ہے، بیسیوں جگہ سلیمان اور اس کے بعد کے سلاطین کو خلفاء اور امراء المومنین کہہ کر خطاب کیا ہے،

سلاطین گجرات نے پرتگالیوں کی نئی توپوں اور جہازوں کے سامنے اپنے کو بے دست و پا پاکر آخر آستانۂ خلافت کی طرف رجوع کیا، ہندوستان کے سمندروں میں یہ حوادث اور سانحے پیش آرہے تھے کہ اس کے میدانوں میں بابر اپنی بارہ ہزار کی جمعیت سے آموجود ہوا،

---

[1] ص ۳۱۷

اور دم کے دم میں لودیوں کی بساط الٹ کر ہندوستان کا بادشاہ بن گیا،

تمھیں معلوم ہے کہ آلِ تیمور اور آلِ عثمان باہم حریف کی حیثیت رکھتے تھے لیکن انصاف بالائے طاعت است و مذہب بالائے سیاست، اس ناگواری کے باوجود شاہانِ تیمور اس قبیلۂ اسلام کو تو نہیں چھوڑ سکتے تھے، جہاں آلِ عثمان کے نام کا خطبہ ہر ہفتہ پڑھا جاتا تھا، اور نہ حرمین کے حقوق و فرائض کو بھلا سکتے تھے جن کی حفاظت و خدمت گذاری اب سلاطینِ عثمان کے تاجِ قیصری کا طرہ تھی، اور اس حجاز کی آمد و رفت بند نہیں کر سکتے تھے، جہاں ہر سال اُن کے امراء اور رعایا جوق در جوق خلیفۂ عثمانی کے زیرِ سیادت ادائے حج کے لئے جاتے تھے، اور بالآخر اگر اُن کو خود توفیق ملتی تو وہ منبر کے نیچے بیٹھ کر اپنے نام کا نہیں بلکہ قسطنطنیہ ہی کے سلطان کے نام کا خطبہ سنتے، اس لئے وہ کسی نہ کسی طرح سلاطینِ عثمان کی مذہبی برتری اور امامتِ کبریٰ کے ماننے پر مجبور تھے،

۹۳۲ھ میں بابر نے ہندوستان کے تخت پر قدم رکھا، لیکن تم کو معلوم ہے کہ اس عظیم الشان کامیابی کے بعد شہنشاہ ہند نے اپنا پہلا فرض کیا محسوس کیا؟ ترکستان کے علما کو انعامات بھیجے، اور حرمین اور مزاراتِ متبرکہ میں جو خلیفۂ عثمانی کے زیرِ سیادت تھے، نذر و فتوحات ارسال کئے، مورخ بدایونی کی عبارت ہے،

"بمکۂ مدینۂ مقدسہ و مزاراتِ متبرکہ نذرہا ارسال داشت"

بابر نے ایک نیا خط ایجاد کیا تھا جس کا نام خطِ بابری پڑ گیا تھا، اس خط میں خاص اپنے قلم سے قرآن مجید کا ایک نسخہ لکھ کر مکۂ معظمہ تحفہ بھیجا،

۹۳۷ھ میں بابر نے وفات پائی، اور ہمایوں نے تختِ حکومت پر قدم رکھا، ایک قیدی شاہزادہ نے بھاگ کر سلطان گجرات کے یہاں پناہ لی، اس تقریب سے ہمایوں کو گجرات پر حملہ کرنے کا موقع ہاتھ آیا، اب گجرات دونشانوں کے بیچ میں تھا، خشکی کے راستہ سے ہمایوں

حملہ آور تھا، اور دریائی راستہ سے پرتگالی سواحل کو برباد کر رہے تھے، سلطان گجرات نے پرتگالیوں کے مقابلہ میں آستانۂ خلافت سے جو امداد طلب کی تھی، وہ روانہ ہو چکی تھی، سلیمان پاشا کی قیادت میں ترکی جہازات کا بیڑا عرب کے سواحل پر نمودار ہوا، اور یمن کے سواحل کے انتظامات سے فارغ ہو کر ۹۴۲ھ میں ہندوستان کے بندرگاہ کی طرف روانہ ہوا، یہاں پہونچ کر اس نے پرتگالیون کا قلع قمع شروع کر دیا، لیکن پاشا نے غلطی یہ کی کہ اپنے طرز سے ہندوستانیوں پر یہ ظاہر کیا کہ وہ گویا ہندوستان کی فتح کے ارادہ سے آیا ہے، گجرات کے سلطان نے یہ دیکھ کر اپنی امداد و اعانت اور رسد کا انتظام موقوف کر دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ سلیمان پاشا اپنے افسوں، توپوں، اور دوسرے سامان جنگ کو چھوڑ کر یمن واپس چلا گیا، پرتگالیوں نے پھر سر اٹھایا، ادھر ہمایوں کی فوجیں بڑھتی چلی آتی تھیں، سلطان نے پرتگالیو سے صلح کر کے گجرات کے بہت سے بندر اُن کے حوالہ کر دیئے،

"مورخین کی تاریخ عالم میں ہے کہ اس زمانہ میں سلاطین عثمانیہ ہندوستان کے معاملات میں دلچسپی لینے لگے تھے، ۱۵۳۵ء (مطابق ۹۴۲ھ) میں دہلی کے سلطان سکندر کا بیٹا ہمایوں کی شکایت لے کر قسطنطنیہ سلطان کے پاس پہنچا، بہادر شاہ گجراتی کے دربار سے ایک سفیر پرتگیزوں کے مقابلہ میں اعانت طلبی کے لئے حاضر ہوا جنھوں نے کچھ دنوں پہلے دیو (دیپ) کا بندر بہادر شاہ سے چھین لیا تھا، سلطان نے مصر کے پاشا کو حکم دیا کہ وہ جہازوں کا بیڑہ لے کر ہندوستان جائے، اور وہ بندرگاہ اُن سے واپس لے لے، لیکن اس سے پہلے کہ جہازات روانہ ہوں، یہ خبر پہونچی کہ بہادر شاہ پرتگیزوں کے ہاتھ سے مارا گیا، بادشاہ نے اپنا خزانہ گجرات سے مکہ معظمہ کو منتقل کر دیا تھا، اُس کے مرنے پر وہ قسطنطنیہ بھیج دیا گیا، ۱۵۴۶ء (مطابق ۹۵۳ھ) میں ہندوستان کے ایک بادشاہ علاء الدین کی طرف سے ایک سفیر قسطنطنیہ اس غرض سے آیا کہ پرتگیزوں کے مقابلہ میں سلطان کی امداد حاصل کرے، ۱۵۵۱ء (مطابق ۹۵۸ھ) میں پیری رئیس (ترکی کپتان) نے مسقط اور ہرمز پر قبضہ کر لیا، اور اُس کے

نائب مراد نے اسی جزیرہ کے سامنے پرتگیزوں سے ایک جنگ کی، اور ناکام رہا ۱۵۵۳ء مطابق ۹۵۷ھ میں سیدی علی نے خلیج فارس میں بصرہ کے قریب اُن کا پھر مقابلہ کیا، اور شکست کھائی اور بالآخر گجرات کے بندر میں پناہ لی[۵۱]

اس تاریخ کے مصنفین نے ان چند سطروں میں جن واقعات کی طرف اشارہ کیا، گجرات کی تاریخوں میں یہ بیانات مفصل موجود ہیں لیکن اُن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، صرف اتنا کہنا ہے کہ بہادر شاہ گجراتی کے پاس جو بھاری توپ خانہ تھا، وہ انہی ترکوں کا عطیہ یا متروکہ تھا، رومی خاں اور توپخانہ کے دوسرے تجربہ کار افسر سب ترک تھے، اور انہی لوگوں کے ذریعہ سے ہندوستان میں توپ سازی کا فن رواج پذیر ہوا، بہادر شاہ نے ہمایوں اور پرتگیزوں کی دوہری آگ میں پھنس کر جان دی، اس کا ارادہ تھا کہ وہ ہندوستان سے ہجرت کر جائے، اسی لئے اُس نے اپنا خزانہ اپنے معتبر افسروں کی معرفت مکہ معظمہ بھیج دیا تھا، اسی اثنا میں پرتگالیوں نے بعض قلعے بنائے تھے، اُن سے نامہ و پیام کو رہا تھا، ان کے پاس تنہا بعض درباریوں کو لے کر جہاز پر چلا گیا، انھوں نے دھوکے سے موقع پاکر مار ڈالا، رحمہ اللہ

بہادر شاہ کے بعد ۹۴۵ھ میں محمود شاہ، گجرات کا بادشاہ ہوا، اس کے زمانہ میں سلطان سلیمان نے سلیمان پاشا کو بیڑہ دے کر پھر ہندوستان سے پرتگیزوں کے نکالنے کو بھیجا، سلیمان پاشا کے بیڑے کو شکست ہوئی، اس کی وجہ ظفر الوالہ کے مصنف نے تو یہ بتائی ہے کہ پاشا امرائے گجرات سے مشورہ نہیں لیا کرتا تھا، اس لئے انھوں نے رسد بند کردی تھی لیکن روح الروح[۵۲] کے مصنف کا

---

[۵۱] ہسٹورینس ہسٹری آف دی ورلڈ جلد ۲۴، ص ۳۴۴، [۵۲] یمن کی دسویں صدی ہجری کی تاریخ ہے، اس کا پورا نام کتاب روح الروح ما بعد المائۃ التاسعۃ من الفتن والفتوح ہے، مصنف کا نام عیسیٰ بن لطف اللہ ابن مطہر یمنی ہے، اس کتاب کا قلمی نسخہ دارالمصنفین میں ہے،

بیان ہے کہ ہم نے بعض ثقات سے سُنا ہے کہ پاشا کو ہندوستان کے بادشاہوں نے بہت سے روپیے دیئے کہ واپس[1] چلا جائے، بہر حال پاشا جب قسطنطنیہ واپس گیا، تو اس سے جواب طلب ہوا، سلطان نے غضب ناک ہو کر کہا :۔

ما أرسلتك الا لاخراج الفرنج	میں نے تجھ کو دیپ سے فرنگیوں کو
من البنادر لا لصاحبها	نکالنے کے لئے بھیجا تھا، ہندوستان
لا سلاطة علی المسلمین بالہند	میں مسلمانوں پر بادشاہ بنا کر نہیں
(ظفر الوالہ ص ۴۲۵)	بھیجا تھا،

بہادر شاہ گجراتی کا وزیر آصف خان جو نہایت لائق و فاضل اور محدث تھا، سلطان کی طلب پر اڈریا نوپل حاضر ہوا، دربار میں پہنچ کر سلطان کے ہاتھوں کو اپنی آنکھوں سے لگایا، سلطان نے بھی اس کی بڑی عزت و توقیر کی، اور دریافت کیا کہ تمہاری کیا آرزو ہے، جس کو میں پوری کر سکتا ہوں خان نے ہندوستان کے وقار کو صدمہ نہیں پہنچایا، صرف ہندوستان واپس جانے کی اجازت چاہی، اور حرم محترم میں کوئی اعزازی عہدہ حاصل کیا، سلطان نے سب سے دلچسپ سوال یہ کیا کہ تمہاری مملکت کی بربادی کا سبب کیا ہوا ؟ خان نے فلسفۂ تاریخ سے اس کا عمدہ جواب[2] دیا،

سیدی علی رئیس (کپتان) جس کا اس سے پہلے ترکی بیڑے کے افسروں میں ذکر آ چکا ہے وہ بھی ان لوگوں میں تھا جو بیڑے کو لے کر قسطنطنیہ واپس نہ جا سکے تھے، سیدی علی نے خشکی کا راستہ اختیار کیا، وہ پورے ہندوستان کو ناپ کر افغانستان و ایران و ترکستان ہو کر قسطنطنیہ واپس گیا، اور مرآۃ الممالک کے نام سے اپنا سفرنامہ مرتب کیا، اس کا ترجمہ جرمن اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوا ہے، انگریزی میں پروفیسر ویمبری نے اس کا ترجمہ کیا ہے، مگر پروفیسر موصوف نے

---

[1] کتاب مذکور واقعات ۹۴۵ھ [2] ظفر الوالہ ص ۳۰۷،

اس ترجمہ کے حواشی میں سخت غلطیاں کی ہیں، اسی نسخہ کا ترجمہ کارخانۂ وطن لاہور نے کیا ہے جو اور زیادہ مسخ اور غلط ہے، سفرِ یورپ میں روم میں ایک ترکی ادیب رؤف احمد بے اڈیٹر اخبار استقلال قسطنطنیہ سے ملاقات ہوئی، موصوف نے اثنائے گفتگو میں فرمایا کہ قسطنطنیہ میں اصل سفرنامہ چھپ گیا ہے، میں نے باصرار اس کتاب کی اُن سے خواہش کی لیکن اب تک یہ آرزو پوری نہیں ہوئی، بہرحال اس وقت یہی اردو ترجمہ میرے پیش نظر ہے، سیدی علی نے اس سفرنامہ میں ہمایوں اور ہندوستان کے دوسرے بادشاہوں سے ملاقات کا حال لکھا ہے، جس سے اُس زمانہ کے ہندوستان کا مسئلہ خلافت سے تعلق ظاہر ہوگا،

سیدی علی کا بیان ہے کہ

"جب وہ بلوچستان کے بندر گوادر پر پہنچا، تو وہاں کے حاکم نے ہمارے جہاز پر آکر ہمارے بادشاہ (سلطان) کی نسبت اظہار عقیدت مندی و وفاداری کیا، اور وعدہ کیا کہ آیندہ کبھی ہمارا بیڑا اس جانب سے گذرا تو وہ پچاس ساٹھ کشتیاں سامانِ رسد وغیرہ نظر کرنے کے علاوہ ہر قسم کی امداد دینے کو تیار رہے گا۔" (ص ۲۳)

سورت میں مسلمان ہمیں دیکھ کر نہایت خوش ہوئے (کیونکہ وہ ہمیں کفار کے ہاتھوں سے بچانے والا خیال کرتے تھے، اور ہم سے یوں مخاطب ہوئے، ..... کہ ہم صدق دل سے دعائیں کر رہے تھے کہ خداوند کریم اپنے فضل وکرم سے عثمانی بیڑے کو گجرات میں پہنچائے اور عثمانی سلطنت کے اس علاقہ کو مامون و محفوظ کرکے ہمیں ہندوستانی کفار کے پنجہ سے نجات دلائے۔" (ص ۲۹)

احمد آباد پہنچ کر وہاں میں نے سلطان اور اس کے وزیر اور عماد الملک اور دیگر ارکانِ سلطنت سے ملاقاتیں کیں، سلطان میری سندیں دیکھ کر بہت تعظیم و تکریم سے پیش آیا،

اور ہمارے بادشاہ کی نسبت عقیدتمندی کا اظہار کیا،..... ایک روز جب میں عماد الملک سے
ملنے اس کے محل میں گیا، تو وہاں ایک پرتگالی سفیر ملا جس نے عماد الملک کو مخاطب
کرکے کہا کہ سلطان ٹرکی کے ساتھ ہم لوگ کوئی مخالفت نہیں کرسکتے، ہم لوگوں کو اُن
کی ضرورت ہے، علاوہ ازیں وہ دنیائے اسلام کے بادشاہ ہیں"

(ص ۳۳)

سیدی علی گجرات سے چل کر سندھ آیا، وہاں اس وقت خانہ جنگی برپا تھی، شاہ حسین کو جب اُس کے آنے کی خبر معلوم ہوئی تو نہایت تعظیم سے استقبال کیا، اور اس کو خلعت فاخرہ دیا، اور عسکر النیب اُس کی جماعت کا نام رکھا، اور سلطان معظم کی خدمت میں مراسلہ بھیجا، (ص ۳۷)
سب سے زیادہ دلچسپ بیان وہ ہے جب ترکی امیر البحر بادشاہ ہمایوں کے دربار میں حاضر ہوا اور سلسلۂ گفتگو سلطنت عثمانیہ کی وسعت تک پہونچ گیا، تو بالآخر تیموری شہنشاہ کو سلطان آلِ عثمان" کی خلافت اور دینی پیشوائی کا اپنی زبان سے اقرار کرنا پڑا، سیدی علی نے کہا کہ "چین تک میں ہمارے سلطان کا نام خطبہ میں لیا جاتا ہے، ہمایوں نے اپنے وزراء کی طرف دیکھکر کہا کہ "بیشک سلطان ٹرکی ہی بادشاہ کہلانے کے مستحق ہیں اور سطح زمین پر یہی اس عزت کے مستحق ہیں، ہمایوں نے دوسرے موقع پر دریافت کیا کہ "خان کریمیا بھی سلطان ٹرکی کا ماتحت ہے؟" اور جب اس کا جواب اس کو اثبات میں ملا، تو اُس نے کہا کہ "اگر یہ سچ ہے تو پھر خان کو اپنے نام کا خطبہ پڑھنے کا کیونکر حق ہوگا؟" امیر البحر نے کہا کہ "یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ ہمارے بادشاہ کے سوا کسی اور کو یہ حق حاصل نہیں ہے، کہ وہ جس کو چاہے خطبہ کا اختیار بخشے" امیر البحر کا بیان ہے کہ درباریوں کے چہروں سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ میرے دعوے سے متفق ہیں، اور سب نے مل کر سلطان کے حق میں دعائے خیر کی، (ص ۴۶)

نیک دل ہمایوں کی بادشاہی ہندوستان میں چند سال سے زیادہ قائم نہ رہی، ۹۴۷ھ سے لیکر ۹۶۲ھ تک آوارہ گرد وسفرِ حجاز کے شوق میں مارا مارا پھرا، ہندوستان کے تخت پر اب شیر شاہ سوری کا قبضہ تھا، اس نے چند سال میں اپنے دانشمندانہ نظم ونسق سے ہندوستان کو امن وامان کی بہشت بنادیا، شیر شاہ کے دربار میں سید رفیع الدین محدث ترکستان کے ایک عالم تھے، ان کے آبا، واجداد حرمین میں درس دیا کرتے تھے، ۹۵۱ھ میں مارواڑ سے واپسی میں محدث موصوف نے بادشاہ سے سفرِ حرمین کی اجازت چاہی تاکہ بطریقِ سلف وہاں اپنی زندگی وہ درس وتدریس میں صرف کرسکیں، شیر شاہ نے جو جواب دیا اُس کا لفظی ترجمہ یہ ہے :-

"مجھے اس میں مضائقہ نہ تھا لیکن میں نے آپ کو ایک خاص مصلحت کی بنا پر روک رکھا ہے، اور وہ یہ ہے کہ امید ہے کہ بفضلِ خدا چند روز میں ہندوستان کا میدان کفر کے کانٹوں سے پاک ہوجائے گا، چند قلعے جو باقی ہیں، وہ بھی تھوڑی سی توجہ میں فتح ہوجائیں گے، اس کے بعد آرزو یہ ہے کہ دریائے شور کو عبور کرکے قزلباشوں (ایران کی صفوی حکومت کے طرفدار جو مذہباً متعصب شیعی تھے، اور جن کی ترکوں سے متواتر لڑائیاں ہوئیں) تک پہنچوں، جو حجاج وزائرین بیت اللہ کو جانے نہیں دیتے، اور مذہب اسلام میں جنھوں نے نئی بدعت پیدا کی ہے، اور اُن سے جنگ کردں اور وہاں سے تم کو اپنا وکیل وقاصد بناکر سلطان روم کی خدمت میں بھیجوں تاکہ میرے اُن کے درمیان دینی برادری کا رشتہ قائم ہوجائے، اور اُن سے درخواست کرکے کہ مکہ معظمہ یا مدینہ منورہ میں سے ایک کی خدمت کا فرض میرے لئے حاصل کرو، اس وقت سلطان روم اُدھر سے اور میں اِدھر سے بڑھوں، اور قزلباشوں کو بیخ سے اکھاڑ کر پھینکوں، سلطان جب اُدھر سے حملہ کرتے ہیں تو یہ بھاگ کر اِدھر چلے آتے ہیں، اور اُن کی مراجعت کے بعد

پھر بدستور اپنی جگہ پر پہونچ جاتے ہیں، لیکن اب اگر ہم دونوں مل کر دونوں طرف سے اُن کو گھیریں تو ہندوستان کی کثرت فوج اور ترکوں کے آتشبار توپخانہ کے مقابلہ میں قوت قزلباشوں میں معلوم، جہاں تک میں نے غور کیا، اس سفارت کے لئے تم سے بہتر شخص مجھ کو دوسرا نظر نہیں آتا، اور اسی سبب سے تم کو سفر کی ابھی اجازت نہیں دیتا۔[۱]

شیرشاہ کے اس معترفانہ بیان کا جو اُس کے دلی خیالات کا آئینہ ہے بغور پڑھو، تم کو لفظ لفظ سے معلوم ہوگا کہ وہ سلطان عثمانی کا کس عقیدتمندی کیساتھ نام لیتا ہے، اُنکی مذہبی پیشوائی کو تسلیم کرتا ہے، اُنکی دینی برادری کا دعوی کرتا ہے، اور حرمین میں سے ایک کی خدمت کے لئے اُن سے التماس کرتا ہے، افسوس کہ شیرشاہ کو مُہلت نہ ملی، اور اُس کے ایک سال کے بعد ۹۵۲ھ میں باروت سے جل کر اس جہانِ فانی کو وداع کہا،

۹۶۲ھ میں اوس کے ناخلف جانشینوں نے ہندوستان کا تخت کھودیا، اور ہمایوں پھر ہندوستان کا بادشاہ بن کر سامنے آگیا لیکن تین ہی برس کے اندر اس کو اکبر کے لئے اپنی جگہ خالی کردینی پڑی،

کون نہیں جانتا کہ اکبر ایک نئے مذہب کی بناڈالنے کا خواب دیکھا کرتا تھا، اس کے لئے سب سے پہلا زینہ امامت و خلافت کا دعوی تھا، چنانچہ رجب ۹۸۷ھ میں ایک محضر تیار کیا گیا جس میں اکبر کو "خلیفۂ عصر اور امام زمان" تسلیم کیا گیا تھا، اور قرآن پاک کی آیت اور احادیث سے "امام عادل" کی اطاعت فرض بتائی گئی تھی، اور آخر میں اس کو مختلف فیہ مسائل میں اجتہاد کا رتبہ بخشا گیا تھا، اس محضر میں اکبر کے لئے حسبِ ذیل خطابات لکھے گئے تھے،

---

[۱] تاریخ بدایونی جلد اول ص ۳۷۰،

حضرت سلطان الاسلام، کہف الانام، امیرالمومنین ظل اللہ فی العالمین کلمۂ طیبہ کے بجائے لاالٰہ الااللہ اکبر خلیفۃ اللہ درباریوں کا کلمہ قرار پایا، محضر مذکور پر علماء سے زبردستی دستخط کرائے گئے، اکبر کی بدنامی کی خبریں دور دور تک پھیلیں، اہالی توران نے اکبر کو طعن آمیز خط لکھا، قطب الدین خاں نے برسر دربار کہا کہ ولایت کے بادشاہوں کو مثلاً سلطان روم وغیرہ کو جب اس کا حال معلوم ہوگا تو ہماری کس قدر بدنامی ہوگی، اکبر نے جھنجھلا کر کہا کہ "تو سلطان روم کی طرف سے غائبانہ اُن کا حمایتی بن کر آیا ہے تاکہ یہاں سے نکلنے پر وہاں تیری عزت و منزلت ہو، جائیے وہیں تشریف لیجائیے"، اکبر کے اصل الفاظ بدایونی میں یہ ہیں :-

"تو برائے خاطر خوندکار روم غائبانہ از جانب او ایں درشتی می کنی وجائے از برائے خود دستہ کہ از ینجا بروی پیدا کردہ تا اعتبار یابی ہمانجا برو"

(جلد ۲ ص ۲۷۴)

تم نے فریقین کی اس سخت و درشت گفتگو کو سُنا، اور اس کا مطلب سمجھا برائے خدا مجھے یہ بتاؤ کہ جو مطلب میں سمجھتا ہوں، یا سمجھنا چاہتا ہوں، اگر وہ غلط ہے، تو اس دعوائے امامت و خلافت و تجدید دین کی مخالفت کو سلطان روم کی خاطر داری و بہی خواہی و جانب داری کے الزام سے کیا تعلق ہے؟

- اس اکبری جاہ و جلال و نصرت و اقبال کے عالم میں حج کے راستہ کی یہ حالت ہوگئی تھی کہ ہندوستان کے صدر مذہبی نے یہ فتویٰ دیدیا کہ چونکہ خشکی کا راستہ قزلباشوں نے اور دریا کا راستہ فرنگیوں نے بند کر دیا ہے، اس لئے فریضۂ حج ساقط ہوگیا ہے، ہندوستان کے بندروں سے حجاز کو جہازات کا جانا بغیر اس کے ممکن نہ تھا، کہ فرنگیوں سے اجازت (قول) کا

سلہ یہ سلاطین عثمانیہ کا مذہبی لقب تھا،

عار اٹھایا جائے، تخت آگرہ کا امام عادل یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا، اور کچھ نہ کر سکتا تھا امرائے اکبری کے بڑے بڑے ارکان خانخاناں، مرزا عزیز کوکہ، شیخ عبدالنبی، مخدوم الملک، اعتماد خاں، سلطان جہاں سب اسی ذلت کے ساتھ گئے، اور واپس آئے[1] لیکن مجھے کچھ اور کہنا ہے تیموری دربار کے یہ امرائے نامدار اور علمائے ذوی الاقتدار سفر حج کے لئے گئے لیکن سمندر کے اس پار پہنچ کر موسم خلیل کے سب سے بڑے اسلامی مجمع میں منبر خطابت سے جو موج ہوا بلند ہوئی کیا انھوں نے اس میں سلاطین آل عثمان کا نام سنا یا آگرہ کے خلیفہ عصر اور امام زماں کا؟

مرزا عزیز کوکہ، اکبر کا رضاعی بھائی تھا، دربار کا امیر کبیر تھا لیکن ساتھ ہی نہایت ہی سیدھا سادھا، دیندار نیک اعتقاد تھا، جب ۱۰۰۲؁ھ میں یہ ہندوستان سے چلا تو اس کا جہاز یمن جا کر لگا حسن پاشا والی یمن نے نہایت شان وشوکت سے اس کا استقبال کیا اور مرزا نے ہندوستان کے تحفے اور ہدیے پاشا کے سامنے پیش کئے[2]

مدت سے یہ دستور چلا آتا تھا کہ سلطنت تیموری ہر سال ہندوستان کی طرف سے ایک امیر حاج مقرر کر کے اوس کے ساتھ چار لاکھ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی خدمت گذاری کے لئے بھیجا کرتی تھی، اکبر نے بھی اس رسم کو جاری رکھا، یہ روپیہ عموماً گجرات کے خزانہ سے بھیجا جایا کرتا تھا، اسی لئے گجرات کی تاریخوں میں اس کا بکثرت ذکر ہے، شوال ۹۸۶؁ھ میں جب اکبر اجمیر میں تھا، خواجہ احرار کی اولاد میں سے خواجہ محمد یحییٰ کو میر حاج بنا کر اور چار لاکھ روپیہ ساتھ دے کر مکہ معظمہ روانہ کیا[3] ۹۸۷؁ھ میں میر ابو تراب میر حاج بنائے گئے، اور لاکھوں روپے نقد و سامان اون کو دیئے گئے، کہ شریف مکہ کے مشورہ سے وہاں علما و مشائخ

---

[1] دیکھو فرشتہ تاریخ ملیبار [2] کتاب روح الروح قلمی واقعات سنہ ۱۰۰۲ [3] بدایونی جلد ۲ صفحہ ۲۴۶

اور فقرا میں تقسیم کر دیئے جائیں۔[۵۱]

اکبر کے بعد جب جہانگیر نے عنانِ سلطنت اپنے ہاتھ میں لی تو سلطان روم نے آقم نام ایک سفیر اس کے دربار میں بھیجا، لیکن صرف اس شبہہ پر کہ درباریوں نے اس کی شناخت نہیں کی، اوس کو قبول نہیں کیا، چنانچہ خود تزک جہانگیری میں لکھتا ہے :-

"آقم نام حاجی ماوراء النہری کہ مدتہا در روم بود خالی از معقولیت و معرفتے نیست، خود را ایلچی خوندکار (سلطان روم) گفتہ در آگرہ ملازمت کرد، کتابت مجہولی نیز داشت، نظر باحوال و اوضاع او کردہ ہیچ کس از بندہاے درگاہ تصدیق بایلچی بودن او نکردند، از زمانے کہ حضرت صاحب قرانی (تیمور) فتح روم کردہ ایلدرم بایزید حاکم آنجا زندہ بدست افتاد و بعد از گرفتن پیشکش و تحصیل مال یکسالہ کل ولایت روم قرار دادند، کہ بدستور ملک مذکور را بتصرف باز گذارند، درہمیں اثنا ایلدرم بایزید وفات یافت ملک را بہ پسرا و موسیٰ چلپی مرحمت کردہ خود معاودت فرمودند تا حال از جانب قیاصرہ آنجا باوجود چنیں احسانے کس نیامدہ و ایلچی نفرستادند، الحال چہ گونہ باور تواں کرد کہ ایں شخص ماوراء النہری فرستادہ خوندکار باشد اصلا ایں سخن معقول من نیفتاد، ہیچ کس بر صدق دعویٰ او گواہی نداد بنا بر ایں فرمودم کہ ہر جا کہ خواستہ باشد برود" (ص ۹۶ تا ۷۰)

اس عبارت سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ خاندانی رقابت کا شعلہ اب تک تیموری شہزادے کے سینے میں بھڑک رہا ہے، بہرحال ترکوں نے رشتہ برادری جوڑنے کے لئے اپنی پیش قدمی ظاہر کر دی،

---

[۵۱] تاریخ گجرات ابو تراب ص ۹۶، کلکتہ،

جہانگیر کی اس خشکی اور ترشروئی کی تلافی اس کے نیک دل اور زود آشنا بیٹے شاہجہاں نے کردی ۱۰۴۹ھ میں جب سلطان محمد رابع بغداد کی فتح کے لئے عراق آیا ہوا تھا، ظریف نام ایک قاصد کو گرانبہا تحائف دے کر عراق روانہ کیا، سلطان نے نہایت عزت و محبت سے قبول کیا، اور ارسلان آقا ایک ترکی قاصد کو اس کے جواب میں نہایت عمدہ خاصہ کے دو گھوڑے مع مرصع طلائی ساز و سامان کے اور مروارید باف عبا دے کر شاہجہاں کے پاس بھیجا، ارسلان آقا کے پہونچنے سے پہلے ٹھٹھہ اور ملتان کے صوبیداروں کے نام احکام بھیج دیے گئے تھے، کہ منزل بہ منزل عزت و تکریم سے اسکو پہنچاتے جائیں اور ملتان کے خزانہ سے دس ہزار روپیہ اسکو سفر خرچ دیے جائیں، (خافی خاں واقعات ۱۰۴۹ھ)

مرآۃ احمدی نام گجرات کی ایک تاریخ ہے، مصنف صوبہ گجرات کا دیوان تھا، اسلئے تمام سرکاری کاغذات تک اس کی رسائی تھی، ذیل میں شاہجہاں کی فیاضیوں کے، اور سلطان روم اور حرم محترم کی بجا آوریِ خدمات کے واقعات اس کے مختلف صفحات سے لے کر یکجا کر دیئے جاتے ہیں،

۱۔ شاہجہاں نے ۱۰۴۱ھ میں دیوان خواجہ جہان کو حرمین کی اجازت دی، پانچ لاکھ روپیہ تاجپوشی کی نذر مانی گئی تھی، ازاں جملہ فی الحال ۲ لاکھ ۴۰ ہزار روپیہ کا مال حسب مذاق اہلِ عرب احمد آباد اور سورت سے خرید کر، خواجہ صاحب کے ساتھ بھیجنے کا حکم متصدیان صوبۂ گجرات کے نام صادر ہوا، حکیم مسیح الزمان بھی رخصت حج لے چکے تھے، حکم میں لکھا تھا کہ سارا مال انہی کی رائے سے تقسیم ہوگا،

۲۔ ۱۰۴۲ھ میں حکیم ابو القاسم حکیم الملک کو اجازت حج و زیارت ملی، اور متصدیان گجرات کے نام حکم صادر ہوا کہ ۶۰ ہزار کا اسباب منجملہ رقم نذر دی جائے،

۳- ۱۰۵۰ھ میں احمد آباد کے کاریگروں سے خوشبودار عنبر کی ایک قندیل نہایت خوبصورت سات سو تولہ کے وزن کی بنوائی گئی، صناعوں نے مرصع کاری سے جواہر بے بہا قندیل میں جوڑ دیئے تھے، سارے جواہرات میں الماس کا ایک دانہ نہایت پاکیزہ تھا، ایک لاکھ قیمت تھی، اور قندیل کا سارا خرچ ملا کر ڈھائی لاکھ صرف ہوئے تھے، یہ قندیل بحکم حضور روضۂ نبوی کے لئے بنائی گئی تھی، ۱۰۵۰ھ میں تیار ہوگئی، ناظم صوبہ نے سید احمد سعید کے ہمراہ حضور میں بھجوادی، بادشاہ نے ملاحظہ فرماکر بہت پسند کی، اور حکم فرمایا کہ سید مذکور کے ہمراہ قندیل مدینہ طیبہ بھیجی جائے، متصدیان احمد آباد کے نام حکم ہوا کہ ایک لاکھ ۶۰ ہزار روپئے کا اسباب حسب مذاق عرب خرید کر سید صاحب کے سپرد کیا جائے تا عتبات کے مستحقین میں صرف ہو، اور یہ رقم اسی مد میں لکھی جائے، مگر تقدیر کہ ہوا کچھ ایسی چلی کہ جہاز پھر پھرا کر سورت واپس آگیا،

۴- ۱۰۶۰ھ میں فراست خاں نواب ناظر محل شاہی کو حرمین کی اجازت ہوئی، چلتے وقت ۵۰۰ اشرفی زاد راہ دیا گیا، اور ایک لاکھ ۵۰ ہزار روپیہ کا مال واسباب احمد آباد سے

. . . . دلایا گیا، کہ اُن میں سے ۵۰ ہزار کا

مال شریف مکہ زید بن محسن کو، اور ۵۰ ہزار کا سادات علماء و فضلاء و گوشہ نشینان مکہ معظمہ کو، اور ۵۰ ہزار کا مدینہ طیبہ کے فقراء و مساکین کو تقسیم کیا جائے،

۵- اسی سال سلطان محمد خاں والی روم کے ایلچی سید محی الدین (از اولاد شیخ عبدالقادر جیلانی) کے سورت میں وارد ہونے کی خبر متصدی بندر کی تحریر سے حضور میں گذری، ایک خلعت اور فرمان گرز بردار کے ساتھ ایلچی کے پاس بھیجا گیا، اور ۱۰ ہزار روپیہ خزانہ سورت میں ایلچی مذکور کو سفر خرچ کے دیئے گئے،

۶۔ ۱۰۶۱ھ میں ایلچی رخصت ہوا، حاجی سعید احمد کے ہمراہ سورت آیا، حاجی صاحب بار دیگر تنزیل مذکور پہنچانے کو مامور کئے گئے تھے، متصدیانِ بندر سورت کو تاکید کی گئی کہ ایک لاکھ روپئے کا اسباب حسبِ مذاق اہل عرب حاجی مذکور کو بغرض تقسیم مستحقین مکہ معظمہ سپرد کیا جائے،

۷۔ متصدی بندر سورت کی عرضداشت سے حضور میں دریافت ہوا کہ فرمانروائے روم سلطان محمد خاں کا ایلچی ذوالقدر آقا برادر وزیر اعظم صالح پاشا مع نامہ و پیام ۲۹ر صفر ۱۰۶۳ھ کو وارد سورت ہوا، حکم ہوا کہ بارہ ہزار روپیہ ایلچی مذکور کو خزانہ سورت سے دیئے جائیں،

۸۔ اُسی زمانہ میں قلتِ غلہ سے بے نوایانِ مکہ معظمہ کی محتاجی اور تکالیف حضور میں گذری، سُن کر بادشاہ نہایت متاسف ہوا، ۱۶ر جمادی الثانیہ ۱۰۶۴ھ میں خواجہ صاحب کا انتخاب ہوا خلعت سے سرفرازی دے کر حرمین شریفین کی اجازت اُن کو دی گئی، چلتے وقت ایک لاکھ روپئے کا مال و اسباب حسب مذاق عرب سورت سے اُن کے حوالہ کیا گیا کہ ازانجملہ ایک حصہ شریف مکہ کو، دوسرا صلحا و فضلاء کو اور تیسرا مدینہ طیبہ کے زاویہ نشینوں کو دیا جائے،

کارخانۂ ملتان میں ایک جانماز مطابق نمونۂ مسجد نبوی بنوائی گئی تھی، اگرچہ حضور کے پسند خاطر نہ تھی تاہم خواجہ صاحب کے ساتھ مدینہ منورہ بھیجی گئی،

یہ ایک سرکاری افسر کے روزنامچہ کے سادہ واقعات ہیں، خافی خاں کے حوالہ سے اس سفارت کے واقعہ کی کسی قدر تفصیل لکھی جاتی ہے،

۱۰۶۶ھ میں بندر سورت کے متصدی نے عرضی گذرانی کہ سلطان محمد خان قیصر روم

کی طرف سے ذوالفقار آقا خط اور تحائف لے کر وارد ہوا ہے، حکم ہوا کہ گوز برداروں کے ساتھ بندر سورت کے خزانہ سے ۱۲ ہزار روپیے سفر خرچ دے کر روانہ کیا جائے، اور ۵ ہزار سلطان پور نندربار کے فوجدار اور ۱۲ ہزار برہان پور کی دیوانی سے اور ۵ ہزار اجین کی دیوانی سے اور ۱۲ ہزار اکبرآباد کے خزانہ سے ادا کئے جائیں، اور یہ بھی حکم ہوا کہ اس کے علاوہ صوبہ دار اپنی طرف سے بھی اُس کی خدمت کریں، اس طرح منزل بہ منزل طے کرتے ہوئے سفیر جب دارالحکومت کے قریب پہنچا، تو حکم ہوا کہ لشکر خان بخشی اور طاہر خان کو اُس کے استقبال کے لئے جائیں، اور اپنے ساتھ لاکر حضور میں پیش کریں، سفیر نے قیصر کا خط اور دو گھوڑے جن کے ساز طلائی تھے، اور زین میں موتی ٹنکے تھے، اور گرز مرصع کار جو اس ملک کے سلاطین کا خاص ہتھیار ہے پیش کیا، بادشاہ نے خط کو باعزاز تمام لیا، اور سفیر کو ۲۰ ہزار روپئے نقد اور سا گجہ (عطر) کے تین پیالے، اور ایک طلائی پاندان عطا کیا، اور ایک سرکاری مکان میں جہاں جملہ سامان مہیا تھے، اتارنے کا حکم دیا، اسی درمیان میں شہزادہ سلیمان شکوہ کی شادی رچی، اس جشن کی تقریب سے ۲۰ ہزار روپئے سرکار سے، ۲۵ ہزار شاہزادہ کی طرف سے، اور ۱۵ ہزار ملکۂ دوراں نواب قدسیہ کی جانب سے مع دوسر جڑاؤ اسامانوں کے کل تقریباً ایک لاکھ روپیہ نقد و جنس سفیر کو مرحمت ہوا، قائم بیگ ایک ملازم جو ترکی و عربی بولتا تھا، نگراں مقرر ہوا، ایک مرصع خنجر جس کے قبضہ میں بیش بہا موتی، اور ایک گراں قیمت لعل جڑا ہوا تھا، اور جس کی قیمت ایک لاکھ تھی، اور ایک مرصع کمر بند جس کی قیمت ۴۰ ہزار تھی، اور دو ہزار تھان سادہ اور زری کے کپڑے بنگالہ، احمدآباد، اور برہان پور کی ساخت کے جن کی لاکھ روپیہ قیمت تھی، اور ۵۰ تولے عطر جہانگیری جس کی قیمت اس زمانہ میں ۴ ہزار سے زیادہ تھی، اور دوسرے تحائف سلطان کے لیے اس کے حوالہ کیے گیے، اور علامی سعد اللہ خان وزیر کا لکھا ہوا سلطان کے نام ایک عربی خط دیا گیا،

سفیر موصوف سے یہ سن کر کہ قسطنطنیہ میں آجکل طاعون ہے، بادشاہ نے سو دانے موتیوں کی تسبیح جس کا امام زہر مہرہ کا تھا، اور جو ہمیشہ بادشاہ کے بازو پر بندھی رہتی تھی، تحائف میں داخل کردی، سفیروں کے ساتھ خان جہان ایک امیر کو احمد آباد اور سورت سے ایک لاکھ روپیہ کا مال دے کر مکہ معظمہ روانہ کیا، کہ ان میں ایک تہائی شریف مکہ کو دیا جائے، اور باقی حرم کے علماء اور مستحقین میں تقسیم کیا جائے، ملتان کے شاہی کارخانہ میں مسجد نبوی کے عرض وطول کے برابر ایک نہایت عمدہ قالین تیار کرایا گیا تھا، وہ بھی ساتھ کردیا گیا،

ناظرین! تم نے تاریخوں میں والی توران اور دارائے ایران کے درباروں سے بھی بارگاہ تیموری میں قاصد اور سفرا آتے ہوئے دیکھے ہیں، کیا اس اعزاز، اس مسرت، اس فیاضی اور اس عقیدت کا سماں بھی وہاں تم کو نظر آیا، اس فرق مراتب کی تم کوئی صحیح توجیہ سوا اس کے کیا کرسکتے ہو کہ یہ خادم الحرمین الشریفین کی بارگاہ کا قاصد تھا، اور جو کچھ اس کے ساتھ کیا گیا، اور سلطان کے حضور میں جو کچھ بھیجا گیا، اور حرمین کے لئے جو تحائف قاصد کے ساتھ ارسال کئے گئے، وہ شاہ جہاں کا ولولۂ دین پرستی اور جوش مذہبی تھا،

ناظرین کو حسرت ہوگی کہ یہ شاہی مراسلات اگر آج تاریخوں میں محفوظ ہوتے، تو کس قدر بیش قیمت چیز ہوتی لیکن میں انھیں تسلی دیتا ہوں کہ اگر مورخین نے اُن کی قدر و قیمت کو نہیں پہچانا تو ہمارے ادیبوں اور منشیوں نے اُن کی اہمیت کا صحیح اندازہ کرلیا تھا، سلاطین اور شہزادوں کے خطوط و مراسلات کا ایک بڑا قلمی مجموعہ موسوم بہ فیاض القوانین[۱] اس وقت میرے سامنے ہے، اور اس میں یہ تمام مراسلات موجود ہیں، ان میں والیان توران کے معاملات کے متعلق دوستانہ سفارشیں اور جوابات ہیں، شاہجہان اپنے عربی خط مورخہ شعبان سنہ ۱۰۶۱ھ

---

[۱] یہ نادر مجموعہ ہمارے مخدوم نواب حسام الملک مولوی سید علی حسن خان کا مملوکہ ہے، مولانا شبلی

یں سلطان کو حسب ذیل القاب سے یاد کرتا ہے:۔

"الی من الیہ مآب الشوکۃ وآیات الحشمۃ رفیع المکان منبع الشان بسمو المرتبۃ سماء دعلو المراتبۃ بیضاء معلی الویۃ السیاسۃ باسط الریاسۃ مشید ارکان الشریعۃ الحنفیۃ ومؤید احکام الملۃ الحنیفیۃ، مقاتل الشرار الزنج مقاتل الافرنج عالی الحضرۃ سامی الرتبۃ، سلالۃ خواقین الروم، ناصر الملھوف والمظلوم، مورد الطاف الکریم المفضال، مھبط اعطاف الکبیر المتعال، شمسا للرفعۃ والعزۃ والبسالۃ والعظمۃ والشان، السلطان محمد خان لازالت شموس سلطنۃ ثابتۃ عن الزوال واتمام دولتہ علی الکمال"

سلطان محمد خاں کی طرف سے شعبان ۱۰۶۳ھ میں اس کا جواب شاہجہاں کے نام بھیجا گیا جس میں اولاً شاہجہاں کے لئے حسب ذیل القاب ہیں،

"بجانب عالی حضرت، معالی منقبت، گردوں رفعت، فریدوں شوکت، خورشید اضاءت، جمشید نباہت، دارا درایت، عطارد فطنت، مشتری کیاست، مسند آرائے سلطنت ممالک ہند، فرمانروائے اقلیم سند، مظہر الطاف جلی وخفی، حارس حوزۂ کابلستان وغزنین، جالس اورنگ، اقلیم نصرت آئین، المختص بمزید عنایۃ الملک المستعان ابو المظفر شہاب الدین، محمد صاحبقران ثانی بادشاہ غازی"

آگے چل کر سلاطین آلِ عثمان کے مفاخر میں لکھا ہے:۔

(بقیہ حاشیہ ص ۱۷۰) مرحوم نے مضامین عالمگیر میں جب سے اس کا حوالہ دیا ہے، اس کی متعدد نقلیں انگلستان اور ہندوستان کے مشہور کتب خانوں نے حاصل کی ہیں،

"بر علم عالم آرائے ایشان (شاہجہاں) مخفی و مستور نیست کہ حضرت حق فیاض مطلق ایں دودمان عظیم الشان، آلِ عثمان راکہ بلطف ربانی وعون سبحانی محفوف بادہ برائے احیائے مراسم دین مبین واحکام شرع متین برپا دیا برجا کردہ، واجداد وامجاد ماکہ سلاطین پاک گوہراند وخواقین معدلت گستر ند، ازیں قدر عہد بعید وزمان مدید تاحال بتقدیم مساعی جمیلہ وخدمات دینیہ جزیلہ موصوف اند و باعانت وامداد ضعفا مشہور ومعروف"

اس کے بعد لکھا ہے کہ والی توران نے ہماری بارگاہ میں آپ کی سختی و تعدی کی فریاد کی ہے:-

"برائے قطع رگ نزاع وجدل وحل عقدۂ سخت اشکال بے محل بسوب درگاہ پناہ وخلافت دستگاہ، تضرع نامۂ کنگب گویلے او آمدہ"

اس لئے میں نے وہ محبت نامہ لکھا:-

"بموجب حمیت دینیہ ورافت نوعیہ وہمت ملکیہ، درباب منزول واشتیں ملتمس او (والی توران) مکتوب محبت اسلوب ارسال داشتہ"

سفیر کی نسبت لکھا ہے کہ

"تبلیغم قوائم سریر خلافت مصیر با سر فراز کردہ شد"
(بوسہ پایہ)

سلطان کا یہ خط ۱۰۶۳ھ میں ہندوستان پہنچا، شاہجہاں کو اس خط کا عالم لہجہ پسند نہ آیا، اور سلطان کو ایک اور دوسرا شکایت آمیز فارسی خط لکھا، جس کے القاب یہ ہیں:-

بحشمت نصاب، عظمت مآب، بہرام صولت، مشتری سیما، کیوان منزلت بغیا

ضیا، مزین، جاوجہاں بانی محسن بساط کامرانی، رافع الویہ دین مبین، ناصب اعلام شرع متین، محارب اشرار زنگ، مجادل فجار فرنگ، عالی حضرت فلک رفعت فرمانروائے بلاد روم حامی ملہوف ومظلوم، المخصوص بوفور لطف الکریم المنان سلطان محمد خان"

میں نے ان خطوط کے القاب اس لئے نقل کئے ہیں کہ تاریخوں میں کتب انشا میں ابوالفضل کے دفتروں میں فرمایان توران اور شاہان ایران کے نام خطوط درج ہیں، ان کو پڑھ کر آسانی سے ہمارے ناظرین فیصلہ کر سکتے ہیں، کہ ان میں برادرانہ اور مساویانہ طرز خطاب ہے تو ان میں فرق و امتیاز، بزرگی کی نگہداشت، اعلائے دین و نشرحیا اور دیگر خدمات مذہبی کا اعتراف و تسلیم بھی ہے۔

شاہجہاں کے پرامن عہد کی تفصیل میں صفحات کچھ زیادہ لگ گئے، لیکن بہرحال وہ ضروری تھے، اب عالمگیر کا عہد آتا ہے، اس کے زمانہ میں دلی اور قسطنطنیہ کے تعلقات واضح نظر نہیں آتے، . . . .

. . . . لبتہ دستور قدیم کے مطابق کبھی ہندوستانی امرا، اور علماء اور میر حاج کی معرفت، اور کبھی شرفائے مکہ کے وکیلوں کی معرفت حرمین کی اعانت اور امداد کی رقم برابر جاری ہے ۱۱۰۲ھ میں میر عزیز بدخشی نے جو مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ نذر دے کر بھیجا گیا تھا، وہیں انتقال کیا،

(مرأۃ احمدی)

عالمگیر کے بعد ہندوستان کی تیموری طاقت کا زوال ہونے لگا، تاہم سنہ ۱۲۰۱ھ کے ایک ہندوستانی حاجی ساکن مرادآباد شہادت دیتے ہیں کہ محمد شاہ کے زمانہ تک دستور قدیم

جاری رہا[1]،

اس موقع پر میں ایک اور مسئلہ بھی صاف کر دینا چاہتا ہوں، وفد خلافت لندن کے ایک مضمون کے جواب میں پروفیسر مارگولیوتھ نے لکھا تھا کہ تیموری سلاطین خود خلافت کے مدعی تھے، پروفیسر موصوف کو ہماری فارسی تاریخوں کے مبالغہ آمیز آداب و القاب شاہانہ سے دھوکا ہوا، حقیقت یہ ہے کہ ان چاپلوس اور خوشامدی سرکاری تاریخ نویسیوں نے اس بلند واہم لفظ کی اس قدر مٹی خراب کی ہے کہ ان کے مذاقِ سلیم پر افسوس آتا ہے، اُن کی زبان میں اس لفظ کے معنی صرف "سلطنت اور بادشاہی" کے رہ گئے تھے، اس لئے یہ لفظ نہ صرف اکبر و جہانگیر و شاہجہاں و عالمگیر کے لئے وہ استعمال کرتے ہیں، بلکہ عام شاہزادوں، بلکہ ایران کے شیعی سلاطین صفوی، بلکہ ایک عیسائی بادشاہ تک کے لئے استعمال کرنے میں انھوں نے دریغ نہیں کیا ہے اور نہ اس احمقانہ خیال کو کون دل میں جگہ دے سکتا ہے، کہ جن کے نام ہندوستان سے باہر دوسرے اسلامی ملکوں میں کبھی سُننے بھی نہ گئے ہوں، وہاں کی ریاست دینی کا اُن کو دعویٰ تھا، یہ تخیل ہندوستان کے تیموری سلاطین کے حاشیۂ گمان میں بھی نہ تھا، اُن کی کوششوں کا جولانگاہ جو کچھ تھا، وہ ہندوستان اور صرف ہندوستان تھا،

لیکن اس امر سے انکار نہیں کیا سکتا، کہ ہندوستان میں جب تک تیموری سلطنت پُر زور رہی، یہاں کی مسجدوں میں سلاطین ٹرکی کے نام کا خطبہ نہیں پڑھا گیا، اور اس کی ضرورت بھی نہ تھی، مقامی سلاطین کے نام اس کے لئے کافی تھے، مگر جیسے جیسے ملک کے مختلف گوشوں سے اُن کا اثر ہٹنے لگا، اور مختلف اطراف اور صوبے انگریزوں، فرانسیسیوں، پرتگیزوں اور دوسرے

---

[1] واقعات الحرمین قلمی موجودہ کتب خانہ نواب نور الحسن خاں مرحوم لکھنؤ،

کے ہاتھوں میں یا مقامی نوابوں کے قبضہ میں جانے لگے سلطان ترکی کا نام وہاں کی مسجدوں اور محرابوں میں رونق کا باعث ہونے لگا، ۱۱۷۵ھ میں یعنی آج سے ۱۶۲ برس پہلے دکن کے ایک بزرگ سید قمر الدین اورنگ آبادی حج سے واپسی میں سیلون پہونچے تھے، میر آزاد بلگرامی اُن کے حوالے سے سبحۃ المرجان میں لکھتے ہیں، کہ

"ساحلی مقامات میں ڈچوں کی حکومت ہے، اور اندرون ملک میں ہندو راجہ ہے، یہاں کے مسلمان بادشاہ ہند اور سلطان روم کے نام کا خطبہ پڑھتے ہیں، کہ وہ خادم الحرمین الشریفین"

اس وقت ہندوستان کی بساط پر جو یورپین شاطر اپنی اپنی قسمت کے پانسے ڈال رہے تھے، اُن سب کو معلوم تھا کہ اس ملک کے مسلمانوں کے دلوں میں سلطان کی عقیدت کا کتنا گہرا نقش ہے، اور بحیثیت خلیفۂ اسلام ان کی اطاعت کو وہ کس قدر فرض جانتے ہیں، چنانچہ اس عہد کے انگریز و فرانسیسی دونوں قوموں کے کھلاڑی اپنی بازی کی جیت کے لئے سلطان ہی کے نام سے پانسے ڈالنے لگے، دونوں نے اپنی کامیابی کا ذریعہ یہ سمجھا کہ وہ اپنے کو سلطان اور خلیفۂ اسلام کا دوست اور حلیف اور دوسرے کو مخالف اور دشمن ثابت کریں، فرانسیسیوں نے اس باب میں جو کوششیں کی ہیں، ان کا کسی قدر بیان علامہ جبرتی کی تاریخ مصر (جلد ۳) میں ہے، انگریزوں کی کوششوں کی روداد ایک انگریزی تاریخ میں موجود ہے، جو ۱۸۰۰ء میں سرکاری کاغذات کی مدد سے مرتب کی گئی ہے، اس کتاب کا عنوان یہ ہے، A Review of The origin ...... progress and Result

---

لہ چنانچہ سر سید اپنے مضمون خلافت مطبوعہ تہذیب الاخلاق میں اپنی ذاتی واقفیت سے لکھتے ہیں کہ شاہ عالم کے بعد مسجدوں میں سلاطین روم کے نام خطبوں میں لئے جانے لگے،

-of the decisive war with the late Tipu sultan

نیز حیدر علی اور ٹیپو سلطان کی فارسی تاریخ کارنامۂ حیدری میں یہ مراسلات درج ہیں، چار سال ہوتے ہیں کہ معارف (فروری ۱۹۱۸ء) کو ان خطوط کے انکشاف کا فخر سب سے پہلے حاصل ہوا ہے، ٹیپو سلطان کے تعلقات براہ راست سلطان سے قائم تھے، مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے راستہ سے (غالباً موسم حج کے تعلق سے) باہم خط وکتابت جاری تھی، اس زمانہ میں ارل آف مارننگٹن (مارکوئیس آف ولیسلی) ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے ہندوستان کے گورنر جنرل تھے، اور مسٹر اسپنسر قسطنطنیہ میں برطانوی سفیر تھے، انگریزوں نے سفیر مذکور کی وساطت سے سلطان ٹیپو کے نام، ۲۰ ستمبر ۱۷۹۸ء کو سلطان سلیم ثالث کے دربار سے ایک خط حاصل کیا، خط عربی زبان میں کئی صفحوں میں ہے، اس کا ماحصل یہ ہے کہ "فرانسیسی بڑے غدار ہیں، بے دین ہیں، اسلام اور مسلمانوں کے دشمن ہیں، اور انگریز ہمارے دوست اور مددگار ہیں، اس لئے فرانسیسیوں سے کوئی تعلق نہ رکھو، اور انگریزوں سے صلح کرو، ۱۶ جنوری ۱۷۹۹ء کو یہ خط سلطان ٹیپو کے پاس بھیجا گیا، اور اس کے ساتھ گورنر جنرل مذکور نے ایک خط خود اپنی طرف سے لکھا جس کے حسب ذیل فقرے عبرت افزائے چشم بصیرت ہیں،

"آپ کے لئے بہتر ہے کہ تمام مذاہب کے دشمن اور خلیفۂ اسلام پر حملہ کرنے والے فرانسیسیوں سے ہر قسم کے تعلقات منقطع کر کے اپنا جوش اسلامی دکھائیں، اور امید ہے کہ جب آپ نامۂ سلطانی کو پڑھیں گے، تو آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ فرانسیسیوں نے مسلمانوں کے مسلم خلیفہ کی توہین کی ہے، اور ان پر حملہ آور ہوئے ہیں، اور بے وجہ اس ملک (مصر و شام) میں ظالمانہ جنگ شروع کی ہے جس کی ہر مسلمان عزت کرتا ہے، اور جس کو

مذہب اسلام کی یادگاروں کا خزینہ سمجھتا ہے "

سلطان ٹیپو نے سلطان سلیم کے اس خط کا نہایت مختصر جواب عربی میں لکھ کر بھیجا جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے :-

" اُس خدا کی حمد جس نے اسلام کو بڑے بڑے سرداروں کی نگہبانی سے زینت بخشی، اور جس نے مذہب کی بنیاد کو برگزیدہ بادشاہوں کے نظم و نسق سے مضبوط کیا، درود وسلام ہو اُس کے پیغمبر محمدؐ پر، اور اُن کے آل واصحاب پر جو خیر الانام علیہ السلام کے طریقہ کے مددگار تھے، بعد ازیں: وارثِ مرتبۂ سلیمانیہ، جامع رموزِ حکمتِ لقمانیہ، مظہر قدرتِ الہیہ، موردِ کراماتِ غیر متناہیہ، مجمعِ علوم و حکم، کانِ بلندی ہمت، مقدمۂ لشکر فتح و ظفر، منتخب کتاب قضا و قدر، تری اور خشکی کے بادشاہ، دنیا میں خداوند تعالیٰ کے خلیفہ سلطان روم، خدا اُن کی حکومت، خلافت کو ہمیشہ قائم رکھے، کی جناب میں گذارش ہے کہ نامۂ عالی نہایت اچھے وقت میں پہونچا، اور اس کے مضامین سے آگاہی ہوئی جس میں کہ فرانسیسی قوم کی بُرائیاں اور اہلِ اسلام کے ساتھ اُن کی دشمنی اور اُن کا یہ ارادہ کہ دنیا سے تمام مذاہب کو اُکھاڑ پھینکیں، اور انگریزوں کی حمایت اور جناب عالی کا یہ عزم کہ خونریزی بیچ میں پڑ کر ہمارے اور اُن کے درمیان تصفیہ کرا دیں، اور جناب کا یہ حکم کہ ہمارے اُن کے درمیان جو وجوہِ مخالفت ہیں، اُن کو ہم بیان کریں مندرج تھا، آستانۂ والا پر مخفی نہیں ہے کہ ہماری غرض خدا کے راستہ میں جہاد اور دینِ الٰہی کے سررشتۂ امور کو درست کرنا ہے، یہ آپ نے صحیح فرمایا ہے کہ فرانسیسی قوم میں دینداری نہیں، اور ہم اُن کی بُرائیوں سے بہت اچھی طرح واقف ہیں لیکن آج کل انگریز ہم سے لڑنے آئے ہیں، اور انھوں نے سامانِ جنگ

تیار کیا ہے، اس بنا پر ہم پر بلکہ تمام مسلمانوں پر اُن سے جہاد فرض ہے، آستانۂ والا سے امید ہے کہ خاص اوقات میں ہمارے لئے دعا فرمائیں، اور اپنی دعا اور محبت سے ہماری مدد فرمائیں، اسی کی جناب سے درخواست ہے اور خدا ہمارے اور آپ کے لئے کافی ہے،

اور ہم نے اس سے پہلے سید علی محمد اور مدار الدین کی معرفت اس سے پہلے خط لکھا ہے، جس میں بہ تفصیل اپنی باتیں بیان کی ہیں، اور نیز ایک دوسرا خط یوسف وزیر کی وساطت سے مدینہ منورہ کی راہ سے ارسال کیا ہے، ان خطوط سے ہمارے دلی خیالات بہ تشریح و تفصیل جناب والا پر واضح ہوں گے، درود ہو پیغمبر محمد پر اور اُن کے نیک آل و اصحاب پر رضؓ،

کیا اس خط کے بعد بھی مسئلۂ ہندوستان و خلافت عثمانیہ میں کوئی شک و شبہ باقی رہ جاتا ہے،

۱۲۱۳ھ میں ادھر انگریزوں نے سرنگاپٹم پایۂ تخت میسور پر قبضہ کیا، اور سلطان ٹیپو نے شہادت پائی، اور اُدھر مصر کو فرانسیسیوں نے فتح کر لیا، سلطان شہید کے مزار واقع سرنگاپٹن (میسور) کی دیوار پر متعدد عربی و فارسی کے اشعار و قطعات تاریخ کندہ ہیں جن میں سے دو ایک شکستہ عربی شعروں کی حسب ذیل عبارت ہے،

ان اخذت مصر کما قد	اگر مصر فتح کر لیا گیا، جیسا کہ لوگ
ذکروا والسرنج فقد	بیان کرتے ہیں، اور سرنگاپٹن بھی
قد اخذت،	فتح ہو گیا،
مصیبۃ ما مثلها ارّختها	تو ایک ایسی مصیبت ہے، جس کی نظیر نہیں، میں نے اس واقعہ کی تاریخ یہ کہی ہے،

ذهب عزّ الروم والهند کلّها، | کہ روم اور ہندوستان کی تمام عزت خاک میں مل گئی،

اس مختصر لیکن عالمگیر اسلامی اخوت سے متاثر عبارت میں روم اور ہندوستان کے تعلقات کی کس قدر واضح تشریح ہے،

۱۸۵۳ء سے ۱۸۵۶ء تک کی جنگ کریمیا میں برطانیہ نے اپنے مشرقی مقبوضات کی خاطر ٹرکی کا ساتھ دیا، لیکن ٹرکی کو بہت جلد اس اعانت کی تلافی کا موقع مل گیا، ۱۸۵۷ء کے غدر میں کریمیا کی انگریزی فوج اپنے ساتھ مسلمانانِ ہند کے نام دربار سلطانی سے ایک فرمان لائی جس میں خلیفۂ اسلام کی حیثیت سے سلطان عبد المجید نے مسلمانوں کو برطانوی حکومت کی اطاعت کی نصیحت کی تھی، افسوس ہے کہ مجھے اس فرمان کی عبارت اب تک نہیں ملی ہے تاہم یہ اس قدر مشہور واقعہ ہے کہ ہندوستان سے ہزاروں میل دور رہنے والے مسلمان بھی اس سے ناواقف نہیں ہیں، چنانچہ مصطفےٰ کامل پاشا نے اپنی تصنیف مسئلہ مشرقیہ جلد اول ص ۲۱ میں اور تونس کے اخبار الصواب (۴ر فروری ۱۹۲۱ء) نے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے،

موجودہ دیسی اسلامی ریاستوں میں حیدرآباد سے بڑی کوئی اسلامی ریاست نہیں ہے، یہ نہیں معلوم کب سے لیکن یہ واقعہ ہے کہ مکہ مسجد سے لے کر چھوٹی چھوٹی مسجدوں تک میں ہر ہفتہ جمعہ کے خطبہ میں حضور نظام سے پہلے سلطان کا نام لیا جاتا ہے، مکہ مسجد میں یہ نظارہ بھی پیش آتا ہے کہ نمازیوں کی صف میں خود فرماں روائے مملکت نظام موجود ہوتا ہے، اور اس کے سامنے خطیب خادم الحرمین الشریفین کے لئے دعائے خیر کرتا ہے، اور پیچھے سے ہزاروں زبانیں ایک ساتھ آمین پکارتی ہیں،

روم وروس کی جنگِ پلونا میں ہندوستان کے عام مسلمانوں نے بلکہ مسلمان والیانِ ملک نے بڑی فراخ حوصلگی سے چندے دیئے تھے، اس تقریب سے ہماری اسلامی ریاست بھوپال نے بھی اپنا فرض ادا کیا تھا، ۱۲۹۶ھ میں نواب شاہجہان بیگم نے گراں قدر مالی امداد سلطان کی خدمت میں پیش کی تھی، اسی کے ساتھ نواب سید صدیق حسن خان مرحوم نے بھی اپنی جدید تصنیف تفسیر فتح البیان کا ایک نسخہ پیشگاہ سلطانی میں ہدیہ بھیجا تھا، ان ہدایا کے جواب میں بارگاہ سلطانی سے جو فارسی فرمان مورخہ ۱۰ ربیع الاول ۱۲۹۶ھ بمہر خیر الدین پاشا صدر اعظم آیا تھا، اس کی نقل اس وقت میرے سامنے ہے، اصل فرمان نواب صاحب مرحوم کے خاندان میں اب تک موجود ہے، اس فرمان کے حسبِ ذیل اقتباسات بڑے مدعا کے ثبوت کے لئے کافی ہیں،

"بعد از فوزِ اخلاص شمار، بدربار شوکت قرار خلافتِ اسلامیہ، امتثالاً لامر خلق اللہ الشان، (سلطان) کہ بر دقت امت محمدیہ اقدم فرائض است وتشرف یافتن بمسند جلیل وکالت خلیفۂ پیغمبر آخر الزمان صلعم ...... در اثنائے ایں سرور، ارادۂ سنیۂ حضرت خلافت پناہی شرف صادر بودہ ...... حصول التفات جہاں درجات حضرت خلافت پناہی برحق ......: فلہذا امتثال امر مطاعِ خلافت پناہی کردہ ام وبا نامۂ ہمایون[1]

۱۸۷۲ء میں نواب کلب علی خان والی رامپور حج کو گئے، تو سلطان کی طرف سے ان کا شاہانہ استقبال ہوا، ۱۸۷۷ء کی جنگ روس میں نواب صاحب نے ڈیڑھ لاکھ روپے نذر بھیجے، سلطان نے اپنے سفیر حبیب حسین آفندی، کی معرفت اُن کو فرمان اور تمغہ بھیجا[1]،

خلافتِ عثمانیہ کی مخالفت میں فتنہ پردازی کا آغاز ۱۸۹۷ء کی جنگ روم ویونان سے ہوا، چونکہ اس وقت برطانیہ کی ہمدردی واعانت یونان کے شامل حال تھی، اس لئے مقربانِ بارگاہ

---

[1] اخبار الصنادید جلد دوم ص ۱۶۴

کو حصولِ خوشنودی کی فکر ہوئی، سرسید اور اُن کے ساتھ چند اور خطاب یافتوں نے انکارِ خلافت میں مضامین کا سلسلہ شروع کیا، پائنیر ان مستند مفتیوں کی تحریروں کا دارالاشاعۃ بنا، اسی زمانہ میں بمبئی کے مسلمانوں نے فتح یونان کی خوشی میں جشن منایا، سرسید یہ دیکھ کر غصہ سے آگ بگولہ ہوگئے، چند پُر زور مضمون لکھ کر اس فتنہ سے مسلمانوں کو بچانا چاہا، لیکن وہ نہ بچے اور اس دہکتی ہوئی آگ میں کود ہی پڑے، اس زمانہ کے مستند علماء نے، اسلامی اخبارات نے اور عام مسلمانوں نے سرسید اور اُن کے رفقاء کی اس تحریک کو نفرت اور غصہ کی نظر سے دیکھا، مدتوں رسائل و اخبارات میں اس پر گرم اور تُند بحثیں ہوتی رہیں، اور جمہور اسلام کا فیصلہ سرسید اور اُن کے معزز رفقاء کے خلاف رہا،

دسمبر ۱۸۹۹ء کے علی گڑھ میگزین میں مولانا شبلی مرحوم نے ایک ناتمام مضمون مسئلہ خلافت پر لکھا، جس میں سرسید اور عام مسلمانوں کی نزاعِ آراء کا حوالہ دیکر تاریخی حیثیت سے یہ بتانا چاہا، کہ ترکوں سے پہلے بڑے بڑے سلاطین اسلام میں پیدا ہوئے لیکن عباسیوں کے مقابلہ میں کسی نے دعوائے خلافت نہیں کیا، یہ اس مضمون کا اصل ہے، اس واقعیت تاریخی سے کس کو انکار ہے، اصل سوال تو یہ تھا کہ عباسیوں اور دیگر قریشی قوتوں کے فقدان کی حالت میں قابض و مستولی وذی اقتدار سلاطین ٹرکی کا دعوی قابلِ تسلیم ہے یا نہیں، مولانا نے اس کے متعلق ایک حرف نہیں لکھا، اور خود اس مضمون کی ناتمامی اور ایک مختصر نمبر کے بعد مضمون کے دوسرے نمبروں کی اشاعت کا التوا اس کی دلیل ہے، کہ ایک ہی نمبر سے اُن کو معلوم ہوگیا کہ کشفِ حقیقت کے بجائے اور زیادہ الجھنوں کے پیدا ہو جانے کا خطرہ ہے، آج کل اس مضمون کی طرف بار بار ہماری توجہ منعطف کرائی جاتی ہے، لیکن اولاً تو ہم ایک کے سوا کسی دوسرے کو معصوم عن الخطا نہیں جانتے، دوسرے ایک ناتمام اور خارج از بحث مضمون کی بنا پر، اسی مصنف کی زندگی بھر کے

کارناموں پر پردہ نہیں ڈالا جاسکتا ہے ۱۸۸۲ء کی جنگ روم و روس میں اپنے شہر سے ہزاروں کا چندہ بھیجا، پھر اسی شوق و ولولہ میں ٹرکی کا سب سے اوّل سفر کیا، اور اس کے لئے مدتوں معتوب رہے، اور ان پر الزام لگایا گیا، کہ وہ سلطان عبدالحمید کی طرف سے اتحادِ اسلامی کے مبلّغ بن کر آئے ہیں، لیکن ان کا یہ حال رہا کہ آخر وقت تک وہ ترکوں کے نام پر سر دھنتے رہے ۱۸۹۲ء کی یہ مثنوی جو قسطنطنیہ میں بیٹھ کر جشن عید کے موقع پر لکھی تھی، علی گڑھ میگزین کے مضمون کے ساتھ ملاکر پڑھنے کے قابل ہے،

غلغلہ برخاست کہ بادا نوید — مرحبا نائبِ خلافت رسید
داغ نہ جبہہ خورشید و ماہ — حضرتِ خاقان خلافت پناہ
شاہ فلک کوکبہ عبدالحمید — ایدہ اللہ بنصر مزید
زیب و طراز ہمہ عالم توئی — سایۂ یزداں بجہاں ہم توئی
جملہ بدانند کہ در غرب و شرق — ہست ترا تاج خلافت بفرق
تازگی بدر و حنین از تو ہست — زیب و طراز حرمین از تو ہست
جز تو کہ ہست اے شہ انجم سپاہ — آنکہ بود شرعِ نبی را پناہ
فرۂ دین نبوی از تو ہست — بازوے اسلام قوی از تو ہست
شرع بجاہ تو چو شد ارجمند — بادبفرمان تو چرخِ بلند

قسطنطنیہ کے قیام میں رسم سلاملق کا نظارہ دیکھا تھا، خطبہ میں جب سلطان کا نام آیا، تو اس کا اثر علی گڑھ میگزین کے مضمون کے مصنف پر ہوتا ہے،

"خطیب نے جب سلطان کے مقصورہ کی طرف نگاہ اٹھا کر بڑے جوش سے یہ کہا کہ

اللّٰھُمَّ انصر ھذا السّلطان السّلطان بن السلطان الخاقان بن الخاقان السلطان الغازی

عبد الحمید خاں

تو میرے بے اختیار آنسو جاری ہوگئے، اور دیر تک دل کا یہ حال تھا کہ اُمڈا چلا آتا تھا، خطیب نے پہلے صحابہ کا نام پڑھا، اور سلطان کا نام آیا تو ایک زینہ اُتر آیا، تاکہ ظاہر ہو کہ سلطان اگرچہ ظل اللہ ہیں تاہم اُن کا رُتبہ حضرت صدیق و حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے کچھ نسبت نہیں رکھتا،" (مکاتیب ج ا ص ۱۶)

جنگِ بلقان میں اگرچہ انھوں نے بہت کچھ کہا، لیکن صرف ایک شعر اُن کے عقیدۂ دلی کا آئینہ ہے،

زوالِ دولتِ عثماں زوالِ شرع و ملت ہے،
عزیزو فکرِ فرزند و عیال و خانماں کب تک

پچھلی جنگ میں اُن کی وفات سے چند روز پیشتر ترکوں نے جنگ میں شرکت کی تھی، شہر کے چند وفاداروں نے اُن کے مکان پر ایک جلسہ کا اعلان کیا، اور جب لوگ جمع ہوگئے تو اُن کو اطلاع کی، اور مرضی دریافت کی، اس وقت بستر موت پر اُن کی زبان سے یہ دلسوز فقرہ نکلا کہ "آہ! میں تو اپنے کو اس لائق بھی نہیں سمجھتا کہ میری کھال سے ترک اپنے جوتوں کا تسمہ بنائیں؟"

سنہ ۱۹۱۱ء میں شملہ میں ایک سرکاری مشرقی کانفرنس منعقد ہوئی تھی، اثنائے ملاقات میں برن صاحب چیف سکریٹری صوبہ متحدہ نے مولانا سے دریافت کیا کہ اب مسلمان مذہبی حیثیت سے حکومت برطانیہ کو کیسا جانتے ہیں، مولانا نے کہا کہ "آپ کو خبر نہیں کہ وہ خطبوں میں "السّلطان ظل اللہ فی الارض" پڑھتے ہیں، برن صاحب نے فرمایا کہ "ہاں، مگر اس سے تو مراد سلطان ٹرکی ہیں"

مضمون کا خاتمہ ذیل کے دو اقتباسوں پر ہوتا ہے، مشہور انگریزی رسالہ "دی سینیٹ" نے نومبر ۱۹۱۵ء کے نمبر میں "سلطان اور اُس کے رفقار" کے عنوان سے ایک مضمون شائع کیا تھا اُس کا ایک فقرہ حسب ذیل ہے،

" سلطان سلطنتِ برطانیہ کا رفیق ہے، جو مشرقی جنگ کے وقت انگلستان کا مددگار ہوگا، سلطان فقط فرماں روا ہی نہیں ہے، بلکہ تاجِ برطانیہ کی سات کروڑ مسلمان رعایا کا مذہبی پیشوا ہے "

یہ سات کروڑ مسلمان رعایا ہندوستان ہی کے مسلمان تو نہیں ہیں ؟ مسٹر بلنٹ سے بڑھ کر ٹرکی اور مشرق کی تاریخ کا ذاتی واقف کار انگریزوں میں نہیں، وہ اپنی تصنیف مستقبل اسلام میں جس کا اردو ترجمہ میر اکبر حسین صاحب الٰہ آبادی مرحوم کے قلم سے ہوا ہے، حسب ذیل فقرہ ہے،

" حنفیوں کے علاوہ سلطان کو مالکی و شافعی بھی جو پہلے خلافتِ عثمانیہ کو تسلیم نہیں کرتے تھے، اب صدق دل سے خلیفۃ الاسلام تسلیم کرنے لگے ہیں، ...... اور ہندوستان کے مسلمان ہر جگہ ان کے لئے مساجد میں علانیہ دعائیں مانگتے ہیں "

سب کے آخر میں مسئلہ کا فیصلہ اسی رأی العیان واقعہ سے ہو جاتا ہے، کہ مدتوں سے ہماری مسجدوں کے منبر و محراب انہی سلاطین عظام کے ناموں سے گونج رہے ہیں، وللہ الحمد

منقول از معارف

دسمبر ۱۹۲۰ء و اکتوبر ۱۹۲۱ء

ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کیونکر ہوئی؟

ہمارے آریہ دوستوں کو تعجب ہے کہ ایک ہزار سال کے اندر ہندوستان میں جہاں ایک بھی کوئی مسلمان نہ تھا، سات کروڑ مسلمانوں کی تعداد کیونکر پیدا ہوگئی؟ لیکن کیا اُن کو کبھی اس پر بھی تعجب آیا ہے کہ ہندوستان جہاں کبھی ویدک دھرم مطلق نہ تھا، ہندوستان قدیم کی کروڑوں پرانی قومیں کیونکر اس دھرم میں آگئیں، پھر بودھ مذہب نے اسی سرزمین میں ویدک دھرم کو کیونکر شکست دی، اور بعدازیں ویدک دھرم نے بودھ مذہب کو آگ، تلوار اور زبان سے کیونکر نیست ونابود کر دیا، یہ سب پُرانی باتیں ہیں اُن کو جانے دیجئے، چند صدیاں پہلے یہاں ایک عیسائی بھی نہ تھا، مگر اب یہاں نصف کروڑ کے قریب عیسائی آبادی پیدا ہوگئی ہے، اور روز بروز پیدا ہوتی جا رہی ہے، یہ کیونکر؟

عیسائی مشنریوں نے تمام دنیا میں یہ پھیلا رکھا ہے کہ مسلمانوں نے تلوار کے زور سے اپنا مذہب پھیلایا ہے، حالانکہ انھیں اچھی طرح معلوم ہے، کہ رومی سلاطین نے عیسائی مذہب کی اشاعت میں کیا کیا نہ کیا، اسپین، پرتگال، روس، ہولنیڈ نے خصوصًا، اور یورپ کی عام سلطنتوں نے اس کے لئے کیا کیا راہیں نہ اختیار کیں، اور خود ہندو راجہ دھرم کی خاطر کیا کیا نہ کر گذرے، اسی طرح اگر بعض مسلمان بادشاہوں سے ایسی باتیں سرزد ہوئیں، تو صرف وہی سرزنش اور

ملامت کے مستحق کیوں ہیں؟

تمام دنیا کے مذاہب میں سے صرف اسلام ہی ایک مذہب ہے جس نے یہ فلسفہ دنیا میں ظاہر کیا ہے کہ مذہب یقین کا نام ہے، اور یقین تلوار کی دھار اور نیزہ کی نوک سے پیدا نہیں کیا جا سکتا،

لا اکراہ فی الدین	مذہب میں کوئی زبردستی نہیں،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تنبیہ ہوتی ہے:-

افانت تکرہ الناس حتی یکونوا مومنین،	اے پیغمبر! کیا تو لوگوں کو مجبور کریگا کہ وہ ایمان والے ہو جائیں،

خدا نے فرمایا پیغمبر کا کام جبر و اکراہ نہیں، بلکہ صرف دعوت اور تبلیغ ہے،

لست علیھم بمصیطر	اے پیغمبر تو ان کا فروں پر حاکم بنا کر نہیں بھیجا گیا۔
فانما علیک البلاغ	اے پیغمبر! تجھ پر صرف تبلیغ ہی فرض ہے،

قرآن نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ اس کے مذہب کی تبلیغ دنیا میں کیونکر کی جائے،

ادع الی سبیل ربك بالحکمة والموعظة الحسنة وجادلھم بالتی ھی احسن۔	اپنے رب کے راستہ کی طرف تو لوگوں کو دانائی سے اور اچھی نصیحت سے بلا اور اُن سے مناظرہ کر، تو اس طریقہ سے جو بہترین ہے،

اگر یہ سچ ہے کہ اسلام صرف تلوار کے زور سے پھیلا تو کارلائل کے اس سوال کا کیا

جواب ہے؟ کہ "اگر محمد نے تیغ زن سپاہیوں کے زور سے اسلام کو پھیلایا، تو پہلے اُن تیغ زن سپاہیوں کو کس تلوار سے مسلمان بنایا؟" اس اصول کی بنا پر تو چاہیئے تھا کہ ان ملکوں میں اسلام کا سایہ بھی نہ پڑتا، جہاں تلوار نے اس کا ساتھ نہیں دیا، حالانکہ سب کو معلوم ہے کہ ملک حبش پر مسلمانوں نے اُس کے اس احسان کے بدلہ میں کبھی تلوار نہیں اٹھائی کہ اس نے ایک دفعہ اسلام کے ابتدائی سخت مصیبت کے ایام میں مسلمانوں کو اپنے ہاں پناہ دی تھی تاہم آج وہاں نصف آبادی مسلمان ہے، افریقہ کے اُن خطوں میں جہاں مسلمان سپاہیوں کا گذر بھی نہیں ہوا تھا، وہاں حلقہ بگوشانِ اسلام کی اتنی بڑی تعداد کیونکر نظر آتی ہے؟ چین پر مسلمانوں نے فوج کشی نہیں کی مگر تین چار کروڑ مسلمان وہاں کہاں سے آگئے، جزائر ملایا مسلمان سلاطین کی تاخت وتاراج سے ہمیشہ محفوظ رہے، مگر آج وہاں چار کروڑ مسلمان کس طرح پیدا ہوگئے؟ سیام، انام، اور مشرق اقصیٰ کے دوسرے ملکوں اور جزیروں میں جہاں کسی مسلمان سپاہی کا قدم بھی نہیں پہنچا، اسلام کا قدم وہاں کیونکر پہونچ گیا؟ ترکی تاتار نے تو خود مسلمانوں پر تلوار چلائی تھی، اُن پر تلوار کس نے چلائی؟ اور اُن کو کس نے مسلمان بنایا؟

دوسرے ملکوں کو جانے دو، خود ہندوستان کو دیکھو، یہاں اسلامی فتوحات کا سیلاب درۂ خیبر سے ہوکر آیا، اور پنجاب سے کبھی آسام تک پہونچ گیا، مگر درحقیقت اُن کی قوت کا مرکز صوبہ آگرہ، دہلی، اودھ، بہار، اور دکن رہا، مگر دیکھو کہ یہی وہ مقامات ہیں، جہاں آج بھی مسلمانوں کی تعداد سب سے زیادہ کم ہے، یعنی آٹھ سو برس کے بعد بھی وہاں چند فی صدی سے زیادہ نہ بڑھ سکے، برخلاف اس کے جہاں اُن کا اقتدار حکومت زیادہ مضبوط نہ تھا، وہاں وہ حیرت خیز کثرت رکھتے ہیں، بنگال، کشمیر اور سندھ، جیسے دور دست اطراف میں اُن کی تعداد اپنے ہمسایوں سے افزوں ہے،

دکن پر مسلمانوں کا ہمیشہ قبضہ رہا بہمنی سلطنت پوری قوت سے مسلط تھی، اس کے بعد پانچ اسلامی سلطنتیں معاصرانہ قائم ہوئیں، اور اس وقت بھی دکن کے بڑے رقبہ پر ایک اسلامی سلطنت حکمران ہے، تاہم وہاں مسلمانوں کی تعداد سب سے زیادہ کم ہے،

سب اہل تاریخ جانتے ہیں کہ راجپوتانہ کی ریاستوں کو کلی طور سے کوئی مسلمان بادشاہ زیر نہ کر سکا، انگریزوں کے عہد تک وہاں کے ہندوؤں کے ہاتھوں میں مسلمان بادشاہوں کے مقابلہ کے لئے تلواریں تھیں، مگر بایں ہمہ وہاں کی کوئی ریاست آج ایسی نہیں، جہاں تھوڑے بہت مسلمان نہ ہوں، سیلون اور برما پر کبھی مسلمانوں نے قبضہ نہیں کیا، مگر وہاں مسلمانوں کی خاصی تعداد ہے،

ان گذشتہ واقعات کو بھی جانے دو، انگریزی عہد کے "پرامن" زمانہ کو سامنے لاؤ جب ہندوستان میں مسلمانوں کی بے نیام "تلوار" ہمیشہ کے لئے کند ہوگئی ہے، ۱۸۵۷ء کے بعد کی پہلی مردم شماری سے لے کر ۱۹۲۱ء کی مردم شماری تک کی ہر دہ سالہ تعداد کو دیکھو کہ مسلمان ستر اسی برسوں میں پانچ کروڑ سے سات کروڑ کے قریب کیونکر پہونچ گئے، ۱۸۹۱ء کی مردم شماری میں مسلمانوں کی تعداد یہاں پانچ کروڑ ستر لاکھ تھی، ۱۹۰۱ء میں ۶ کرور ۲۵ لاکھ ہوگئی، اور ۱۹۲۱ء کی مردم شماری میں ۷ کروڑ ستر لاکھ ہوگئی، تیس برس کے عرصہ میں ایک کروڑ مسلمان کس محمود اور عالمگیر کی تلوار کی فتوحات ہیں، اور آج بھی ملک کے ہر گوشہ میں نئے مسلمانوں کا جو اضافہ ہو رہا ہے، وہ کس جابرانہ قوت کا اثر ہے،

ہمارے آریہ دوستوں کو ہندوستان میں اسلام کی اشاعت پر سخت استعجاب اور حیرت ہے، اور اس کے اسباب و وجوہ کے جاننے کے لئے سخت بےچینی ہے، اور بےخبری یا تعصب سے وہ کبھی اس کا بڑا سبب غزنوی کی تلوار کو اور کبھی عالمگیر کے مظالم کو قرار دیتے ہیں، ذیل کے

صفات میں ہم اُن کے سامنے سے حقیقت کا پردہ اُٹھانا چاہتے ہیں تاکہ انھیں معلوم ہو کہ ہندوستان میں اسلام کی ترقی انہی طبعی طریقوں سے ہوئی ہے جن سے دنیا میں ہر داعی مذہب کی ہوئی ہے، ہوتی ہے اور ہوگی،

ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کا سب سے پہلا اور قدیم سبب عربوں اور ہندوؤں کا تجارتی میل جول تھا، عرب تاجروں اور سواحلِ ہند کے سوداگروں میں باہم تعلق نہایت قدیم زمانہ سے قائم تھا، بلکہ اس کا آغاز اسلام سے بہت پہلے ہو چکا تھا، البتہ اسلام کے بعد عرب قوم کی تنظیم نے ان تعلقات کو اور زیادہ مستحکم اور مضبوط کر دیا، اب عرب تاجر پہلے کی طرح صرف رومی مال و اسباب اور عربی مصنوعات و پیداوار ہی ہندوستان میں نہیں لانے لگے، بلکہ ساتھ ہی ساتھ اپنی سب سے بڑی دولت اور اپنی سب سے قیمتی متاع جو عرصہ میں اس پیغمبر عربی کے وسیلہ سے ان کو ملی تھی، وہ بھی رفتہ رفتہ اپنے ساتھ لانے لگے، اور یہاں سے اب وہ صرف مسالوں، خوشبوؤں، تلواروں، اور کپڑوں کا سامان ہی نہیں لے جانے لگے، بلکہ نومسلموں کی کچھ تعداد بھی اپنے ساتھ لیجانے لگے، ملیبار، سندھ، گجرات، کچھ، کوکن، سواحلِ بنگال، اور جزائرِ ہند کی قوموں نے ان کو فرشتۂ رحمت سمجھ کر قبول کیا، عربی سفرناموں اور جغرافیہ کی کتابوں میں ان مقامات کے نام اور حالات بکثرت مذکور ہیں،

ملیبار میں موپلا اور نوایت انہی عرب تاجروں کی یادگار نسل ہیں، اور یہی ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کے سب سے پہلے داعی اور مبلغ ہیں، انھوں نے جس آشتگی، سکون، اور خاموشی سے اس فرض کو انجام دیا عیسائی مشنری اور انگریزی مورخین تک ان کی اس قابلیت کے مداح اور ستائشگر ہیں،

ہندوستان میں اسلام کے داخلہ کا دوسرا راستہ سندھ ہے، سندھ کا علاقہ مدت دراز سے

شاہانِ ایران کا باجگذار تھا، اور جاٹ اور میڈی قوم کے لوگ ان کی فوج کے سپاہی تھے، اس کے بعد جب ایران کا تخت مسلمانوں کے قبضہ میں آیا، تو گذشتہ سلطنت کے ترکہ کے طور پر سندھ کے تعلقات اُن کو ہاتھ آئے، اور اس وقت سے لے کر محمد قاسم فاتح سندھ کے زمانہ تک والی عراق اور رایانِ سندھ کے درمیان صلح و شکست کے واقعات پے درپے پیش آتے رہے، محمد قاسم کے فتوحات کی وسعت جو بلوچستان اور کراچی سے لے کر ملتان تک تھی بہت جلد ختم ہوگئی، یعنی اس نے سو برس کا زمانہ بھی نہیں پایا ہے، لیکن اسلام کے مذہبی فتوحات کا سیلاب بدستور جاری رہا،

ہندوستان میں اسلام کی آمد کا تیسرا مشہور راستہ درۂ خیبر کا ہے، جدھر سے وہ اپنی پیدائش سے چار سو برس کے بعد محمود غزنوی کی تیغ خاراشگاف کے سایہ میں داخل ہوا،

ہمارے آریہ دوستوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ ہندوستان مذہبی حیثیت سے پہلے بھی ویسا ہی تھا جیسا آج ایک زمانہ سے وہ نظر آتا ہے، کہ ویدک دھرم نام ایک برہمنی مذہب کو ہر باشندۂ ہند کے لئے ضروری سمجھا جاتا ہے، عرب میں اسلام کی پیدائش اور ہندوستان میں بودھ مذہب کا زوال ساتھ شروع ہوا، تاہم اس کو مٹتے مٹتے بھی ایک زمانہ لگ گیا، عرب مسلمان جب ملیبار، سیلون، سندھ[۱] گجرات اور کوکن وغیرہ میں آئے ہیں، تو اُن کا مقابلہ ویدک دھرم کے ہندوؤں سے نہ تھا، بلکہ بودھ مت اور جین مت کے پیرووں سے تھا، اس وقت ترکستان سے کابل تک اور پنجاب و کشمیر سے سندھ تک بودھ مت اور گجرات وغیرہ ادھر کے ساحلی علاقوں میں جین مت غالب تھا، اور ملیبار اور مدراس کے اطراف میں ویدک دھرم یا برہمنی مذہب کے پیرو لوگ نہ تھے، بلکہ زیادہ

---

[۱] اس بیان کی تصدیق کے لئے دیکھو الیٹ کی "تاریخ سندھ" ص ۵۰۴ سے ۵۰۰ تک، الیٹ نے عرب سیاح اور جغرافیہ نویسوں کے بیانات کے ساتھ چینی سیاحوں کے بیانات اور دوسرے دلائل یکجا کر دیئے ہیں،

ہندوستان کے پرانے باشندے تھے، جن کو درۂ خیبر سے آنے والے مغرور برہمنوں نے ہندوستان سے نکال دیا تھا، یا وہ خود سے بھاگ کر دور دست علاقوں میں چلے گئے تھے،

ہندوستان کے حدود میں اسلام کا پہلا قدم جنوبی ہند میں پڑا، بیان کیا جاتا ہے کہ ملیبار کے راجہ نے شق القمر کا معجزہ اپنی آنکھوں سے دیکھا یعنی ایک رات اُس کو چاند شق ہو کر دکھائی دیا، اُس نے ادھر ادھر لوگوں کو تحقیق حال کے لئے بھیجا، بالآخر معلوم ہوا کہ عرب دیس میں ایک پیغمبر پیدا ہوا ہے، اور اُس نے یہ معجزہ دکھایا ہے، راجہ یہ سُن کر مسلمان ہوگیا، اور عرب چلا گیا، ایک روایت میں ہے کہ وہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں پہونچا، دوسری روایت میں ہے کہ وہ حضرت ابوبکرؓ کے عہدِ خلافت میں پہنچا، اور بالآخر یمن میں اُس نے انتقال کیا، اور وہیں مدفون ہوا،

ملیبار اور اس کے اطراف میں جو پرانی قوم آباد ہے، اُس کو نایر کہتے ہیں، یہ عام ہندوؤں سے بالکل مختلف ہیں، اور ان میں قدیم وحشت اور بربریت کے بہت سے اثرات پائے جاتے ہیں، اور اُن میں کوئی صحیح اور بانظام مذہب ایسا نہ تھا، جو اسلام کا مقابلہ کر سکتا، اُن کو عام برہمن نہایت ذلیل سمجھتے ہیں، اور اُن سے چھوت کرتے ہیں، تاریخ تحفۃ المجاہدین میں ہے کہ اگر کوئی اونچی ذات کا ہندو ان سے چھو جائے، تو جب تک وہ غسل نہ کرے، کھا نہیں سکتا، اگر کھائے تو سردار اُس کو اپنی برادری سے نکال کر، انھیں نیچ ذاتوں کے ہاتھ بیچ دیتا تھا، اور اس کی بقیہ عمر غلامی میں گذرتی تھی، یا وہ بھاگ کر دوسری جگہ چلا جاتا تھا، ایک کنوئیں سے دوسرا پانی نہیں پی سکتا تھا، پاس بیٹھ نہیں سکتا تھا، آج بھی ان اطراف میں بالکل یہی حالت ہے، آپ روز سنتے ہیں کہ مدراس میں برہمن اور نان برہمن کی لڑائیاں برابر جاری ہیں،

اسی طرح یہاں کی عورتوں پر یہ ظلم ہے کہ وہ بیک وقت چند شوہروں کی پابند ہیں

اور ہر ایک کی خوش دلی ان کا فرض ہے، اس افسوسناک واقعہ کا امیر خسرو نے ایک شعر میں ذکر کیا ہے، میر جمال الدین حسین انجو نے اپنے لغت میں لفظ ملیبار کے تحت میں ان کی اس رسم کو بیان کیا ہے[1]، غیر قوموں میں شادی کرنے سے بھی ان کو چنداں باک نہ تھا،

الغرض جب مسلمان تاجر ادھر آئے تو ان مظلوم فرقوں کو اچھا خاصا ایک امن کا سایہ ہاتھ آیا، مسلمان تاجروں نے ان کو نوکر رکھا، اُن سے تعلقات بڑھائے، ان کی عورتوں سے شادیاں کیں، نیچ قوم کے لوگ اور نیز ذات سے خارج لوگوں نے بھاگ بھاگ کر اسلام کے دامن امن میں پناہ لینی شروع کی، اور یہی لوگ جب مسلمان ہو کر دوسرے مسلمانوں کے برابر حقوق حاصل کر لیتے تھے، تو دوسرے ہندو بھی ان کی عزت میں کمی نہیں کرتے تھے، یہ دیکھ کر یہاں کی ادنیٰ قوموں کو اور بھی اسلام کی طرف رغبت ہوئی،

یہی حال اس ملک کا آج بھی ہے، اگر ان اطراف میں دفعۃً پرتگیز نہ پہونچ گئے ہوتے تو یہ پورا علاقہ دائرۂ اسلام میں آگیا ہوتا، لیکن پرتگیزوں نے یہاں آکر اور دریا سے عربوں کی تجارت کا راستہ روک کر اُن کو تباہ کر دیا، اور آبادی کے مسلمانوں کو عرب و مصر سے اپنے تعلقات کے توڑ دینے پر مجبور کر دیا، بالآخر عیسائیوں نے غلبہ پایا، اور اس وقت سے ان مقامات میں اسلام کی جگہ عیسائیت نے لے لی ہے، چنانچہ تمام صوبوں سے زیادہ وہاں عیسائیت کو فروغ ہے، اور روز بروز وہاں صلیب پرستوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے، اور ٹراونکور اور کوچین کے علاقوں کے لوگ تو گویا پورے کے پورے عیسائی ہو گئے ہیں،

ذیل میں ہم تحفۃ المجاہدین (جو علاقہ مالابار کی تنہا تاریخ ہے) کے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں، جن سے حقیقتِ حال ظاہر ہوگی،

---

[1] فرشتہ جلد دوم ص ۳۷۲، نولکشور،

"ہندوستان کے مغربی ساحل کے بندرگاہوں میں مختلف ملکوں سے تاجر بکثرت آتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ نئے شہر آباد ہو گئے ہیں، اور مسلمانوں کی تجارت سے ان میں آبادی بڑھ گئی ہے، اور مکانات کثرت سے بن گئے ہیں، یہاں کے سردار اور راجہ مسلمانوں پر سختیاں کرنے سے پرہیز کرتے ہیں، باوجودیکہ یہ سردار اور اُن کی سپاہ بت پرست ہیں مگر وہ مسلمانوں کے مذہب اور اُن کے شعائر کا بہت کچھ پاس و لحاظ کرتے ہیں،.... بُت پرستوں اور مسلمانوں کے اس اتحاد سے اس لئے اور تعجب پیدا ہوتا ہے، کہ مسلمانوں کی تعداد کل آبادی کا دسواں حصہ بھی نہیں"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس عہد میں ان تاجروں کی مدد سے اس علاقہ کی آبادی کا کتنا حصہ اسلام کا حلقہ بگوش ہو چکا تھا،

"بحیثیت مجموعی ملیبار کے ہندو راجاؤں کا برتاؤ مسلمانوں کے ساتھ عزت اور مہربانی کا ہے، کیونکہ اُن کے ملک میں زیادہ شہروں کا آباد ہو جانا انہی مسلمان تاجروں کی بود و باش کا نتیجہ ہے،

اس اقتباس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان اطراف کے ہندو راجہ کیوں عرب تاجروں کی اس قدر عزت کرتے تھے، اور اُن کے کاروبار میں کوئی دخل نہیں دیتے تھے۔

نائر قوم کے لوگ اپنے ایسے ہم قوموں سے جو بُت پرستی چھوڑ کر مسلمان ہو جاتے ہیں، مزاحمت نہیں کرتے، اور نہ اُن کو دھمکیاں دے کر ڈراتے ہیں، بلکہ وہ اُن کے ساتھ ایسی ہی عزت کا برتاؤ کرتے ہیں، جیسے اور مسلمانوں کے ساتھ خواہ وہ نومسلم کیسی ہی نیچی ذات سے مسلمان ہوا ہو۔[1]

---

[1] تحفۃ المجاہدین کا نسخہ میرے سامنے نہیں، کچھ تو فرشتہ نے ملیبار کی تاریخ میں نقل کیا ہے، مگر یہ

اس اقتباس نے اس راز کا پورا پردہ کھول دیا کہ ان نیچ ذات کے لوگوں کے اسلام لانے کا سبب کیا تھا،

عرب جغرافیہ نویسوں اور سیاحوں نے ہندوستان کے جن حصوں کا حال لکھا ہے، وہ وہی ہیں جو عرب تاجروں کے بحری گذرگاہ تھے، وہ خلیج فارس کے بندرگاہوں سے جن میں مشہور سیراف اور بصرہ ہے، سندھ آتے تھے، اور یہاں سے سمندر کے کنارہ کنارہ کوکن اور گجرات کے سواحل سے گذر کر، مدراس کے سواحل پر پہونچتے تھے، اور یہاں سے لنگر اٹھاکر مشرقی بنگال اور آسام کو عبور کرکے چین کی راہ لیتے تھے، راستہ میں مالدیپ، سیلون، جاوا، سماٹرا، سنگاپور، اور دوسرے جزائر کی طرف بھی نکل جاتے تھے، چنانچہ اُن کے یہی تجارتی رہ گذر اُن کی اشاعتِ اسلام کی کوششوں کے مرکز تھے،

سواحلِ ہند پر سندھ سے لیکر حدودِ چین تک وہ متعدد ہندو راجاؤں اور سلطنتوں کے نام گناتے ہیں، مگر یہ نام کچھ تو ان قدیم سلطنتوں اور شہروں کے معدوم یا گمنام ہوجانے سے کچھ عربی میں تلفظ بدل کر، کچھ کتابوں کے نسخوں اور کاتبوں کے ہاتھوں سے کچھ سے کچھ ہو کر بالکل غیر معروف ہوگئے ہیں، ان سلطنتوں یا ملکوں میں سے چند مشہور نام یہ ہیں، جن کو تمام جغرافیہ دانوں اور سیاحوں نے بالاتفاق نقل کیا ہے،

سلطنتِ بلہرا، جزر، طافن، کشمین، اور رہمی، ان کے علاوہ تانڈا اور موگا وغیرہ کے علاقے آتے ہیں، ہندوستان کے مستشرق مورخین مثلاً الیٹ اور ڈاؤسن، رینا وغیرہ نے ان ناموں کی اصل نکالنے میں بڑی دیدہ ریزی کی ہے، ان کی تحقیق کا نتیجہ یہ ہے: کہ بلہرا کی اصل بلبھ راے ہے جو

(بقیہ حاشیہ ص ۱۹۳) اقتباسات ڈاکٹر آرنلڈ کی کتاب "دعوتِ اسلام" کے صفحہ ۲۸۲، ۲۸۳ سے یہاں نقل کئے گئے ہیں،

مالوہ کے حکمراں خاندان کا نام تھا، عربوں نے بھی اس کو شاہی لقب ہی بتایا ہے، جزر تو ظاہر ہے کہ گجر یعنی گجرات ہی، طافن کی نسبت ان خصوصیات کی بنا پر جو عربوں نے بیان کی ہیں، رینا وَ کی رائے ہے، کہ وہ اورنگ آباد دکن ہے، لیکن طافن کا وہ حل نہیں کر سکا، میری رائے ہو کہ طافن نہیں، یہ لفظ طاقن ہے، چنانچہ اس کا املا طاکن بھی رینا وَ نے پایا ہے، اور طاقن اور طاکن، واکھن یا دکن، یا دکھن کی خرابی ہے، کشن بن کو ٹاڈ، کچ بھوج (عربی میں چ ش سے بدل جاتی ہے) اور رینا وَ میسور بتاتا ہے، اور رہمی راج کو مشرقی بنگال قرار دیتا ہے،[1]

عربوں نے سب سے زیادہ بلہرا یا بلھرائے کی سلطنت کا ذکر کیا ہے، اور اس کے دار السلطنت کا نام وہ مانکیر (مانگیر یا مانگیر) بتاتے ہیں، اور کمکم نام ایک علاقہ بھی وہ اس میں شامل کرتے ہیں، کمکم غالباً کوکن ہے، سب سے پہلا عرب سیاح جس کا سفرنامہ زمانہ کے دست برد سے محفوظ ہے، وہ عراق کے تاجر سلیمان سیرافی کا ہے، اس نے اپنا سفرنامہ تیسری صدی ہجری (آٹھویں صدی عیسوی) کے شروع میں لکھا تھا، فرانسیسی مستشرق ریناڈ (Reinaud) نے اس کو مع فرنچ ترجمہ اور حواشی کے ۱۸۴۵ء میں سلسلۃ التواریخ کے نام سے شائع کیا ہے،

اس نے اپنا سفرنامہ انہی راستوں سے کیا ہے، جن کا ذکر ابھی اوپر گذرا، وہ بیان کرتا ہے کہ ہندوستان اور چین کے لوگ بلا اختلاف یقین رکھتے ہیں، کہ دنیا میں چار بادشاہ سب سے بڑے ہیں، سب سے بڑا وہ عرب کے بادشاہ (خلیفۂ بغداد) کو سمجھتے ہیں، کہ وہ سب سے دولت مند، سب سے زیادہ باجاہ و جلال ہے، اور وہ سب سے بڑے مذہب

---

[1] دیکھو الیٹ جلد اول کے تاریخی اور جغرافی ضمیمے، ان ناموں کی تصحیح اور تحقیق ایک دلچسپ موضوع ہے لیکن اس کے لئے اور موقع ہے،

کا بادشاہ ہے، جس سے بڑی کوئی چیز نہیں، اس کے بعد خاقان چین، بعد ازیں قیصر روم، پھر راجہ بلہرا، سوراخ کئے ہوئے کانوں[۵۱] والے آدمیوں کا بادشاہ، راجہ بلہرا، تمام ہندو راجاؤں سے زیادہ معزز ہے، اور گو ہندوستان کا ہر راجہ اپنی سلطنت میں مستقل ہے، مگر اس کی بزرگی کو تسلیم کرتے ہیں، بلہرا کے راجاؤں کی عمریں بڑی ہوتی ہیں، بلہرا کی رعایا کا یہ عقیدہ ہے کہ ہمارے راجاؤں کی عمریں اس لئے بڑی ہوتی ہیں، کہ وہ عربوں (مسلمانوں) سے محبت رکھتے ہیں، تمام راجاؤں میں راجہ بلہرا سے زیادہ عربوں (مسلمانوں) سے زیادہ محبت رکھنے والا کوئی دوسرا نہیں، اور اسی طرح اس کی رعایا بھی محبت رکھتی ہے،[۵۲]

کیا یہ سمجھا جائے کہ کوکن میں مسلمانوں کی زیادہ بود و باش، اور اسلام کی اشاعت بلہرا کے راجاؤں کی اسی بے تعصبی کا نتیجہ ہے؟ گجرات کے راجہ کی نسبت اس کا بیان ہے کہ "وہ عربوں (مسلمانوں) کا دشمن ہے، بایں ہمہ وہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ عرب کا بادشاہ (خلیفۂ بغداد) دنیا میں سب سے بڑا بادشاہ ہے، اور ہندو راجاؤں میں اس سے زیادہ اسلام کا کوئی دشمن نہیں[۵۳]" اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ "طافن (یا دکھن) کا راجہ بھی عربوں (مسلمانوں) سے راجہ بلہرا ہی کی طرح محبت رکھتا ہے[۵۴]"

"چین والے داڑھی نہیں رکھتے، اور وہ قدرۃً بھی اس سے محروم ہیں، لیکن ہندوؤں کی لمبی لمبی داڑھیاں ہوتی ہیں، مونچھیں بھی نہیں ترشواتے[۵۵]" ....

---

[۵۱] معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں ادھر کے لوگ کانوں میں بالا پہنتے تھے، [۵۲] سفرنامہ سلیمان تاجر مطبوعہ پیرس ۱۸۱۱ء ص ۲۶ و ۲۷، [۵۳] ایضاً ص ۲۸ [۵۴] ایضاً ص ۲۹ [۵۵] ایضاً ص ۵۵،

"...... چین اور ہندوستان کے لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ بدوہ (بدھ) کے مجسمے اور بت (بُت کی اصلیت بھی بدھ یعنی بودھ ہے) ان سے باتیں کرتے ہیں، حالانکہ باتیں اُن کے پجاری کرتے ہیں[۱]، اور ان دونوں ملکوں کے لوگ جانور کو قتل کرکے کھاتے ہیں، اہلِ چین میں خود اپنا کوئی مذہب نہیں ہے، ان کا مذہب ہندوستان سے آیا ہے، اور وہ بیان کرتے ہیں کہ ہندوستان ہی نے یہ بدھ کے مجسمے اُن کے لئے بنائے ہیں، اور ہندو ہی اصل مذہب والے ہیں، اور یہ دونوں قومیں تناسخ کی قائل ہیں، صرف مذہب کی فروعی باتوں میں ان کا اختلاف ہے[۲]...... اور جہاں تک علم ہے، ان دونوں قوموں کے لوگوں میں کوئی مسلمان نہیں ہے، اور نہ کوئی عربی بولتا ہے[۳]"

اس اقتباس سے یہ ثابت ہوتا ہے، جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، کہ اسلام کا مقابلہ برہمنی دھرم سے نہیں لیکن بدھ مت سے تھا، اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک ہندوستان کے جن علاقوں سے وہ گذرا ہے، وہاں کوئی نومسلم ہندو اس کو نہیں ملا ہے، البتہ عرب تاجروں کی نوآبادیاں اس کو ملتی جاتی ہیں، جیسے دکھن اور کوکن کے علاقوں میں،

عرب تاجروں اور سیاحوں نے جزائرِ ہند میں سے "دیبجات" یعنی دیپ کے جزیروں کا جس سے اُن کی مراد سرندیپ، سندگلدیپ، اور مالدیپ ہیں، بہت ذکر کیا ہے، خصوصاً سرندیپ (سیلون) جہاں ایک پہاڑ پر اُن کے اعتقاد کے مطابق حضرت آدم اور حوا کے نقشِ قدم ہیں، لوگ جو ادھر سے گذرتے تھے، اُن کی زیارت کو جاتے تھے، سلیمان تاجر نے ان جزائر کے اثنائے ذکر میں کسی مسلمان آبادی کا ذکر نہیں کیا ہے لیکن سلیمان

---

[۱] سفرنامۂ سلیمان تاجر مطبوعہ پیرس ۱۸۴۵ء ص ۵۵ [۲] ایضاً ص ۵۲ [۳] ایضاً ص ۵۳

کے بعد اس کے سفرنامہ کا، ایک اور عرب تاجر ابوزید سیرافی نے تتمہ لکھا ہے، جو تیسری صدی ہجری کے وسط میں غالبًا لکھا گیا ہے، اس میں سرندیپ کے بیان میں یہ پوری تصریح ہے، کہ عرب تاجروں نے یہاں آباد ہونا شروع کر دیا ہے[1]،

تیسری صدی کے آخر اور چوتھی صدی کے شروع میں بزرگ بن شہریار ایک ایرانی مسلمان جہازران نے سالہا سال کے بحری سفروں کے بعد خود اپنے چشم دید اور دوسرے جہاز رانوں سے سنے ہوئے واقعات عجائب الہند کے نام سے قلمبند کئے ہیں، اور مطبع بریل لیڈن نے اس کو چھاپا ہے، اس کتاب میں جابجا مسلمانوں کی نوآبادیوں کے تذکرے ملتے ہیں، ایک ہندو جہازران کا حال ملتا ہے، جو مسلم تھا، اور اسی جہازرانی سے اوس نے بڑی دولت کمائی تھی، اُس نے حج کیا تھا[2]۔ اتنے زمانہ میں زیور یعنی ملیبار وکالی کٹ کے راجہ کے ملک میں مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد ہوگئی تھی، کہ اُن کے لئے ایک مسلمان قاضی جس کو ہنرمند کہتے تھے، راجہ کی طرف سے منتخب[3] کیا جاتا تھا،

جاوا میں بھی ہم کو اس عہد میں مسلمان تاجر ملتے ہیں، اور اس طرح کہ وہاں کے راجہ کے دربار میں مسلمان درباری رسوم وآداب سے معاف کئے جاتے ہیں[4]، سندگاپور کے راجہ کے دربار میں بھی مسلمان ملتے ہیں[5]، بمبئی کے قریب بھی مسلمان ملتے ہیں[6]، آگیر کے علاقہ میں ایک مسلمان کو ایک درخت ملتا ہے، جس کے پتوں پر کلمۂ طیبہ لکھا ہوتا ہے[7]، پتوں پر لکھا ہو یا نہ ہو، مگر اس سے دلوں پر کلمۂ طیبہ کا آغاز نقش تو ثابت ہوتا ہے، انڈمان کے جزیرہ میں حضرت سلیمانؑ کا مقبرہ دکھائی دیتا ہے[8]،

---

[1] تتمہ سفرنامہ سلیمان تاجر۔ [2] عجائب الہند ص ۱۰۔ [3] ایضًا ص ۱۴۳۔ [4] ایضًا ص ۱۴۵۔ [5] ایضًا ص ۱۵۷۔ [6] ایضًا ص ۱۵۲۔ [7] ایضًا [8] عجائب الہند ص ۱۴۳،

عجائب الہند کی روایت کے مطابق تو ہندوستان کے جزیروں میں سے سب سے پہلے سرندیپ میں اسلام کا نور چمکا، عرب جغرافیہ نویسوں نے اس جزیرہ کے لوگوں کے جو مذہبی حالات لکھے ہیں اُن سے یہ قطعاً ثابت ہوتا ہے کہ یہاں کے باشندے بودھ مت کے پیرو تھے، بزرگ بن شہریار لکھتا ہے کہ ہندوستان کے پجاریوں، عابدوں اور زاہدوں (یعنی جوگیوں اور بھکشوؤں) کی کئی قسمیں ہیں، ان میں سے ایک بیکور (بیکوڑا) ہیں، اور اُن کی اصل سرندیپ سے ہے، اور یہ مسلمانوں سے بہت محبت رکھتے ہیں، اور اُن کی طرف اُن کا میلان بہت ہے، اور گرمی میں یہ ننگے رہتے ہیں۔ صرف چند انگل کی دھجی کمر میں باندھتے ہیں، اور جاڑوں میں چٹائی اوڑھتے ہیں، دوسرے وہ ہیں جو کپڑے پہنتے ہیں، اُن کے یہ کپڑے مختلف رنگ برنگ کے ٹکڑوں کو سی کر بنائے جاتے ہیں، اور اس سے اُن کا مقصود اپنا امتیاز اور شہرت ہے، اور بدن پر مُردوں کی ہڈیاں جلا کر اُس کی راکھ ملتے ہیں، اور داڑھی کے بال منڈاتے ہیں لیکن بدن کے اور حصّوں کے بال ویسے ہی چھوڑ دیتے ہیں، اور گلے میں کسی مردہ کی کھوپڑی لٹکائے رہتے ہیں، اور غیرت اور تواضع کے لئے اسی میں کھاتے اور پیتے ہیں۔

"اہلِ سراندیپ کو جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا حال (غالباً عرب تاجروں کی زبانی) معلوم ہوا تو انھوں نے اپنا ایک ہشیار آدمی تحقیق کی غرض سے، عرب روانہ کیا، جب وہ وہاں پہنچا تو حضرت عمرؓ کی خلافت کا زمانہ تھا، حضرت عمرؓ نے اُس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حال بتایا، اور باتیں بتائیں، وہ لوٹ کر آیا، تو مکران (قریب بلوچستان) میں اس کا انتقال ہو گیا، اس کے ساتھ اس کا رفیقِ سفر غلام تھا، وہ صحیح سلامت سرندیپ پہونچا، اور وہاں کے لوگوں کو سب حال سُنایا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، اور حضرت ابوبکرؓ کی جو کیفیت سُنی تھی، وہ بتائی، اور حضرت عمرؓ کے واقعات ان کو سُنائے اور

منجملہ اُن کے یہ بھی کہا کہ وہ بھی پیوند لگے ہوئے کپڑے پہنتے ہیں، مسجد میں سوتے ہیں، اور نہایت خاکسارانہ زندگی بسر کرتے ہیں، اب یہ لوگ مسلمانوں کے ساتھ جو یہ تواضع اور محبت کرتے، اور یہ میلان خاطر رکھتے ہیں، وہ اسی سبب سے ہے[۱]

اس تفصیل سے ظاہر ہو گا کہ بدھ مت کے پیرؤں کو اسلام کے ساتھ ایک خاص مناسبت پیدا ہو گئی تھی، اور جس چیز کو وہ تلاش کرتے تھے، وہ ان کو اس مذہب میں ملتی تھی،

اب وہ زمانہ آ گیا تھا کہ عرب تاجروں کے ساتھ درویشوں کی کوششیں بھی شامل ہو گئی تھیں، چنانچہ اُن کی کوشش سے سرانذیپ کے بعد اسلام کا نور ملیبار کے علاقہ میں چمکتا نظر آتا ہے، تاریخ فرشتہ میں تحفۃ المجاہدین کے حوالہ سے یہ قصہ منقول ہے، کہ ہجرت کی دو صدیاں گذر چکی تھیں، ہر مذہب کے تاجروں اور سوداگروں کا یہاں گذر تھا، کہ عرب و عجم کے چند مسلمان فقراء کا گذر ہوا، جو سرانذیپ حضرت آدم و حوا کی قدمگاہ کی زیارت کو جا رہے تھے، بادِ مخالف کی جھپٹ سے وہ ملیبار کے ساحل پر پہونچ گئے، شہر کدنگلور (کرانگا نور) میں جا کر وہ اترے، وہاں کا راجہ جس کو سامری (زمورن) کہتے ہیں، وہ نہایت عقلمند تھا، وہ ان بزرگوں کی صحبت سے مستفید ہوا، اور ہر قسم کی گفتگو درمیان میں آئی، منجملہ اُن کے مذہب کی بحث بھی آئی، ان درویشوں نے اپنا مذہب اسلام بتایا، زمورن نے کہا کہ ہمارے ملک میں جو یہود و نصاری اور ہنود رہیں، جو تمہارے مذہب کے مخالف ہیں، اور دنیا کی سیاحت کئے ہوئے ہیں، ان سے سنا ہے کہ عرب و عجم اور ترکوں کے ملکوں میں یہ مذہب پوری طرح پھیلا ہوا ہے لیکن اب تک مجھ کو مسلمانوں کی صحبت نہیں ملی ہے اپنے پیغمبر کا کچھ احوال بیان کرو، ایک درویش نے جو علم و صلاح سے آراستہ تھا، تقریر شروع کی، اور آپ کے معجزات کو اس خوبی سے بیان کیا کہ راجہ متاثر ہو گیا، اور کلمۂ طیبہ ادا کر کے

---

[۱] عجائب الہند مطبوعہ لیڈن صفحہ ۱۵۶ - ۱۵۷،

مسلمان ہوگیا لیکن اپنے مذہب کو مخفی رکھا، اور مسلمانوں کو بھی تاکید کی کہ وہ اس راز کو فاش نہ کریں، اور یہ درخواست کی کہ سرندیپ سے واپسی میں پھر ادھر ہی سے تشریف لیجائیے، واپسی میں راجہ بھی حیلہ سے درویشوں کے ساتھ چھپ کر روانہ ہوگیا، اور ملک کو اپنے وزیر کے سپرد کر گیا، راجہ عرب پہونچ کر مرگیا، اور مرتے وقت وصیت کی کہ چونکہ ہم سب کا مقصود ملیبار میں دین اسلام کی اشاعت ہے، اس لئے بہتر ہے کہ آپ لوگ تجارت اور بیوپار کے ذریعہ سے وہاں آمد و رفت کیجئے، اور وہاں قیام کیجئے، مکانات بنائیے تاکہ لوگ دین محمدی کی طرف رجوع کریں، اور اس کے بعد اُس نے اپنے مُہری خطوط اپنی زبان میں لکھ کر حوالہ کئے کہ ملیبار جاکر وہاں کے حاکموں کو دکھائیے، چنانچہ یہ لوگ ملیبار واپس آئے، یہاں کا حاکم خط دیکھ کر مہربان ہوا، اور یہاں اسلام کی اشاعت کی پہلے کدنگلور (کرانگانور) میں مسجد بنائی، پھر کولم میں مسجد بنی، پھر تھوبائی، سدرادہی، گندآرید، چالیٹ (کالی کٹ) باکنو، منگلور اور کانجر کوٹ میں مسجدیں بنائیں اور یہاں مسلمانوں کی عزت ہونے لگی"[۱]

تیسری صدی کے آخر اور چوتھی صدی کے شروع میں مشہور مورخ اور سیاح مسعودی بغداد سے ہندوستان آیا تھا[۲]، وہ ہندوستان کے جنوبی ساحلی شہروں میں کھنبایت، تھانہ گجرات، یا دکھن، راجہ بلہرا، یا بلہو راے کی سلطنت اور اس کے دارالسلطنت مانگیر اور لیموزرین لا (یا ملیبار) کے راجہ کا ذکر کرتا ہے، مسلمانوں کی محبت و عداوت کی حیثیت سے وہ ہندو راجاؤں کی نسبت وہی خیالات کسی قدر اضافہ کے ساتھ بیان کرتا ہے، جن کو سلیمان تاجر اپنے سفرنامہ میں اس سے ساٹھ پینسٹھ برس پیشتر ظاہر کر چکا تھا، اس عرصہ میں ان علاقوں میں اسلام بہت

---

[۱] تاریخ فرشتہ بحوالہ تحفۃ المجاہدین جلد ۲ ص ۳۷۰، نولکشور، [۲] مروج الذہب مسعودی ج ۱ ص ۳۷۷، طبع پیرس،

کچھ آگے بڑھ گیا تھا،

مسعودی کی شہادت ہے کہ سندھ اور ہند کے تمام راجاؤں میں سے راجہ بلہرا کے راج کی طرح اور کسی راج میں مسلمانوں کی اتنی عزت نہیں، اسلام اس راجہ کی حکومت میں معزز اور محفوظ ہے، اور ان کے ملک میں مسلمانوں کی مسجدیں اور جامع مسجدیں بنی ہوئی ہیں، جو آباد ہیں، یہاں کے بادشاہ چالیس چالیس اور پچاس پچاس برس حکومت کرتے ہیں، یہاں کے لوگوں کا اعتقاد ہے کہ ہمارے راجاؤں کی عمریں اسی عدل اور مسلمانوں کی عزت کرنے کی وجہ سے زیادہ ہوتی ہیں،[۵۱] گجرات کا راجہ مسلمانوں سے اب تک وہی نفرت رکھتا ہے، دکھن کے راج میں مسلمانوں کی عزت ویسی ہی ہے، وہ راجہ صلح پسند ہے،[۵۲]

مسعودی سنہ ۳۰۴ھ میں زیمور کے ملک میں اپنا آنا بیان کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ "یہاں خالص اور مخلوط النسل مسلمانوں کی جن کو یہاں "بیسر" کہتے ہیں، دس ہزار کی آبادی ہے، یہ سیراف، عمان، بصرہ، اور بغداد اور دوسرے شہروں کے وہ لوگ ہیں، جو یہاں آباد ہوگئے ہیں، اور یہیں انھوں نے شادی بیاہ کر لیا ہے، اور یہیں سکونت اختیار کر لی ہے، اور ان میں بعض نامی تاجر ہیں، جیسے موسیٰ بن اسحاق، اور آج کل یہاں مسلمانوں کا رئیس (ہنرمند) ابوسعید معروف ابن زکریا ہے، اور بیسرہ وہ مسلمان کہلاتے ہیں، جو ہندوستان میں پیدا ہوئے ہیں"[۵۳]

اس اقتباس سے ظاہر ہوگا کہ مسلمانوں کی تعداد عہد بعہد ترقی کرتی جاتی ہے، اور ان کی ترقی کا ایک ذریعہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے اسی ملک کے لوگوں میں شادی بیاہ شروع کر دیا ہے، ابن سعید مغربی پانچویں صدی میں ملک مراکش میں بیٹھ کر جغرافیہ فلکی کی ایک کتاب ترتیب دیتا ہے، اس کے بیچ بیچ میں، کہیں کہیں جنوبی ہندوستان کے شہروں کے نام آتے ہیں،

---

۵۱ مروج الذہب مسعودی ج ۱ ص ۲۰۳، ۵۲ ایضاً ص ۲۰۴، ۵۳ ایضاً جلد ۲ ص ۸، ۸۶،

اوران شہروں کی اسلامی آبادیوں کی طرف اشارہ کرتا ہے، یہ وہ زمانہ ہے جب مسلمان گو پنجاب میں داخل ہو گئے ہیں، لیکن بقیہ ہندوستان اب تک ان کے حملوں سے سرتا سر محفوظ ہے تاہم ابن سعید مغربی کہتا ہے کہ "تھانہ گجرات کا آخری شہر ہے، اور ہندوستان کے اس ساحل پر سب کفار آباد ہیں، جو بتوں کو پوجتے ہیں لیکن وہ اپنے ساتھ مسلمانوں کو بھی بساتے ہیں[۱]" کھنبایت (گجرات) کے متعلق ابن سعید کہتا ہے کہ "وہ ہندوستان کے ساحلی شہروں میں سے ہے، جہاں تاجر جایا کرتے ہیں، اور وہاں مسلمان آباد ہیں[۲]" کولم (مدراس) کے متعلق بیان کرتا ہے کہ "کولم سالے ذاتوں ملک کا آخری شہر ہے، سمندر کے کنارے واقع ہے یہاں مسلمانوں کا ایک محلہ ہے، اور اُن کی ایک جامع مسجد بھی ہے[۳]"

اس بیان کے کم و بیش سوا سو برس کے بعد ابن بطوطہ ہندوستان آتا ہے، اور محمد تغلق سلطان دہلی کی طرف سے سفیر ہو کر چین روانہ ہوتا ہے، وہ دہلی سے دولت آباد (دکن) ہو کر کرناٹک (معبر) کی راہ سے ملیبار، کولم اور کالی کٹ پہنچتا ہے، جہاں سے اس زمانہ میں جہازات چین ہو کر روانہ ہوا کرتے تھے، جہاز تباہ ہوتا ہے، اور ابن بطوطہ واپس آکر جزائر مالدیپ، سراندیپ، (سیلون) اور جاوہ وغیرہ کی سیر کرتا ہے، اور پھر ملیبار آکر خشکی سے کنارہ کنارہ بنگال سے آسام ہو کر چین چلا جاتا ہے،

ابن بطوطہ ان تمام راستوں میں جہاں جہاں مسلمانوں کی آبادیاں ملتی ہیں، یا مسلمان افراد سے ملاقاتیں ہوتی ہیں، ان سب کا تذکرہ کرتا ہے، لیکن اب یہ صاف نظر آتا ہے، کہ مسلمان تاجروں کے ساتھ ساتھ مسلمان صوفیہ اور فقراء کے دستے بھی ملتے جاتے ہیں، اور چونکہ ان فقراء کی ظاہری حالت ہندو جوگیوں اور بدھ بھکشوؤں سے ملتی جلتی معلوم ہوتی ہے،

---

[۱] تقویم البلدان ابو الفداء مطبوعہ پیرس ۱۸۴۰ء ص ۳۵۹، [۲] ایضاً ص ۳۵۷، [۳] ایضاً ص ۳۶۱

اس لئے عوام میں اُن کے ساتھ گرویدگی اور عقیدت نمایاں ہے، اور اس کا اثر اسلام کی اشاعت پر جو کچھ پڑ سکتا تھا وہ ظاہر ہے،

اس وقت سلطان دہلی کی حکومت اگرچہ گجرات، کرناٹک اور دکھن تک پہونچ چکی تھی، تاہم ابھی ساحلی علاقوں میں اثر بہت کم تھا، اور جنوبی صوبوں میں ہندو امرا، بدستور فرماں روا تھے، کبھی کبھی جب وہ مجبور ہوتے تھے، تو سالانہ خراج ادا کر دیتے تھے، مگر عرب تاجر اور عجمی صوفیہ برابر اپنے کاروبار میں لگے رہتے تھے، ابن بطوطہ دولت آباد اور ساگر ہو کر کھنبایت پہنچتا ہے، گو یہ بندرگاہ سلطنت دہلی سے اب ملحق پاتا ہے، مگر یہاں کی تمام تجارت، کاروبار اور اثر و اقتدار تاجروں اور جہازرانوں کے ہاتھ میں نظر آتا ہے، ایک نو مسلم ہندو الیاس نامی ناخدا ہے مسلمانوں کی ہر طرف کثرت ہے تاجروں کی بنائی ہوئی مسجدیں اور صوفیہ کی خانقاہیں آباد ہیں، کہتا ہے کہ "عمارات اور مساجد کی حیثیت سے یہ بہترین شہر ہے، اور اس کا سبب یہ ہے کہ یہاں کے اکثر باشندے دوسرے ملکوں کے تاجر ہیں، تو وہ ہمیشہ عمدہ مکانات اور خوبصورت مسجدیں بناتے رہتے ہیں، اور اس میں باہم مسابقت کرتے ہیں، عالیشان عمارتوں میں نسے شریف سامری کا محل ہے، اس کے پہلو میں عظیم الشان مسجد ہے، اور ملک التجار گازرونی کا مکان ہے، اور اس کے پہلو میں بھی مسجد ہے،.... شہر میں حاجی ناصر دیار بکری صوفی کی خانقاہ ہے، دوسری خواجہ اسحاق کی ہے، جہاں لنگر قائم ہے[۱]،

اس شہر میں اسلام کی آبادی اور ترقی کے اس معیار کو دیکھو جو اب اس سوا سو برس میں اس کو حاصل ہو گئی، اب ہندو نو مسلم بھی جہازراں بن کر دینی اعزاز و دولت حاصل کر رہے ہیں، خانقاہیں آباد ہیں، اور لنگر خانے جاری ہیں، ابن بطوطہ کھنبایت کے بعد کاوی اور گندھار پہنچتا ہے جہاں

---

[۱] ابن بطوطہ ج ۲ ص ۱۲۸ - و ۱۲۹، مطبوعہ خیریہ مصر،

ایک ہندو راجہ جانشی حکمراں ہر؟ تاہم مسلمان یہاں آباد ہیں، اور بعض راجہ کے دربار میں داخل ہیں، یہاں کا ناخدا ابراہیم چھ جہازوں کا مالک ہے، یہاں ہمارا مسافر جاگرنامی جہاز پر سوار ہوتا ہے فوقہ (یا گوگا) نام شہر میں داخل ہوتا ہے، یہاں کا راجہ دنگول ہندو ہے، تاہم یہاں مسلمان ملتے ہیں، ایک مسجد ہے جو حضرت خضر کی طرف منسوب ہے، اور حیدری فقراء کی ایک جماعت مع اپنے شیخ کے یہاں گوشہ نشین ہے، یہاں سے سنگاپور پہنچتا ہے، دیکھتا ہے کہ یہاں ہندو راجہ ہریب کی ماتحتی میں ایک اسلامی ریاست سلطان جمال الدین ہنوری کی قائم ہے، مسلمانوں کا آباد کردہ شہر رونق پذیر ہے، اور عظیم الشان جامع مسجد ہے، جو بغدادی مسجدوں کا مقابلہ کر رہی ہے یہ ناخدا حسن کی بنوائی ہوئی تھی، اور سلطان جمال الدین ہنوری اسی ناخدا کا بیٹا تھا،

جزیرہ کے پاس ایک چھوٹا سا جزیرہ اور ہی، ہمارا سیاح جب وہاں قدم رکھتا ہے کیا دیکھتا ہے کہ ایک بتخانہ کی دیوار سے ٹیک لگائے ایک جوگی مراقبہ میں مصروف ہی، آنکھیں بند ہیں، ابن بطوطہ نذر پیش کرتا ہے، وہ قبول نہیں کرتا، اور الٹا خود کئی اشرفیاں اس کو دیتا ہی، اور ایک اونٹ کے بالوں کی بنی ہوئی عبا نذر کرتا ہے، اور ابن بطوطہ کے ہاتھ سے تسبیح لے کر اس کو ملتا اور سونگھتا ہے، اور پھر آسمان کی طرف نظر اٹھا کر اشارہ کرتا ہے، اور پھر قبلہ کی طرف اشارہ کرتا ہے، جہاں دیدہ سیاح ان اشاروں سے پالیتا ہے، کہ یہ جوگی کے بھیس میں کسی مسلم صوفی کی روح ہے، جو باشندگان جزیرہ کے خوف سے اپنے اسلام کو چھپائے ہوئے ہے، چلتے وقت رازدان سیاح، جوگی کے ہاتھ کو بوسہ دیتا ہے، اس کے رفقائے سفر معترض ہوتے ہیں، اس پر جوگی ابن بطوطہ کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے، اس کو چومتا ہے، اور مسکرا دیتا ہے، اور واپسی کا اشارہ کرتا ہے، اور چپکے سے چند اور اشرفیاں ہدیہ دیتا ہے، باہر آکر ابن بطوطہ جوگی کے راز کو اپنے ہمراہیوں کے سامنے پیش کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ یہ مسلمان ہے،[۱]

---

[۱] ابن بطوطہ جلد ۲ ص ۱۳۱ و ۱۳۳ مطبوعہ مطبع خیریہ مصر،

سنگاپور سے لوٹ کر وہ ملیبار آتا ہے، دیکھتا ہے کہ اس ملک میں چھوٹے بڑے بارہ راجہ حکومت کرتے ہیں، ملک آباد ہے، ہر طرح امن وامان ہے، مسلمانوں کی بڑی عزت ہے، مگر ہندو مسلمانوں کے ساتھ کھاتے نہیں، اور نہ اپنے گھر کے اندر آنے دیتے ہیں، راستہ میں دیکھتے ہیں تو ہٹ جاتے ہیں، مسلمان مسافروں کے لئے ہر جگہ سرائیں ہیں، ہر جگہ مسلمانوں کی آبادیاں ہیں[۱] جن شہر میں سب سے پہلے وہ داخل ہوا، اس کا نام ابی سرور بتاتا ہے، اور کہتا ہے کہ یہ ساحل پر بندرگاہ ہے، اور یہاں کے مسلمان چودھری کا نام شیخ جمعہ ہے، یہ دولت مند اور بڑا مخیر ہے، اپنی تمام دولت غریبوں اور محتاجوں پر صرف کرتا ہے، آگے بڑھ کر پاکنور میں وہ داخل ہوتا ہے، کہتا ہے کہ یہاں مسلمانوں کی ایک جماعت ہے، یہاں کے مسلمان چودھری کا نام حسین سلاط ہے، اور یہاں قاضی اور خطیب بھی ہیں، اور حسین کی بنوائی ہوئی ایک جامع مسجد بھی ہے، اور یہاں کے راجہ کا نام باسدیو ہے، اس کے پاس تیس جنگی جہاز ہیں، اور ان کا کپتان مسلمان ہے، اس کے بعد وہ منگرور پہنچتا ہے، یہاں فارس اور یمن کے مسلمان تاجروں کو ملتے ہیں، یہاں کے راجہ کا نام رام دیو بتاتا ہے، اور کہتا ہے کہ اس شہر میں چار ہزار مسلمان ہیں، عام رعایا گو ان کے خلاف ہے، مگر راجہ تجارت کی مصلحت سے اُن سے صلح رکھتا ہے، یہاں کے مسلمان قاضی کا نام بدرالدین کرناٹکی ہے، اور وہ یہاں درس بھی دیتا ہے،

بعد ازیں شہر ہیلی میں داخل ہوتا ہے، یہاں ایک عالیشان جامع مسجد ہے، جس کی وجہ سے یہ شہر ہندوؤں اور مسلمانوں کے نزدیک متبرک ہے، جہاز والے اس کی نذریں مانتے ہیں، خطیب حسین اس کا متولی ہے، اور حسین وزان یہاں کا چودھری ہے، اس مسجد میں طالب علموں کی ایک جماعت ہے، جن کو مسجد کے خزانہ سے وظیفے ملتے ہیں، اور اس کے متعلق ایک مطبخ ہے، جس سے مسافروں کو اور غریب مسلمانوں کو کھانا ملتا ہے، یہاں مقدشوا (افریقہ) کے ایک درویش سے

---

[۱] ابن بطوطہ ج ۲ ص ۱۳۱ و ۱۳۲ مطبوعہ مطبع خیریہ مصر،

ملاقات ہوئی، جو ہمیشہ روزہ رکھتے ہیں، پھر یہاں سے جرپٹن یا گرپٹن پہنچا، یہاں بغداد کے ایک عالم سے ملاقات ہوئی، ان کا ایک بھائی یہاں بڑا تاجر تھا، یہاں کے راجہ کا نام کویل ہے یہاں سے فارس عمان اور یمن کو جہازات جاتے ہیں، یہاں سے وہ پٹن گیا، یہ بھی راجہ کویل ہی کی عملداری میں ہے، راجہ کویل کے باپ کی بنوائی ہوئی ایک جامع مسجد ہے، اور ایک عالیشان تالاب بھی ہے، جس میں مسلمان نہاتے اور وضو کرتے ہیں، یہ تالاب راجہ کویل ہی کے بزرگوں میں سے کسی نے بنوایا ہے، اور وہ مسلمان تھا، اس کے اسلام کا ایک عجیب قصہ لوگوں نے سنایا، اس جامع مسجد میں ایک خاص قسم کا درخت ہے، کہتے ہیں کہ ہر موسم خزاں میں اس سے ایک پتہ گرتا ہے، جس پر دست قدرت سے لاالہ الا اللہ لکھا ہوتا ہے، یہ پتہ جب گرتا ہے، تو آدھا مسلمان لے لیتے ہیں، اور آدھا ہندو راجہ کے خزانہ میں جمع ہوتا ہے، اور سخت بیماریوں میں اس سے شفا حاصل ہوتی ہے، راجہ مذکور یہ کرامت دیکھ کر مسلمان ہو گیا، اور اس پر ایک جامع مسجد اور تالاب بنوا دیا، اس کے بعد راجہ کی اولاد مسلمان نہ ہوئی، اوس نے اس درخت کو اکھڑوا دیا، خدا کی قدرت اس کے بعد یہ درخت پہلے سے بھی زیادہ شاندار طریقہ سے اُگ آیا، اور راجہ فوراً مر گیا،

یہاں سے یہ پٹن پہنچا، یہ بھی بندرگاہ ہے، اور سمندر کے کنارے ایک مسجد ہے، جس میں مسلمان ٹھہرتے ہیں، کیونکہ یہاں کوئی مسلمان نہیں، یہاں کے باشندے برہمن ہیں، جو ہندوؤں میں عالی مرتبہ ہیں، اور وہ مسلمانوں سے نفرت کرتے ہیں، اور اسی لئے یہاں مسلمان نہیں ہیں، یہ ایک جامع مسجد بھی جو باقی ہے، وہ اس وجہ سے ہے کہ ایک برہمن نے اس کی چھت خراب کر دی تو اس کے گھر میں آگ لگ گئی، جس میں وہ خود اس کی اولاد اور گھر کا تمام اثاثہ جل گیا،

اس وقت سے ہندو اس مسجد کو متبرک سمجھتے ہیں، اور اس کو ڈر سے نہیں چھوتے، اس کے بعد یہاں سے نکل کر پندرینا پہنچا، یہاں مسلمانوں کے تین محلے ہیں، اور ہر محلہ میں ایک مسجد ہے، اور ساحل پر جامع مسجد ہے، اور عجب پُر بہار ہے، یہاں کا قاضی اور خطیب عمان کا ایک آدمی ہے، اس کا بھائی بڑا فاضل ہے،

اس کے بعد کالی کٹ میں داخل ہوا، یہاں کا راجہ ہندو ہے، اور سامری (زمورن) نام ہے، یہ دنیا کے بڑے بندرگاہوں میں سے ہے، چین جاوا سیلون، مالدیپ، یمن، اور فارس کے جہازات آتے ہیں، یہاں کا ملک التجار ابراہیم شاہ بندر ہے، یہ بحرین کا باشندہ ہے، قاضی کا نام فخر الدین ہے، اور یہاں کی خانقاہ کے سجادہ نشین شیخ شہاب الدین گازرونی ہیں، جن کی فتوحات کی کوئی حد نہیں،[۱]

کالی کٹ سے کولم جانا ہوتا ہے، یہاں مسلمان تاجروں کی بڑی جماعت ملتی ہے، علماء بھی ہیں، اور مسلمانوں کا رئیس محمد شاہ بندر ہے، ایک تاجر کی بنوائی ہوئی ایک جامع مسجد بھی ہے، یہاں مسلمان معزز اور محترم ہیں، یہاں کے راجہ کا نام تبردری ہے، یہ مسلمانوں کی بڑی عزت کرتا ہے، اور اُن کے ساتھ عدل و انصاف سے پیش آرہا ہے،

سیلون (سرندیپ) اور مالدیپ کو ہم بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں، اب ان پر چند صدیاں گذر چکی ہیں، ہمارا سیاح اب مالدیپ پہنچتا ہے، دیکھتا ہے کہ ان جزیروں میں صرف مسلمان ہی مسلمان ہیں، اور وہ نہایت نیک اور پابند مذہب اور باایمان ہیں، یہاں ایک عورت سلطانہ خدیجہ بنت صلاح صالح بنگالی حکمران ہے، یہاں کے لوگوں کے مسلمان ہوجانے کا واقعہ یہ ہے، کہ پہلے یہ سب کافر تھے، یہاں ہر سال سمندر سے ایک عجیب بلا آتی تھی، اس کا دستور تھا کہ ایک کنواری لڑکی بلیدان دی جاتی تھی، ایک دفعہ یہ واقعہ پیش آیا، لڑکیوں پر قرعہ پڑا،

[۱] یہ تمام اقتباسات ابن بطوطہ جلد ۲ ص ۱۳۴، ۱۴۰ سے ہیں، [۲] ص ۱۴۳،

ایک بڑھیا کی لڑکی کا نام نکلا، بڑھیا سخت بے قرار ہوئی، اتفاق سے اس بڑھیا کے یہاں بربر کا ایک مسلمان ٹھہرا تھا، وہ حافظِ قرآن تھا، مسلمان نے کہا گھبراؤ نہیں، میں اس کی تدبیر کرتا ہوں اس رات کو وہ مسلمان، عورت بن کر بیت خانہ میں گیا، لوگ صبح کو گئے کہ اس کی لاش اٹھالائیں دیکھا کہ وہ زندہ تلاوتِ قرآن کر رہا ہے، یہ کرامت دیکھ کر لوگ سخت متحیر ہوئے، بادشاہ کو خبر ہوئی، وہ بھی آیا، سب نے اسلام قبول کیا، اور اس نے وہاں رہ کر سب کو اسلام کے آداب و احکام کی مالکی مذہب کے مطابق تعلیم دی، ایمان کی جامع مسجد پر اسبتہ کمیں یہ عبارت لکڑی میں منقوش ہے کہ "سلطان احمد شنورازہ، ابوالبرکات بربری مغربی کے ہاتھ پر اسلام لایا۔"[1]

یہ قصہ صحیح ہو یا نہ ہو مگر یہ واقعہ ہے کہ جزیرہ مالدیپ آج بھی مسلمانوں سے آباد ہے اور ایک مسلمان سلطان زیرِ حفاظت برطانیہ حکمراں ہے، سنہ ۱۹۰۱ء کی مردم شماری میں یہاں مسلمانوں کی تعداد تیس ہزار تھی، یہاں کے مسلمانوں میں عربی النسل بکثرت ہیں، اور بودھ مت کے نومسلموں کی بھی تعداد کثیر ہے جو کہ اصلی باشندے ہیں، اسی کے قریب سرندیپ جس کو سیلون اور لنکا بھی کہتے ہیں، واقع ہے، یہاں بھی اسلام نے اپنا پورا دخل پیدا کر لیا، سنہ ۱۹۰۱ء کی مردم شماری میں یہاں دو لاکھ مسلمان تھے، یہاں اسلام ابھی اپنی پُرامن رفتار ترقی سے چل رہا تھا کہ زمانہ نے تاریخ کا ورق الٹ دیا، اور مسلمانوں کا زوال اور مسیحی یورپ کی ترقی کا آغاز ہوا، پندرھویں صدی عیسوی میں پرتگیزوں نے اور پھر ڈچوں نے آکر اسلام کا بیڑا غرق کر دیا، اور اس وقت سے ان جزائر میں اور جنوبی ہند میں اسلام کی جگہ عیسائیت نے لے لی، اور وہ منظر آج بھی آپ کے سامنے ہے۔

صفحاتِ بالا میں ہندوستان میں اسلام کے داخلہ کے تین راستوں میں سے ایک راستہ کا نقشہ دکھایا گیا ہے، اور صدی بصدی اس کی ترقی کی تصویر کھینچ دی گئی ہے، دیکھو کہ اس تصویر

---

[1] سفرنامہ ابن بطوطہ ج ۲ ص ۲ ۵ و ۱۲۵ و ۱۲۵ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں سیلون اور مالدیپ کا مضمون۔

یں خون کی سُرخی کہیں نہیں جھلکتی، بلکہ اسلام اپنی سادگی، مساوات اور حقانیت سے اپنا راستہ خود صاف کرتا گیا ہے، اور نیچ ذات اور معمولی لوگوں کے دلوں پر قبضہ کرتا ہوا بادشاہوں اور راجاؤں کے قلوب تک پر قابض ہو گیا ہے، ان عرب تاجروں اور درویشوں کے ہاتھوں میں محمود اور عالمگیر کی تلوار نہ تھی، اُن کے ذریعہ سے جو اشاعتِ اسلام ان اطراف میں ہوئی، اس کے طریقے حسب ذیل تھے،

۱۔ عرب تاجروں نے خود آکر اپنی نو آبادیاں قائم کیں، یہاں کی نومسلم عورتوں سے انھوں نے شادیاں کیں،

۲۔ نیچ ذات کے ہندو اور نابرہمن جو برہمنوں کے دباؤ، ظلم اور ترفع اور غرور سے نالاں تھے، انھوں نے اسلام میں آکر عزت پائی،

۳۔ تاجروں کی فیاضی اور انسانیت نوازی نے غریبوں اور محتاجوں کو اپنے دامن میں پناہ دی،

۴۔ جو لوگ ذرہ ذرہ سی باتوں پر اپنی ذات سے خارج کر دیئے جاتے تھے، وہ اسلام کی برادری میں داخل ہوتے گئے،

۵۔ بہت سے لوگ اپنے بچوں کو غربت کے مارے عربوں کے ہاتھ فروخت کر دیتے تھے، وہ اُن کو لیکر اسلام کی تربیت دے کر اپنی اولاد کی طرح پال کر جوان کرتے تھے،

۶۔ اسلام کی روحانی طاقت کی عجیب و غریب نشانیاں اُن کی نگاہوں سے گذریں، جس نے اُن کو اسلام کے قبول کرنے پر مجبور کر دیا،

۷۔ علما اور درویشوں نے اپنی روحانی کشش کے جلوے دکھائے،

ہندوستان میں اسلام کے داخلہ کا دوسرا راستہ سندھ ہے پہلی صدی ہجری یا ساتویں صدی عیسوی میں شمالی

ہندوستان پر تین سلطنتیں محیط تھیں، سندھ جس کی ایک حد سمندر تھی، اور دوسری حد بلوچستان، اور تیسری پنجاب کے اندر ملتان کے بعد تک، اور چوتھی موجودہ صوبہ متحدہ کے کنارہ تک، ملتان کے کچھ بعد پنجاب کا جو علاقہ رہ جاتا تھا، اس کا نام عربوں کی اصطلاح میں چھوٹا کشمیر تھا، اور اس کے بعد موجودہ بڑا کشمیر تھا، اور ادھر موجودہ صوبہ متحدہ میں قنوج (اودھ) کی سلطنت شروع ہو جاتی تھی، غرض اس حد بندی سے یہ واضح کرنا ہے کہ سندھ کا علاقہ اس زمانہ میں موجودہ سندھ سے بہت وسیع تھا، عرب جغرافیہ نویسوں اور سیاحوں نے اپنے زمانہ کے سندھ کی حد بندی یہ کی ہے کہ اس کے ایک طرف سمندر، دوسری طرف بلوچستان، تیسری طرف کشمیر، اور چوتھی طرف قنوج کی حکومت ہے،

اس قطعۂ زمین میں جو قومیں آباد تھیں اُن کے حسب ذیل نام تھے:-

(۱) مید، یہ قوم دریائے سندھ جس کو عرب نہر مہران کہتے تھے، اس کنارہ پر آباد تھی، اس قوم کا نشان سندھ میں اب تک ہے،

(۲) جاٹ جس کو عرب زط کہتے تھے، یہ دریا کے اس کنارہ پر بستے تھے، یہ دونوں قومیں آپس میں ہمیشہ دست و گریبان رہتی تھیں،

(۳) ٹھاکر، جن کو عرب اپنے تلفظ میں تاکرا ور جمع کی صورت میں تکاکرہ بولتے تھے یہ راجپوت تھے، اور سلطنت کے امرا اور فوج کے سپہ سالاروں میں اُن کا شمار تھا،

ان کے علاوہ برہمن تھے بھاٹیہ اور سومری وا بسی اور سودھا قومیں آباد تھیں،

ہم اس حقیقت کا اوپر کی سطروں میں اظہار کر چکے ہیں کہ جب وقت مسلمان ہندوستان میں آنے لگے ہیں، اس ملک کا تنہا مذہب ویدک دھرم یا برہمنی نہ تھا، بلکہ زیادہ تر بودھ مت تھا، اس لئے آج کل کے آریہ سماجی دوستوں کا شور و غل اور ہنگامۂ و فریاد اور اپیل، واقفکار اور اہل علم اصحاب

کی نظروں میں مضحکہ انگیز ہے، اس سلسلہ میں ہم اس سے بھی زیادہ ایک دلچسپ نظریہ کا اظہار کرنا چاہتے ہیں، بودھ مت کے خلاف سب سے زیادہ پُرجوش جہاد جس نے کیا وہ نویں صدی عیسوی (تیسری صدی ہجری) کے شنکراچاریہ جی ہیں، لیکن تم بتا سکتے ہو کہ بودھ مت کی بت پرستی کے خلاف اس ہندی مجدد میں یہ جوش و ولولہ کہاں سے آیا، شنکراچاریہ جی جنوبی دکن میں پیدا ہوئے ملیبار میں نشو و نما پائی، اور یہ وہ مقامات تھے، جو اسلام کے نعرۂ توحید سے گونج رہے تھے، اور جہاں بت پرستی کے خلاف مسلمان واعظین کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں، اس بنا پر جس طرح شمالی ہندوستان میں کبیر داس اور گرو نانک وغیرہ پہلے اور دیانند جی بعد کو پیدا ہوئے جنھوں نے اسلام کی توحید سے بت شکنی کا سبق سیکھا، ٹھیک اسی طرح تیسری صدی ہجری کے عرب تجّار اور واعظین سے جو اس علاقہ میں اس وقت پھیلے ہوئے تھے شنکراچاریہ جی نے بت شکنی کا فیض حاصل کیا،

سندھ میں مسلمان پہلی صدی کے آخر میں یعنی آٹھویں صدی عیسوی کے بالکل شروع میں آئے، اور ہندوستان سے بدھ مت کا پورا زوال نویں صدی میں اور اوس کے بعد ہوا ہے، ہمارا خیال ہے، کہ ہندوستان میں بدھ مت کا زوال ویدک دھرم کے پرچار سے زیادہ، اسلام کی فتوحات اور اس کی تبلیغ و اشاعت سے ہوا ہے، مسلمان جب بنگال پہنچے ہیں، تو وہاں ویدک دھرم نہیں بودھ مذہب تھا، اور اسی طرح سندھ کا وسیع علاقہ مسلمانوں کے داخلہ کے وقت برہمنوں کا نہیں بودھ مت کا پجاری تھا، ہم کو وہاں بودھ پور[1] نام ایک شہر ملتا ہے، نوبہار[2] نام ایک خانقاہ یا معبد ملتا ہے، جو خاص بودھ لوگوں کی خانقاہ اور دار التعلیم کو کہتے ہیں، اور ان کے پجاریوں کا نام ہم سمنی سنتے ہیں، جو خاص بودھ علماء کا لقب تھا، اور جو برہمن کے حریف مقابل تھے الیٹ صاحب بھی اپنی تاریخِ ہند میں لکھتے ہیں:-

---

[1] چچ نامہ ترجمہ الیٹ ص ۱۴۳ [2] چچ نامہ ترجمہ الیٹ ص ۱۵۰ و ۱۶۱

"چونکہ بودھ مت سندھ میں اس وقت مسلمہ طور پر رائج تھا، جب مسلمانوں کو پہلے پہل ہندوستانی توہم پرستی سے سابقہ پڑا، اس لئے لازمی طور پر اس نام (بد) کا ماخذ لفظاً بودھ ہے، نہ کہ فارسی لفظ بد (بت) جو کہ غالباً خود بھی لفظ بودھ کی محرف شکل ہے۔

.... بہت سے آثار اس بات کے موجود ہیں کہ بودھ مت اس عہد میں اودی سندھ میں پھیلا تھا، نہ صرف مخصوص طور پر چینی سیاحوں کے تذکرے اور ابن حوقل کا بیان اس کی تائید کرتا ہے، بلکہ عرب مصنفین کے چند ضمنی اشارات وتلمیحات بھی ہیں، جن میں خاص طور پر کوئی تذکرہ برہمنوں اور بودھوں کا بحیثیت ایک دوسرے کے حریف ہونے کے نہیں ہے، کیونکہ ان دونوں کا امتیاز باہمی (خصوصاً طرزِ عبادت، ایصالِ ثواب، قصص مذہبی) عام طور پر اس قدر نازک ہے کہ ناواقف اور مغرور بدیسیوں کی توجہ مشکل سے ادھر منعطف ہوسکتی تھی، چنانچہ جہاں کہیں پجاریوں کا تذکرہ ہے عموماً اُن کو "سمنی" کہا گیا ہے، سلطنت کا ہاتھی سپید ہوتا تھا، جو ایک نہایت معنی خیز بات ہے، ایک ہزار برہمن (پجاری) جس نام سے کہ اُن کا عربی کتابوں میں تذکرہ ہے، اور جو چاہتے تھے، کہ اپنے قدیم مذہبی معتقدات، اور رسم ورواج کو قائم رکھیں، اُن کو محمد بن قاسم نے خلیفۂ وقت کی اجازت سے فرمان دیا تھا، کہ وہ اپنے ہاتھوں میں کچکول لے کر ہر صبح کو در بدر پھر کر اپنی روزی حاصل کریں، اور یہ ایک مخصوص مذہبی رسم ہے، جو بدھ پجاریوں میں جاری ہے، اور سب سے آخر یہ کہ مجسّمے بنا کر یا کسی اور طور پر اپنے فاتحوں کی جسمانی یادگار قائم کرنا، یہ تمام امور بدھوں کے خصائص طبعی کی طرف اشارہ کرتے ہیں، نہ کہ برہمنوں کے، ان اثباتی دلائل کے علاوہ منفی شہادت بھی اس امر سے پیدا ہوتی ہے، کہ کوئی تذکرہ ستی، جنیو، گئو پوجا،

اشنان (اشنان) ہون پجاریوں کے ہتھکنڈوں، اور دوسرے پیشوایانہ تحکمات، جوگیانہ نفس کشی، یا دیگر رسوم و اعمال جو برہمنی مذہب کے خصوصیات ہیں، ان تحریرات میں نہیں ہیں[1]۔"

اسی سے یہ مسئلہ بھی حل ہو گا کہ اہل سندھ اس قدر روادار، بے تعصب، علوم و فنون میں ماہر، سیر و سیاحت اور دوسری قوموں سے ملنے جلنے میں کیوں اس قدر آزاد تھے، بغداد کے دربار میں جو حکما تھے، وہ یقیناً یہی سندھ کے بودھ مت والے تھے، اور یہی ایران تک گئے، سندھ اور ایران بری اور بحری دونوں راستوں سے باہم قریب قریب ہم سرحد ہیں، اسی لئے سندھ کے راجاؤں اور ایران کے بادشاہوں میں آپس میں لڑائیاں جاری رہتی تھیں، کبھی یہ اُن پر حملے کرتے رہتے تھے، اور کبھی وہ اُن پر حملہ آور ہوتے تھے، کبھی بلوچستان، اور مکران کے علاقے سندھ میں شامل ہو جاتے تھے، اور کبھی سندھ کی سرحدیں سلطنت کسریٰ کے حدود میں آجاتی تھیں، اس تعلق سے ایران کی فوج میں سندھ کی متعدد قومیں سپاہیانہ خدمات انجام دیا کرتی تھیں، ان میں تین قوموں کے نام آتے ہیں، اساورہ، سیابجہ، اور زط، زط تو جاٹ ہے، اساورہ شاید کہ سوار کی جمع ہو، اور سیابجہ، سیاہ بچہ (کالا) کی شاید خرابی ہو، بہرحال اساورہ کی قومیت کا حال یقینی طور سے نہیں معلوم، مگر سیاہ بچہ اور جاٹوں کے ساتھ اُن کے میل جول اور خلا ملا سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بھی شاید سندھ ہی کے رہنے والے ہوں، اور خصوصاً اس بنا پر کہ یہ عربوں اور ایرانیوں کی لڑائی میں یہ ایرانیوں سے الگ ہو کر مسلمانوں کے شریک حال ہو گئے تھے[2]۔

بہرحال سندھی قوموں میں سب سے پہلے جاٹوں میں اسلام پھیلا ہے، یہاں تک کہ صحابۂ کرام

---

[1] الیٹ جلد اول ص ۵۰۴، ۵۰۶ ۱۸۶۷ء،

[2] بلاذری ذکر اساورہ ص ۳۷۲-۳۷۳،

کے زمانہ میں تو نو مسلم جاٹ اپنا بودھ مذہب چھوڑ کر عراق جا کر بسنے لگے تھے، حضرت عبداللہ بن مسعود جو کوفہ میں رہا کرتے تھے، وہ ایک روایت میں کہتے ہیں کہ "ہم نے ایسے لوگوں کو دیکھا جو صورت شکل میں بالکل جاٹ معلوم ہوتے تھے"[1] حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے غالباً ۳۲ھ کے قریب میں وفات پائی ہے،

یہ قبائل چونکہ یزدگرد شاہ ایران کی فوج میں تھے، اس لئے اُن کو مسلمانوں کے دیکھنے اور ملنے کا بکثرت اتفاق ہوا ہوگا، یزدگرد کے مقابلہ میں حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ مسلمانوں کی فوج لئے پڑے تھے کہ سیاہ (کالا، شاید ہندوستانی پہلے بھی کالے کہلاتے ہوں) نے جو اسواری تھا، اور اپنی جماعت کا سردار تھا، اسلام کی کامیابی اور کمک کو دیکھ کر حضرت ابو موسیٰؓ کو یہ پیغام بھیجا کہ "ہم لوگ بھی تمہارے مذہب میں داخل ہونا چاہتے ہیں، مگر اس شرط پر کہ ہم تمہارے دشمن ایرانیوں سے تو تمہارے ساتھ مل کر لڑیں گے لیکن اگر تم میں خود باہم لڑائی ہو تو فریقین میں سے کسی کا ساتھ نہ دیں گے، اور اگر عرب ہم سے لڑیں تو ہماری حفاظت تم پر فرض ہوگی، اور ہم کو مذہبی ہوگی، نیز ہم کو اجازت ہوگی کہ ہم جہاں چاہیں، قیام کریں، اور جس قبیلہ سے چاہیں اتحاد کرلیں، اور ہمارے وظائف درجہ اعلیٰ کے ہوں"

حضرت ابو موسیٰؓ نے جواب دیا کہ ہم نو مسلموں کے لئے صرف ایک ہی شرط جانتے ہیں کہ اُن کے اور تمام مسلمانوں کے حقوق ہر طرح برابر ہوں گے، لیکن انھوں نے اس مجمل شرط کے قبول کرنے سے انکار کیا، حضرت عمرؓ کو خبر ہوئی تو کہلا بھیجا کہ "اُن کی یہ سب شرطیں مان لی جائیں" چنانچہ اس کے بعد یہ لوگ مسلمانوں کے ساتھ آکر مل گئے، اور انہی کے ساتھ سیاہ بجہ اور جاٹ لوگ بھی شریک ہوگئے، یہ لوگ عراق میں آکر عرب قبائل کے ساتھ مل کر آباد ہوئے، اور

---

[1] ترمذی ابواب الامثال،

یہ سندھی قوموں میں اسلام کا پہلا داخلہ تھا، اُس کے بعد اس قبیلہ کے اور لوگ جو سواحل پر مویشی چراتے تھے، وہ مسلمان ہو گئے،

یہ سندھی قومیں چونکہ بہادر اور جنگ جو تھیں، اس لئے اسلامی فوجوں میں اُن کو خاصہ درجہ حاصل ہو گیا، اور اکثر امانت اور اعتماد کی جگہوں پر اُن کا پہرہ بٹھایا جاتا تھا، حضرت علیؓ کے عہد میں بصرہ کا خزانہ انہی سپاہیوں کی نگرانی میں تھا، اور وہ حضرت علیؓ کے طرفداروں میں تھے، (دیکھو طبری) ان لوگوں نے مسلمان ہو کر اپنے نام اسلامی رکھ لئے تھے، بصرہ کی اس محافظ فوج کے سردار کا نام ابوسلمہ تھا جو جاٹ تھا اور نہایت صالح تھا، امیر معاویہؓ نے غالبًا رومیوں کے مقابلہ کے لئے عراق سے بہت سے جاٹوں اور سیاہ بچوں کو لیجا کر شام کے ساحلی شہروں میں اور انطاکیہ میں بسایا تھا، اور اسی طرح ولید بن عبدالملک اموی نے بھی اپنے عہد میں ان جاٹوں کو انطاکیہ میں لیجا کر آباد کیا تھا[۵۱]،

عراق میں آبادی اور عربوں سے میل جول کے بعد جاٹ مسلمان نہ صرف سپاہی ہی رہے بلکہ ان میں سے بعض خاندانوں نے علمی ترقیاں بھی کیں، اس حقیقت کے اظہار میں کوئی شرم نہیں بلکہ یہ اسلام کے فخر کا نشان ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہ جن کے پیرو آج اسلام کے بیشتر ممالک میں ہیں، اور جن کی فقہ پر آج مصر و ٹرکی اور افغانستان کی سلطنتوں کا دارومدار ہے، وہ ایک جاٹ تھے[۵۲]، کیا دنیا کا کوئی مذہب اس مساوات اور رواداری کی مثال پیش کرسکتا ہے، اور اپنے نو معتقدوں کو یہ رتبہ اور یہ اعزاز بخش سکتا ہے، کہ وہ امام اعظم کا لقب حاصل کرسکے، امام ابوحنیفہ کی ولادت سنہ ۸۰ھ میں ہوئی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا

---

۵۱ یہ پوری تفصیل فتوح البلدان بلاذری باب امر الاساورہ والزط میں مذکور ہے، ۵۲ ابن خلکان ترجمہ نعمان بن ثابت، ج ۲ ص ۴۰۲،

خاندان فتح سندھ سے پہلے اسلام لا چکا تھا بعض مورخین نے یہ لکھا ہے کہ یہ خاندان کابل سے آیا تھا،

مسلمانوں نے سندھ پر باقاعدہ حملہ ۹۳ھ میں شروع کیا، یہ وہ زمانہ تھا جب عراق میں حجاج بن یوسف ثقفی کی گورنری تھی، اور اُس کے ماتحت ایران میں اس کا ہفتدہ سالہ بھتیجا محمد بن قاسم ثقفی والی تھا، اوپر گذر چکا ہے کہ عراق اور جزائر ہند کے درمیان عربوں کی تجارت قائم تھی، اور اُن کے جہازات سوداگری کے مال واسباب لدے ہوئے آتے جاتے رہتے تھے، سندھ کے سواحل بیچ کے رہ گذر تھے، ان سواحل پر خانہ بدوش قبائل آباد تھے، جو بحری ڈاکے ڈالا کرتے تھے، مالدیپ میں بعض مسلمان تاجر تھے، جو مع اہل وعیال وہاں رہا کرتے تھے اتفاق سے ان تاجروں نے وفات پائی، مالدیپ کے راجہ نے مناسب سمجھا کہ اُن کی بیوی بچوں کو عراق بھیج دیا جائے، چنانچہ یہ مسلمان خواتین ایک جہاز پر سوار کرا کے بھیجی گئیں، جب یہ جہاز سندھ کے کناروں پر پہنچا تو سندھ کے دریائی ڈاکوؤں نے اس کو لوٹ لیا، اور مسلمان خواتین کو نہایت بے رحمی سے جدا کر لے گئے، انہی خاتونوں میں سے کسی معصوم کی زبان سے یہ درد بھری چیخ نکلی "اے حجاج! مدد!" بچے کھچے مسافر جب عراق پہونچے تو اس سانحہ کا حال حجاج کو معلوم ہوا، اُس نے اُسی وقت دیوانہ وار پکار کر کہا :- اے خاتون! ٹھہرو، میں آیا"

اُسی کے ساتھ ایک اور واقعہ بھی سامنے رکھ لو، سندھ کا برہمن راجہ چچ جو ایک بلند حوصلہ راجہ تھا، بلوچستان اور مکران پر اُس نے پے بہ پے حملے کئے تھے، یہ اسلام سے کچھ پہلے کی بات ہے اسلام کے بعد مسلمانوں کی طرف سے ان حدود میں جو فوج متعین تھی اس میں سے ایک عرب سردار محمد علافی یا علانی نام، پانچ سو عربوں کے ساتھ ایک مجرم کی حیثیت سے اسلامی فوج سے نکل کر راجہ چچ کے ساتھ ہو گیا تھا، اور اکثر معرکوں میں اُس کے ساتھ رہا، اور اس وقت بھی

جب اسلامی فوج سندھ کے قریب آچکی تھی، اور اب راجہ چچ کا بیٹا راجہ داہر حکمران تھا وہ برابر اس کے ساتھ رہا،

غرض یہ آتشگیر مسالہ تو پہلے سے موجود تھا، ان مسلمان خواتین کے لوٹے جانے کے واقعہ نے حجاج ثقفی کو برافروختہ کر دیا، اس پر بھی اُس نے ملائمت کے ساتھ راجہ داہر کو لکھا کہ "ان مسلمان خواتین کو عزت اور حرمت کے ساتھ واپس بھیج دو" راجہ نے یہ کہکر ٹالا کہ "ان ڈاکوؤں پر میرا قابو نہیں" ناچار مسلمانوں کو خود براہ راست ان ڈاکوؤں کی تنبیہ کرنی پڑی، حجاج نے ایران سے محمد بن قاسم کو آگے بڑھنے کا حکم دیا، اور ادھر سمندر کی راہ سے اُس نے اسلحہ اور سامان روانہ کئے، ہندوستان پر مسلمانوں کے ابتدائی حملہ کے یہ اسباب ہیں، ان میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے، کہ جس کو اس جذبہ سے موسوم کیا جائے کہ وہ دیوانہ وار تلواریں سونت سونت کر ہندوستان کی سرحد پر اس لئے بڑھ آئے، کہ وہ ہندوؤں کو بزور شمشیر مسلمان بنا ڈالیں،

گو الیٹ صاحب کو نظر نہیں آتا، مگر کم از کم مجھے تو سندھ کی سب سے پہلی پرانی اسلامی تاریخ جو عام طور پر چچ نامہ کے نام سے مشہور ہے، (اور جس کے دوسرے نام تاریخ السند اور منہاج المسالک ہیں) کے مطالعہ سے یہ پوری طرح واضح ہو جاتا ہے کہ سندھ میں بودھوں اور برہمنوں کے درمیان اختلاف اور مخاصمت برپا تھی، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں مذاہب بعض گھرانوں میں اس طرح بھی پھیلے ہوئے تھے، کہ ایک بھائی ہندو ہے تو دوسرا بودھ ہے، اسی بنا پر سندھ کے راجاؤں کے حالات پڑھ کر مجھے یہ فیصلہ کرنا پڑا ہے کہ راجہ چچ ہندو برہمن تھا، اس نے چھوٹے چھوٹے بودھ راجاؤں کو لڑ بھڑ کر مٹا دیا، یا باجگذار بنا لیا تھا[1] یہ

---

[1] چچ نامہ الیٹ ج ۱ ص ۱۴۲ و ۱۵۱

راجہ آغازِ ہجرت کے وقت سندھ میں فرماں روا تھا، اس کے بعد راجہ چندر اُس کا بھائی راجہ ہوا، بودھ مت کا پرجوش پیرو تھا، اور جن لوگوں نے اپنا مذہب پہلے چھوڑ دیا تھا، ان کو زور اس نے بودھ بنایا،[۱] ہندو برہمنوں نے یہ دیکھ کر سر اُٹھایا، ناچار وہ معرکوں میں نکلا، مگر کامیاب نہیں ہوا، اُس کے بعد چچ کا بیٹا راجہ داہر اس کی جگہ بیٹھا، یہ مجھے ہندو برہمن معلوم ہوتا ہے،

تاریخی قیاسات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت جب مسلمان سندھ کی سرحد پر پہنچے، ملک میں ان دونوں مذہبوں کے اندر جنگ برپا تھی، اور بودھ برہمنوں کے مقابلہ میں اپنے کو بے دست و پا پاکر مسلمانوں کی طرف صلح و محبت کا ہاتھ بڑھا رہے ہیں، ہم دیکھتے ہیں کہ عین اُس وقت جب محمد بن قاسم کی فاتح فوج شہر بیرون یا نیرون میں پہنچتی ہے، تو وہاں کے لوگوں نے اپنے سمینوں (بودھ پجاریوں) کو پیش کیا، اور معلوم ہوا کہ انھوں نے اپنے سفرا عراق میں خاص حجاج کے پاس بھیج کر امان حاصل کر لی ہے، چنانچہ نیرون کے لوگوں نے محمد کا شاندار استقبال کیا، اس کے لئے رسد کا انتظام کیا، اور اپنے شہر میں داخل کیا، اور صلح کی پوری پابندی کی، اس کے بعد جب اسلامی فوج نہر سندھ کو عبور کرکے ہندوستان پہنچتی ہے، تو پھر سمینہ[۲] بودھ لوگ صلح کے قاصد بنتے ہیں،[۳] اسی طرح سیوستان میں ہوتا ہے، کہ سمنی لوگ (بودھ) نیچے راے اپنے راجہ کو چھوڑ کر بخوشی مسلمانوں کا ساتھ دیتے ہیں، اور اُن کو قبول کرتے ہیں،

---

[۱] چچ نامہ ایلیٹ ص ۱۵۲، و ۱۵۳ ج ۱، [۲] یہاں پہنچ کر ذرا ہم کو لفظ سمینہ پر ایک لحظہ ٹھہرنا ہے، سب سے پہلے یہ لفظ مجھکو علم کلام کی کتابوں میں نظر آیا، ذکر المعتزلہ زبیدی، ملل و نحل شہرستانی، کتاب البدء والتاریخ للبلخی والمقدسی میں یہ لفظ ملا، لیکن اس کی حقیقت سے ناواقف رہا، اس کے بعد جب سندھ کی تاریخ پڑھی تو اس میں یہ لفظ بار بار آیا، اور معلوم ہوا کہ یہ عربی زبان میں بودھ مت کے پیرووں کا نام ہے، اصل میں یہ سنسکرت لفظ ہے، ایلیٹ صاحب کہتے ہیں، کہ یہ سنسکرت لفظ "سرامنا" ہے، جس کے معنی پجاری جوگی

کاکا کوئی مشہور عقلمند اور سیاست داں آدمی تھا، جاٹ، وُسا اس کے پاس جاکر مشورہ کرتے ہیں کہ کیا مسلمانوں کی فوج پر شبخون مارا جائے، وہ جواب میں کہتا ہے: "اگر تم ایسا کرسکو تو بہتر ہے، مگر سُنو کہ ہمارے پنڈتوں اور جوگیوں نے جنتر دیکھ کر یہ پیشینگوئی کردی تھی کہ اس ملک کو ایک دن مسلمان فتح کرلیں گے، لوگ اس کی بات نہیں مانتے، اور نقصان اٹھاتے ہیں" کاکا نے کہا تم خوب جانتے ہو کہ میرا ارادہ اور عزم مشہور ہے لیکن بودھوں کی کتابوں میں پیشینگوئی پہلے ہی لکھی جاچکی ہے، کہ ہندوستان کو مسلمان فتح کریں گے، اور میں بھی یقین رکھتا ہوں کہ درحقیقت ایسا ہی ہونے والا ہے"، اُس کے بعد کاکا محمد بن قاسم کے پاس چلا جاتا ہے، اور جاٹوں کے ارادوں سے اُس کو آگاہ کرتا ہے، اور اپنی کتابوں کی پیشینگوئی اُس کو سُناتا ہے، محمد بن قاسم اس کو بعزت تمام لیتا ہے، اور اس کو اُس کے ساتھیوں کو انعام واکرام اور خلعت سے سرفراز کرتا ہے، اور راجہ داہر کے بہت سے مخالف افسر (غالبًا بودھ) خود آکر اطاعت کرتے ہیں[۵۱]، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سندھ کے بودھوں نے ایک طرف مسلمانوں کو اور دوسری طرف برہمنوں کو تولا، تو اُن کو مسلمان بہتر نظر آئے، اور دوسری وجہ یہ ہوسکتی ہے، کہ اس سے پہلے ترکستان و افغانستان کے بودھوں کے ساتھ مسلمانوں نے جو حُسنِ سلوک کیا، ان لوگوں نے جس کثرت اور سرعت کے ساتھ اسلام کو اختیار کیا، اس کا اثر ملک کے بودھوں پر بھی پڑا،

(بقیہ حاشیہ ص ۲۱۹) یا زاہد کے ہیں، اور خاص طور پر بودھ مت کے معتقدوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے، اور قریب قریب اسی نام سے یونانی مورخوں اور جغرافیہ نویسوں نے بھی اُن کا تذکرہ کیا ہے (ج ۱ ص ۵۰۶) [۵۳] بلاذری ص ۴۳۰ و ۴۳۸ طبع بریل لیڈن میں یہ واقعہ نہیں پہلا واقعہ چچ نامہ میں بھی ہے،

[۵۱] چچ نامہ الیٹ ص ۱۰۶، ایضاً ص ۱۶۰، ۱۶۱-۱۶۲، ۱۶۷

محمد بن قاسم ایک ایک شہر کو فتح کرتا جاتا تھا، اور نقباے اسلام لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتے جاتے تھے، محمد بن قاسم نے اعام اعلان کر دیا تھا، کہ جو چاہے اسلام کو قبول کرکے ہمارا بھائی بنے، اور ہمارے برابر حقوق حاصل کرے، اور جو چاہے، اپنے کیش و مذہب پر قائم رہ کر اطاعت اختیار کرلے، لوگ جوق جوق آرہے تھے، اور اپنی خواہش کے مطابق یا مسلمان ہورہے تھے، یا ذمی بن رہے تھے، خود محمد بن قاسم کی فوج میں اس وقت چار ہزار نومسلم جاٹ تھے[۱] بودھی ان ایک سردار اکرامان اور منصب پاتا ہے[۲] نیرون میں بدھ معبد کے مطابق نومسلموں کے لئے جامع مسجد بنتی ہے، اور ایک امام مقرر ہوتا ہے[۳] سیوستان اور سیسام کے قلعے جب فتح ہوتے ہیں، تو وہاں کے لوگ اسلام قبول کرتے ہیں، بت خانوں کی جگہ مسجدیں تعمیر ہوتی ہیں، امام و موذن مقرر ہوتے ہیں، خطبے پڑھے جاتے ہیں[۴]

اب ٹھاکر بھی اسلام کی اطاعت کی طرف مائل ہوتے ہیں، محمد بن قاسم ان کی پوری عزت کرتا ہے، ان کو اکرام و انعام و جاگیر سے خوش کرتا ہے، موکا نام ٹھاکر آتا ہے تو اس کو دو بانگی کا چتر دیتا ہے، یہ پہلا چتر ہے، جو مسلمان کسی ہندو راجہ کو عطا کرتے ہیں[۵]

ہم کو ایک سندھی پنڈت کا نام ملتا ہے، جو راجہ داہر کے دربار میں پورا رسوخ رکھتا تھا، وہ مسلمان ہو جاتا ہے، اور یہ درجہ حاصل کرتا ہے، کہ اس کو "مولانا اسلامی" کا خطاب ملتا ہے، اور محمد بن قاسم کی طرف سے وہ راجہ داھر کے دربار میں سفیر بن کر جاتا ہے، مولانا اسلامی جب دربار میں قدم رکھتے ہیں، تو پہلے کی طرح راجہ کی ہندوانہ بندگی نہیں بجالاتے ہیں، راجہ پہچانتا ہے، اور اس گستاخی کی وجہ دریافت کرتا ہے، مولانا فرماتے ہیں: اے راجہ! جب میں

---

[۱] بلاذری ص ۴۴۳ و چچ نامہ ص ۲ [۲] الیٹ ج اول ایضاً ص ۱۵۸ [۳] ایضاً ص ۱۶۴

[۵] ایضاً ص ۱۶۵،

تیری رعایا تھا تو مجھ پر واجب تھا کہ تیری تعظیم بجا لاؤں، مگر اب جب میں مسلمان ہو گیا ہوں، اور اسلام کے بادشاہ کی رعایا ہوں تو مجھ سے یہ توقع نہیں رکھنی چاہئے کہ میں اپنا سر ایک کافر کے سامنے جھکاؤں گا"۔ راجہ یہ سُن کر آگ ہو گیا، اور کہا کہ اگر تم قاصد بن کر نہ آئے ہوتے تو تمھاری گردن اُڑا دیتا۔" مولانا نے کہا: "ایک میرے قتل سے عربوں کو کوئی بڑا نقصان نہیں پہنچ سکتا، لیکن وہ میرے قتل کا تم سے انتقام لیں گے، اور جرمانہ وصول کر لیں گے"[۱]۔

دیکھو تو ایک نو مسلم پنڈت کو اپنے اسلام پر کتنا غرور اور اپنے مسلمان بھائیوں کی امداد و اعانت پر کتنا بھروسا اور عام مسلمانوں کے ساتھ اپنے حق اور رتبہ کی برابری پر کتنا یقین ہے،

پھر نظر آتا ہے کہ بھاٹیہ ٹھاکر اور غزنی کے جاٹوں نے اسلام کی رضامندانہ اطاعت اختیار کر لی ہے[۲]، محمد بن قاسم امرائے سندھ کے نام عام اعلان کرتا ہے کہ جو چاہے مسلمان ہو کر ہمارا بھائی بن جائے، اور جو چاہے اپنے مذہب پر قائم رہ کر امن و امان حاصل کرے، اِس اعلان کو پڑھ کر سیسار کا راجہ داہر کے وزیر نے اپنے خاص معتمدوں کو بھیج کر امان حاصل کی، اور اُس نے اپنے اخلاص کے ثبوت میں ان مسلمان خواتین کو جو جہاز میں لوٹ لی گئی تھیں، دربار میں لا کر حاضر کیا[۳]،

برہمن آباد وغیرہ کے فتح ہو جانے کے بعد غالباً برہمنوں نے یہ دیکھ کر کہ اُن کے حریف بودھوں نے مسلمانوں کے ساتھ مل کر کس قدر فوائد حاصل کئے ہیں، انھوں نے بھی اپنا ایک وفد مرتب کیا، اور محمد بن قاسم کے دربار میں پہونچے، محمد نے اُن کی قدر کی، لیکن برہمنوں نے یہ شرط پیش کی کہ ہندوستور کے مطابق ہمارا قومی درجہ تمام دیگر ذاتوں سے بلند رکھا جائے،

---

[۱] چچ نامہ ایلیٹ ج ۱ ص ۱۲۵ [۲] ایضاً ص ۱۶۰ [۳] ایضاً ص ۱۶۰،

محمد بن قاسم نے اُن کے ان دعوی کی سچائی کی تحقیق کی، اور جب اُس کو اُس کے متعلق تشفی ہو گئی، تو اُس نے اُن کا اعزاز کیا، اور اُن کو تمام عہدوں پر سرفراز کیا، برہمنوں نے اس کا خاص شکریہ ادا کیا، اور گاؤں گاؤں میں جاکر نئے حکمراں کے عدل و کرم کے گیت گائے، اور اپنے ہم مذہبوں کو اطاعت اور فرماں برداری پر آمادہ کیا، اور جو مساوات حقوق عربوں کی بدولت پیدا ہوتی تھی، اس کی ہر جگہ جاکر تعریفیں کیں[1]۔

باایں ہمہ محمد نے اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا، کہ وہ فاتح سے زیادہ ایک مبلغ ہے، چنانچہ اس نے برہمنوں میں بھی عام اعلان دیا کہ جو چاہے اسلام اختیار کرے، اس سے جزیہ معاف ہوگا (مگر ظاہر ہے کہ مسلمانوں کی طرح اس پر زکوٰۃ فرض ہے) اور جو اپنے آبائی مذہب پر قائم رہنا چاہے وہ بخوشی رہ سکتا ہے۔

"بعضے از ایشاں بر اقامت معاودت نمودند و بعضے دل برگزیدہ نہادند و بر کیش اسلاف می رفتند"

چچ نامہ کا یہ فقرہ ہے اس کے ساتھ یہ ہے:-

ان میں جو مسلمان ہو گئے تھے، وہ غلامی اور جزیہ وغیرہ سے آزاد رہے، اور جو اپنے مذہب پر قائم رہے، اُن کے تین درجے قائم کئے گئے، اعلیٰ طبقہ یعنی امراء کے لئے ۴۸ درم، متوسط طبقہ کے لئے ۲۴ درم اور نیچے طبقہ کے لئے ۱۲ درم ٹیکس مقرر ہوا، اور یہ حکم دیا گیا، کہ جو لوگ مسلمان ہو جائیں وہ اس سے معاف کئے جائیں، (لیکن اُن پر مسلمانوں کی طرح جزیہ کے بجائے ڈھائی فیصدی زکوٰۃ ضروری واجب ہو گی جس کی مقدار جزیہ سے زیادہ ہی رہی) چنانچہ جن لوگوں نے اسلام قبول کر لیا تھا، وہ

---

[1] چچ نامہ ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۴۸، ۱۹۱ ایلیٹ ج ۱

جزیہ سے معاف ہوئے، اور جو لوگ اپنے آبائی مذہب پر رہے، انھوں نے جزیہ دیا، لیکن اُن کی زمینیں اور جائدادیں اُن سے لے نہیں لی گئیں، بلکہ علی حالہا اُن کے ہی قبضہ میں رہنے دی گئیں[1]،

کیا اس اقتباس سے یہ پوری طرح واضح نہیں ہوتا کہ فاتح سندھ نے اپنے مذہب کی اشاعت میں کبھی بھی تشدد اور سختی کا استعمال نہیں کیا، بلکہ اُس نے ہر مذہب کو جائز آزادی عنایت کی جزیہ کی رقم جو وصول کی گئی وہ حد درجہ معمولی ہے، یعنی زیادہ سے زیادہ ۴۸ درم، اور کم سے کم ۱۲ درم موجودہ انگریزی سکوں کے مطابق، گویا اس نے امراء سے سالانہ دس روپئے، متوسط طبقہ سے سالانہ پانچ روپے اور غرباء سے سالانہ ڈھائی روپئے لئے اور اس سے زیادہ بڑھ نہیں سکتا تھا، اس کے مقابلہ میں دیکھو کہ مسلمانوں سے جو رقم وصول کی جاتی تھی، وہ فی شخص مقرر نہ تھی، بلکہ اُس کی آمدنی کے اعتبار سے ڈھائی فی صدی لی جاتی تھی، جو دس روپیہ سالانہ سے بہت زیادہ ہو جاتی تھی، اس پر بھی اگر ہمارے آریہ دوست یہ کہیں کہ اسی جزیہ کے سبب سے ہندوؤں نے اسلام قبول کر لیا، تو اُس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ ہندوؤں کی نگاہوں میں اُن کا مذہب خود اس قدر کم رتبہ تھا، کہ اُن کے امراء کے نزدیک دس روپئے سالانہ، متوسطین کے نزدیک پانچ روپے سالانہ، اور غرباء کے نزدیک دو روپیہ آٹھ آنہ سالانہ بھی اُن کے دھرم کی قیمت سے زیادہ گراں تھا، تو یہ مسلمانوں کا قصور نہیں،

محمد بن قاسم نے سندھ سے فراغت کر کے ملک کے دوسرے حصوں میں بھی ہندوؤں کے سامنے اپنے مذہب کی تبلیغ کی، چنانچہ یہی ملتان میں اُس نے کیا، مگر کسی ایک کو بھی اُس نے اسلام کے قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا، سندھ کے محدود رقبہ کے باہر سندھ سے متصل جو ایک حقیقی ہندوستان

[1] چچ نامہ ص ۱۸۲ الیٹ ج ۱

یعنی قنوج کی سلطنت تھی، محمد نے اپنے داعی وہاں راجہ کے دربار میں بھی بھیجے، چنانچہ ایک ہزار دستہ کی حفاظت میں اُس نے راجہ قنوج کے پاس اپنے مبلغ بھیجے کہ اسلام کا ہدیہ قبول کرو، مگر اُس نے بدقسمتی سے انکار کیا[۱]، محمد کچھ اور آگے کارروائی کرنا چاہتا تھا، مگر اُس کو موقع نہ ملا، اور دربار خلافت کی طلب پر وہ واپس گیا، جب وہ یہاں سے جانے لگا تو اہل سندھ نے اس کا بڑا ماتم کیا، اور اس کے مجسمے بنا بنا کر یادگار قائم کی[۲]،

ہم صفحات بالا میں اپنے ناظرین کو سندھ کے علاقہ کی سیر کرا رہے تھے، اب بھی ہم وہیں ہیں، محمد بن قاسم کی فتوحات ۹۳ھ میں اور اُس کے بعد ہوئی تھیں، یہ خلیفہ ولید بن عبدالملک کا زمانہ تھا، اس کے بعد ۹۶ھ میں سلیمان بن عبدالملک خلیفہ ہوا، اور ۹۹ھ میں اُس نے وفات پائی، اُس کے انتقال کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ خلیفہ ہوئے جنھوں نے ۱۰۱ھ میں اس عالم کو الوداع کہا، اسی سے فرشتہ وغیرہ مصنفین کی غلط بیانی ثابت ہوتی ہے، جنھوں نے لکھا ہے کہ خلیفہ عبدالملک نے محمد بن قاسم کو سندھ سے پکڑوا کر اس لئے بانواعِ عقوبت قتل کر ڈالا کہ محمد بن قاسم نے راجہ داہر کی جن لڑکیوں کو حرم سرائے خلافت کے لئے بھیجا تھا، انھوں نے محمد بن قاسم سے انتقام لینے کے لئے خلیفۂ وقت عبدالملک سے جا کر یہ جھوٹی شکایت کی کہ "اے خلیفہ! اب ہم تیرے کام کی نہیں: کہ محمد بن قاسم اس سے پہلے ہماری عصمت دری کر چکا ہے" یہ سن کر خلیفہ بہت برہم ہوا، اور اس نے حکم دیا کہ ابن قاسم کو سندھ سے گرفتار کرکے لایا جائے، اور اس جرأتِ رندانہ کے پاداش میں اس کا سر قلم کر دیا جائے، لیکن بلاذری، طبری وغیرہ عرب مورخین نے اس واقعہ کا ذکر تک نہیں کیا ہے، سندھ عبدالملک کے بعد فتح ہوا ہے، اور ابن قاسم خلیفہ سلیمان کے حکم سے گرفتار ہوا ہے، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ حجاج کی اس سازش میں کہ سلیمان خلیفہ نہ ہو،

---

[۱] چچ نامہ ص ۲۰۰، [۲] فتوح البلدان بلاذری ص ۴۴۰،

ابن قاسم بھی شریک تھا، اس لئے جب سلیمان خلیفہ ہوا، تو اس نے شرکائے سازش کو پوری سزا دی، چونکہ فارسی تاریخوں کی بدولت فتوحات سندھ کے سلسلہ میں یہ کہانی لوگوں میں عام طور سے پھیلی ہوئی ہے، اس لئے بعض رفقائے دارالمصنفین کو ہم نے ہدایت کی ہے، کہ وہ ایک مستقل مضمون میں اس واقعہ کی تنقید کریں،

بہرحال محمد بن قاسم نے خلیفہ سلیمان کے عہد میں جب سندھ کو چھوڑا ہے، تو وہاں اسلام کو کافی رونق ہو چکی تھی، اور جیسا کہ پہلے ہم نے لکھا ہے وہاں کے بودھوں اور برہمنوں دونوں میں اسلام پھیلنا شروع ہو چکا تھا، خلیفہ سلیمان کے بعد جب حضرت عمرؓ بن عبدالعزیزؒ خلیفہ ہوئے، تو انھوں نے محمد بن قاسم کے ادھورے کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا چاہا، معلوم ہے کہ حضرت عمر ابنؒ عبدالعزیز نہایت دیندار، زاہد، متقی، عدل پرور اور منصف خلیفہ تھے، ان کے سہ سالہ عہد خلافت میں اسلام نے وہی رونق حاصل کر لی تھی، جو خلافت راشدہ کے دور میں اسے حاصل تھی، خلیفۂ اسلام حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کے عدل و انصاف، زہد و اتقاء اور حسن سیرت و حسن کردار کے افسانے ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیلے ہوئے تھے، اور حکومت اسلام کی غیر مسلم رعایا اسلام کے اس زندہ پیکر کو دیکھ کر اس کی طرف کھنچی چلی آتی تھی،

سندھ کی غیر مسلم رعایا بھی اسی اثر میں دبی تھی، اور اس کی کشش سے حلقۂ اسلام میں داخل ہوتی چلی جاتی تھی، خود خلیفہ نے سندھ کے راجاؤں کے نام خطوط لکھے، اُن کو اسلام کی دعوت دی، اس دعوت کو کامیابی حاصل ہوئی، اور بعض راجاؤں نے خوشی خوشی اسلام کو قبول کیا،

بلاذری طبع یورپ ص ۴۴۴ میں اور کامل ابن اثیر طبع یورپ جلد ۵ ص ۴۴ میں ہے،

فکتب الی الملوک (ملوک السند)	حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز نے سندھ کے
یدعوھم الی الاسلام والطاعۃ	راجاؤں کو خطوط لکھے جن میں ان کو

علیٰ اَنْ تَیَملکهم ولهم ما للمسلمین	اسلام اور اطاعت کی دعوت دی،
وعلیهم ما علیهم وقد کانت	اس شرط پر کہ اُن کی حکومتیں قائم رہینگی
بلغتهم سیرته و مذهبه	اُن کے اور مسلمانوں کے تمام حقوق
فاسلم جیشه والملوک و	مساوی ہوں گے، ان لوگوں کو
تسمّوا باسماء العرب،	اس سے پہلے حضرت عمرؓ بن عبد العزیزؒ
	کے اخلاق اور مذہب کا حال معلوم
	ہو چکا تھا، اس پر داہر کا بیٹا جے سنگھ
	(یا جے شیا) اور دوسرے راجہ
	مسلمان ہو گئے، اور انھوں نے اپنے
	نام عربوں کے سے رکھے،

پہلے زمانہ میں ایک بادشاہ کے تبدیلِ مذہب کا، جو اثر رعایا پر پڑتا تھا، وہ سب کو معلوم ہے، اس بنا پر سندھ کے ان راجاؤں کے قبولِ اسلام سے ان کی رعایا میں اسلام کی خاطر خواہ اشاعت ہوئی ہوگی،

۱۰۷ھ میں خالد قسری عراق کا والی اور اس کی طرف سے جنید سندھ کا نائب مقرر ہوا، جنید نے ۱۰۷ھ میں کسی غرض سے چاہا کہ ایک فوج لے کر جے شیا کے ملک کو عبور کرے، راجہ کو خوف ہوا کہ وہ کہیں اس بہانہ سے ہمارے ملک پر قبضہ نہ کرلے، اس لئے اس نے آگے بڑھ کر روکا، اور کہا کہ ہم لوگ مسلمان ہیں، اور مجھے اس مردِ صالح (حضرت عمرؓ بن عبد العزیزؒ) نے یہاں کا والی بنایا تھا، آخر طرفین نے ضمانت پیش کی، پھر مورخین لکھتے ہیں، کہ راجہ مرتد ہو کر لڑنے پر آمادہ ہو گیا، اور باہمی ضمانتیں ایک دوسرے کو واپس کر دی گئیں، راجہ گرفتار ہو کر مارا گیا، اس کے بھائی چچ نے

چاہا کسی طرح وہ بچکر عراق نکل جائے، اور گورنر عراق خالد قسری کے سامنے اپنا مقدمہ اور جنید کی غداری کا واقعہ پیش کرے، لیکن جنید نے اس کو بھی دھوکے سے قتل کروا دیا[۱]،

میرا خیال ہے کہ راجہ کے نقض عہد کر لوٹنے سے اُس کے کفر و ارتداد پر استدلال صحیح نہیں ہوسکتا، اگر ایسا ہوتا تو جے کو کسی طرح عراق جاکر اپنا مقدمہ پیش کرنے کی جرأت نہ ہوسکتی، بلکہ جنید نے اپنی کارروائی کو صحیح ثابت کرنے کے لئے یہ اختراع کیا ہوگا، واقعہ یہ ہوگا جیسا کہ اس قسم کے واقعات حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کے بعد دوسرے اسلامی ملکوں میں بھی پیش آئے، کہ ظالم امراء اور حکام اس بنا پر کہ غیر مسلموں کے مسلمان ہو جانے سے جزیہ کی رقم کم ہو جاتی ہے، ایسا کرتے تھے کہ نومسلموں سے بھی جزیہ کا مطالبہ کرتے تھے، حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز نے اپنے زمانۂ خلافت میں اس خلافِ شریعت رسم کا قطعی سدباب کر دیا، اس پر افسروں نے شکایت کی کہ خزانہ خالی ہو رہا ہے، حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز نے جواب میں لکھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم داعی اور ہادی بن کر آئے تھے، محصل اور ٹیکس وصول کرنے والے بن کر نہیں آئے تھے، حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کے سنہ ۱۰۱ھ میں وفات پا جانے کے بعد رفتہ رفتہ پھر وہی بدعت شروع ہوگئی، خالد القسری والی عراق کے متعلق مشہور ہے کہ وہ دل سے مسلمان نہ تھا، اس کی ماں نصرانیہ تھی، اور اس کا خود میلان مجوسیت کی طرف تھا، ایسی صورت حال میں اس کی ذات سے اسلام کو جو بھی صدمہ نہ پہنچا ہوا وہ کم ہے، اور آخر میں اسی لئے وہ سنہ ۱۲۰ھ میں معزول کر دیا گیا،

خلفائے بنی امیہ سے حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کے بعد کسی اور خلیفہ کے متعلق معلوم نہیں کہ اُس نے ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کی کوشش کی ہو، یا تو خود بخود اسلام نے اپنا راستہ آپ صاف کیا، یا طالبین حق نے خود آگے بڑھ کر دستگیری کی، اور اسلام کی اشاعت ہوئی، یا

---

[۱] کامل ابن اثیر وغیرہ واقعات سنہ ۱۰۷ھ

علما، مشائخ اور تجار نے اپنا فریضۂ تبلیغ ادا کیا، تاہم ملک سندھ میں اسلامی مرکز کے قیام نے اس کے اطراف میں اسلام کی روشنی پہنچانے میں بڑا کام کیا، منصور کے عہد میں سندھ کا شہر گندہار فتح ہوا، اور وہاں بت خانہ کے بجائے مسجد تعمیر ہوئی، تو حکم الٰہی سے وہاں بڑی سرسبزی و شادابی ہوئی، اور خوب غلہ پیدا ہوا، اس پر وہاں کے باشندوں نے مسجد کو بڑے خیر و برکت کی چیز سمجھا، اور اس کو بڑا متبرک قرار دیا[۱]، بنو عباس کے عہد فرماں روائی کے ساتھ اسلام میں عقلی معرکہ آرائیوں نے نئے برگ و بار پیدا کئے، اور مخالفین اسلام کے اعتراضات کے جواب میں کتابیں تصنیف ہونے لگیں، اور سلطنت نے ہر طرح اس کام میں مصنفین کی مدد کی،

علم کلام کا پہلا بانی واصل بن عطاء ہے، ۸۰ھ میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوا، اور ۱۳۱ھ میں وفات پائی، بصرہ جو ہندوستان کا بندرگاہ تھا، اس کا مسکن تھا، اسلام کی پہنائے سلطنت میں جو غیر مسلم فرقے تھے، ان میں ایک ہندوستان کا فرقۂ سمنیہ بھی تھا، آپ پہلے پڑھ چکے ہیں کہ عرب سمنیہ، بودھ کے پیرووں کو کہتے تھے، جو خدا کی مستقل ہستی کے قائل نہ تھے، جہم ابن صفوان جو فرقۂ جہمیہ کا بانی ہے، اس سے ان بودھ مت والوں سے مناظرہ ہوا، بودھیوں نے کہا کہ اشیا کے علم و معرفت کے تمھارے پاس صرف پانچ ذریعے ہیں، یعنی حواس خمسہ، یہ بتاؤ کہ تم کو اپنے خدا کا علم ان میں سے کس حاسہ کے ذریعہ سے ہوا، جہم نے کہا، ان میں سے کسی سے نہیں، بودھیوں نے کہا تو پھر خدا مجہول ہے، یعنی اس کے وجود پر یقین کیونکر ہوا، جہم کوئی جواب نہ دے سکا، اور اس نے واصل کو یہ اعتراض لکھ کر بھیج دیا، واصل نے جواب میں لکھا کہ انسان کے پاس علم و معرفت کے علاوہ ایک چھٹا ذریعہ بھی موجود ہے، اور وہ دلیل ہے، ان سے پوچھو کہ دیوانہ اور ہشیار میں، زندہ اور مردہ میں کوئی فرق ہے، یا نہیں ہاں

[۱] بلاذری طبع یورپ ص ۴۴۵،

کہنے سے چارہ نہیں، اور یہ فرق صرف دلیل سے معلوم ہوتا ہے، جہم نے بھی یہی جواب جاکر بودھ والوں کو دیا، انھوں نے کہا، یہ تمھارے دماغ کی بات نہیں، جہم نے اقرار کیا، اور اُن کو واصل کا پتہ دیا، چنانچہ یہ حق کے طالب واصل کے پاس گئے، اور اس سے گفتگو کی، اور اسلام کی حقانیت پر اُس کے دلائل سُن کر مسلمان ہو گئے،[۱]

سندھ کے راجاؤں کو جیسے جیسے اسلام سے واقفیت ہوتی جاتی تھی، ان کا میلان اس کی طرف بڑھتا جاتا تھا، یہاں تک کہ ہم کو ہندوستان کے ایک ایسے راجہ کا بھی علم ہے، جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اہلِ بیت اطہار سے غایت درجہ عقیدت تھی، منصور عباسی کی خلافت میں جب ساداتِ علویہ نے خروج کیا، اور اُن کو کچھ کچھ کامیابیاں ہونے لگیں، تو محمد علوی کے فرزند عبداللہ اشتر نے اپنے باپ کے حکم سے سندھ کا رُخ کیا، اس وقت سندھ میں عمر بن حفص ایک عرب والی تھا، اُس نے عبداللہ بن اشتر کا نہایت دھوم دھام سے استقبال کیا، اور سندھ میں عباسیوں کے بجائے علویوں کی حکومت کا اعلان ہو جانے والا تھا، سپید علم بن چکے تھے، کہ دفعۃً علویوں کو شکست ہوئی، اور ساری تجویز خاک میں مل گئی، عبداللہ نے کہا کہ اے عمر! اب میری جان تمھارے ہاتھ میں ہے، عمر نے کہا گھبرائیے نہیں، یہاں سندھ کے راجاؤں میں سے ایک بڑا راجہ ہے، جس کے پاس بڑی قوت ہے، اور اس کے ساتھ وہ اشد الناس تعظیماً لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس کو نہایت سخت عقیدت ہے، تم اس سے معاہدہ کرکے اس کے پاس چلے جاؤ، پھر تمھارا کوئی کچھ نہ بگاڑ سکے گا،

---

[۱] شرح کتاب الملل والنحل یحییٰ زبیدی، ترجمۂ واصل، تراجم معتزلہ کا یہ حصہ ڈاکٹر آرنلڈ نے ذکر المعتزلہ کے نام سے الگ رسالہ میں چھپوایا ہے، دیکھو رسالہ مذکور، ص ۱۲ مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن،

چنانچہ عبداللہ نے ایسا ہی کیا، اس نے اُن کو بڑی عزت و تکریم سے لیا، اور وہاں وہ شاہانہ تزک و احتشام سے رہنے لگے، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ اُن کے چار سو طرفدار زیدی بھی اُن کی خدمت میں چلے گئے، منصور کو یہ معلوم ہوا تو عمر کو سندھ کے مشرق سے ہٹا کر افریقہ کے مغرب میں والی بنا کر بھیج دیا، اور اہل بیت کی خاطر راجہ نے منصور جیسے پرشکوہ بادشاہ کی خفگی برداشت کی، عبداللہ مع اپنے دس ہمراہیوں کے اتفاقاً نئے والی کے ہاتھ گرفتار ہوگئے[۱]، مگر اُن کے سینکڑوں ہمراہی غالباً وہیں سکونت پذیر ہوگئے۔

خلفائے عباسیہ کے آغاز عہد میں علماء میں دو مقابل کے حریف گروہ تھے، ایک محدثین جو اپنے عمل اور نمونہ سے لوگوں میں دین کی روح پھونکتے تھے، اور دوسرے متکلمین جو اپنے زور بیان، قوت استدلال، اور مخالفین کے معترضانہ خیالات کی تردید کرکے لوگوں کو قبولِ حق کی دعوت دیتے تھے، خلیفہ ہارون رشید پہلے گروہ کا حامی تھا، مگر اتفاقاً بعض واقعات ایسے پیش آئے جنھوں نے ہارون کو بالآخر متکلمین کی طرف بھی ملتفت کردیا،

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ سندھ اور ہندوستان کے بودھی راجاؤں میں اسلام کی طرف جو رجحان پیدا ہورہا تھا، دربار کے بودھ پرست پنڈتوں کو اس کی روک تھام کی بڑی فکر رہا کرتی تھی، منجملہ ان راجاؤں کے ایک راجہ کا ذکر ہے کہ اس نے اپنا میلان اسلام کی طرف ظاہر کیا تھا، اور اُس کے دربار کے پنڈت نے اُسے سمجھانا چاہا، یہ واقعہ دو طریقوں سے بیان کیا جاتا ہے، ایک یہ کہ پنڈت نے راجہ کو سمجھایا کہ یہ مذہب دلیل و برہان کا نہیں، بلکہ صرف تلوار کی قوت سے پھیلتا ہے، چنانچہ راجہ نے ہارون رشید کو لکھا کہ تم ایک ایسے گروہ کے سردار ہو جو انصاف پسند نہیں، وہ صرف تقلیدی مذہب رکھتے ہیں، اور تلوار سے غلبہ پاتے ہیں، اگر تم کو اپنے مذہب

---

[۱] کامل ابن اثیر واقعات سنہ ۱۵۱ھ،

کی صداقت کا یقین ہے تو کسی کو میرے پاس بھیجو کہ میں اس سے مناظرہ کروں، اگر حق تمھاری طرف ہوا تو میں مسلمان ہو جاؤں گا، اور اگر حق میری طرف ہوا، تو تم کو میرا مذہب قبول کرنا ہوگا،
ہارون نے یہ خط پاکر ایک محدث کو سندھ روانہ کیا، راجہ نے ان کی بڑی خاطر مدارات کی،
مناظرہ شروع ہوا، پنڈت نے راجہ کی طرف سے محدث موصوف کے سامنے یہ سوال پیش کیا کہ
بتاؤ تمھارا خدا قادر علی الاطلاق ہے یا نہیں، محدث نے جواب دیا بے شک ہے، پنڈت نے
کہا "تو کیا وہ اس پر بھی قادر ہے کہ وہ اپنے مثل آپ پیدا کرے، ؟ اگر کر سکتا ہے تو وہ قادر علی الاطلاق
نہیں ہوا، محدث نے یہ لفظی گورکھ دھندے سُن کر کہا کہ یہ کلامی مباحث ہیں، جن میں پڑنا ہم بدعت
سمجھتے ہیں، پنڈت نے راجہ کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ حضور نے دیکھ لیا کہ جو کچھ میں کہتا تھا سچ
ثابت ہوا، راجہ نے پھر ہارون رشید کو لکھا کہ پہلے تو صرف لوگ یہ کہتے تھے، کہ اسلام دلیل او
برہان کا مذہب نہیں، اور مجھے ان کے کہنے کا یقین نہ تھا، اب تو بداہتہً معلوم ہو گیا کہ وہ لوگ
جو کچھ کہتے ہیں، سچ کہتے ہیں، اور مجھے یقین ہو گیا؛ کہ تمھارا مذہب غلط ہے، ہارون کے پاس یہ خط
پہنچا تو اس پر قیامت گذر گئی، اور نہایت دلتنگ ہوا، اور اہل دربار سے کہا کہ کیا اب اس دین
کا کوئی ایسا حامی نہیں، جو اس کی طرف سے لڑ سکے، لوگوں نے عرض کی کیوں نہیں بہت
ہیں، پوچھا وہ کون ہیں، جواب دیا وہی لوگ جن کو حضور والا نے دین میں بحث وجدال سے
روک دیا ہے، خلیفہ ہارون رشید نے ان کو حاضر ہونے کا حکم دیا، وہ آئے تو اس نے راجہ
کا اعتراض اُن کے سامنے رکھا، اُن میں سے ایک نوعمر متکلم نے آگے بڑھ کر کہا کہ یہ سوال ہی غلط ہے،
جو مخلوق ہوگا وہ حادث ہوگا، اور جو حادث ہوگا، وہ قدیم کے مثل نہیں ہو سکتا، اس لئے یہ سوال کہ
خدا جو قدیم یعنی ازلی و ابدی ہے، وہ اپنا مثل پیدا کر سکتا ہے یا نہیں، ایسا ہو جیسے کوئی یہ سوال کرے
کہ خدا اپنے کو عاجز یا جاہل بنا دینے پر قدرت رکھتا ہے یا نہیں ؟ خلیفہ ہارون رشید اس نوعمر
متکلم کا جواب سُن کر بہت خوش ہوا، اور حکم دیا کہ اسی کو راجہ کے دربار میں بھیجا جائے، درباریوں نے

عرض کی کہ ممکن ہے کہ وہاں اور بھی کچھ مشکل سوالات پیش ہوں، جن کا جواب یہ نو عمر متکلم نہ دے سکے، اسلئے کسی تجربہ کار کو بھیجنا چاہیئے، چنانچہ معمر ایک مشہور متکلم کا انتخاب ہوا، اور اس کو مناظرہ کے لئے ہندوستان بھیجا گیا، پنڈت معمر کی شہرت سُن چکا تھا، اُس نے خیال کیا کہ اگر معمر صحیح و سالم راجہ تک پہنچ گیا، تو پھر خیریت نہیں، اس لئے اُس نے راستہ ہی میں زہر دے کر اس غریب کا کام تمام کرادیا،[۱]

اس واقعہ کی دوسری صورت یہ ہے کہ ہندوستان کے بعض راجاؤں نے ہارون رشید کو لکھا کہ اپنے ہاں سے اسلام کا کوئی عالم ہمارے یہاں بھیجئے جو مجھے اس مذہب سے باخبر کرے، اور ہمارے پنڈت سے مناظرہ کرے، ہارون نے ایک محدث کو بھیجا، پنڈت نے راستہ ہی میں کسی کو بھیج کر جانچ لیا، کہ یہ کس قابلیت کا آدمی ہے، محدث صاحب جب دربار میں پہنچے تو راجہ نے سب پنڈتوں کو جمع کیا، اور مناظرہ شروع ہوا، ایک پنڈت نے پوچھا کہ تمھارے مذہب کی صداقت کی کیا دلیل ہے؟ محدث نے ایک سلسلۂ سند سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث بیان کی کہ یہ مذہب سچا ہے، پنڈت نے کہا تو تم نے جس شخص سے قول نقل کیا، اس کو کیونکر جانا کہ وہ اپنے دعوائے نبوت میں صادق تھا، محدث صاحب نے اس کے ثبوت میں قرآن پاک کی چند آیتیں تلاوت کیں، پنڈت نے کہا تم نے کیونکر جانا کہ یہ خدا کا کلام ہے، محدث صاحب یہ طرز گفتگو و بحث سُن کر خاموش ہوگئے، راجہ نے باعزاز تمام اُن کو واپس کردیا، اور ہارون کو لکھا کہ کسی متکلم کو بھیجے جو اصل مذہب کی صداقت کی دلیلیں ہمارے سامنے پیش کرسکے، ہارون نے خلدہ نام ایک متکلم کو بھیجا، ابھی وہ راستہ ہی میں تھا کہ پنڈت نے اُس کے پاس بھی آدمی بھیج کر امتحان لیا، کہ وہ کس قابلیت کا آدمی ہے، اور ڈر کر راستہ ہی میں اُس کو زہر دلوادیا، اور وہ مرگیا،[۲]

---

[۱] ذکر المعتزلہ یحییٰ زبیدی طبع حیدرآباد ص ۳۲، [۲] ایضاً ص ۳۵،

اس واقعہ سے مجھے صرف یہ دکھانا تھا کہ اسلام ہندوستان میں آہستہ آہستہ اپنے اثرات پھیلا رہا تھا، اور لوگوں میں یہ خیالات پیدا ہو رہے تھے کہ یہ آخر یہ مذہب کیا ہے،؟ اور کہاں تک یہ سچا ہے؟ غرض اسلام بھی ہندوستان کا ایک قابلِ وقعت مذہب بن گیا۔ اور اسی لئے جب کبھی ہندوؤں نے مسلمانوں کو سندھ کے کسی علاقہ سے بے دخل کیا تو اکثر مسجدوں کا احترام قائم رکھا، اور وہاں کے مسلمانوں کے جمعہ وجماعت میں خلل نہیں ڈالا، مامون المتوفی ۲۱۸ھ کے عہد میں ایک مسلمان افسر نے سندان واقع کچھ کو فتح کر لیا، اور پھر تھوڑے ہی دنوں کے بعد ہندوؤں نے اس کو واپس لے لیا تو وہاں کی مسجد کو علیٰ حالہٖ باقی رکھا، اور اس سے کوئی تعرض نہیں کیا، وہاں جتنے مسلمان رہ گئے تھے، وہ اس میں نماز ادا کرتے تھے، اور خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھتے تھے[۱]

ہارون رشید اور مامون کے زمانہ میں سندھ کے جو حکما اور اطبا بغداد گئے تھے، اُن میں بہت سے اپنے آبائی مذہب پر قائم رہے، البتہ ایک شخص صالح بن بہلہ ہندی نے اسلام ضرور قبول کر لیا تھا، آج کل کے محققوں نے صالح کے عربی نام کو الٹ پھیر کر ہندی نام کے قریب کرنا چاہا ہے، ان کا خیال ہے کہ یہ کسی ہندی نام کی بگڑی ہوئی شکل ہے، اگر اس نکتہ پر اُن کی نظر نہیں پڑی کہ یہ ہندی نہیں خالص عربی نام ہے، جو اس ہندی حکیم نے مسلمان ہونے کے بعد اختیار کر لیا تھا، ابن ابی اصیبعہ نے طبقات الاطباء میں ابراہیم بن صالح کے علاج کے سلسلہ میں صالح کی جو گفتگو نقل کی ہے، اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ مسلمان ہو گیا تھا، صالح کہتا ہے کہ "اے امیر المومنین! تو امام ہے، اگر ایسا ہو (یعنی خدانخواستہ اگر ابراہیم کی اس شب میں موت ہو جائے) تو میرے تمام غلام خدا کی راہ میں آزاد اور میری تمام سواریاں خدا کی راہ

---

[۱] بلاذری طبع یورپ، ص ۴۴۶،

میں وقف، اور میرا تمام مال و اسباب مسکینوں کے لئے صدقہ، اور میری سب بیویوں پر تین طلاقیں واقع ہوں[1]" کیا یہ کسی غیر مسلم کی گفتگو ہو سکتی ہے، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سندھ میں صرف عوام ہی نہیں بلکہ بڑے بڑے ودّان پنڈت اور پڑھے لکھے لوگ بھی اسلام کے اثر سے متاثر تھے،

اس زمانہ میں مسلمانوں میں صرف دینی اور ادبی علوم رائج تھے، یعنی قرآن تفسیر، حدیث، فقہ اور شعر و ادب، چنانچہ سندھ کے نومسلموں نے ان فنون میں کامل دستگاہ پیدا کی، رجال کی کتابوں میں سندھ کے متعدد علما، اور محدثین کے نام ملتے ہیں، ابو معشر نجیح السندی، سندھ کے ایک غلام نادہ تھے، اپنے آقاؤں کے ساتھ سندھ سے عرب گئے، وہاں آزاد ہو گئے، اور انھوں نے مدینہ منورہ میں سکونت اختیار کر لی، کچھ دنوں کے بعد وہ اسی مدینہ کی نسبت سے مشہور ہوئے اور اب ابو معشر نجیح بجائے سندی کے مدنی کہلاتے ہیں، فن مغازی و سیر میں انھوں نے وہ کمال پیدا کیا، کہ امام الفن کہلائے لیکن زبان سے سندیت نہ گئی، عربی صحیح مخارج سے ادا نہیں کر سکتے تھے، تاہم شاگردوں کا ٹھٹھ لگا رہتا تھا، ۱۷۰ھ میں انھوں نے جب وفات پائی، تو فرمانروائے وقت خلیفہ ہارون رشید اس نومسلم سندھی عالم و امام فن کی نماز جنازہ کا امام تھا،

ایک بزرگ رجاء السندی ہیں، جو عرب کے بجائے ایران پہونچے، اور اسفرائینی ہو کر مشہور ہوئے یہ فن حدیث کے باکمال استاد تھے، مشہور محدث حاکم اُن کے بارے میں کہتے ہیں، رکن من ارکان الحدیث، یہ نہ صرف خود محدث اور حافظ حدیث تھے، بلکہ اُن کے خاندان میں اور بہت سے حفاظ حدیث پیدا ہوئے، ۲۲۱ھ میں وفات پائی،

ابو عطاء السندی ایک ادیب گذرا ہے جس کے فضل و کمال ادبی کا شاہد صرف یہ واقعہ کافی

---

[1] طبقات الاطبا، طبع مصر ج ۲ ص ۳۴،

کہ ابو تمام نے حماسہ میں اُن کے عربی اشعار داخل کئے، سندھی بن شاہک ایک سندھی بزرگ بغداد پہنچکر بغداد کے پل پر فردکش ہوئے تھے، اُن کی نسل سے کشاجم پیدا ہوا، جو عربی کا مشہور شاعر گذرا ہے، ابو نصر فتح بن عبد اللہ السندی، ایک سندھی غلام تھے تعلیم پاکر نکلے، تو الفقیہ المتکلم بن گئے، [۱]

خاص ہندوستان میں جہاں اسلام کی سلطنت نہ تھی، وہاں مسلمان تاجر موجود تھے، وہ بھی اپنے فرض (تبلیغِ اسلام) سے غافل نہ تھے، ہندوستان میں کشمیر، ملتان اور کابل کے بیچ میں ایک شہر عسیفان نام کا تھا، (معلوم نہیں اس کا اصلی لفظ ہندی تلفظ کیا ہے؟ تاہم اپنے جغرافیائی حدود کے لحاظ سے وہ پنجاب ہی کا کوئی شہر ہو سکتا ہے) وہاں ایک بڑا بدخانہ (بودھ خانہ یا بتخانہ) تھا جس کا وہاں کا راجہ معتقد تھا، اور اُس کے پجاریوں کو وہ بہت کچھ نذرانے دیا کرتا تھا، اتفاق سے راجہ کا بیٹا بیمار پڑا، راجہ نے تمام پجاریوں کو بُلا کر کہا کہ تم سب مل کر اُس بڑے بُت سے التجا کرو کہ وہ میرے بیٹے کو اچھا کر دے پجاری تھوڑی دیر کے بعد آئے، اور اطلاع دی کہ ہم سب نے اس سے التجا کی، اور اُس نے کہا ہے کہ یہ اچھا ہو جائے گا، لیکن لڑکا اُس کے بعد ہی مر گیا، راجہ کو اپنے مذہب سے سخت نفرت ہو گئی، بُت خانہ کو ڈھا دیا، بودھ کی مورت کو توڑ دیا، پجاریوں کو قتل کر ڈالا، اُس کے بعد اس کے ملک میں جو مسلمان تاجر تھے، اُن کو بلوایا، ان تاجروں نے اس کے سامنے توحید پیش کی، راجہ مسلمان ہو گیا [۲]، ممکن ہے کہ اس واقعہ کا اثر اُس کی رعایا پر نہ پڑا ہو، اور وہ اسلام سے متاثر نہ ہوئی ہو، یہ واقعہ معتصم باللہ المتوفی ۲۲۷ھ کے عہدِ حکومت کا ہے،

اسی طرح اسلام آہستہ آہستہ اپنا راستہ آپ صاف کرتا چلا جاتا تھا، سندھ میں ساوندری نام ایک مقام تھا، خدا جانے اب ہے یا نہیں، یہاں کے باشندوں نے محمد بن قاسم کے زمانہ میں

---

[۱] دیکھو انساب سمعانی لفظ "سندی"۔ [۲] بلاذری ص ۴۴۶،

اسلام نہیں قبول کیا تھا، مگر ایک شرط پر محمد بن قاسم نے اُن سے صلح کر لی تھی، اور وہ یہ تھی کہ مسلمان جب اُن کے پاس سے گذریں تو وہ اُن کی مہمانی کریں، اور اُن کو راستہ بتادیں، اُس کے ڈیڑھ سو برس کے بعد بلاذری فتوح البلدان میں لکھتا ہے کہ "آج ساوندری کے تمام باشندے مسلمان ہیں"[1] بلاذری نے اپنی یہ کتاب ۲۵۵ھ میں لکھی تھی،

ہندی میں مذہب اسلام پر پہلا رسالہ

تیسری صدی کے آخر میں منصورہ سندھ کے پایہ تخت میں عبداللہ بن عمر بن عبدالعزیز حاکم تھا، کشمیر بالا وزیرین کے بیچ میں الرا کا راجہ تھا، جو ہندوستان کے تمام راجاؤں میں بڑا تھا، اس کا نام مہروگ اور اس کے باپ کا نام رائیگ تھا، ۲۷۰ھ میں اُس نے منصورہ کے حاکم کو لکھا کہ میرے پاس کسی ایسے شخص کو بھیج دیجئے جو مجھے ہندی زبان میں اسلام کی شریعت آکر سمجھا دے، منصورہ میں ایک عالم عراق کے باشندے تھے، جو نہایت ہشیار، سمجھدار اور شاعر تھے، اور ہندوستان میں مدت تک رہ جانے کے باعث یہاں کی زبانوں کو اچھی طرح جانتے تھے، اور اُن میں شعر تک کہتے تھے، عبداللہ بن عمر حاکم منصورہ نے اُن کو بلوا کر، راجہ کی خواہش سے اُن کو مطلع کیا، انھوں نے ایک قصیدہ میں اسلام کے تمام ضروری مسائل کو لکھ کر نظم کر دیا، اور اُس کو راجہ کے پاس بھیج دیا، راجہ یہ قصیدہ سُن کر بہت خوش ہوا، اور عبداللہ کو لکھا کہ اس قصیدہ کے مصنف کو اُس کے پاس بھیج دیا جائے، چنانچہ وہ عراقی عالم راجہ کے پاس گئے، اور تین برس اُس کی خدمت میں رہے، جب وہ راجہ کے یہاں سے لوٹ کر آئے تو عبداللہ نے راجہ کا حال پوچھا، انھوں نے اوس کے حالات بیان کئے، اور کہا کہ میں نے اس کو اس حال میں چھوڑا ہے کہ وہ دل اور زبان دونوں سے مسلمان ہو چکا تھا، لیکن حکومت چھن جانے کے خوف سے وہ برملا اپنے اسلام کا اعلان نہیں کرتا،

---

[1] بلاذری ص ۴۳۹

ہندی میں قرآن مجید کا پہلا ترجمہ

عالم عراقی نے بیان کیا کہ راجہ نے مجھ سے خواہش کی کہ ہندی زبان میں میں اُس کو قرآن پاک کا ترجمہ سنایا کروں، چنانچہ سورۂ یٰسین (بائیسواں پارہ) تک میں نے اس کو ہندی میں ترجمہ کر کرکے سنایا، ایک دفعہ قرآن کی یہ آیت آئی،

قال من یحیی العظام وھی رمیم | کہنے لگا کون ان سڑی گلی ہڈیوں میں
قل یحییھا الذی انشأھا اول مرۃ | پھر جان ڈالے گا. کہدو وہی اُن میں
وھو بکل خلق علیم، | جان ڈالے گا جس نے ان کو پہلے
پیدا کیا، اور وہ سب بنانا جانتا ہے،

جب میں نے راجہ کو اس آیت کا ترجمہ سنایا، تو وہ ایک سونے کے تخت پر جس میں بیش قیمت جواہرات لگے تھے، بیٹھا تھا، اس نے سن کر کہا، پھر اس کو دہرایا، میں نے پھر دہرایا، وہ دفعۃً تخت سے اترا، اور چند قدم چل کر ایک نم زمین پر جو پانی چھڑکنے سے تر تھی، اپنے گال رکھدیئے، اور خوب رویا، یہاں تک کہ اس کا چہرہ خاک آلودہ ہو گیا، اور بے اختیار بول اٹھا کہ "یہی وہ پہلا اور ازلی معبود ہے، جس کا سا کوئی نہیں"، انھوں نے کہا کہ راجہ نے ایک گھر بنا لیا ہے، اور یہ ظاہر کیا ہے کہ وہ اس میں ایک خاص غرض کے لئے تنہائی چاہتا ہے، مگر وہ اس میں چھپ کر درحقیقت نماز پڑھتا ہے[1]،

تیسری صدی جب ختم ہو رہی تھی اور چوتھی صدی کا آغاز تھا کہ عراق کا سیاح مسعودی سندھ اور ملتان میں داخل ہوا، اس وقت سندھ کے تمام سیاسی روابط اور تعلقات بغداد کی مرکزی حکومت سے منقطع ہو چکے تھے، اور خود سندھ میں عربوں کی دو تین خودمختار ریاستیں پیدا ہو گئی تھیں، اور باقی اسلامی مقبوضات پر ہندو راجہ دوبارہ قابض ہو گئے تھے، مگر وہ مسلمانوں

---

[1] عجائب الہند بزرگ بن شہریار ناخدا مصنفہ ۳۰۰ھ طبع لیڈن ص ۲،

کے مذہبی رسوم سے بالکل تعرض نہیں کرتے تھے لیکن مسلمانوں سے ان کی سیاسی معرکہ آرائیاں قائم رہتی تھیں، وہ قنوج کی سلطنت کا ذکر کرتا ہے، اور اس کے حدود یہ بتاتا ہے کہ شمال میں ملتان اور جنوب میں مانکیر (دکن) ہے اور کہتا ہے کہ "اس سلطنت کے شمال میں امیر ملتان اور جو اس کے ساتھ مسلمان ہیں، اُن سے لڑائی رہتی ہے"

ملتان میں بنو اسامہ بن لوئی بن غالب ایک عرب قریشی خاندان کی حکومت ہے" اس کے پاس بڑی فوج اور قوتِ مدافعت ہے، اور مسلمانوں کی سرحدوں میں سے ایک سرحد ہے' اور اس سلطنت میں ایک لاکھ کے قریب گاؤں آباد ہیں، یہاں ہندوؤں کا ایک بڑا بت خانہ ہے جس کی زیارت کو دور دور سے ہندو آیا کرتے ہیں، اور اس پر نذر و نیاز چڑھایا کرتے ہیں، اور بڑی دولت اس میں جمع ہوا کرتی ہے، جب کوئی راجہ ملتان پر حملہ کی تیاری کرتا ہے، تو امیر ملتان دھمکی دیتا ہے کہ تم حملہ کروگے تو میں بتخانہ تباہ کر دوں گا، اس ڈر سے حملہ آور واپس چلے جاتے ہیں"

اس کا بیان ہے کہ "سندھ میں بھی اس وقت ایک اسلامی ریاست قائم ہے، جس کا صدر مقام منصورہ ہے، اور میرے جانے کے وقت عمر بن عبداللہ (یہی وہ عبداللہ ہے جس نے راجہ مہاجہ الرا کے پاس عراقی عالم کو بھیجا تھا،) حکمراں تھا، اور اسی کے دربار میں ایک وزیر عرب امیر اور وہاں کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ حمزہ سے بھی ملاقات ہوئی، یہاں سادات علوین کی بڑی تعداد ہے، ان کے علاوہ عرب اور اسلام کے بعض اور مشہور خاندان بھی آباد ہیں، منصورہ کا شاہی خاندان بنو عمر بن عبدالعزیز کہلاتا ہے، یہ عمر بن عبدالعزیز اموی نہیں بلکہ ہبار بن اسود قریشی کی نسل سے عمر بن عبدالعزیز نام ایک دوسرے شخص کی اولاد ہیں"[1]

۳۰۳ھ میں وہ کھنبایت بھی جاتا ہے، جہاں مسلمانوں کی معتدبہ تعداد آباد تھی، اور

---

[1] مروج الذہب مسعودی طبع یورپ ج اوّل ص ۳۷۴، ۳۷۷،

جہاں کا راجہ مناظرہ کا بڑا شائق تھا، اور جب کوئی مسلمان اُس کے پاس پہونچتا تھا تو اس سے مباحثہ کرتا تھا،[۱]

مسعودی کے تقریباً ۵۰ برس کے بعد بشاری مقدسی بیت المقدس کا ایک مسلمان عالم ہندوستان کی سیاحت کو آتا ہے، ۳۷۵ھ کے گرد وپیش میں وہ اپنا سفرنامہ ترتیب دیتا ہے، وہ سندھ کی سلطنت کو کئی حصوں میں منقسم پاتا ہے، وہ اُس کی آس پاس کی سلطنتوں، اور حکمرانوں کا بھی ذکر کرتا ہے، ملتان اور منصورہ کی اسلامی ریاستیں اس کے زمانۂ قیام میں بدستور قائم تھیں، صرف اس قدر فرق تھا، کہ ملتان کی اسلامی ریاست کا مذہب اسلامی شیعہ تھا، جس کے تعلقات براہِ راست مصر کے اسماعیلی فاطمی خلفاء کے ساتھ قائم تھے، اور منصورہ کے بادشاہ اہلِ سنت تھے، اور جو خلفائے بغداد کے نام کا خطبہ پڑھتے تھے، بشاری مقدسی نے بھی ملتان کے بت خانہ کا ذکر کیا ہے، اور اُس کی مورت کی جو کیفیت لکھی ہے، اس سے اس میں کوئی شک نہیں رہتا، کہ یہ بودھ ہی کی مورت تھی، اور یہ بودھوں کا معبد تھا،

بشاری ویہند نام ایک شہر کا نام لیتا ہے، اور اس کی بڑی تعریف کرتا ہے، ابو الفدا بیرونی کے حوالہ سے تقویم البلدان میں ویہند کی نسبت لکھتا ہے کہ "یہ گندھار کا پایۂ تخت ہے، اور یہ وادی سندھ میں واقع ہے" اور ادریسی کے حوالہ سے لکھتا ہے کہ "گندھار اور نہروالہ (قریب احمد آباد گجرات) کے درمیان پانچ منزلوں کی مسافت ہے" وینسنٹ اے اسمتھ صاحب دی ارلی ہسٹری آف انڈیا (ج ۱ ص ۳۴۵) میں اوہند نام کے دار السلطنت کو دریائے سندھ پر جگہ دیتے ہیں، اور لکھتے ہیں، کہ مسلمانوں کے ۲۵۶ھ میں کابل فتح کر لینے کے بعد دار السلطنت اوہند کو منتقل ہو گیا، جو دریائے سندھ پر واقع تھا، اور یہ ہندو شاہیہ خاندان کا پایۂ تخت ہوا" بہرحال چوتھی صدی کے آخر میں بشاری

---

[۱] مروج الذہب مسعودی طبع یورپ ج اوّل ص ۲۵۴،

کابیان ہے کہ یہاں گو آبادی کا بڑا حصہ غیر مسلم ہے، مگر یہاں تھوڑی سی تعداد مسلمانوں کی بھی ہے اور اُن کی الگ ایک ریاست ہے[۵۱]

قنوج جس سے مراد غالباً وہ شمالی ہند کی پوری سلطنت ہے، جس کا پایہ تخت قنوج تھا اور جس کے حدود اس زمانہ میں کشمیر، پنجاب، سندھ اور گجرات تک پھیلے تھے، بشاری کہتا ہے "یہاں بھی مسلمانوں کی خاصی تعداد ہے، سلطنت گو ہندوؤں کی ہے، اور غلبہ انہی کو حاصل ہے، مگر ایک چھوٹی سی الگ ریاست مسلمانوں کی بھی ہے[۵۲]" پھر لکھتا ہے "یہاں گوشت بہت ملتا ہے اور بہت سستا ملتا ہے، یہاں مسلمانوں کی زیادہ تر غذا گیہوں ہے" "اور یہاں علماء اور مسلمان معززین بھی ہیں، اور جامع مسجد بھی ہے، جو شہر پناہ کے اندر واقع ہے[۵۳]"

منصورہ کی نسبت لکھتا ہے کہ "یہ سندھ کا پایہ تخت ہے، دمشق کے مثل ہے، ...... جامع مسجد بہت بڑی ہے، جو پتھر اور اینٹ سے بنی ہے، جیسی عمان کی جامع مسجد ہے، سال کے ستون ہیں" "اور چار دروازے ہیں، .... یہاں کے باشندوں میں اسلام کی بڑی تازگی ہے" "اور علم بھی ہے، آبادی بہت ہے، تجارت کی گرم بازاری ہے، ..... غالب تعداد کفار کی ہے" دیبل (موجودہ کراچی) میں بھی وہ مسلمانوں کی تعداد کم بتاتا ہے" اسی طرح بنل کی نسبت بھی کہتا ہے کہ یہاں مسلمانوں کی تعداد تھوڑی ہی ہے[۵۴]

وزیر جیہانی جس نے چوتھی صدی ہجری میں اپنا جغرافیہ لکھا ہے، اُس نے سندھ کے شہروں میں بیرون نام شہر کو جو دیبل اور منصورہ کے بیچ میں تھا، اور منصورہ سے پندرہ فرسنگ دور تھا، خالص اسلامی آبادی بتایا ہے، اور لکھا ہے کہ "یہاں کے باشندے مسلمان ہیں بعض لوگ مشہور

---

۵۱ احسن التقاسیم لمعرفۃ الاقالیم بشاری مطبوعہ لیڈن ص ۴۸۵ ، ۵۲ ایضاً ، ۵۳ ایضاً ص ۴۸۰ ،

۵۴ احسن التقاسیم لمعرفۃ الاقالیم بشاری ص ۴۷۹ ،

مسلمان فلسفی اور ریاضی داں البیرونی کو جو بو علی سینا کا ہم پلہ تھا، اور جس نے ہندوؤں کے علوم پر سب سے مستند کتاب لکھی ہے، اور سنسکرت کا بڑا عالم تھا، یہیں کا رہنے والا بتایا ہے[۵۱]۔

عام سندھ کی مذہبی حیثیت کے متعلق بشاری کا بیان ہے کہ

"یہاں کی عام رعایا بت پرست ہے، یہاں واعظوں کا نام و نشان نہیں، اور نہ وعظ گوئی کی یہاں اہمیت ہے، یہاں کے مسلمان عام طور سے اہلحدیث ہیں، یہاں کے قاضی ابو محمد منصوری کو میں نے داؤدی، مذہب (ظاہری) کا پیرو پایا، یہ اپنے مذہب کے امام تھے، اور یہ درس بھی دیتے تھے، اور اُن کی چند تصنیفیں بھی ہیں، اور ملتان کے لوگ شیعہ ہیں، .... بایں ہمہ ملک دوسرے فقہا کے پیرؤں سے خالی نہیں ہے، امام ابو حنیفہ کے پیرو شہروں میں پائے جاتے ہیں، لیکن یہاں مالکی حنبلی، اور معتزلہ نہیں ہیں، اُن کے عقائد اور طریقے اچھے ہیں[۵۲]۔"

قصدار یا قزدار نام ایک مشہور شہر ہندوستان کی افغانی سرحد پر ملتان سے بیس منزل کی مسافت پر واقع تھا، محمود غزنوی نے چوتھی صدی کے اختتام پر اس کو فتح کیا، لیکن محمودی فتوحات سے پہلے وہ شہر محمدی فتوحات میں داخل ہو چکا تھا، غالباً چوتھی صدی کے وسط میں ایک معتزلی متکلم و مناظر ابو الحسن علی بن لطیف جب یہاں پہونچے ہیں، تو انھوں نے دیکھا کہ یہاں خارجی مسلمانوں کی بڑی آبادی ہے، اُن کی مسجد بھی ہے، بعض اہل حرفہ بھی ہیں، خوارج کا ایک امام بھی ہے، شہر میں بڑا امان ہے، چوری کا نام و نشان نہیں[۵۳]،

ان اقتباسات سے ظاہر ہوگا کہ اس سے پہلے کہ محمود غزنوی کی تلوار ہندوستان کی فضا میں

---

۵۱ تقویم البلدان ابو الفدا طبع یورپ ص ۳۴۸: ۵۲ بشاری ص ۴۸۱ ۵۳ معجم البلدان یاقوت رومی طبع مصر جلد ۷، ص ۷۷،

غیظ و غضب کی بجلی بن کر گرے، ہندوستان کے متعدد گوشے اسلام کے نور سے روشن ہو چکے تھے، اور اسلامی تمدن، اسلامی مذہب، اسلامی طور طریقے پھیل چکے تھے، یہاں تک کہ ان میں فرقہ بندیاں شروع ہو گئی تھیں، اور اسلام کا یہاں کے معتبر اور مستند مذاہب میں شمار ہونے لگا تھا، اور مسلمانوں کی تعداد کسی قدر کم سہی، مگر اس کا سلسلہ دریائے سندھ سے لیکر ایک طرف قنوج تک اور دوسری طرف ملتان کشمیر اور قصدار تک پھیل چکا تھا، اور یہاں کے راجاؤں میں اس کی طرف خاصہ میلان پیدا ہو گیا تھا،

(باقی)[1]

(معارف جنوری و مئی و اگست ۱۹۲۴ء)

---

[1] افسوس ہے کہ یہ محققانہ مضمون نا مکمل رہ گیا، اور پھر مصنفؒ کو اس کی تکمیل کا موقع نہ مل سکا،

"مرتب"

بدنصیب کشمیر

اور

عدلِ شاہجہانی کا نقشِ سنگی

آج کل اخبارات میں مسلمانانِ کشمیر کی مظلومی کی داستانیں پڑھ کر دل دہل جاتا ہے کہ یہ ملک کے اُن باشندوں کا حال ہے، جو وہاں کی ۹۵ فی صدی آبادی پر قابض ہیں، اور یہ مسلمان باشندے عموماً باہر سے آئے ہوئے نہیں، بلکہ زیادہ تر خود اصل ملک کے باشندے ہیں، اور انھوں نے صرف یہ جرم کیا ہے کہ اپنے مذہب کو بدل ڈالا ہے،

یہ ناقابلِ انکار واقعہ ہے کہ اس ۹۵ فیصدی آبادی کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں، اُن کے اوقاف وعمارات کا کوئی خبر گیراں نہیں، اُن کی بعض بعض مسجدیں دفاتر سرکاری اور حکام کے سکونتی مکانات کا کام دیتی ہیں، محصولوں اور ٹیکسوں کی کثرت نے مسلمان کاشتکاروں کو مفلوک الحال بنا رکھا ہے، مختلف صنعتوں اور پارچہ بافی کے اکثر کاریگر مسلمان ہیں، مگر وہ خود اپنی کمائی سے اپنی دولت نہیں حاصل کر سکتے، کل کا قصہ ہے کہ ایک سرکاری کارخانہ کو بند کر کے سیکڑوں مسلمانوں کو بیکار کر دیا گیا، حضرت شاہ ہمدان کی خانقاہ کی بے حرمتی اور اس کے ایک حصہ کے انہدام کے واقعات اخبارات میں آچکے ہیں، کشمیر تیموریوں کے عہد میں دنیا کی جنت بن گیا تھا، مگر آج کوئی جا کر دیکھے کہ یہ جنت دوزخ بن گئی ہے، اور لاکھوں آدمی وہاں سے اپنے آبائی وطن کو خیرباد کہہ کر

پنجاب کے مختلف شہروں میں آباد ہو گئے ہیں

سلطان زین العابدین والی کشمیر نے جس عدل و انصاف، بے تعصبی، اور رواداری سے اس ملک پر سلطنت کی، اُس کا حال تاریخ کے اوراق بتائیں گے لیکن تیموریوں نے جس شان سے اس "خطۂ کشمیر جنت نظیر" کی تربیت، پرورش اور نشوونما کی تھی، اکبر جہانگیر اور شاہجہاں کے کارناموں کا کوئی صحیفہ نہیں جس میں اُس کے آیات باہرات نہ ہوں،

لیکن آج ہم جو چیز اُس کی دلیل اور شہادت میں پیش کرنا چاہتے ہیں، وہ کاغذی تحریر اور تاریخی دفتر نہیں، بلکہ سنگی نقش ہے، جس کو پڑھ کر کشمیر میں تیموریوں کے عدل و انصاف کے کارنامے "نقش فی الحجر" ہو جائیں گے،

تیموریوں کے عہد میں اس خطہ پر جن صوبیداروں نے حکومتیں کیں، اُن میں سب سے مشہور اور نامور ظفر خاں ہے، کشمیر میں ظفر خاں سے پہلے جو صوبیدار تھا، اُس نے بہت سی بدعتیں رائج کی تھیں، ظفر خاں نے بحکم شاہجہانی ان تمام بدعتوں کا ازالہ کیا،

ظفر خاں پہلے پہل ۵ سنہ جلوس شاہجہانی میں، اپنے باپ کی طرف سے نائب ہو کر، کشمیر کا صوبیدار مقرر ہوا، ایک سال کے بعد اپنے باپ کی وفات پر وہ اس خطہ کا مستقل صوبیدار بنایا گیا، اور ۱۲ سنہ جلوس تک اس عہدہ پر فائز رہ کر معزول ہوا، اور تربیت خاں وہاں کا صوبیدار ہوا، ۱۵ سنہ جلوس میں کشمیر میں قحط پڑا، شاہجہاں نے وہاں کے فاقہ زدہ باشندوں کی اعانت میں کوئی کمی اٹھا نہیں رکھی، مگر بادشاہ کو معلوم ہوا کہ تربیت خاں سے اس کا انتظام بن نہ آیا، اسلئے ناچار پھر کشمیر کی صوبیداری کا قرعۂ فال ظفر خاں کے نام پڑا، مآثر الامرا (ج ۲ - ص ۷۵۹) میں بضمن ظفر خاں مذکور ہے،

"چون بعرض رسید کہ تربیت خاں صوبیدار کشمیر با وصف صدور تاکید دار سال

زرِ نقد با حوالِ مساکین آنجا کہ دراں سال قحط رو داده بود، چنانچہ بایدمی پرداز د، مرتبۂ ثانی خان مذبور بصوبہ داری کشمیر دستوری یافت"

۱۰۴۵ھ جلوس میں جب شاہجہاں خود کشمیر گیا، اور دیکھا کہ خان مذکور نے رعایا کی خاص ہر دلعزیزی حاصل کرلی ہے، (در جائزۂ حسن سلوکے کہ رعایا و سکنۂ آنجا از خود راضی داشتہ) اس کا مرتبہ و اعزاز بڑھایا ۱۰۵۱ھ جلوس میں ظفر خان یہاں سے علیحدہ ہوکر صوبہ ٹھٹھہ کا صوبہ دار مقرر ہوا، اور بالآخر دارا شکوہ کے فتنہ میں ہر طرف سے کنارہ کش ہوکر لاہور میں اقامت گزین ہوا، اور یہیں ۱۰۷۳ھ میں پیوند خاک ہوگیا،

ظفر خاں کی علمی و ادبی خدمات کے تذکرہ کا یہ موقع نہیں، یہاں صرف اس کے اُن انسانی خدمات کا تذکرہ مقصود ہے، جو اُس نے اہلِ کشمیر پر اپنے عہد صوبہ داری میں کئے، اُس نے شاہجہاں سے ایک فرمان حاصل کیا، جس کے رو سے اس کو جدید اصلاحات کا پورا اختیار حاصل ہوگیا، پھر اس غرض سے کہ یہ فرد اصلاحات اگر کاغذی صورت میں سرکاری دفاتر میں رہی، تو ممکن ہے کہ آئندہ صوبہ دار اس کو کام میں نہ لائیں، اور رعایا اس سے ناواقف ہوکر اس سے اجرا اور بحالی کا کوئی مطالبہ نہ کرسکے، بنا بریں ظفر خاں نے اس فرمان شاہی کو سری نگر کشمیر کی جامع مسجد کے جنوبی دروازہ کے باہر کی طرف ایک سیاہ پتھر پر کھدوا کر نصب کرا دیا، تاکہ ہر آئندہ و روند کی اس پر بے تامل نظر پڑسکے،

ہم شکر گذار ہیں کہ غلام احمد صاحب ایک قدردان معارف نے پونچھ (کشمیر) سے اس فرمان کی ایک بعینہٖ نقل ہمیں عنایت فرمائی ہے، جو حسب ذیل ہے، ساتھ ہی ساتھ فارسی سے ناواقف اصحاب کے لئے اس کا اردو ترجمہ بھی بالمقابل کردیا گیا ہے،

اللہ اکبر

نقل فرمانِ سعادت نشان حضرت	ترجمہ فرمان شاہجہانی

سلیمان مکانی صاحبقران ثانی کہ بتاریخ
ہشتم اسفندیار من ماہ الٰہی حسب الالتماس
کمترین خانہ زادان احسن اللہ المخاطب
بہ ظفر خان درباب برطرف نمودنِ بدعتہا
کہ در زمان صوبہداران سابق در بلدۂ
دلپذیر کشمیر شدہ بود باعثِ خرابی
رعایا و سکنہ این دیار بود، شرف
ورود یافتہ،

اس فرمان کی نقل جس کو شاہجہانی نے
۸ اسفندیار ماہ الٰہی کو احسن اللہ مخاطب
بہ ظفر خان کی درخواست پر ان خرابیوں
کو جو اس کے پیشرو صوبہ دار کشمیر کے
عہد صوبہ داری میں پیدا ہوگئی تھیں،
دور کرنے کے لئے لکھا ہے،

چون ہمگی ہمت والانہمت مصروف
و معطوف بر رفاہیت خلق است بنا
برین بعضے امور کہ در خطۂ دلپذیر کشمیر
باعثِ آزار آن دیار می شد حکم
فرمودیم کہ برطرف باشد از جملہ این
مقدمات یکے آنست کہ

چونکہ ہماری تمامتر توجہ خلق کی بہبودی
کی طرف منعطف ہے، اس لئے علاقہ
کشمیر کی بعض کارروائیوں کے متعلق جو
اُن کے لئے تکلیف دہ ہیں، کہ ہم حکم
دیتے ہیں کہ

وقت چیدن زعفران مردم را بہ عنف می
بردند کہ زعفران بچینید و قلیلے نمک بعلت
اجرہ آن بآں مردم می دادند، ازین
جہت بآں جماعۃ آزار بسیار می رسد
حکم فرمودیم کہ تکلیف چیدن زعفران

(۱) زعفران کے جمع کرتے وقت لوگوں
کو زبردستی پکڑ کر مزدوری کے لئے لے
جاتے تھے، کہ زعفران چنیں، اور اس
کی اجرت میں تھوڑا سا نمک دیتے
تھے، اس سبب سے اُن لوگوں کو سخت

بہ کسے نکشید و آنچہ تعلق بخالصۂ شریف
داشتہ باشد، مزدوراں را راضی ساختہ
اجورۂ واقعی بدہند و آنچہ تعلق بجاگیردار
داشتہ باشد، گل زعفران بجنس حوالہ
جاگیردار نمایند تا بہر طریقے کہ بخواہند
بچینند

مصیبتوں کا سامنا تھا، ہم حکم دیتے
ہیں کہ اب اس کام کے لئے کسی پر
زبردستی نہ کی جائے جو خالصہ شریف
(یعنی شاہی) سے متعلق ہو، اُن کے
مزدوروں کو راضی کرکے معقول اُجرت
دیں اور جو جاگیردار سے متعلق ہو، اُس کو
اس کو اسی حالت میں اس کے حوالہ
کردیا جائے کہ [illegible] صورت سے چاہے
اُسے چنوائے،

(۲) مقدمۂ دیگر آنست کہ در زمانِ بعضے
از صاحب صوبہاے کشمیر بر سر خروار
سالے ۲ دو دام بعلت ہیزم می گرفتہ اند
و در عمل اعتقاد خاں چار دام بآں علت
بر سر خروارے گرفتہ می شد، چوں ازیں
جہت آزار بسیار نیز بر عایا می رسید بنا بریں
حکم فرمودیم کہ بالکل رعایا را از طلب ایں
وجہ معاف دارند و بعلت ہیزم ہیچ چیز
نگیرند،

(۲) بعض والیانِ صوبہ کشمیر کے عہد میں
ہر خروار پر ۲ دام لکڑیوں کے عوض لئے
جاتے تھے، اور اعتقاد خاں نے ۴ دام
اسی غرض سے وصول کئے چونکہ اس
سے رعایا کو سخت تکالیف کا سامنا
کرنا پڑتا ہے، اس لئے ہم نے حکم
دیا کہ اس کو سرے سے معاف کردیا
جائے اور لکڑی کے عوض کوئی
چیز نہ لی جائے،

(۳) مقدمۂ دیگر آنست کہ دہے کہ جمع

(۳) ایک بات اور یہ ہے کہ جن دیہات

آں زیادہ از چہار صد خروار سالے بود
باشد، ازاں دو گوسفند حکام آنجا ہر سالہ
می گرفتہ اند،[۱] اعتقاد خاں در ایام
صاحب صوبگی خود بجائے گوسفند
بر سرِ ہر گوسفندے شصت و شش
دام می گرفتہ چوں ازیں جہت نیز
بر عایا آزار تمام می رسید، بالکلیہ حکم
فرمودیم کہ برطرف باشد، نہ گوسفند
بگیرند و نہ نقد، ایں علت و رعایا را از
گرفتن این وجہ معاف دارند،
(۴) دیگر اعتقاد خاں در ایام
صاحب صوبگی خود سراسری نمودہ
بر سرِ ہر ملاحے خواہ جوان خواہ پیر
خواہ خورد سال ہفتاد و پنج دام
می گرفت و معمول قدیم آں بودہ کہ
بر سرِ جوانے شصت و شش دام و

کی جنس ۴۰۰ سو خروار سے زائد ہو، اس
سے افسر ہر سال دو بکرے وصول
کرتے تھے، اعتقاد خان نے اپنے عہد
صوبہ داری میں ہر بکری کے دام ۶۶
دام وصول کرنے شروع کئے، اور
چونکہ یہ بھی رعایا کی تکلیف کا موجب
تھا، اس لئے ہم نے حکم دیا کہ اُسے
بھی بالکل برطرف کر دیا جائے، نہ
بکریاں اور نہ نقد لیا جائے، رعایا کو
ہر قسم کے مطالبہ سے بری رکھا جائے
(۴) اعتقاد خاں اپنے زمانہ صوبہ
داری میں کسی قسم کے خیال کے بغیر
تمام ملاحوں[۲] پر خواہ وہ جوان ہوں
بچے ہوں یا بڑھے، ۷۵ دام وصول
کرتا تھا، حالانکہ دستور قدیم یہ تھا
کہ جوان سے ۶۶ دام، بڈھے سے ۱۲ دام

---

[۱] معارف: ہم کو معلوم ہوا ہے کہ آج کل اُس کے بجائے ساٹھ بکریاں لیتے ہیں، اور موجودہ حکام اس کا کوئی انسداد نہیں کرتے،

[۲] معارف: کشمیر میں عموماً امراء اور اہلِ سیاحت کشتیوں میں رہتے ہیں اور اُن کی وہاں بڑی آمد ہے، اور اب تک یہی حال ہے،

بر سر پیرے دوازدہ دام و بر سر خورد
سالے سی و شش دام می گرفتہ اند،
حکم فرمودیم کہ دستور سابق را معمول
داشتہ بدعتے کہ اعتقاد خاں کرد،
برطرف دانند و بمقتضائے آں عمل
نکنند،

اور نیچے سے ۲ ۳ دام لئے جاتے تھے
اس بنا پر ہم نے حکم دیا کہ اعتقاد
خاں نے جو بدعت شروع کی تھی
اس کو موقوف کرکے دستور قدیم
کے مطابق محصول وصول اور عمل
کیا جائے،

(۵) مقدمۂ دیگر آنست کہ صاحب
صوبہا در وقت میوہ در ہر باغ
در ہر باغچہ کہ میوۂ خوبے کہ کسان داشتہ
اند، کسان خود را تعین می نمودہ اند
کہ آن میوہ را بجہت آنہا محافظت نمایند
و نمی گذاشتہ اند کہ صاحبان آں
باغہا و باغچہا آن میوہ را متصرف شوند
ازیں جہت آزار بسیارے باں جماعہ
رسیدہ، چنانچہ بعضے ازاں مردم درختہائے
میوہ را دور ساختہ اند، حکم فرمودیم
کہ ہم صاحب صوبہ قرق میوۂ باغ و
باغچہائے نکنند،

(۵) صوبہ داروں کا دستور رہا ہے کہ
فصلِ میوہ میں جن جن باغوں میں
اچھے میوے ہوتے تھے، اُن میں اپنے
آدمی حفاظت کے لئے مقرر کردیتے
تھے، اور ان باغوں اور باغچوں
کے مالکوں کو، اُن سے مستفید ہونے
کا کوئی موقع نہ ملتا تھا، اس وجہ سے
رعایا کو سخت پریشانی ہوتی، اور اسی
وجہ سے بعض مالکانِ باغ نے اپنے
درختوں کو کاٹ ڈالا ہے، ہم نے حکم
دیا کہ کوئی صوبیدار کسی باغ یا باغچہ
کے میوہ پر قبضہ نہ کرے،

می باید کہ حکام ہم کرام و دیوانیان

موجودہ اور آیندہ کے حکام کرام

کفایت فرجام وعمّال حال واستقبال
صوبۂ کشمیر این حکام جہاں مطاع را
مستمر وابدی دانند وتغیر وتبدیل بقواعد
آن راہ نہ دہند، وہر کس کہ تغیر وتبدیل
را راہ دہد بلعنت خدا وبغضب بادشاہی
گرفتار خواہد شد تحریراً فی تاریخ بست و
ششم آذر ماہ الٰہی،

عمّال اور دیوانوں کو ہمارے ان شاہی
احکام کو دائمی و ابدی سمجھنا چاہیے اور
اُن میں کوئی تغیر وتبدل نہ کریں اور جو شخص
ایسا کرے گا، اس پر خدا کی لعنت اور
بادشاہ کا غضب نازل ہوگا،

مکتوبہ ۲۶ آذر ماہ الٰہی

(معارف ماہ اکتوبر ۱۹۲۳ء)

ہندوکش عالمگیر کے عہد

کی

دو عجیب کتابیں

جامعہ ملیہ کی پُر اصرار دعوت پر مجھے ایک ہفتہ کے لئے جامعہ آنا پڑا، اور اسی تقریب سے میں نے اس کے کتب خانہ کی سیر کی، ارباب جامعہ مُبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے آٹھ برس کی مختصر مدت میں اپنے دوسرے شعبوں کے ساتھ اپنے اس شعبہ یعنی کتب خانہ کو بھی قابل قدر حد تک وسعت دی، اس وقت اس کے کتب خانہ میں کم وبیش آٹھ ہزار کتابیں ہیں، جن میں عربی، فارسی، انگریزی، اور اردو کی کتابیں داخل ہیں، جو قرینہ کے ساتھ آلماریوں میں رکھی ہیں، اور مرتب ہیں، ان میں ڈھائی سو کے قریب عربی اور فارسی کی قلمی کتابیں ہیں، جن کی ہنوز ترتیب کی نوبت نہیں آئی تھی، میں نے اپنے مختصر قیام میں ان کتابوں کو دیکھا، اور ان میں بعض ایسی کتابیں پائیں جو مختلف حیثیتوں سے قدر کے قابل تھیں، منجملہ ان کے دو کتابیں مجھے نہایت عجیب معلوم ہوئیں کہ ان کا کوئی نسخہ اب تک میری نظر سے نہیں گذرا تھا،

ان دونوں کتابوں کی ندرت اور قدر کا سبب یہ ہے کہ یہ دونوں کتابیں اس اورنگ زیب عالمگیر کے عہد کی تصنیف ہیں، جس کو اُس کے دشمن اور مخالف ہندوکش، ہندو علوم وفنون کا برباد کرنے والا، ہندو مذہب کو تباہ کرنے والا، ہندوؤں کو زبردستی مسلمان بنانے والا مشہور کرتے رہے ہیں، لیکن

دوسری شہادتوں اور دلیلوں کے ساتھ آج یہ دو مردہ خاموش کتابیں زندہ اور گویا شاہد ہیں جو علی الاعلان یہ گواہی دیتی ہیں، کہ اس مرحوم بادشاہ پر یہ تمام الزام تہمت ہیں،

ان میں سے ایک کتاب کا نام "مت اچھرا" اور دوسری کا نام "رد کفر" ہے، یہ دونوں کتابیں اپنے عہد کے دو مخالف اور متضاد منظروں کو پیش کرتی ہیں، پہلی کتاب ایک پکے ہندو کی تالیف ہے اور دوسری ایک نومسلم ہندو کی، پہلی کتاب کا مقصد سنسکرت نہ جاننے والے ہندوؤں کو اُن کے اُن کے مذہب سے آگاہ کرنا ہے، اور دوسری کا بت پرست ہندوؤں کو اسلام کا راستہ دکھانا ہے، ان دونوں کتابوں کی زبان فارسی ہے، جو اس زمانہ میں تمام ہندوستان کی ادبی اور علمی زبان تھی،

امت اچھرا

یہ کتاب بڑی تقطیع کے ۱۲۴ صفحوں میں ہے، کتاب کا یہ نسخہ فرخ آباد میں ۲۴ فروری ۱۸۴۷ء مطابق ۹ ربیع الاول ۱۲۶۳ھ کو اختتام کو پہنچا ہے، کاتب کا نام سید کلام الدین شاہ قادری ساکن فرخ آباد ہے، کاتب مذکور نے یہ نسخہ قاضی محمد غلام محی الدین خان" سرشتہ دار محکمۂ کچہری صدرامین اعلیٰ" کے لئے لکھا ہے، جیسا کہ اس کے آخر میں بیان ہے،

کتاب کی فارسی زبان خاصی ہے، جا بجا اصطلاحات ہندی اور سنسکرت کے استعمال کئے ہیں، افسوس ہے کہ یہ نسخہ بیحد غلط ہے، دیباچہ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ جاک بلک (اور خاتمہ میں جاگ دلگ ہے) نام رکھیسر (؟) نے بکرماجیت کے زمانہ میں اس کتاب کو اشلوک میں لکھا تھا، اس کا نام "سمرت جاک بلک" مشہور ہو گیا تھا، چونکہ وہ بہت مشکل کتاب تھی، اس لئے گوشائیں بکیا نیر (؟) نے اُس کو نئے سرے سے مرتب کیا، اور اس کا خلاصہ کیا، اور مت اچھرا نام رکھا، اسی خلاصہ کا سلطان اورنگزیب عالمگیر کے زمانہ میں لعل بہاری ولد کاہید سنگھ نے جو بھوجپور ضلع شاہ آباد قنوج کا رہنے والا تھا،

اور جو اورنگزیب کے درباری امیر اللہ وردی خاں کا متوسل تھا ۱۰۹۰ھ میں سوبھا سکر پنڈت کی مدد سے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا تاکہ سنسکرت سے ناواقف اس کو سمجھ سکیں، اور فائدہ اٹھائیں، یہ سوبھا سکر پنڈت سنسکرت کے بڑے ماہر تھے، اسلام آباد عرف منجھولی واقع سرکار گورکھپور کے باشندہ تھے،

کتاب کا موضوع جیسا کہ دیباچہ میں ہے احکام و مذاہب و اوامر و مناہی (نواہی) ہنود" ہے، کتاب تین مقالوں پر منقسم ہے، اور ہر مقالہ میں متعدد فصلیں ہیں،

مقالۂ اول :- "در آچارا دھیائے کہ آن را بزبانِ عرب عبادت گویند" اس میں ۲۹ فصلیں ہیں،

مقالۂ دوم :- "در بیوہارا دھیائے کہ عبادت از معاملات باشد" اس میں ۵۴ فصلیں ہیں،
مقالۂ سوم :- "در پرایشچت ادھیائے کہ آں را کفارت (کفارہ) خوانند" اس میں ، فصلیں ہیں،

فصلوں کی تفصیل تو مشکل ہے، مگر اس تعبیر و تفسیر سے صاف نظر آتا ہے کہ اس زمانے کے "روشن خیال" ہندوؤں کی یہ کوشش تھی کہ وہ اپنے شاستر کو اسلامی فقہ کے نمونہ پر تیار کریں، جس طرح آج ہمارے محکوم روشن خیال اپنی اسلامی فقہ کو انگریزی قانون کی صورت میں ڈھالنے کے لئے بے قرار ہیں،

اس کتاب کے دیباچہ میں "ہندو کش عالمگیر" کو جن القاب و آداب سے یاد کیا گیا ہے، وہ آج ہمارے ہندو بھائیوں کے پڑھنے کے لائق ہے،

"اکنوں کہ دریں عہد بادشاہِ خلافت پناہ، عادل، مظفر، مؤید ظل اللہ، سلیمان بارگاہ مظہر الطاف الٰہی، مطلعِ انوار بادشاہی، مجسم داد و کرم، قامع آثار جفا و ستم، بر دا شتہ حضرت

منان، گماشتۂ ایزد سبحان، خورشید برج خلافت مشتری آسمان سلطنت ظل ظلیل سبحانی،
واسطۂ انتظام انسی و جانی، شیرازۂ نسخۂ اسلام، ماحی بدعت کفر و ظلام، مالک ہفت
اقلیم، زینت افزائے تخت و دیہیم، وارث ملک سلیمانی، فروغ دودمان صاحب قرانی،
خسرو فلک اقتدار، بادشاہ خورشید اختیار، سلطان بن سلطان، خاقان زمین و
زمان، محبب، فرمانروایان حال و ماضی، ابوالمظفر محی الدین محمد اورنگزیب بہادر عالمگیر
بادشاہ غازی، خلد اللہ ملکہ و سلطانہ کہ دورش چوں دور قدح پُر نشاط، و زمانش مانند
ایام شباب پر سرور و انبساط، روز بازار فضل و دانش است، ہندی نژادان فارسی
دوست را بنظم و نثر از حد بیشتر است"

غور کیجئے کہ یہ کتاب سرکاری حیثیت سے نہیں لکھی جارہی تھی، اور نہ بادشاہ کے دربار میں
پیش کئے جانے کی غرض سے ترجمہ کی جارہی تھی، مگر بایں ہمہ ان جذبات کا ادا ہونا یہ ظاہر کرتا ہے
کہ اس عہد کے ہندو اس کو کیا سمجھ رہے تھے، اور آج اس کو کیا سمجھ رہے ہیں،

آگے چل کر وہ اپنا اور اپنے آقا کا کس محبت اور منت شناسی کے جذبہ کے ساتھ ذکر
کرتا ہے:۔

"پیش نہاد خاطر احقر العباد بعل بہاری ولد رائے پرراے کا بید سنگھ متوطن بھوج پور
من مضافات سرکار شاہ آباد عرف قنوج متعلق بصوبہ اکبر آباد کہ رگ و پے ایں تربیت
یافتہ یک خاندان والا دودمان عزّ و علا نواب سپہر جناب خورشید القاب، عالمیان تاب،
رکن السلطنت العظمیٰ، اعتضاد الخلافۃ الکبریٰ، سزاوار است آں عبوتی، چراغ دودمان
سلجوقی، مہبط الطاف بادشاہی، منظور انظار خلیفۂ الٰہی نواب اسد وردی خاں عالمگیر
شاہی است"

کیا یہ سطریں آج انقلاب روزگار کی تصویریں نہیں؟

۲- ردّ الکفر

دوسری کتاب کا نام "ردّ الکفر بحجۃ القوی" ہے، اس کتاب پر قاضی محمد ولد قاضی محمد باقر کی ملکیت کی مہر ہے، اور معلوم نہیں، کہاں سے جامعہ میں آگئی ہے، اس کا مصنف نو مسلم ہندو ہے، اس کا پہلا نام ہرکشن تھا، اور اسلامی نام عبد القوی ہے، وہ سامانہ کا رہنے والا تھا، جو پنجاب میں ایک مقام ہے، مقدمہ میں وہ عالمگیر کا ذکر اور اس کتاب کی کیفیت اس طرح لکھتا ہے:۔

بندۂ فقیر حقیر عبد القوی ساکن سامانہ بخدمت اہلِ اسلام التماس می دارد کہ قبل ازیں نام فقیر ہرکشن بود، ایمان آورد، بر دین حضرت رسالت پناہ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کہ حق است و کفر باطل، کفر را گذاشتہ اسلام را حق شناختہ نام خود را عبد القوی نہاد ..... شوال ۱۰۸۱ھ از دورِ خلافت ظلِ سبحانی خلیفۃ الرحمانی، ابو المظفر محی الدین محمد اورنگ زیب بہادر عالمگیر بادشاہ غازی صدقہ کہ صدق حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ و عدلہ کہ عدل حضرت عمر خطاب رضی اللہ عنہ، حلمہٗ کہ حلم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ و شجاعتہ کہ شجاعت حضرت شاہ مرتضیٰ علی کرم اللہ وجہہ خلد اللہ ملکہ و عمرہ و سلطنتہٗ در خاطر رسید کہ مردمان کہ در کفر اند (عبارت غلط ہے) و کفر در قلم باید آورد تا کذب کفر و صدق اسلام معلوم گردد، و اگر مسلمان بخواند، سلامتی ایمان است، اگر کافر بخواند در باب ایمان خدائے تعالیٰ خوب خواستہ باشد مسلمان شود، نام این کتاب ردّ الکفر بحجۃ القوی (مصنف کے نام کی تلمیح ہے۔) نہادہ شد، امید کہ این نسخہ کمترین بندگان بدست ہر مسلمان کہ برسد کیفیت ایں رسالہ منتشر گرداند، بسعادت دارین یا بد لطرف دلائل دعبائد نظر کند

بر طرف املاء انشا نظر کند، اگر خطا شدہ باشد اصلاح بدہد، ایں نیز ثواب اینان است"

اس رسالہ کی زبان معمولی ہے، ۲۹ حقیقتوں پر یہ کتاب مشتمل ہے، آخر سے کچھ نا تمام ہے، ہر حقیقت کے تحت میں ہندوؤں کے مختلف عقائد و رسوم کو لے کر اُس کی تفصیل کی ہے، اور اس کی خرابیاں دکھائی ہیں، اور اُس کے مقابل میں اسلام کی خوبیاں بتائی ہیں،

بہرحال اگر اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں ایسے نومسلم ہندو ہوتے تھے، تو کون کہہ سکتا ہے کہ عالمگیر کے زمانہ میں دلائل کے زور کے بجائے تلوار کے زور سے ہندوؤں کو مسلمان بنایا جاتا تھا،

(معارف: جون ۱۹۲۹ء)

لاہور کا ایک فلکی آلات ساز

ناظرین کو یاد ہوگا کہ چند ماہ پہلے ہم نے اپنے شذرات میں جرمنی کے ڈاکٹر فان کلیوبر کے ایک خط کا ذکر کیا تھا جس میں موصوف نے اپنے ایک فلکی کرہ کے بنانے والے ضیاالدین محمد کا حال دریافت کیا تھا، ذیل میں ہم پہلے موصوف کا خط درج کرتے ہیں، اور اس کے بعد اس کے متعلق جو کچھ پتہ لگ سکا ہے، اس کو حوالۂ قلم کرتے ہیں، اس سلسلہ میں اگر کوئی صاحب علم کچھ نئے معلومات پیش کریں گے تو ہمارے شکریہ کا باعث ہوگا،

نقل خط ڈاکٹر فان کلیوبر

"جناب محترم! میرا قصد ہے کہ ایک عربی کرہ کے متعلق جو برلن کے عجائب خانہ میں ہے، کچھ لکھوں، اس کرہ پر ایک تحریر ہے جس میں بنانے والے کا نام، تاریخ اور مقام درج ہے، اس تحریر کا عکس اس خط کے ساتھ آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں، چاہتا ہوں کہ اس کے بنانے والے کے متعلق تفصیلات معلوم کروں کہ یہ کون شخص تھا؟ کیا کوئی معروف مہندس یا منجم ہے؟ کہاں کا رہنے والا ہے، ؟ اس کا زمانہ کیا تھا؟ اس نے اور بھی ایسے کرے تیار کئے ہیں، ؟ اس کا کوئی تعلق آپ کے ملک کے رئیس جے سنگھ سوائی سے تو نہیں تھا، جو خود بڑا نجومی تھا:؟

یہاں جو کتابیں مجھے مل سکیں، ان میں ان باتوں کا پتہ نہ چل سکا لیکن بعض

ہندوستانی دوستوں نے بتلایا کہ اگر آپ کو لکھوں تو ضرور کچھ سراغ لگ سکے گا، میں بہت ممنون ہوں گا اگر آپ براہِ کرم اپنی معلومات سے مجھے مستفید فرمائیں، مجھے بڑی ہی خوشی ہوگی، اور یقین ہے کہ ایشیائی تمدن سے ہماری محبت اور شغف میں اس سے اضافہ ہوگا، اپنی سیاحتوں میں میں خود بھی اس تمدن کا دلدادہ بن چکا ہوں؛

آپ کا فان کلیوبر"

ضیاء الدین محمد اسطرلابی ہمایونی لاہوری

اسطرلابی | عربی علم ہیئت کی درس گاہوں میں جو آلات فلکی عام طور سے استعمال کئے جاتے تھے، ان میں سب سے مشہور کرہ اور اسطرلاب ہیں، ان میں سے کرہ کی ضرورت صرف تعلیم میں پیش آتی ہے، وہ روزمرہ کے استعمال کی چیز نہیں، مگر اسطرلاب سے چونکہ آفتاب کا ارتفاع اور دوسرے ستاروں کا اندازہ لگاتے ہیں، اس لئے یہ ہیئت اور فلکیات کے عالم، منجموں اور جوتشیوں کے روزانہ استعمال میں آتا ہے، اور اس لئے یہ زیادہ متداول ہے، اور اسی بنا پر آلات فلکی کے بنانے والوں کا لقب بھی متاخرین میں اسطرلابی مشہور ہو گیا ہے، کرہ کی نسبت کردی" شخصیت کے بجائے شکل کی نسبت میں اصطلاحاً مستعمل ہے، اس لئے وہ کاریگر اور صناع کے نام کے لئے غیر موزوں قرار دیا گیا ہے، اور اسطرلابی" چونکہ اصطلاح میں کسی شکل کا نام نہیں، نہ ہیئت کی کسی اور اصطلاح سے متصادم ہے، اس لئے اس آلہ کی طرف انتساب سے فلکی آلات کے بنانے والے کا لقب بنایا گیا ہے،

ہمایونی | یہ ہمایونی ہمایوں کی طرف منسوب ہے، جو آلِ تیمور کے سلسلہ میں ہندوستان کے تیموری فاتح بابر کا جانشین تھا،

سلاطین آل تیمور کو علوم ہئیت سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے، تیمور کے پوتے مرزا الغ بیگ المتوفی ۸۵۳ھ نے سمرقند میں مشہور رصد خانہ قائم کیا، جس میں اس عہد کے مشہور علماے ہئیت قاضی زادہ رومی، غیاث الدین جمشید اور علی بن محمد قوشجی نے تحقیقات کیں، اور اس میں جو زیچ لکھی گئی، اس کا نام زیچ الغ بیگی رکھا گیا، بابر نے اپنی تزک میں اس رصد خانہ کے کھنڈروں کا ذکر کیا ہے،

بابر کا بیٹا ہمایوں جس کے نام کی طرف اصطرلاب کی نسبت ہے، نجوم و ہئیت کے علوم کا ماہر و عالم تھا، ملا بدایونی نے منتخب التواریخ میں جو ۱۰۰۰ھ کی تالیف ہے، ہمایوں کے حال میں لکھا ہے،

"در علوم نجوم و ہئیت و سائر علوم غریبہ بے نظیر"

(جلد اول ص ۴۶۰ کلکتہ اڈیشن)

فرشتہ میں ہے :-

"و در علم ریاضی علم مہارت می افراشت، مدار صحبتش با علماء و فضلاء بودہ ہمہ وقت در مجلس او مسائل علمی مذکور می شد"

(جلد اول، مقالہ دوم ص ۲۴۳ نولکشور پریس اڈیشن)

بادشاہ نے ہئیت کا یہ فن علامہ الیاس اردبیلی سے سیکھا تھا، جو ہئیت کے تمام فنون اور رصد بندی میں ماہر تھے۔ (ان کا حال بدایونی نے منتخب التواریخ جلد سوم ص ۱۳۱ مطبوعہ کلکتہ میں لکھا ہے)

عراق و ایران کے قیام کے زمانہ میں حکمت و ہئیت کے علوم کے دو نامور عالم، ایک یہی الیاس اردبیلی مذکور اور دوسرے شیخ ابوالقاسم جرجانی بادشاہ کے ساتھ تھے، اور اس وقت بھی جب بادشاہ ہندوستان کا تخت کھو کر آوارۂ غربت تھا، ان دونوں دانشوروں سے

قطب شیرازی المتوفی سنہ ۷۱۰ھ کی فاضلانہ کتاب درۃ التاج کا جو فارسی میں حکمت نظری و عملی پر مشتمل ہے، درس جاری تھا، (مآثر رحیمی ص ۱۲۰ جلد ۱ کلکتہ واکبرنامہ دفتر اول ص ۶۴۲ نولکشور پریس)

اکبرنامہ میں ایک دلچسپ قصہ لکھا ہے، ہمایوں ایران کے سفر کے دوران میں جب تبریز پہنچا تو بیک محمد آختہ بیگی نام اپنے ایک نوکر سے کہا کہ یہ پُرانا شہر ہے یہاں کرہ تلاش کروا کرہ فارسی میں گھوڑے کے بچھڑے کو کہتے ہیں، خوش فہم نوکر نے آقا کے اس حکم کی تعمیل اس طرح کی کہ چند بچھڑے لے کر خدمت شاہی میں حاضر ہوا، بادشاہ اس غول بیابان کو دیکھ کر ہنس پڑا، ابوالفضل نے اس واقعہ کو ان لفظوں سے شروع کیا ہے،

"چوں بہ تبریز نزول فرمودند ازانجا کہ توجہ اقدس باصطرلاب وکرہ وسائر آلات رصدی درجۂ کمال داشت ....(ص ۱۴۴ نولکشور)

خود بادشاہ علماء کی طرح ہیئت وریاضی کا درس دیتا تھا، بادشاہ کے مصاحب خاص نورالدین ترخان سفیدونی (المتوفی سنہ ۹۹۲ھ) نے جو اس فن کے ماہر تھے، بادشاہی سے اس فن کا درس حاصل کیا تھا، بدایونی میں ہے:-

"ملا نورالدین ترخاں نوری سفیدونی جاگیردار سفیدون از توابع سندھ او در علوم ہندسی وریاضی ونجوم وحکمت ممتاز وازاجلۂ مصاحبان ہمراز بادشاہ مغفرت پناہ بود" (ج ۳ ص ۱۹۷)

مآثرالامراء (جلد اول ص ۴۸۰ کلکتہ) میں مولانا نورالدین ترخاں کے حال میں ہے:-

"مولانا بفضل وکمال وشجاعت وسخاوت اتصاف داشت وبہ ہیئت وہندسہ واصطرلاب شوق مند بود........ وصحبتش باجنت آشیانی (ہمایوں) کوک گشتہ

از جملہ ندیمان و مجلس نشینان بزم ہمایونی گردید ...... گاہے پادشاہ از واستفادۂ علوم می کرد، دگاہے اوازعلم ریاضی خصوص اصطرلاب از جناب ہمایونی کہ دریں فن مہارت تمام داشت استفادہ می نمود"

بادشاہ کو ہیئت و فلکیات سے جو ذوق تھا، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ترکی امیر البحر جو سلطان سلیمان خاں کی طرف سے گجرات کے بندر سے پرتگیزوں کو نکالنے آیا تھا، اور جس کا جہاز تباہ ہوا، اور اس کو بالآخر خشکی کی راہ یعنی ہندوستان، ایران اور عراق سے اپنے ملک کو واپس جانا پڑا، اس نے اپنے سفر نامہ مرآۃ الممالک میں ہمایوں سے ملاقات کے سلسلہ میں اس کے نجوم و فلکیات کے شوق کا تذکرہ کیا ہے، ہمایوں چاہتا تھا، کہ ترکی امیر البحر جو خود بھی فلکیات کا ماہر تھا، وہ ہمایوں کے پاس سے نہ جائے، مگر امیر البحر مذکور نے جانے پر اصرار کیا، اس پر بادشاہ نے اس شرط پر رخصت دی کہ

"برسات کے تین مہینوں کے گذرنے کے بعد جن میں راستے ناقابلِ گذر ہوتے ہیں، میں جا سکتا ہوں، اس اثنا میں چاند اور سورج کے گرہنوں کا حساب کرتا رہوں، اور وہاں کے نجومیوں کو آفتاب کی گردش اور خط استوا کے نکات کے پڑھنے میں مدد دوں"

..... میں کام میں مصروف ہو گیا، اور نجومی مشاہدات ختم کئے"

(باب ہشتم ترجمۂ مرآۃ الممالک پروفیسر ویمبری)

ہمایوں کی بہن گلبدن بیگم جس نے ہمایوں کے حال میں ہمایوں نامہ لکھا ہے، اس میں ایک موقع پر مذکور ہے، کہ ہمایوں نے خود ایک شادی کے لئے اصطرلاب اٹھا کر ستاروں کی گردش معلوم کرکے تاریخ سعید مقرر کی،

"غرض کہ بعد از چہل روزہ در ماہ جمیدالاول ۹۴۸ھ در مقام پاتر روز دوشنبہ

یم روز بود کہ اسطرلاب را حضرت بادشاہ بدستِ مبارک خود گرفتہ اند و ساعت سعد را اختیار کردہ" (ص ۳۰۵ لندن)

ہمایوں کو ریاضیات اور آلاتِ ریاضی سے اس قدر انس تھا کہ اس کے رفیق سپہ سالار بیرم خانخانان نے اس کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا ہے، اس میں اصطرلاب سے تشبیب کی ہے،

مطلع قصیدہ کہ درباب اصطرلاب گفتہ[1]

آں چرخ چیست کامدہ بر محورش مدار — آں مدرکز میانہ شہابش کند گذار
باآن کہ می کند بہ مہ و خور برابری — آمدیاں ز حلقہ بگوشانِ شہریار
تا روبجشم کوکبہ آفتاب را — چوں مہچۂ لوائے شہنشاہ نامدار
پیوستہ آسمان و زمین زیر حکم اوست — ہچوں نگینِ خاتمِ شاہِ جم اقتدار
برکف نہادہ خوان زرمی پر از اشرفی — تا بر قدوم اشرفِ شاہاں کند نثار
شاہ بلند قدر ہمایوں کہ از شرف — بر درگہش سپہر نہد روئے افتقار

اس قصیدہ میں چرخ، محور، مدار، بدر، شہاب، ماہ، خور (آفتاب) حلقہ، آفتاب، آسمان، زمین، شرف، سپہر اسی فن ہیئت اور اصطرلاب کے اصطلاحات ہیں،

عام طور سے مشہور ہے کہ ہمایوں کتب خانہ کے زینہ سے گر کر مرا تھا، واقعہ یہ ہے کہ پرانی دہلی میں شیر شاہ نے شیر منڈل کے نام سے ۹۴۷ھ میں بہت بلند سہ منزلہ ایک عمارت بنوائی تھی، اس کی تیسری منزل پر ایک برجی بنی ہے، جو تمام علاقوں سے اونچی ہے،[2] بادشاہ نے اس عمارت کو غالباً اس لئے کتب خانہ بنادیا تھا، کہ یہ اونچی عمارت اپنی بلندی کے سبب سے کسی قدر رصد خانہ کا کام دے، جس شام کو وہ گرا ہے اس شام کو خیال تھا کہ ستارۂ زہرہ طلوع ہوگا، بادشاہ وہاں

---

[1] بدایونی ج ۳ ص ۱۹۲ کلکتہ، [2] آثار الصنادید سرسید مرحوم ص ۵، نامی پریس کانپور،

ریاضی دانوں کے ساتھ مباحث میں مصروف تھا، اور سر شام زہرہ کے طلوع کا انتظار تھا کہ مغرب کی اذان ہوئی، بادشاہ بیٹھ کر اٹھنا چاہتا تھا کہ زینہ سے پھسل کر گرا، اور زخمی ہوا، اور اس زخم کو جانبر نہ ہوا، اکبرنامہ میں ہے،

"و آخرہاے روز بالاے بام کتبخانہ رفتہ..... جمعے از ریاضی داناں راطلب فرمودند و آن شب نظر طلوع زہرہ بود می خواستند ملاحظہ فرمایند"[1]

اس بادشاہ کے تمام کام فلکیات اور نجوم کے اصول پر ہوتے تھے، دربار کے دنوں میں کاموں کی تقسیم بھی علم نجوم کی مناسبت سے تھی، غیاث الدین خوندمیر نے ہمایون نامہ میں اور ابوالفضل نے اکبرنامہ میں ان دنوں کی تقسیم اور اُن کے مناسبات نجومی کی پوری تفصیل کی ہے، دربار اور خیمہ و خرگاہ کی ترتیب بھی فلکیات ہی کے اصول سے ہوتی تھی، دربار کے لئے خیمے ایسے بنوائے تھے، جو یونانی ہیئت کے نو دن آسمانوں کی پوری نقل تھے، ہر آسمان میں جو ستارے ہیں اُن کے نمونے اس میں بنے تھے،

ہمایوں کو اس قسم کے اختراعات سے بڑی دلچسپی تھی، ایک "بساط نشاط" بنایا تھا، اس بساط میں فلکی دوائر اور کرات عناصر بنائے تھے، پہلا جو فلک اطلس کی طرف منسوب تھا، سپید تھا، دوسرا کبود، تیسرا زحل کی مناسبت سے سیاہ، چوتھا مشتری کی مناسبت سے صندلی، پانچواں مریخ کے تعلق سے لال، چھٹا آفتاب کی مناسبت سے سنہرا، ساتواں زہرہ کے سبب سے سبز، آٹھواں عطارد کے تعلق سے سوسنی، نواں چاند کی مناسبت سے سفید، اس کے بعد اربعہ عناصر کے نقشے تھے، اُن میں سے کرۂ خاک میں ساتوں اقلیموں کے نقشے تھے، نجوم کے قاعدہ سے ہر روز کے ستارہ کا جو رنگ اہل نجوم نے خاص کیا ہے، اس دن وہی رنگ پورے دربار کا ہوتا تھا، اسی طرح

---

[1] اکبرنامہ نولکشور پریس اڈیشن، ص ۳۹۹ و مآثر رحیمی جلد اول ص ۶۰۹، کلکتہ، [2] دیکھو الیٹ کی تاریخ ہند جلد ۵ ص ۱۱۶،

بارہ برجوں کا ایک خیمہ بھی بنوایا تھا، کئی جگہ رصد خانوں کے بنانے کا ارادہ کیا، اور بہت سے آلاتِ رصد ترتیب دیئے تھے،[51] انہی آلاتِ رصد میں سے ایک اصطرلاب بھی ہے،

مارچ و مئی ۱۹۰۹ء میں یعنی آج سے چوبیس پچیس برس پہلے الندوہ میں میں نے "مسلمان اور علم ہیئت" پر ایک مضمون لکھا تھا، اس میں سب سے پہلی دفعہ میں نے ضیاء الدین ہمایونی اصطرلابی کا ذکر کیا تھا، اس سلسلہ میں میں نے لکھا تھا :-

"ہندوستان میں اصطرلاب کا رواج ہمایوں نے دیا، ہمایوں علم ہیئت میں نہایت ماہر تھا، اس نے ایک خاص طرز کا اصطرلاب بنایا تھا، جس کو اصطرلاب ہمایونی کہتے ہیں، چنانچہ ندوہ کے کتب خانہ میں جو ایک قدیم اصطرلاب ہے، اس پر یہ عبارت کندہ ہے، "عمل ضیاء الدین محمد بن قائم محمد بن ملا عیسیٰ بن شیخ الہداد اصطرلابی، ہمایونی لاہوری ۱۰۵۹ھ"[52]

افسوس ہے کہ میرے اس مضمون میں اس بیان کا حوالہ مذکور نہیں، اس وقت ہر چند میں نے اس کے حوالے جا بجا کتابوں میں تلاش کیے، مگر اب تک کامیابی نہیں ہوئی، ہاں علامہ غلام حسین جونپوری الموجود ۱۲۵۰ھ نے جامع بہادرخانی میں لکھا ہے، کہ "صناعانِ متاخرین" نے اصطرلاب میں یہ اصلاحیں کی ہیں،[53] کیا عجب کہ ان متاخرین سے اسی ہمایونی اصطرلاب کی طرف اشارہ ہو،

ہمایوں کی خدمت میں جو صناع فلکیات کے یہ آلے اور نقشے اور کرے بناتے تھے، ان کے نام تاریخوں میں جگہ نہیں پا سکے ہیں، صرف ایک ملا منصور ہروی کا نام آئین اکبری میں ہے، کہ

---

[51] اکبرنامہ دفتر اول، ص ۲۹۷   [52] الندوہ، مارچ ۱۹۰۹ء ص ۴۴،

[53] جامع بہادرخانی ص ۵۰۱ کلکتہ،

"از پرستاران جنت آشیانی (ہمایوں) بود..... اسطرلاب وکرہ ومسطرے چند چنان برساخت کہ کاردیدگاں راشگفت درآورد"

(ج ۱ ص ۳۱ نولکشور پریس اڈیشن)

ضیاء الدین اور اس کا خاندان | ضیاء الدین اور اس کے خاندان کا کوئی پتہ ہم کو اب تک تاریخوں اور تذکروں سے نہیں چلا ہے، لیکن ضیاء الدین اور اس کے باپ قائم محمد کے بنے ہوئے کروں اور اصطرلابوں پر اس کے نام ونسب کا جو سلسلہ لکھا ملتا ہے، اس سے یہ یقین ہوتا ہے، کہ ضیاء الدین کا پردادا "الهداد" ہمایوں کے عہد کا صناع تھا، اور جو ہمایونی طریق کے کرتے اور اصطرلاب تیار کرتا تھا، ضیاء الدین اور اس کے باپ قائم محمد کے حسب ذیل مصنوعات کا پتہ ہم کو مل سکا ہے،

قائم محمد کا بنایا ہوا ایک اصطرلاب کلکتہ میں قاضی عبدالباری[1] کے پاس ہے، اس اصطرلاب پر حسب ذیل کتبہ ہے:-

(۱)

"عمل قائم محمد بن عیسیٰ بن الهداد اصطرلابی ہمایونی سنہ ۱۰۳۴ھ"

اسی اصطرلاب کے دوسرے گوشہ پر ہے،:-

"۲۱ سنہ جلوس جہانگیری"

اس کا بنایا ہوا ایک کرۂ فلکی بانکی پور کے مشرقی کتب خانہ میں ہے، اس پر یہ عبارت

---

[1] یہ کلکتہ کے ایک پرانے خاندان کی یادگار ہیں، ان کے اصطرلاب کی اطلاع پروفیسر محفوظ الحق پریسیڈنسی کالج کلکتہ نے بھیجی ہے،

درج ہے :-

(۲)

"صنعتہ اقل العباد قائم محمد بن عیسیٰ بن اللہداد اسطرلابی لاہوری ہمایونی سنہ ۱۰۴۷ھ"

کرہ کی دوسری جانب یہ عبارت کندہ ہے :

تمت ایں کرہ مکمل مشتمل بیک ہزار و بست و دو کواکب ثوابت کہ جمیع ازاں چہل و ہشت صورت مرصودہ نمودہ اند، اہل (؟) علمار و حکمار تنجیم، چنانچہ مرصود در رصد مرزا الغ بیگ است، و در تقویم ہر کوکب ثابتہ سہ درجہ زیادہ کردہ ایم بحساب حکمار علمار ایں فن تا بایں تاریخ سنہ ۱۰۴۷ھ"

یہ کرہ خالص پیتل کا بنا ہوا ہے، ہر کوکب کے پاس چاندی کی کیل ہے، اور ہر برج کی شکل بھی بنی ہوئی ہے، اور برجوں کے پاس اس طرح سے جڑی ہیں، کہ ان کی شکلیں متوہم ہو جاتی ہیں،

قائم محمد کے بیٹے ضیاء الدین محمد کے بنائے ہوئے حسب ذیل کروں اور اصطرلابوں کا حال ہم کو معلوم ہوا ہے، جن کو ہم سنہ کی ترتیب سے نیچے درج کرتے ہیں،

۱۔ اس کی بنائی ہوئی سب سے قدیم صنعت ایک فلکی کرہ ہے، جو اس وقت پھلواری ضلع پٹنہ میں مولوی یوسف صاحب رضوی کے پاس ہے، یہ کرہ خالص پیتل کا ہے، اور ہر ستارہ کے پاس چاندی کی ایک کیل گڑی ہے، تین پاؤ پختہ وزن ہے، اس خاندان میں یہ کرہ سنہ ۱۲۳۵ھ سے چلا آرہا ہے، کرہ پر حسب ذیل عبارت[۱] نقش ہے،

"عمل ضیاء الدین محمد بن قائم محمد بن ملا عیسیٰ ابن ملا اللہداد اسطرلابی ہمایونی

---

[۱] اس کرہ کی واقفیت کے لئے ہم مولوی سید احمد عروج ہاشمی صدر منزل مسند دیپٹنہ کے ممنون ہیں،

لاہوری فی سنہ ۱۰۵۰ھ"

۲۔ اس کے بعد اُس کی بنائی ہوئی دوسری چیز ایک اصطرلاب ہے، جو اس وقت ندوۃ العلما کے کتب خانہ میں ہے، اس اصطرلاب پر نام و تاریخ اس طرح ہے،

"عمل ضیاء الدین محمد بن قائم محمد بن ملا عیسیٰ بن شیخ اللہ داد اصطرلابی ہمایونی لاہوری فی سنہ ۱۰۵۹ ہجری،

۳۔ اسکا بنایا ہوا دوسرا اصطرلاب نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے کتب خانہ (حبیب گنج ضلع علی گڑھ) میں ہے، اس کی عبارت اور تاریخ یہ ہے:۔

"عمل اقل العباد ضیاء الدین محمد بن قائم محمد ابن ملا عیسیٰ بن شیخ اللہ داد اسطرلابی ہمایونی لاہوری فی سنہ ۱۰۶۴ ہجری"

۴۔ اسی سال کا بنایا ہوا اس کا کرہ رامپور میں ایک حکیم صاحب کے پاس تھا، اور جواب طبیہ کالج علی گڈھ میں ہے، اس کا حلقہ ٹوٹ گیا ہے مگر کرہ سالم موجود ہے، اس پر یہ عبارت ہے،

عمل اقل العباد ضیاء الدین محمد بن قائم محمد بن ملا عیسیٰ بن شیخ اللہ داد اسطرلابی ہمایونی لاہوری فی سنہ ۱۰۶۴ھ"

۵۔ اس کی چوتھی فلکی یادگار وہ کرہ ہے، جس کا حال ڈاکٹر کلو بر نے ہم کو لکھ کر اس کے فوٹو کے ساتھ بھیجا ہوا یہ بھی کرہ ہے جو اس وقت جرمنی کے پایۂ تخت برلن کے عجائب خانہ انسانی میں ہے، اس پر کتبہ یہ ہے،

عمل اقل العباد ضیاء الدین محمد بن قائم محمد ابن ملا عیسیٰ ابن شیخ اللہ داد اسطرلابی ہمایونی لاہوری فی سنہ ۱۰۷۱ ہجری،

اس کے بعد سنہ ۱۰۷۴ھ کے بنائے ہوئے اُس کے چار اصطرلابوں کا حال ہم کو معلوم ہے، جو اس

وقت یورپ اور ہندوستان میں موجود ہیں،

۶۔ ایک مولانا ابوبکر صاحب جونپوری (ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ) کے پاس ہے نسبتہً چھوٹا ہے، اس پر عبارت یہ ہے :۔

"عمل اقل العباد ضیاء الدین محمد بن قائم محمد بن شیخ اللہ داد اسطرلابی ہمایونی لاہوری فی سنہ ۱۰۴۷ ہجری،

۷۔ دوسرا ریاست رام پور کے شاہی کتب خانہ میں ہے، اس کے حروف کہیں کہیں سے گھس گئے ہیں، جو پڑھے جاتے ہیں، وہ یہ ہیں[۱] :۔

"عمل اقل العباد ضیاء الدین محمد بن قائم محمد بن ملا عیسیٰ بن شیخ اللہ داد......

فی سنہ ۱۰۴۷ ہجری،

۸۔ اس سنہ کا تیسرا اصطرلاب وہ معلوم ہے، جو ۱۹۳۱ء کے ایرانی فنون کی نمائش منعقدہ لندن (پرشین آرٹ اگزبیشن) میں پیش ہوا تھا، اور جس کا ذکر نمائش مذکور کی مطبوعہ فہرست ص ۱۹۳ میں موجود ہے، اس پر یہ عبارت کھدی تھی[۲]،

"عمل اقل العباد ضیاء الدین محمد بن قائم محمد بن ملا عیسیٰ بن شیخ الہداد اسطرلابی ہمایونی فی سنہ ۱۰۴۷ ہجری"

فہرست مذکور کے مرتب نے الہداد کے نام کے پڑھنے میں غلطی کی ہے، اس ہندوستانی نام کو جو "الہٰ" اور "داد" کا مجموعہ ہے، اور جس کے معنی عطیۂ الٰہی کے ہیں، "الحداد" پڑھا گیا، جس کے معنی عربی میں لوہار کے ہیں، اور پیتل کی صناعی کی مناسبت سے شاید یہ الحداد موزوں سمجھا گیا ہے، مگر یہ صریحاً تحریف ہے،

---

[۱] اس اطلاع کے لئے ہم مولوی امتیاز علی خاں صاحب عرشی ناظم کتب خانہ شاہی رام پور کے

۹ - اسی سنہ کا بنایا ہوا اس کا چوتھا اصطرلاب جو بہت بڑا ہے، بانکی پور لائبریری میں ہے، عبارت یہ ہے:۔

"عمل اقل العباد ضیاء الدین محمد بن قائم محمد بن ملا عیسیٰ بن شیخ الہداد اسطرلابی ہمایونی لاہوری فی ۱۰۷۴ھ"

نتائج | اوپر کے معلومات اور کتبوں کی بنا پر حسب ذیل نتیجے برآمد ہوتے ہیں:۔

ان لوگوں کا وطن لاہور (پنجاب) تھا، سلسلۂ نسب یہ ہے: ضیاء الدین، اس کا باپ قائم محمد، اس کا باپ ملا عیسیٰ، اس کا باپ ملا شیخ الہداد، کتبوں کی عبارت اور لفظ "ملا" کے لقب سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ صفتِ علم سے آراستہ تھے، بدایونی میں ایک شیخ الہداد لنگر خانی لاہوری کا حال ان لفظوں میں ہے:۔

"منسوب بمحلہ ایست از لاہور (محلہ لنگر خان لاہور کا ایک محلہ ہے) در اکثر علوم متداولہ ماہر و متبحر..... و بدرس مشغول است، ہرگز بخانۂ ارباب بے مروت دنیا نرفتہ واز ملوک حاجت نخواستہ و مدد معاش نگرفتہ، عمرش قریب بہشتاد است"

(جلد سوم، ص ۱۵۴)

بدایونی نے اپنی کتاب ۱۰۰۴ھ میں لکھی ہے، اس حساب سے ان شیخ الہداد کی پیدائش تقریباً ۹۲۴ھ ہوتی ہے، اور ہمایوں کی حکومت کا زمانہ ۹۳۷ھ سے ۹۶۳ھ تک ہے، اس بنا پر یہ ہمایوں کے سامنے پچیس تیس برس کے جوان ہوں گے، تاہم اُن کو وثوق کے ساتھ ضیاء الدین کا پردادا شیخ الہداد نہیں کہا جا سکتا۔

ضیاء الدین اور اس کے بزرگوں کے ناموں کو سلاطین کے ناموں کے ساتھ ملانے سے:۔

(بقیہ حاشیہ ص ۲۶۹) منسوب ہیں۔ ۵۲ اس کی اطلاع بھی ہم کو پروفیسر محفوظ الحق نے دی ہے۔

نسبت پیدا ہوتی ہے،

۱- شیخ الہداد	۱- بادشاہ ہمایوں (۹۳۷ھ ۱۵۳۰ء - ۹۶۳ھ ۱۵۵۵ء)
۲- ملا عیسیٰ	۲- بادشاہ اکبر (۹۶۳ھ ۱۵۵۵ء - ۱۰۱۴ھ ۱۶۰۵ء)
۳- قائم محمد	۳- بادشاہ جہانگیر (۱۰۱۴ھ ۱۶۰۵ء - ۱۰۳۶ھ ۱۶۲۷ء)
	۴- بادشاہ شاہجہاں (۱۰۳۶ھ ۱۶۲۷ء - ۱۰۶۸ھ ۱۶۵۷ء)
۴- ضیاء الدین محمد	۵- بادشاہ عالمگیر (۱۰۶۸ھ ۱۶۵۷ء - ۱۱۱۸ھ ۱۷۰۷ء)

ان میں سے دو کی تاریخیں ہم کو ملی ہیں، اور وہ دونوں اس قیاس کے مطابق ہیں، قائم محمد کے پہلے اسطرلاب کی تاریخ ۱۰۳۴ھ سنہ ۲۱ جلوس جہانگیری ہے، اس کے دوسرے کرہ کی تاریخ ۱۰۴۷ھ اس سے ثابت ہے، کہ اس نے جہانگیر اور شاہجہاں کا زمانہ پایا ہے،

ضیاء الدین کے پہلے کرہ پر ۱۰۵۰ھ اور آخری کروں پر ۱۰۷۰ھ منقوش ہیں، جن سے اس کے عمل وصنعت کا زمانہ کم از کم سترہ برس تو بالیقین ہے،

ان لوگوں کا اس کثرت سے آلات بنانا یہ ثابت کرتا ہے، کہ یہ لوگ علمائے مدرسین یا علم ہیئت کے عام شائق و ماہر نہ تھے، بلکہ پیشہ ور کاریگر تھے، ایک ایک سال میں کم ازکم چار چار اسطرلاب یا کرے بناتے تھے، جیسا کہ ۱۰۶۳ھ میں اس کے ایک اسطرلاب اور ایک کرہ کا اور ۱۰۷۰ھ میں اس کے چار اسطرلابوں کا پتہ ہم کو معلوم ہے،

ڈاکٹر تکلو کا یہ شبہہ کہ ضیاء الدین یا اس کے کرہ کو راجہ جے سنگھ سوائی کے رصدخانہ سے تو کوئی تعلق نہ تھا بے بنیاد ہے، اس رصدخانہ کی تعمیر محمد شاہ کے حکم سے راجہ جے سنگھ رئیس جے پور ونصوبہ دار آگرہ و مالوہ نے ۱۱۳۷ھ مطابق ۱۷۲۴ء میں کرائی تھی، یعنی برلن کے کرہ کی ساخت کے چھیاسٹھ برس بعد، اور ضیاء الدین کے پہلے بنائے ہوئے کرہ (موجودہ پھلواری ضلع پٹنہ) کی ساخت کے ۷۹ اناسی برس بعد)

(معارف اگست ۱۹۴۳ء)

(۲)

ناظرین کو یاد ہوگا کہ اگست ۱۹۳۳ء کے معارف میں لاہور کے ایک فلکی آلات ساز کے عنوان سے میرا ایک مضمون چھپا تھا جس میں ضیاء الدین محمد بن قائم محمد بن ملا عیسیٰ بن شیخ الہداد اسطرلابی ہمایونی لاہوری اور اس کے بزرگوں کے حالات اور ان کے بنائے ہوئے اسطرلابوں کی کیفیت اور پتے لکھے گئے تھے،

اس مضمون میں ضیاء الدین اور قائم محمد کے اسطرلابوں کا ذکر تھا، اور اس وقت تک عیسیٰ اور الہداد کے اسطرلابوں کا پتہ مجھے نہیں چلا تھا، تاہم میں نے قرائن سے جو باتیں لکھی تھیں، وہ بعد کی تحقیق سے درست ثابت ہوئیں،

اب ضیاء الدین محمد کے چچا مقیم اور دادا ملا عیسیٰ، اور پردادا شیخ الہداد کے اسطرلابوں کا سراغ لگا ہی، جس سے اس خاندان کے سارے افراد کا سلسلہ پورا ہو جاتا ہے،

الہداد شیخ الہداد کو میں نے خود آلات ساز مانا تھا، اور ہمایوں کا معاصر فرض کیا تھا، ہمایوں کا زمانہ ۹۶۳ھ تک ختم ہو جاتا ہے، الہداد کا بنایا ہوا کوئی اتنا پرانا اسطرلاب تو نہیں ملا ہے، لیکن ۱۹۳۴ء کے سفر حیدرآباد میں مجھے نواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانہ میں الہداد کا بنایا ہوا ایک اسطرلاب ملا جس پر صانع کا نام اور تاریخ یہ درج ہے،

"صنعت استاد الہداد اسطرلابی لاہوری فی ۹۷۵ھ"

یہ اصطرلاب ہمایوں کی وفات کے تیرہ برس بعد کا بنا ہوا ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ عمل تیرہ برس کے لڑکے کا نہیں ہو سکتا، اس لئے وہ ہمایوں کا ضرور معاصر ہے، اور یہ بھی ثابت ہوا کہ الہداد خود بھی آلات ساز تھا، کسٹر میوزیم ہمبرگ میں الہداد کے پوتوں کا بنا ہوا ایک سطرلاب ہے جس

۱۰۱۰ھ کی تاریخ ثبت ہے، اور شکاگو کے ایک میوزیم میں الہداد کے بیٹے کا بنایا ہوا اسطرلاب ۱۰۱۳ھ کا ہے[1] اس سے یہ معلوم ہوا کہ الہداد کی یہ عمر تھی کہ ۱۰۱۳ھ میں اس کا بیٹا عیسیٰ اور ۱۰۱۰ھ میں اس کے پوتے اور عیسیٰ کے بیٹے فلکی آلات کی کاریگری کے لائق ہو چکے تھے، بنا بریں ۹۷۵ھ الہداد کے بڑھاپے کی تاریخ ہے، اور وہ ہمایوں کا معاصر تھا جس نے ۵۰ برس کی عمر میں ۹۶۳ھ میں وفات پائی ہے،

ملا عیسیٰ | میرے گذشتہ مضمون کے انگریزی نسخہ پر جو اسلامک کلچر حیدرآباد (اکتوبر ۱۹۳۵ء) میں چھپا تھا، ایک لائق فاضل نابیا اباٹ (Nalia Abbott) نے شکاگو یونیورسٹی (امریکہ) سے ایک استدراک اسی رسالہ کے جنوری ۱۹۳۷ء ص ۹۹ میں لکھا ہے، جس میں فلکی عجائبخانہ شکاگو (Adler Planetarium and Astronomical museum) کے دو اصطرلابوں کا ذکر کیا ہے، موصوف ہی کے حوالہ سے مجھے ایک ضروری کتاب کا علم ہوا، ایک انگریز محقق رو برٹ ٹی گنتھر (Robert T. Gunther) ناظم مجموعات لیوس ایونس (آشمولین میوزیم) اوکسفورڈ نے دنیا بھر کے اسطرلابوں پر دو جلدوں میں (The Astrolabes of the world) نام ایک کتاب لکھی ہے، اس میں ہندوستانی اسطرلابوں کے باب میں چند ایسے نئے اسطرلابوں کا ذکر ہے، جن کو میں نے نہیں دیکھا، اور اس لئے اُن کا ذکر میرے مضمون میں نہیں آیا، یہ کتاب انگریزی میں ۱۹۳۲ء میں یونیورسٹی پریس آکسفورڈ میں چھپی ہے، اور اس وقت میرے پیش نظر ہے، ان دونوں میں ملا عیسیٰ بن الہداد کے بنائے ہوئے اسطرلابوں کے حوالے ہیں،

گنتھر نے ملا عیسیٰ کے جس اسطرلاب کا حوالہ دیا ہے (جلد ا ص ۱۸۰ نمبر ۹۸) اس کا علم موصوف کو سر پرسی ڈیبسٹر سے نومبر ۱۹۲۸ء میں ہوا، افسوس ہے کہ اس کے بننے کی تاریخ ان لوگوں نے نہیں

---

[1] ان اصطرلابوں کے حوالے آگے آتے ہیں،

دی ہے، اور نہ اس کا فوٹو گنتھر نے چھاپا ہے، نقش کا انگریزی ترجمہ جو دیا گیا ہے اس سے اس کی اصلی عبارت یوں بنتی ہے،

"صنعت اضعف العباد عیسیٰ بن الہداد اسطرلابی لاہوری ہمایونی"

لیکن شکاگو کے مذکورۂ بالا فلکی عجائب خانہ میں عیسیٰ کا بنایا ہوا جو اصطرلاب ہے، اس پر یہ عبارت مع تاریخ درج ہے،

"صنعت اضعف العباد عیسیٰ ولد الہداد ۱۰۱۳ھ"

(اسلامک کلچر جنوری ۱۹۳۷ء ص ۱۴۴)

عیسیٰ کے پوتے ضیاء الدین محمد کا بنایا ہوا ۱۰۶۹ھ کا ایک اصطرلاب لاہور سے الجیریا (الجزائر) پہنچا، اور جولائی ۱۹۱۱ء میں ایک فرانسیسی ال یونس نے خریدا، اس کا ذکر گنتھر نے کیا ہے، (جلد ۱ ص ۲۰۸، نمبر ۷) اس میں ضیاء الدین نے اپنے دادا کے نام کے ساتھ "حافظ" لکھا ہے جس سے معلوم ہوا کہ وہ حافظ قرآن بھی تھے،

لفظ اسطرلابی ہمایونی کا اضافہ بھی ابنی ہی عیسیٰ کے زمانہ سے شروع ہوتا ہے، جیسا کہ گنتھر کے اڑسٹھویں اسطرلاب سے ظاہر ہے،

عیسیٰ کے دو بیٹے محمد مقیم اور قائم محمد۔	سب سے پہلے گنتھر ص ۲۰۸ نمبر ۶۹ نقش ۹۰ کا ذکر ضروری ہے، اس کے عضادہ پر نسخ میں یہ عبارت لکھی ہے،

تمت بایدی اضعف العباد

ابنا عیسیٰ ابن اللہداد

۱۰۳۰ھ فی بلدۃ دار الخلافہ

لہا ور صانہ اللہ عن آفات الدہر

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عیسیٰ کے دو بیٹے تھے، اور دونوں مل کر بھی کام کرتے تھے، ان دونوں بیٹوں کے نام قائم محمد اور محمد مقیم تھے، جیسا کہ اُن کے اسطرلابوں کے نقش سے معلوم ہوتا ہے،

قائم محمد | قائم محمد بن مُلا عیسیٰ بن الہداد کے چند اسطرلابوں کا ذکر میرے پہلے مضمون میں ہے، قائم محمد کا بنایا ہوا اسطرلاب کلکتہ میں قاضی عبید البارئ کے پاس ہے، جس پر حسب ذیل نقش ہے،

"عمل قائم محمد بن عیسیٰ بن الہداد اسطرلابی ہمایونی سنہ ۱۰۲۶ھ"

(سنہ ۱۲ جلوس جہانگیری)

قائم محمد کا بنایا ہوا ایک فلکی کرہ مشرقی کتب خانہ پٹنہ میں ہے، اس پر حسب ذیل عبارت کندہ ہے:۔

"صنعۃ اقل العباد قائم محمد بن عیسیٰ بن الہداد اسطرلابی ہمایونی سنہ ۱۰۳۷ھ"

محمد مقیم | یہ قائم محمد کا بھائی اور ملا عیسیٰ کا بیٹا ہے، میرے پہلے مضمون میں اس کے کسی اسطرلاب کا ذکر نہیں، نہ مجھے ابھی تک ہندوستان میں اس کے بنائے ہوئے اسطرلاب یا کرہ یا کسی اور آلہ کا پتہ چلا ہے، مگر گنتھر نے اپنی کتاب میں محمد مقیم کے بنائے ہوئے ایک کتبہ کا ذکر کیا ہے اور اس کا فوٹو دیا ہے، یہ اسطرلاب خدا جانے کس طرح ہندوستان سے یورپ پہونچ گیا، ال ایونس نے اس کو جولائی سنہ ۱۹۰۹ء میں کارنیڈن پارک، بشپ، والفرڈ میں خریدا تھا، اور اس کا فوٹو ارکیالوجیکل جرنل سنہ ۱۹۱۱ء نقش ۵ نمبر ۲ میں چھپا تھا، اور اس فوٹو کو گنتھر نے بھی چھاپا ہے، نمبر ۲، اس پر یہ عبارت ہے:

"صنعت اضعف العباد محمد مقیم ابن عیسیٰ ابن الہداد اسطرلابی ہمایونی۔

لاہوری ۱۰۵۳ھ"

اس کا دوسرا اسطرلاب برٹش میوزیم میں ہے، اس پر محمد مقیم لاہوری ۱۰۷۰ھ کندہ ہے

(دیکھو گنتھر نمبر ۸)

ضیاء الدین محمد | یہ قائم محمد کا بیٹا ہے، اس کے ہاتھ کے بنائے ہوئے اسطرلاب ہندوستان اور ہندوستان سے باہر بہت ملتے ہیں، ان میں سے چند کا ذکر میں نے اپنے پہلے مضمون میں کیا ہے، نابیا اباٹ نے شکاگو کے مذکورہ بالا عجائب خانۂ فلکی میں اُس کے ایک اسطرلاب کا حوالہ دیا ہے، جس پر اُس کا نام یوں لکھا ہے،

"عمل ضیاء الدین محمد ابن قائم محمد ابن ملا عیسیٰ ابن ملا اللہ داد اسطرلابی ہمایونی لاہوری فی ۱۰۵۰ھ ہجری"

ضیاء الدین کا بنایا ہوا دوسرا اسطرلاب ہندوستان سے شمالی افریقہ کے ملک الجزائر میں پہنچا، اور جولائی ۱۹۱۱ء میں ال اونس نے اس کو خریدا، اس کی صحیح عبارت جس کو گنتھر نے غلط لکھا ہے، یا وہ بے ترتیب نقل ہوئی ہے، حسب ذیل ہے،

"عمل اضعف العباد ضیاء الدین محمد ابن قائم محمد ابن ملا عیسیٰ. ابن شیخ اللہ داد اسطرلابی ہمایونی لاہوری ۱۰۶۹ھ"

نمبر ۱، پر گنتھر نے ایک اور اسطرلاب کا ذکر کیا ہے، جس کے اوپر اس کے بیان کے مطابق حسب ذیل کتبہ ہے،

"عمل محمد بن عیسیٰ بن اللہ داد اسطرلابی ہمایونی لاہوری"

اس پر ایک طرف ۱۰۴۴ھ ہے، اور دوسری طرف ۸ھ جلوس شاہجہانی درج ہے

اس کو بھی ڈاکٹر ال اونس نے ۲۳ ستمبر ۱۹۲۱ء کو خریدا، ہ نابیا اباٹ نے لکھا ہے اور میں اس سے

متفق ہوں کہ محمد کے پڑھنے کے بعد کوئی نقطارہ گیا ہے، یعنی یا تو محمد مقیم ہے، یا قائم محمد ہے، یہ کوئی تیسرا نام نہیں ہے،

اسی طرح کنتھر نے ایک اسطرلاب پر قاسم محمد بن مُلّا عیسیٰ بن الہداد پڑھا ہے، (ص ۲۱۰) یہ بھی غلط ہے، نابیا صاحب کی رائے درست ہو کہ صحیح قرأت قائم محمد ہے، میں نے پہلا مضمون لکھتے وقت رام پور کے اسطرلابوں کے کتبے منگوائے تھے، تو وہاں کے ایک اسطرلاب پر بھی قاسم کھنچا ہوا تھا، سوراخ سے بچانے کے لئے کشش سم بنا دی گئی تھی، وہ بھی حقیقت میں قائم تھا،

(معارف ستمبر ۱۹۳۷ء)

نالندہ کی سیر

صوبہ بہار کے قصبہ بہار شریف کے آس پاس چند میل کے فاصلہ تک بودھ زمانہ کے بے شمار آثار پائے جاتے ہیں، ان میں سے کچھ کھود کر منظر عام پر لائے گئے ہیں، اور کچھ اب تک زمین کے نیچے دبے ہیں، ان دریافت شدہ قدیم آثار میں سب سے زیادہ اہم اور دلچسپ وہ بودھ خانقاہ یا درسگاہ ہے، جو ہندوستان کے پرانے سفرناموں اور یادداشتوں میں نالندہ کے نام سے مشہور ہے،

یہ مقام قصبہ بہار اور راجگیر کے بیچ میں واقع ہے، اور میرے وطن سے دس بارہ میل کے فاصلہ پر ہے، دور دور سے بلکہ یورپ و امریکہ تک سے لوگ ان آثار کو دیکھنے آتے ہیں، لیکن باایں ہمہ قرب مجھے اب تک اس کی زیارت کا موقع نہیں ملا، اور سعدی کا یہ طعن مجھ پر صادق آرہا تھا:-

"سبحان اللہ دوراں باخبر ونزدیکاں بے بصر"

اس دفعہ جب مئی و جون میں وطن میں قیام کا اتفاق ہوا، تو وطن کے کئی نوجوان عزیز اس کو دیکھنے گئے، اور واپس آکر اس کے بعض حالات بیان کئے، اس "گفتار" نے "دیدار" کا شوق پیدا کیا، میرے عزیزوں میں ابوالکمال سید عبدالحکیم صاحب گو بوڑھے نہیں، مگر جوان بھی نہیں، تاہم

ارادہ اور عزم جو انون کا رکھتے ہیں، انھوں نے تحریک کی، اور شاہ محمد قاسم صاحب بیرسٹر میں قصبہ بہار و متولی وقف ریاست مغربی بیگم نے اپنی کار بھیج کر سفر کی شکل حل کی، تو اب کیا عذر ہو سکتا تھا، سید عبدالحکیم صاحب اور برادرم سید عبدالقیوم صاحب جو میرے ہر دینی کام کے اعزازی ذمہ دار ہیں، ساتھ ہوئے، اور صبح سویرے یہ مختصر قافلہ سفر کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا، ابھی آدھا راستہ بھی طے نہیں ہوا تھا کہ موٹر کو وہ افتاد پیش آئی جس کو اہل منطق کی اصطلاح میں مغالطۂ عامۃ الورود کہتے ہیں، یعنی پنکچر جو ہر موٹر کو ہر وقت پیش آسکتا ہے،

نالندہ کا رقبہ اور دفتر خیال ہوا کہ اس جا ترے کے لئے یہ شگون اچھا نہیں ہوا، مگر عزم درست تھا، اس لئے پیادہ ہی آگے بڑھ گئے، خدا نے مدد کی، اور شوفر نے پہیہ جلد بدل لیا، پون گھنٹہ کے سفر کے بعد بی بی لائٹ ریلوے اسٹیشن نالندہ آیا، یہاں سے مقام مذکور تک جو بہت قریب ہے سڑک جاتی ہے، چنانچہ چند منٹ کے بعد ہم نالندہ کے سامنے تھے، ڈسٹرکٹ بورڈ نے سڑکیں بنوادی ہیں نالندہ کے سامنے محکمۂ آثار کی طرف سے نالندہ سے برآمد شدہ اشیا کے لئے ایک مختصر بنگلہ مع احاطہ و باغ بنوایا گیا ہے، اس کو گویا نالندہ کی قدیم اشیا کا عجائب خانہ سمجھیے، اسی میں نالندہ کے آثار گھر کا دفتر ہے، نالندہ کی سیر کے ہر شائق کو پہلے اس دفتر میں جا کر چار آنے کا ٹکٹ خریدنا چاہیے، اور اس کو لے کر نالندہ کے کھنڈروں میں قدم رکھنا چاہیے،

عجائب خانہ یہ ایک بنگلہ ہے، جس کے دو کمروں میں نالندہ کی زمین سے نکلی ہوئی چیزیں قرینہ سے رکھی گئی ہیں، میں نے یہاں سُنا کہ عمدہ اور قیمتی چیزیں کلکتہ میوزیم میں بھیج دی گئی ہیں یہاں کمروں میں زیادہ تر بودھ کی چھوٹی چھوٹی مورتیاں رکھی ہیں جو دھات کی بنی ہوئی ہیں، مٹی کی مہریں، چند سکے، بخوردان، لوہے کے قفل، تانبے کے برتن، اینٹیں جن پر عبارتیں کھدی ہیں، اور بعض جانوروں کے مجسمے بھی ہیں، مٹی کے بدھنے جیسے مسجدوں میں ہوتے ہیں، ان کی بھی

خاصی تعداد ہے، اس سے پتہ چلا کہ مذہبی عبادت گاہوں میں اس قسم کے بندھنوں کا ہونا ہندستان کی پرانی بات ہے، پتھروں اور پتروں پر کھدے ہوئے وہ سندات بھی ہیں، جن کو لکھ کر راجاؤں نے گانوں اور جائدادیں اس خانقاہ پر وقف کی تھیں، جس چیز کو دیکھ کر سب سے زیادہ تعجب ہوا، وہ تلواروں اور دوسرے آہنی ہتھیاروں کا وجود ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں لڑائی اور حفاظت کا بھی سامان تھا،

بڑاگانوں | نالندہ اب نام پڑا ہے، ان آثار کی دریافت سے پہلے اس گانوں کا نام بڑاگانوں تھا جس کو عام طور سے بڑگانوں کہا جاتا ہے، جو اس دیار کے مشہور رئیس جناب چودھری ظہور الحق صاحب مرحوم کی زمینداری میں واقع ہے، یہاں بڑے بڑے اونچے ٹیلے تھے، جن پر اتنی مٹی جم گئی تھی، کہ ان میں بے خطر کھیتی ہوتی تھی، اس مقام سے بہت کم فاصلہ پر وہ گانوں ہے جو آج بھی جینیوں کا مرکز ہے، اور اس میں اُن کی عمارتیں ہیں، ان ٹیلوں اور گانوں کے بیچ میں پیپل کا بڑا درخت ہے جس کے چاروں طرف احاطہ کھینچا ہے، اس احاطہ کے اندر اس درخت کے نیچے بودھ کی ایک بہت بڑی مورتی جو سیاہ پتھر کو کاٹ کر بنائی گئی ہے، زمین پر مدت سے رکھی ہوئی ہے، اس کا نام عام طور سے تلیا بھنڈار مشہور ہے، اس احاطہ سے باہر میدان میں گانوں کی جانب ایک دوسری مورتی کھڑی ہے،

نالندہ کی تلاش | چین کے ایک بودھ سیاح نے جو ساتویں صدی عیسوی کے وسط میں ہندستان آیا تھا، نالندہ نام ایک عظیم الشان بودھ درس گاہ کا ذکر کیا تھا، اس کی جائے وقوع انہی اطراف میں ظاہر کی تھی، قدیم آثار کے بعض یورپین شائق گھومتے پھرتے ادھر بھی آنکلے، ان مورتیوں کو دیکھ کر انھیں ان ٹیلوں کے اندر آثار قدیمہ کے مخفی خزانہ کے دفن ہونے کا خیال ہوا، سب سے پہلے مسٹر براڈلے (Broadley) نے جو اٹھارھویں صدی کے ربع آخر میں بہار کے ڈپٹی مجسٹریٹ تھے،

جنرل کننگھم (Cunningham) کی معیت میں ان آثار کی تفتیش کی، پھر آثار قدیمہ کے دوسرے شائقین آتے رہے، اور کھود کھود کر یہاں سے چھوٹی موٹی چیزیں لے جاتے رہے،

کھدائی | بالآخر روز بروز یہ خیال راسخ ہوتا چلا گیا کہ نالندہ کی خانقاہ مٹی کے انہی ڈھیروں کے نیچے ہے، حکومتِ ہند کے محکمۂ آثار قدیمہ نے ۱۹۱۵ء میں ادھر توجہ کی اور کھدائی کا کام شروع کر دیا، کھدائی جیسے جیسے زیادہ نیچی اور گہری ہوتی گئی، خانقاہ مذکور کی دیواریں اور بنیادیں جوں کی توں نکلنی شروع ہو گئیں، حکومت نے اس کام کی تکمیل کے لئے اپنے خزانہ سے ۲۵ ہزار سالانہ منظور کئے، یہ مقررہ رقم اس پر برابر خرچ ہوتی رہی، اور ہر سال کچھ نہ کچھ نئے آثار برآمد ہوتے چلے گئے، چنانچہ اس وقت (یکم جولائی ۱۹۳۴ء) تک پہلو بہ پہلو گیارہ عمارتوں کی بنیادیں، اور دیواریں برآمد ہو چکی ہیں،

یہ عمارت دراصل بودھوں کی خانقاہ تھی، جس میں بودھ مت کے پجاری، نقیر، اور پیشوا رہتے تھے، اور ان کی موجودگی کی وجہ سے رفتہ رفتہ اس کی حیثیت خانقاہ کے علاوہ درسگاہ کی بھی ہوتی گئی،

نالندہ کے متعلق قدیم بیان | نالندہ کی قدیم تاریخ کے متعلق مہا مہوپادھیا گوری شنکر ہیراچند اوجھا نے اپنے خطبات موسومہ "قرونِ وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب" میں حسبِ ذیل حالات بیان کئے ہیں:-

> "نالندہ کے دارالعلوم کی بنا مگدھ کے راجہ شکرادتیہ نے ڈالی تھی، اس کے بعد کے راجاؤں نے بھی اس کی کافی رعایت کی، اس جامعہ کے قبضہ میں ۲۰۰ سے زیادہ موضع تھے، جو مختلف راجاؤں کے عطیے تھے، ان ہی مواضعات کی آمدنی سے اس کا خرچ چلتا تھا، یہاں دس ہزار طالب علم اور ڈیڑھ ہزار اتالیق رہتے تھے، دور دراز ممالک سے

بھی طلبہ تحصیل علم کے لئے آتے تھے، چاروں طرف اونچے اونچے دہار اور مٹھ بنے ہوئے تھے
بیچ بیچ میں مدرسے اور دارالناظرے تھے، اس کے چاروں طرف بودھ علماء اور
مبلغین کی سکونت کے لئے چو منزلہ عمارتیں تھیں، خوشنما دروازوں چھتوں اور
ستونوں کی شان دیکھ کر لوگ حیرت میں آجاتے تھے، وہاں کئی بڑے بڑے کتب خانے
اور چھ بڑے بڑے ادارے تھے، طلبہ سے کسی قسم کی فیس نہیں لی جاتی تھی، اس کے
برعکس انھیں ہر ایک ضروری چیز کھانا کپڑا، دوا، کتابیں، مکان وغیرہ مفت دیئے
جاتے تھے، اونچے درجوں کے طلبہ کو ایک بڑا کمرہ اور نیچے درجوں کے طلبہ کو معمولی
کمرہ دیا جاتا تھا[۵]

اس جامعہ میں بودھ ادبیات کے علاوہ وید، ریاضیات، نجوم، منطق، دیاکرن، طب
وغیرہ مختلف علوم کی تعلیم دی جاتی تھی، وہاں سیاروں اور فلکی عجائبات کے مشاہدے
کے لئے رصدگاہیں بنی ہوئی تھیں، وہاں کی آبی گھڑی مگدھ والوں کو وقت بتلاتی تھی،
اس جامعہ میں داخل ہونے کے لئے ایک امتحان دینا پڑتا تھا، یہ امتحان بہت سخت ہوتا
تھا، اور کتنے ہی طلبہ ناکام رہ جاتے تھے، پھر بھی دس ہزار طلبہ کا ہونا حیرت کی بات ہے
اس کے فارغ التحصیل طلبہ مستند عالم سمجھے جاتے تھے، ہرش نے اپنے دارالسلطنت کی
تقریب میں نالندہ سے ایک ہزار علماء مدعو کئے تھے، مسلمانوں کے زمانہ میں اس یادگار
اور فیض بار جامعہ کی ہستی خاک میں مل گئی، (ص ۱۷۶)

نالندہ کی تباہی | اوجھا صاحب نے آخری سطر میں جو بات لکھی ہے، وہ اتنی ترمیم کے ساتھ صحیح ہے
کہ نالندہ کی خانقاہ یا درسگاہ مسلمانوں کے زمانہ میں نہیں بلکہ محمد بختیار خلجی کے حملۂ بہار کے وقت

---

[۵] بیل بدھسٹ کارڈس آف دی ویسٹرن ورلڈ ج ۲ ص ۱۷۰، ۱۶۸

اثنائے جنگ میں ایسی منتشر اور پراگندہ ہوئی کہ پھر اس کا شیرازہ نہ بندھ سکا، اس حملہ کی کیفیت قاضی منہاج سراج نے طبقات ناصری میں ۶۴۱ھ میں ایسے شخص سے سن کر لکھی ہے جو بختیار خلجی کے ساتھ اس جنگ میں شریک تھا، عبارت یہ ہے:۔

یک دو سال بریں منوال بداں حوالی	محمد بختیار خلجی ایک دو سال اسی طرح
و ولایت می دوانید، تا استعداد حصار	بہار کے اطراف میں گھوڑا دوڑاتا رہا،
بہار کرد، ثقات رواۃ چنیں روایت	یہاں تک کہ بہار کے حصار کی تیاری
کردند کہ با دویست برگستوان بدر	کی، معتبر راویوں نے بیان کیا کہ
قلعۂ بہار رفت و مناصبہ جنگ پیش	دو سو زرہوں (زرہ پوشوں) کے
برد......	ساتھ بہار کے قلعہ کے دروازہ پر گیا
	اور ناگہانی طور سے لڑائی شروع کردی
چوں بدر حصار وصول افتاد جنگ	جب حصار کے دروازہ تک پہنچے
پیش بردند...... چوں محمد بختیار	کا اتفاق ہوا، ...... محمد بختیار نے
خود را بقوت و دلیری درتنورہ[1]	اپنے کو بہادری و دلیری کے ساتھ اس
دروازہ آن حصار انداخت و قلعہ را	حصار کے دروازہ کے شگاف میں ڈال
فتح کرد، و غنائم بسیار بدست آورد	دیا، اور قلعہ کو فتح کرلیا، اور بہت سا
بیشتر ساکنان آن موضع برہمنان بودند	مال غنیمت ہاتھ آیا، اس مقام کے
سرہا تراشیدہ داشتند، ہمہ کشتہ شدند	زیادہ تر رہنے والے برہمن (بودھ عالم)
در آنجا کتب بسیار بود چوں آن کتب در نظر اہل اسلام	تھے، سر کے بال منڈے ہوئے سب

---

[1] کذا و شاید کہ درتنورہ باشد بمعنی شگافتہ و چاک "س"

آمد جماعتے را طلب کردند، کہ تا از	مارے گئے، اور وہاں کتابیں بہت تھیں
معانی آن کتب علامے باز و ہند جملہ	جب وہ کتابیں مسلمانوں کو نظر آئیں
کشتہ شدہ بودند، چوں معلوم	تو کچھ لوگوں کو طلب کیا، جوان کتابوں
شد، تمامت آں حصار و شہر مدرسہ	کے مطلب سے خبر دیں، سب ہی مارے
بود و بہار بلغت ہندوی اسم مدرسہ	جا چکے تھے، معلوم ہوا کہ یہ پورا حصار
باشد چوں آن فتح برآمد باغنائم	اور شہر مدرسہ تھا، اور بہار ہندوی
بسیار بانگشت،	زبان میں مدرسہ کا نام ہے، جب یہ
(۱۴۷-۱۴۸-۱۵۰- کلکتہ اڈیشن)	فتح ہو گیا تو بہت سے مال غنیمت کے
	ساتھ واپس پھر گیا،

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ حملہ آوروں کو اس حصار کا مدرسہ یا درسگاہ ہونا پہلے سے معلوم نہ تھا، نہ انھوں نے عمارتوں کو برباد کیا اور نہ کتابوں کو غائبا نقصان پہنچایا، عمارتوں کے نقصان نہ پہونچنے کی شہادت تو آثار آج بھی دے رہے ہیں، تمام دیواریں ہال، کمرے اور کمروں کے اندر کے خشتی چبوترے، بعینہ موجود ہیں، البتہ جو چیز نہیں ہے، وہ چھتیں ہیں چھتوں کا کہیں وجود نہیں،

سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ یہ برآمد شدہ عمارت اس طرح سہ منزلہ ہے کہ ایک منزل تو زمین کے برابر ہے، دوسری زمین کے اوپر ہے، اور تیسری اس کے اوپر ہے اور ان میں ہر منزل کی بنیاد نئے بڑے بڑے پتھر رکھ کر اس طرح اس پر کھڑی کی گئی ہے، کہ ہر منزل دوسری منزل سے بے تعلق اور بغیر کسی جوڑ کے ہے، اگر ممکن ہو تو ہر منزل کو دوسری منزل سے علحدہ کرکے اس طرح اکھاڑ سکتے ہیں، کہ نیچے کی منزل کو ذرہ سا بھی نقصان نہ پہنچے، ہر منزل کی نالیاں

اور بڑے بڑے پرنالے الگ الگ ہیں، محکمۂ آثار قدیمہ کے محقق کہتے ہیں، کہ یہ تینوں منزلیں مین راجاؤں کے زمانہ میں الگ الگ بنی ہیں، اور دوسرے قرائن سے یہ ثابت کیا گیا ہے، کہ یہ مقام مسلمانوں کی آمد سے پہلے بھی متعدد بار ویران اور آباد کیا جا چکا ہے، چنانچہ نالندہ کے بعض اندرونی سنگی دروازوں کے آگ لگائے جانے کے آثار بھی پائے جاتے ہیں، غالبًا بودھوں کے دشمن ہندو برہمنوں نے اس کے مٹانے کی کوششیں بار بار کی ہیں،

اس درس گاہ کے بند ہو جانے کی وجہ غالبًا یہ ہوئی ہوگی، کہ محمد بختیار خلجی کے قبضۂ بہار کے بعد وہ زمین اور جائدادیں جو نئے فاتحوں کے ہاتھوں میں آئیں، وہ پھر بطور وقف باقی نہ رہیں، جس کی آمدنی سے یہ درسگاہ چل رہی تھی، اور چونکہ بودھ دھرم کے ماننے والے اس ملک میں باقی نہیں رہے تھے، اس لئے ان اوقاف کے دوبارہ اجراء کے لئے ہندو رعایا کی طرف سے کوئی تحریک نہیں ہوئی ہوگی،

طبقاتِ ناصری کی عبارت بالا میں "برہمن" سے مقصود ہندو برہمن نہیں ہیں، بلکہ بودھ مذہب کے لکھنے پڑھنے والے عالم مراد ہیں، "بہار" کا لفظ اصل "بہار" ہے، جس کے اصلی معنی مدرسہ کے نہیں، بلکہ خانقاہ و معبد کے ہیں، اور چونکہ وہ درس و تدریس کے کام میں بھی آتا تھا، اس لئے اس سے درس گاہ کا مطلب سمجھنا بھی درست ہے،

نالندہ کا زمانہ چینی سیاح فاہیان (Fahian)، جو ۴۰۵ء اور ۴۱۱ء کے درمیان ہندوستان میں آیا تھا، اپنے سفرنامہ میں نالندہ کا کوئی ذکر نہیں کرتا، لیکن دوسرا مشہور چینی سیاح یان جنگ (Yanchang) جس نے ۶۳۰ء اور ۶۴۵ء کے درمیان ہندوستان کا

لہ یہ حالات تمامتر نالندہ کے مختصر رہنما (گائڈ) بزبان انگریزی مصنفہ ایم. ایچ قریشی قائم مقام سپرنٹنڈنٹ محکمۂ آثار قدیمہ پٹنہ سے لئے گئے ہیں،

سفر کیا تھا کسی قدر تفصیل کے ساتھ اس مقام کے حالات بیان کرتا ہے اس سے قیاس ہوتا ہے کہ نالندہ کی مشہور خانقاہیں سنہ ھ اور سنہ ھ کے درمیانی زمانہ میں تعمیر ہوئی تھیں،

نالندہ کے بانی | یان چنگ کی روایت ہے کہ پانچ سو تاجروں نے ایک لاکھ طلائی سکوں کے معاوضہ میں یہ زمین خرید کر گوتم بدھ کو پیش کر دی تھی، اور اس نے تین ماہ تک وہاں شریعت کی تبلیغ کی، یان چنگ ہی کا بیان ہے کہ نالندہ کی پہلی خانقاہ سکرادتیا (Sakraditya) نامی اس ملک کے ایک قدیم راجا نے تعمیر کرائی تھی، اور اس کے بعد پانچ دوسرے راجاؤں نے جن میں سے چار سکرادتیا کی اولاد میں تھے، اور پانچواں وسط ہند کا ایک راجا تھا، اصلی خانقاہ کے شمال، جنوب اور مشرق کی جانب دوسری خانقاہیں تعمیر کرائیں،

نالندہ کے مشائخ | یان چنگ کے زمانہ میں اس خانقاہ میں بودھ مذہب کے کئی ہزار مشائخ رہتے تھے، جن کی اعلیٰ لیاقت کا شہرہ دور دور پھیلا ہوا تھا، اس خانقاہ کا رئیس رہبان سیلا بھدرا تھا

نالندہ کے موجودہ آثار | نالندہ کے آثار میں اینٹ کی قدیم عمارتوں کے کثیر التعداد کھنڈر ہیں، جو دو ہزار فٹ لمبے اور سات سو فٹ چوڑے خط میں پھیلے ہوئے ہیں، مغرب کی جانب ایک قطار اسٹوپا[1] کی ہے، جن میں سے بعض بہت بڑے اور اکثر بالکل چھوٹے ہیں، اس قطار کے مشرق میں ایک سلسلہ خانقاہوں کا ہے، جن میں سے متعدد خانقاہیں محکمۂ آثارِ قدیمہ نے کھود کر باہر نکال لی ہیں،

سب سے بڑا اسٹوپا | یہ ایک عظیم الشان مربع عمارت ہے، جس کے گرد متعدد چھوٹے چھوٹے اسٹوپے ہیں، ان میں سے اکثر دو دو، اور تین تین، ایک کے اوپر ایک بنے ہوئے ہیں، کھدائی کے سلسلہ میں دیکھا گیا، کہ سب سے بڑا اسٹوپا بھی پہلے چھوٹا تھا، بعد میں متعدد اسٹوپے، اس کے اوپر اور چاروں طرف

---

[1] بودھیوں کی قبروں، اور یادگاروں پر زمین سے اوپر تک جتنے مینارے کھڑے کئے جاتے تھے، ان کو اسٹوپا کہتے ہیں،

تعمیر ہوتے گئے، چنانچہ اس وقت اس کے اوپر سات اسٹوپے ایک پر ایک بنے ہوئے ہیں، ان میں سے پہلے کے تین اسٹوپے اس تودے کے اندر مدفون پائے گئے تھے، وہ سب بارہ فٹ مربع نیچے دفن تھے، بقیہ چار اسٹوپوں کی عمارتیں زیادہ وسیع ہیں، اور ان پر جانے کے لئے شمالی رُخ پر چوڑی چوڑی سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں، ان میں سے چوتھا اسٹوپا سب سے زیادہ دلچسپ اور سب سے زیادہ اچھی حالت میں ہے، اس میں خوبصورت طاقوں کی قطاریں بنی ہوئی ہیں، اور گوشوں کے میناروں پر گوتم بدھ اور بودھ مذہب کے مشاہیر کے مجسمے ہوئے ہیں، چونکہ اصلی اسٹوپا ہر اضافہ کے بعد وسعت اور بلندی میں بڑھتا گیا، اس لئے اس کی سطح بھی رفتہ رفتہ بلند ہوتی گئی، اور بہت سے چھوٹے چھوٹے اسٹوپے اس کی سطح کے نیچے کھود کر برآمد کئے گئے ہیں، جن میں سے بعض کا ایک حصہ اور بعض بالکل زمین کے اندر غائب ہو گئے تھے، اس اسٹوپا کے شمالی مشرقی گوشہ پر ایک بلند چبوترہ ہے، جس پر متعدد چھوٹے چھوٹے اسٹوپے بنے ہوئے ہیں، اور اس کے ایک گوشہ میں ایک معبد کی مربع عمارت ہے، اس میں اوالوکیتسور کا ایک کھڑا مجسمہ ہے، جنرل کننگھم کا خیال ہے کہ یہی وہ اصلی اسٹوپا ہے جس کی نسبت یان چانگ نے لکھا ہے کہ وہاں گوتم بدھ نے تین ماہ قیام کر کے اپنے مذہب کی تبلیغ کی تھی۔

اصلی اسٹوپا کے جنوب مشرق میں ایک چھوٹا سا عبادت خانہ ہے، جس میں ایک سنگی مجسمہ ہے، خیال کیا جاتا ہے کہ یہ بودھ مذہب کے مشہور عالم اور فلسفی ناگ ارجن کا مجسمہ ہے،

اس اسٹوپا کے مشرق جانب دو خانقاہوں کے کھنڈر ہیں، اور اس کے بعد شمال مشرق کی طرف ایک بڑی خانقاہ ہے، جو اپنی اہمیت کے لحاظ سے سب سے زیادہ ممتاز ہے،

خانقاہ نمبر ا | اس بڑی خانقاہ کی ڈیوڑھی کے شمالی مغربی گوشہ میں ایک کتبہ تانبے کی تختی پر کھدا ہوا پایا گیا ہے، یہ کتبہ بنگال کے پالا خاندان کے تیسرے فرماں روا دیوپال کا ہے، جو نویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں حکومت کرتا تھا، اس کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سماترا کے راجہ

سری بالاپوتر دیو نے ایک خانقاہ نالندہ میں تعمیر کرائی، اور اپنے ملک کے پانچ گاؤں دیوپال کو دیئے جس کے معاوضے میں دیوپال نے راجہ گرہیا (موجودہ راجگیر) اور گیا کے ضلعوں کے چند گاؤں جو سرنگر (یعنی پٹنہ) کی قسمت میں واقع تھے، اس خانقاہ کی نگہداشت اور جو راہب نالندہ میں آئیں ان کے آرام و آسایش کے لئے دیدیئے،

نالندہ کی کھدائی سے ایک اہم بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ مقام متعدد بار ویران اور آباد ہوا چنانچہ جس مقام پر یہ خانقاہ واقع ہے، وہاں زمین کی ۹ تہیں برآمد ہوئی ہیں، جو ایک دوسرے کے نیچے دبی ہوئی تھیں، ان میں سے ہر تہ پر پختہ فرش اور مسمار شدہ دیواروں کے نشانات پائے گئے ہیں،

قیاس ہے کہ خانقاہ کا زیریں حصہ جس کے حجرے مغرب، جنوب اور مشرق کی جانب دکھائی دیتے ہیں، راجا دیوپال کے عہد میں تعمیر ہوا تھا، خانقاہ میں راہبوں کے لئے حجرے ہیں جن کے سامنے ایک چوڑا برآمدہ ہے، اور اس کے آگے ایک کھلا ہوا مستطیل صحن ہے جس کے وسط میں مشرق کی طرف خانقاہ کا خاص معبد واقع ہے، متعدد حجروں کو کھودنے سے ایک قدیم تر خانقاہ کے آثار ملے ہیں، جو دیوپال کی تعمیر کردہ خانقاہ سے پانچ فٹ نیچے دبی ہوئی تھی، خانقاہ کے خاص معبد میں پہلے گوتم بدھ کا ایک عظیم الشان مجسمہ نصب تھا، جس کی ٹانگوں کے آثار اب تک موجود ہیں، مشرقی برآمدہ میں بھی چند ٹوٹے ہوئے سنگی مجسمے پائے گئے ہیں، جن میں سے ایک "تین دنیاؤں جنت، دوزخ اور زمین کے فاتح" ترلوکیا دونجے کا مجسمہ ہے، صحن کے وسط میں مستطیل شکل کا ایک ٹھوس اور بہت بلند چبوترہ ہے،

خانقاہ کے زیریں اور بالائی حصہ کے درمیان تقریباً چودہ فٹ کا فرق ہے، زیریں حصہ تک پہونچنے کے لئے چوڑی چوڑی سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں، اسی حصہ میں دو کمرے بھی ہیں، جن کی

چھتیں قبہ دار ہیں، مسلمانوں کی فتح سے قبل محرابی چھتوں کی یہ پہلی مثالیں ہیں، یہ نہیں معلوم ہو سکا، کہ یہ کمرے کس غرض سے تعمیر کئے گئے تھے، کیونکہ ان کے اندر کوئی چیز نہیں ملی، کمروں کے سامنے برآمدہ میں سنگ تراشی کے چند دلچسپ نمونے ملے ہیں، ان میں ایک سنگی لوح بھی ہے، جس پر گوتم بدھ کی زندگی کے آٹھ خاص واقعات درج ہیں، یعنی پیدائش، انوار وتجلیات کا ظاہر ہونا، آسمان تراپاسرمیا سے نزول کرنا، بندروں کا پیالۂ شہد پیش کرنا، پاگل ہاتھی نالاگیری کو رام کرنا، بنارس کے سبزہ زار غزالان میں پہلا خطبہ، معجزہ، سراوستی اور مہا پرنیردان،

خانقاہ نمبر۴ | بڑی خانقاہ کے نیچے مغرب جانب ایک دوسرا زینہ ہے، جو ایک قدیم تر خانقاہ کو جاتا ہے، اس عمارت کی ایک نمایاں شے وہ روشندان ہے، جس کا ایک حصہ ابتک باقی ہے، نالندہ کی کسی دوسری عمارت میں ایسا روشندان نہیں ملا ہے، اس خانقاہ کے شمالی نصف حصہ کے کھود دینے سے معلوم ہوا کہ اس کی سطح کے نیچے غالباً راجہ دیوپال کے عہد کی بنی ایک اور خانقاہ تھی، اس دوسری خانقاہ کے شمالی برآمدہ میں کمار گپت (۴۱۳ء تا ۴۵۵ء) کا ایک طلائی سکہ ملا ہے، جس پر ایک تیرانداز کی تصویر بنی ہوئی ہے، اور جو نالندہ کے قدیم ترین آثار میں سے ہے، اس خانقاہ کے جل کر برباد ہو جانے کا ثبوت اس کی جلی ہوئی چوکھٹوں اور اینٹوں سے ملتا ہے،

خانقاہ نمبر۵ | خانقاہ نمبر۴ کے ایک جنوبی مشرقی حجرہ سے ایک زینہ خانقاہ نمبر۵ کو اترتا ہے، جس کے حجروں کی صرف مشرقی قطار ابتک برآمد کی گئی ہے،

خانقاہ نمبر۶ | اس میں حجروں کی دو قطاریں ہیں، جو ایک دوسرے کے پیچھے واقع ہیں، اس خانقاہ میں پختہ اینٹوں کے دو صحن ہیں، ان میں سے ایک صحن اس قدیم تر خانقاہ کا ہے، جو پہلے تعمیر ہوئی تھی، اور جس کے مسمار ہو جانے کے بعد یہ دوسری خانقاہ بنائی گئی، بالائی صحن میں دو چولھے پائے گئے ہیں، جن پر راہب کھانا پکاتے تھے، اس خانقاہ کے صحن میں بھی دوسری خانقاہوں کی طرح ایک کنواں ہے،

خانقاہ نمبر۶ | یہ خانقاہ جس مقام پر واقع ہے، وہاں دو خانقاہیں اس سے قبل آباد تھیں جن کے کھنڈر اس خانقاہ کے نیچے کھودنے سے پائے گئے ہیں،

خانقاہ نمبر۸ | خانقاہ نمبر۷ کے شمال میں خانقاہ نمبر۸ واقع ہے، جس کی کھدائی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے،

سنگی مندر نمبر۲، | خانقاہ نمبر۸ کی پشت پر یعنی مشرق جانب ایک مسمار شدہ سنگی مندر ہے، جس کی دیواروں پر باہر کی جانب سنگ تراشی کے نہایت خوبصورت نمونے بنے ہوئے ہیں، ان میں مختلف اشخاص مثلاً شیوا اور پاروتی، کارتیکیا مع اپنے طاؤس کے اور گوتم بودھ کی جو قلم دوات لئے بیٹھا ہے، تصویریں بنی ہوئی ہیں، ان کے علاوہ مختلف مناظر کی تصویریں بھی ہیں،

مندر سے تقریباً سو گز کے فاصلہ پر شمال مغرب کی جانب ایک بہت بڑا اسٹوپا ہے، جو اسٹوپا کی قطار کے شمالی سرے پر او نانی دہراہر کے تودے کے نیچے دفن ہے، اس اسٹوپا کا صرف ایک حصہ ابھی کھود کر نکالا گیا ہے، تودے کی جڑ میں مشرق جانب گوتم بودھ کا ایک کھڑا ہوا مجسمہ ہے، اسی سے ملی ہوئی ایک چہار دیواری ہے جس کے اندر گوتم بدھ کا جو مقامی طور پر بنگ بھیرو کے لقب سے مشہور تھا ایک عظیم الشان مجسمہ ہے،

نالندہ کا آخر دور | نالندہ کی شہرت تمام قرون وسطیٰ میں دور دور پھیلی ہوئی تھی، مگدھ (موجودہ صوبہ بہار) کو جو شہرت بودھ مذہب کے مرکزی مقام کی حیثیت سے حاصل تھی، اس کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے، کہ چین کے شہنشاہ واتی یا یاوین نے ۵۳۹ء میں ایک وفد مگدھ کو اس غرض سے بھیجا کہ وہ اس مذہب کی کتابیں جمع کرکے کسی فاضل سے ان کا ترجمہ چینی زبان میں کرائے، مگدھ کے راجہ نے جو اس وقت غالباً جیوتیا گپت اول یا کمار گپت سوم تھا شہنشاہ کی خواہش کو بخوشی منظور کیا، اور فاضل پرمارتھا کو اس کام پر مقرر کیا، یہ وفد کئی سال تک ہندوستان میں قیام کرکے پرمارتھا کو لے کر چین کو واپس ہوا، پرمارتھا اپنے ساتھ اپنی مترجم کتابوں کا

ایک بڑا ذخیرہ لیتا گیا تھا، آٹھویں صدی کے بعد بھی جب مگدھ کا سیاسی انحطاط شروع ہوگیا تھا، اُنکی سابق شہرت بدستور قائم رہی، اور پالا خاندان کے فرماں روا اس کی سرپرستی کرتے رہے، تیرہویں صدی میں محمد بختیار خلجی کی فتح مگدھ کے بعد ان خانقاہوں میں درس وتدریس کا سلسلہ بند ہوگیا'

رصد خانہ کا نشان نہیں | گوری شنکر ہیرا چند اوجھا جی نے اوپر کے اقتباس میں یہاں کے رصد خانے کا ذکر کیا ہے، مگر اس درس گاہ و خانقاہ کے جو آثار اب تک نکلے ہیں، ان میں رصد خانہ کا کوئی نشان نہیں ہے، معلوم نہیں یہ کس سند سے انھوں نے لکھا ہے

بعض تعمیری خصوصیات | میں نے اور میرے رفقا رنے ان تمام مقامات کی سیر کی، اس وقت تک پہلو بہ پہلو گیارہ عمارتیں نکلی ہیں، جو تعمیر کے لحاظ سے ہوبہو ایک ہیں، عام طرز یہ ہے کہ بیچ میں وسیع صحن، صحن میں اینٹوں کا فرش، صحن کے بیچ میں ایک کنواں، صحن کے چاروں طرف اینٹ کے پایوں پر سائبان، سائبان کے پیچھے کہیں چھوٹے اور کہیں بڑے مسلسل کمرے، بڑے کمروں میں ادھر ادھر دیوار کے قریب دو لمبے چبوترے جو سونے کے کام میں آئیں، اور چھوٹے کمروں میں ایک چبوترہ، چبوتروں کے پاس دیوار میں ایک طاق، جس کے اندر چور الماری کی طرح، دیوار کے اندر ہی اندر لمبا جوف یا خول، ہمارے رہنما نے ہم کو بتایا کہ یہ طالب علموں کے رہنے کے کمرے ہیں، یہ چبوترہ ان کے سونے کے لئے، اور یہ طاق اور الماری کتابوں کے رکھنے کے لئے،

یہ تمام عمارتیں اینٹوں کی بنی ہوئی ہیں، یہ اینٹیں آج کل کی مروجہ اینٹوں سے لمبائی چوڑائی میں ڈیوڑھی، اور موٹائی میں آدھی ہیں، ان اینٹوں کے بیچ میں جو مسالہ لگایا گیا ہے، وہ اتنا کم ہے کہ معلوم بھی نہیں ہوتا، تاہم اتنا مضبوط ہے کہ ہزارہا سال کے بعد بھی اسی طرح موجود ہے، یہاں کی ایک عمارت کے ایک مقام میں دو ایسی چیزیں نظر آئیں جو اب تک ہندوستان کی قبل

انا اسلام عمارتوں میں کہیں اور مجھے نظر نہیں آئیں، ایک یہ کہ ایک چھوٹا سا کمرہ مخروطی شکل کی لداؤ چھت سے پاٹا ہوا جس کو ہم گنبد کا بہت ہی ادنی خاکہ کہہ سکتے ہیں، دوسری یہ کہ اس مختصر کمرہ میں اندر جانے کے دروازے کے اوپر لداؤ پاٹن جس کو ہم محراب کے تخیل کا سنگ بنیاد کہہ سکتے ہیں، یہ محراب ایک پوری اینٹ کو، دوسری پوری اینٹ سے دبا کر بنانے کے بجائے، اس طرح بنائی گئی ہے جس طرح مسلمانوں میں بغلی قبریں اینٹوں سے پاٹی جاتی ہیں، یعنی دروازے کے دونوں طرف ایک ایک اینٹ کی قطار رکھی، پھر اس پر دوسری قطار اس کو دباتے ہوئے ذرا آگے نکال کر رکھی، پھر اس پر تیسری، اس پر چوتھی، دروازہ کے دونوں پہلو دونوں طرف سے آہستہ آہستہ ملتے گئے، یہانتک کہ آخر جاکر ایک نقطہ پر مل گئے، اور گویا محراب کی شکل پیدا ہوگئی،

(معارف فروری ۱۹۳۵ء)

تاج محل اور لال قلعہ کے معمار

ہندوستان کے ارباب کمال میں خدا جانے کتنی ہستیاں ہیں جو گمنامی کے پردہ میں اس طرح چھپی ہیں کہ آج ہزار تلاش اور جستجو پر بھی اُن کا سُراغ نہیں لگتا، اس ملک میں تاریخ نویسی کا رواج بہت کم تھا، گو مسلمانوں کے آنے کے بعد تاریخ کی کچھ کچھ روشنی یہاں پھیلنے لگی، پھر بھی بادشاہوں کے ایوانِ تاریخ سے باہر بدستور اندھیرا چھایا رہا، شاعروں نے البتہ اپنے تذکروں کی محفل میں شمع جلائی، مگر اُس کی روشنی اتنی مدھم ہے، کہ خود اُن کی صورتیں بھی اس سے پہچان میں اچھی طرح نہیں آتیں، روحانی بزرگوں کے مزاروں پر بھی چراغ جلائے گئے ہیں، مگر اُن سے بھی تبرکات اور کرامات کے سوا کچھ اور نظر نہیں آتا، اگر ملا بدایونی، شاہ عبدالحق دہلوی، اور آزاد بلگرامی نہ ہوتے تو جو کچھ بھی معلوم ہے، وہ بھی ہم کو معلوم نہ ہو سکتا،

لاہور کے جس مہندس خاندان کا حال آج ہم کو سنانا ہے، افسوس ہے کہ تاریخوں میں نام کے سوا اس کے کسی رکن کا حال بھی مجھے معلوم نہیں ہوا، حالانکہ اُن کی بنائی ہوئی عمارتیں تاج آگرہ، لال قلعہ اور جامع مسجد دہلی ہمیشہ سے مشہور روزگار ہیں، مگر کتنے افسوس کی بات ہے کہ جن باکمالوں نے فن کی ندرت کا یہ کمال دکھایا ہے، کاغذ کے پرانے اوراق میں بھی ان کا نام و نشان نہیں ملتا،

شاہجہاں کی تاریخوں میں اُس کے سال ششم میں روضۂ تاج محل کے بننے کا پورا حال، ایک ایک چیز کی پیمایش کے ساتھ لکھا ہے، مگر جن نادرہ کار ہندسوں، نقاشوں، اور طراحوں نے اس کا خاکہ کھینچا، اور جن معماروں نے اس کو بنا کر تیار کیا، ان غریبوں کے نام تک بھی ان اوراق میں جگہ نہ پا سکے، اور آج کل کے محققین بڑی چھان بین کے بعد بھی اُن کا پتہ لگانے میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکے،

اس خاندان کے بعض ارکان کے نام مصنف کی حیثیت سے بعض کتب خانوں کی فہرستوں میں مذکور ہیں، مگر ان میں بھی نام کے سوا کچھ اور نہیں، اور نہ ان افراد کے باہمی تعلق کا ذکر ہے بلکہ اُن کی حیثیت بیگانہ افرادِ انسانی کی ہے،

دیوان مہندس کا نسخہ پورے دو برس ہوئے، کہ ایک کرم فرمانے بنگلور سے مجھکو اطلاع دی کہ اُن کے پاس مہندس نام ایک شاعر کا فارسی دیوان ہے، اور دریافت کیا کہ آپ اس شاعر سے واقف ہیں، میں نے لکھا کہ آپ وہ نسخہ مجھے بھیج دیں، تو میں اپنی رائے ظاہر کردوں، موصوف نے بڑی مہربانی فرما کر نسخۂ مذکور میرے پاس بھیج دیا، میں نے اس شخص کی تلاش میں اکثر تذکرے دیکھے[1] لیکن کہیں کچھ پتہ نہ چلا، مگر خوش قسمتی سے خود اس دیوان میں شاعر کی ایک مثنوی مل گئی، جس میں اُس نے اپنے خاندان کا مختصر حال خود لکھا ہے، اس کو پڑھ کر میری خوشی کی کوئی حد نہ رہی کہ یہ معماروں اور انجینیروں کی طرف سے پہلی آواز تھی جس میں تاج اور لال قلعہ کے بنانے کا دعویٰ کیا گیا تھا،

اس مثنوی سے نہ صرف شاعر کی، بلکہ شاعر کے باپ اور بھائیوں کے حالات بھی معلوم ہوئے، اور اس کے دوسرے قصائد اور اشعار سے یہ بھی قیاس میں آیا، کہ اس باکمال خاندان کی گمنامی کا سبب کیا ہو سکتا ہے،

---

[1] بعض تذکروں میں مہندس کے بیٹے ریاضی کے ضمن میں مہندس کا نام مذکور ہے،

شاعر کا نام لطف اللہ اور تخلص ہندس ہے، ہندس کے معنی علم ہندسہ جاننے والے یعنی انجینیر کے ہیں، اور اس کا یہ دیوان چند قصیدوں بعض مثنویوں اور بہت سی غزلوں پر مشتمل ہے، اور یہ سب فارسی میں ہیں،

دیوان کا کوئی دوسرا نسخہ مجھے نہیں ملا، زیر نظر نسخہ چھوٹی تقطیع کے ۲۰۹ صفحوں پر حاوی ہے، دیوان کے حصۂ غزل کے خاتمہ کی تاریخ اتمام "۲۷ شہر ذی الحجہ بوقت شب تحریر یافت" لکھا ہے، اور دیوان کے خاتمہ پر اس کتاب کی خریداری کی تاریخ لکھی ہے،

"بتاریخ بستم رمضان المبارک ۱۱۵۵ھ، دیوان ہندس خرید شد بسرکار نواب ابراہیم خان بہادر"

اور کتاب کے اندر بعض تاریخی قطعات ہیں جن میں سب سے آخری تاریخ ۱۱۰۶ھ کی ہے، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے، کہ اگر یہ "۲۷ شہر ذی الحجہ ۴۷ھ" ہو تو وہ یقیناً ۱۱۴۷ھ ہے، ورنہ میرا شبہہ اس بنا پر کہ یہاں صرف ۴۷ سنہ لکھا ہے، اور سیکڑہ نہیں لکھا ہے، یہ ہوتا ہے، کہ یہ سنہ ہجری نہیں، بلکہ سنہ جلوس ہے، اب ۱۱۰۶ھ کے بعد اور ۱۱۵۵ھ کے بیچ میں ایسا بادشاہ جس کو جلوس کا ۴۷ واں سال نصیب ہوا ہو، اورنگزیب عالمگیر کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا، ۴۷ سنہ جلوس عالمگیری ۱۱۱۵ھ کے مطابق ہے،

اس نسخہ کے صفحۂ اول پر عمدہ جلی نستعلیق سے "این کتاب سر(کار) نواب بہادر..... لکھا ہے، باقی حروف کٹ گئے ہیں، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس نسخہ کی تقطیع پہلے بڑی تھی، جلد بندی کے وقت کچھ حاشیہ کاٹ دیا گیا ہے، اس کے نیچے "این کتاب سرکار نواب ابراہیم خان بہادر ہزبر جنگ بکتاب خان (بکتاب خانہ) داخل شد" اس پر ایک مہر بھی تھی، جو کسی نے مٹا دی ہے،

شاعر کا نام لطف اللہ اور تخلص مہندس ہم سن چکے ، اور وہ اپنے باپ کا نام احمد معمار بتاتا ہے، معمار احمد کا پیشہ ہے، نام کا جزو نہیں، اُس کے ایک قطعہ میں اس کا شاہی لقب "نادر العصر" مذکور ہے، اس شاعر کی بعض اور تحریریں بھی ہم کو دستیاب ہوئی ہیں، جن میں وہ اپنے باپ کو لزوماً "استاد احمد لاہوری" لکھا کرتا ہے، اب ان ٹکڑوں کے جوڑنے سے احمد کا پورا نام اور لقب "نادر العصر استاد احمد لاہوری" ثابت ہوتا ہے،

نادر العصر استاد احمد لاہوری | اس نادر العصر کے حالات کا سُراغ تاریخ کی کتابوں میں نہیں ملتا، البتہ قلعۂ دہلی کی تعمیر کے سلسلہ میں مورخوں نے کہیں کہیں اس کا نام لیا ہے، محمد صالح کنبوہ نے عمل صالح میں جو شاہجہان کی معاصر تاریخ ہے، شاہجہان آباد کے عمارات و قلعہ کی تعمیر کے بیان میں اس کا نام ان لفظوں میں لیا ہے،

"از شب جمعہ بست و پنجم ذی حجہ مطابق نہم اردی بہشت سال دوازدہم از جلوس اقدس مطابق ایک ہزار و چہل و ہشت[۱] ہجری در زمان محمود و آوان مسعود استاد احمد و حامد[۲] سرآمد معماران نادرہ کار بسرکاری غیرت خان صوبہ دار آنجا بدصاحب اہتمام ایں کار، مطابق طرحے بدیع و نقشہ تازہ کہ بہیچ وجہ نظیر آن در شش جہت دنیا

---

[۱] اس مطبوعہ نسخہ میں جس کی تصحیح ناظم آثار قدیمہ سرکار نظام مولوی غلام یزدانی صاحب نے کی ہے، سہ لفظوں میں چہل و ہشت کے بجائے "ہشتاد و چہل" چھپ گیا ہے، جو قابل تصحیح ہے، [۲] اسی طرح یہ بھی تعجب انگیز ہے، کہ اس مطبوعہ نسخہ میں حامد کا نام حذف ہوگیا، متعدد قلمی نسخے دیکھے سب میں احمد کے ساتھ حامد کا نام بھی ہے، کتب خانہ حبیب گنج کے نسخہ ۲۱/۲۲ کی عبارت یہ ہے:

"موافق سنہ ۱۰۴۸ء در زمان محمود و آوان مسعود، استاد احمد و حامد سرآمد معماران نادر کار ..... مطابق طرحے تازہ و نقشہ بدیع" "ورق ۲۷"

بہ نظرِ نظارگیاں نیامدہ بود، ارنگ ریختہ" (جلد ۳ ص ۲۰۸ کلکتہ)

مدرسہ دیوبند کے کتب خانہ میں ایک قلمی کتاب تاریخ شاہجہاں کے نام سے ہے جس کا نمبر ۴۴۳ ہے، اس میں چند صفحے باب قلعۂ شاہجہان آباد کے عنوان سے شاہجہان آباد اور شالامار باغ کی تعمیر کے حالات میں ہیں، اس سلسلہ میں حسب ذیل عبارت ہے:-

"بحکم اشرف بعد از پنج ساعت از شب جمعہ بست وپنجم ذی الحجہ مطابق اردی بہشت سال دوازدہم از جلوس اقدس شاہجہانی موافق سنہ ہزار وچہل وہشت ہجری کہ مختار دانشوران انجم و افلاک بود، استاد احمد استاد حامد کہ معماران ماہر بودند، و در کار عمارت سرآمد بسرکاری غیرت خاں برادرزادہ عبد اللہ خاں فیروز جنگ کہ نظم صوبہ دہلی و اہتمام تاسیسِ عمارت مذکور باو مفوض شد، مطابق طرحے کہ در پیش گاہ خلافت مقرر گشتہ بود......"

شاہجہانی و عالمگیری عہد کے امرار کے خطوط کا ایک ناقص اور بے نام و نشان پرانا مجموعہ ہے[۵۵]، اس کے ایک خط میں نواب جعفر خاں کی سرائے باغ اور قلعہ حسن ابدال کی تعمیر کے متعلق کچھ لکھا گیا ہے، اس سلسلہ میں استاد احمد معمار کا ذکر ان لفظوں میں آیا ہے:-

"..........بدرگاہ سلاطین سجدہ گاہ معروض داشتہ حقیقت حسن سلوک کاروانی محمد مومن مذکور واستاد احمد معمار کہ در طراحی و وقوف کار عمارت و معاملہ شناسی استعداد تمام دوستی یکساں دارد"

عمدۃ الملک نواب جعفر خاں مختلف مناصب جلیلہ کے بعد ۱۹ سنہ جلوس شاہجہانی مطابق ۱۰۵۵ھ میں پنجاب کا صوبہ دار ۲۱ سنہ جلوس شاہجہانی مطابق ۱۰۵۷ھ میں شاہجہاں کا وزیر اور

۵۵ یہ مجموعہ مولوی عبد اللہ صاحب چغتائی (اسلامیہ کالج لاہور) کی ملک میں ہے،

۱۰۷۳ھ میں عالمگیر کا وزیر ہوا، اور ۱۰۸۱ھ میں وفات پائی، یہ خط غالباً پنجاب کی صوبیداری یا وزارت کے عہد میں اس کو لکھا گیا ہوگا، کیونکہ جیسا آگے معلوم ہوگا کہ اس کے دو ہی برس بعد ۱۰۵۹ھ میں احمد وفات پا چکا تھا،

سرسید مرحوم نے اپنی قابلِ قدر کتاب آثارالصنادید میں استاد احمد اور حامد کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے کہ "یہ اپنے فن میں بے نظیر" اور "ہندسہ و ہیئت میں ثانی اقلیدس اور رشکِ ارشمیدس تھے"،

بہرحال ان حوالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ استاد احمد عہد شاہجہانی میں "سرآمد معمارانِ نادرہ کار" تھا، اور اس کو عمارتوں کا نقشہ اور خاکہ بنانے اور تعمیرات کے دوسرے کاموں میں کمال دستگاہ حاصل تھی،

تاج محل کے حالات میں بعہد انگریزی آگرہ میں ایک فارسی رسالہ خدا جانے کس نے لکھا ہے، اس کے قلمی نسخے عموماً ملتے ہیں، اس میں حالات کے ساتھ ساتھ عمارات کی تصویریں بھی ہیں، شروع میں ممتاز محل کی وفات کی افسانہ نما کیفیت لکھی گئی ہے، اور پھر اس میں تاج محل کی تعمیر کا ایک ایک خرچ اور اس کے ایک ایک پتھر کی قیمت .... اور اس کے ایک ایک کاریگر کے نام مع تعین تنخواہ لکھے ہیں، جو زیادہ تر سنی سنائی حکایتوں، اور فرضی اعداد پر مشتمل معلوم ہوتا ہے، اس رسالہ میں کاریگروں میں سب سے پہلا نام "استاد عیسیٰ نادر العصر نقشہ نویس ساکن روم" لکھا ہے، اس کتاب کے مختلف نسخے دیکھے، اور سب میں ناموں کا کچھ نہ کچھ اختلاف پایا، اور سب سے عجیب بات یہ ہے کہ اس میں ہندو کاریگروں تک کو ساکن روم و بلخ و قندھار و سمرقند لکھا ہے، جامعہ علی گڈھ، حیدرآباد، بھوپال، ندوہ، اور دارالمصنفین کے کتب خانوں کے نسخوں میں اور ان کے علاوہ اور بھی اسکے جو نسخے نظر سے گذرے، ان میں بھی یہ شتر گربگی موجود ہے، "استاد نادر العصر" تک تو نام صحیح ہے، جو استاد احمد معمار کا شاہی لقب تھا، مگر اس میں "عیسیٰ نقشہ نویس ساکن روم" کا نام

اضافہ ہے، یا یہ کہ استاد نادر العصر اور عیسیٰ ساکن روم دو نام ہیں، جو ایک میں مل گئے ہیں، اس کتاب تاج میں امانت خاں شیرازی کے سوا جس کا ذکر تاریخوں اور تذکروں کے علاوہ خود تاج کے کتبوں میں ہے، جن کاریگروں کی فہرست دی گئی ہے، اور جو تنخواہیں لکھی گئی ہیں، وہ تمام تر محتاجِ ثبوت ہیں، لیکن تعجب ہے تاج کے مورخینِ حال نے ان کو بچون و چرا تسلیم کر لیا ہے، بہر حال تاج کے معماروں میں سے جو نام اب سب سے زیادہ اہم سند رکھتا ہے، وہ یہی نادر العصر استاد احمد ہے، جس کا نام اس مضمون میں سب سے پہلی دفعہ پیش کیا جا رہا ہے،

لطف اللہ کے بیان سے اس کے باپ احمد کے کچھ اور حالات بھی معلوم ہوتے ہیں، مثلاً یہ کہ احمد معمار آج کل کا کوئی اناڑی راج نہ تھا، بلکہ وہ باقاعدہ ہندسہ (انجینیرنگ) ہیئت اور ریاضیات کا بہت بڑا عالم تھا، یونانی ریاضیات فلکی کی سب سے اونچی کتاب مجسطی کا ماہر تھا، اور اقلیدس میں خواجہ نصیر طوسی کی مشہور کتاب تحریر اقلیدس کا عالم تھا، لطف اللہ ایک مثنوی میں اپنے خاندانی حالات کا ذکر ان لفظوں میں کرتا ہے،

شاہجہاں داورِ گیتی ستاں ۔ روشنیٔ دودۂ صاحبِ قراں
عرش بریں قبۂ خرگاہِ اوست ۔ رشکِ فلک سدۂ درگاہِ اوست
احمد معمار کہ در فنِ خویش ۔ صد قدم از اہلِ ہنر بود بیش
واقفِ تحریر و مقالاتِ آں ۔ آگہِ اشکال و حوالاتِ آں
حالِ کواکب شدہ معلوم او ۔ سرِ مجسطی شدہ مفہوم او
از طرفِ داورِ گردوں جناب ۔ نادرِ عصر آمدہ او را خطاب
بود معمارت گرآں بادشاہ ۔ داشت در آں حضرت فرخندہ راہ -

ان اشعار سے نادر العصر احمد معمار شاہجہانی کے فضل و کمال کا پورا اظہار ہوتا ہے، اور معلوم

ہوتا ہے کہ وہ شاہجہاں کا مشہور عمارت گر تھا اب اس کے بعد وہ اشعار آتے ہیں جن میں اس عظیم الشان حقیقت کا انکشاف ہے، جو اب تک مستور و مخفی تھی، یعنی یہ کہ یہی وہ ممتاز ہستی ہے، جس نے ممتاز محل کا روضہ اور دہلی کا لال قلعہ تعمیر کیا، کہتا ہے،

آگرہ چوں شد مضرب رایاتِ شاہ — بس کہ بر دبود عنایاتِ شاہ
کرد بحکم شہِ کشور کشا — روضۂ ممتاز محل را بنا
باز بحکم شہِ انجم سپاہ — شاہ جہاں داورِ گیتی پناہ
قلعۂ دہلی کہ ندارد نظیر — کرد بنا احمد روشن ضمیر

ان دو کے علاوہ عہدِ شاہجہانی کی دوسری عمارتیں بھی اس نے بنائی تھیں، چنانچہ کہتا ہے :-

ایں دو عمارت کہ بیان کردہ ام — در صفتش خامہ رواں کردہ ام
یک ہنر از گنج ہنرہاے اوست — یک گہر از کانِ گہرہاے اوست

اس کے بعد اس کی وفات کا ذکر کیا ہے،

چوں نبود عالمِ فانی مقر — کرد سوے عالمِ باقی سفر

اس مثنوی کے شروع میں شاہجہاں کا ذکر زمانہ موجودہ میں کیا گیا ہے،

عرش بریں قبۂ اخر گاہِ اوست — رشکِ فلک سدۂ درگاہِ اوست

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مثنوی شاہجہاں کی زندگی میں لکھی گئی ہے، اور اسی کے عہد میں تاج محل اور قلعۂ دہلی کی تعمیر کا یہ دعویٰ کیا گیا ہے، اس سے زیادہ ثبوت اور کیا درکار ہے،

استاد حامد | استاد احمد کے ساتھ اس کے بھائی استاد حامد کا نام بھی ذکر کے قابل ہے، یہ بھی معماری، ہندسہ، اور دیگر علوم ریاضی میں سر برآوردہ تھا، اور قلعہ کی تعمیر میں احمد کا شریک تھا،

سرسید مرحوم اپنی قابلِ قدر کتاب آثار الصنادید میں قلعۂ شاہجہانی کے بیان میں لکھتے ہیں کہ:

اچھی سے اچھی ساعت دیکھکر استاد حامد اور استاد احمد معماروں نے کہ اپنے فن میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے اور ہندسہ ہیئت میں ثانی اقلیدس اور رشکِ بزرمیدس تھے اس قلعہ کی بنیاد رکھی"۔ (طبع اول ص ۱۴۹)

طبع دوم میں یہی عبارت ان لفظوں میں ہے:

"استاد حامد اور استاد احمد جو اپنے فن میں یکتا تھے، اس قلعہ کو بنواتے تھے" (طبع دوم نامی پریس ص ۲۰)

دہلی کے بڑے بوڑھوں کی زبانی یہ روایت مجھ تک پہنچی ہو کہ جامع مسجد دہلی بھی اسی استاد حامد نے جس کا مشہور نام "استا حامد" ہے بنائی ہے اور اس کے بنانے میں اس کا دوسرا شریک "استا ہیرا" تھا۔

استاد حامد کا نام قلعۂ دہلی کے بعد جو ۱۰۵۸ھ میں بنا، مانڈو کے ایک سیاحتی کتبہ میں جس کی تاریخ ۱۰۶۰ھ ہے، جیسا کہ آگے آئے گا، لکھا ہوا ملتا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اس زمانہ تک زندہ تھا۔ دہلی کے ایک قدیم معزز خاندان کے ایک واقفکار (سید مرتضیٰ علی صاحب، ہیڈ کلرک دفتر کمانڈر انچیف دہلی) کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ یہ استاد حامد اور استاد احمد دونوں بھائی تھے، استاد حامد کے نام سے کوچۂ "اوستا حامد" دہلی میں اب تک دریبہ اور جامع مسجد کے درمیان موجود ہے، اور اُن کی اولاد دہلی میں سکونت پذیر ہے، اور "لاہوروالے" کہلاتے ہیں، آج کل وہ سادہ کاری کا کام کرتے ہیں، الغرض یہی وہ دو کاریگر ہیں جنھوں نے "قلعۂ معلّٰی" اس کے حیرت انگیز عمارات: دیوان عام و دیوان خاص، غسلخانہ اور دوسرے محلات شاہی بنائے، اس تعمیر میں ایک تیسرا نام احمد کے بیٹے لطف اللہ کا شامل ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔

استاد احمد کی تاریخ وفات: اس دیوان کے آخر میں استاد احمد معمار کی وفات کی دو تاریخیں بھی درج ہیں۔

(۱)

در زمانِ سعید شاہجہاں — شاہ عالم پناہ جم مقدار

نادر العصر رفت وگفت خرد — شد بفردوس احمد معمار

۵۹ وال کے بعد "استا حامد"

(۲)

آن نادرِ عصر زینتِ دہر ‏ ‏ ‏ ‏ چون رفت بسوے ملک سرمد
تاریخِ وفاتِ او خرد گفت ‏ ‏ ‏ ‏ محمود العاقبت شد احمد

ان دونوں قطعوں کے ہر چوتھے مصرع سے سنہ ۱۰۵۹ھ کے اعداد نکلتے ہیں، روضہ کی تعمیر سنہ ۱۰۵۰ھ میں یعنی احمد کی وفات سے نو برس پیشتر ختم ہو چکی تھی، اور دہلی کا قلعہ سنہ ۱۰۴۸ھ سے شروع ہو کر احمد کی وفات سے ایک سال پہلے سنہ ۱۰۵۸ھ میں تکمیل پایا تھا، ممکن ہے کہ استاد احمد روضہ کو ختم کر کے قلعہ کی تعمیر میں شامل ہوا ہو، یا روضہ کا اصلی تعمیری کام ختم کر کے شروع ہی سے قلعہ کی تعمیر میں مصروف ہوا ہو،

استاد احمد نے ان تعمیری یادگاروں کے علاوہ اپنی تین جسمانی یادگاریں بھی چھوڑیں، اور ان کو بھی تعمیر و ہندسہ و ریاضیات کی بہترین تعلیم دی، اور غالباً اُس کے پیش نظر یہ چیز تھی کہ ریاضیات کی اعلیٰ درجہ کی جو کتابیں اب تک صرف عربی زبان میں ہیں، اُن کو فارسی میں منتقل کیا جائے، تاکہ وہ علوم فارسی دانوں کی دسترس میں آسکیں، چنانچہ سنہ ۱۰۵۰ھ میں یعنی جس سال روضہ تمام ہوا ہے، اور قلعہ دہلی کی تعمیر جاری تھی، اُس نے اپنے منجھلے بیٹے لطف اللہ کو عبدالرحمٰن صوفی کی صور الکواکب کے ترجمہ کا حکم دیا،

احمد معمار کی تین اولادیں — لطف اللہ کی جس مثنوی کے کچھ ابتدائی اشعار اوپر نقل کئے گئے ہیں، اس میں احمد معمار کی وفات کے ذکر کے بعد اس کے ان تین باکمال فرزندوں کے نام لئے گئے ہیں،

بس سہ پسر ماند ز مرد سترگ ‏ ‏ ‏ ‏ زاں سہ عطاء اللہ رشیدی بزرگ

دیوان کے اس نسخہ میں رشیدی کی جگہ کاتب نے "رشد" لکھا ہے، مگر اُس کی تصنیفات میں اُس کے نام کے ساتھ "رشیدی" لکھا ملتا ہے، اور جیسا کہ ظاہر ہے کہ اسی لفظ کو اسی طرح پڑھنے

سے شعر صحیح ہو سکتا ہے، پھر عطاء اللہ کی تعریف میں کہتا ہے:-

نادرِ عصرِ خود و مشہورِ شہر — عالم و علامۂ و دانائے دہر
مرد ہنر پرور و استاد فن — فاضل و دانشور و حبر زمن
مخزنِ علم آمدہ تالیفِ او — گنج ہنر ہاست تصانیفِ او
نثر دی از آب روان پاک تر — نظم خوشش غیرتِ سلک گہر

اس آخری شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ عطاء اللہ شاعر بھی تھا، اور غالباً اس کے نام کے بعد رشیدی اس کا تخلص ہے، اس کے بعد شاعر یہ بیان کرتا ہے کہ اس نے تمام تر اپنے اسی بڑے بھائی سے تعلیم پائی ہے،

منکہ سخن پرور و دانش ورم — بندۂ آن حبر سخن پرورم
منکہ ربودم زجہاں گوئے علم — از چمنش یافتہ ام بوئے علم
منکہ شدم آگہ سر نہاں — از دم او یافتہ ام قوت جاں

اس کے بعد لطف اللہ اپنے کو احمد معمار کا منجھلا بیٹا بتاتا ہے اور اپنی تعریف آپ کرتا ہے،

ثانی آن بر سہ برادر منم — ہندسہ یک فن بود از صد فنم
گرچہ ہندس لقبم از شہ است — نام من دلشدہ لطف اللہ است

لطف اللہ اپنا نام اور ہندس شاہی خطاب بتاتا ہے، اور یہی اس کا تخلص بھی ہے، اس کے بعد اپنے سب سے چھوٹے بھائی نور اللہ کا نام لیتا ہے،

ثالث آن بر سہ بہادر بال — آمدہ نور اللہ صاحب کمال

پھر کہتا ہے کہ ہم تینوں بھائی معمار اور انجینیر ہیں،

ما ہمہ معمار و عمارت گریم — ما ہمہ استاد و سخن پروریم

اس کے بعد اپنے چھوٹے بھائی نوراللہ کی نظم ونثر کی تعریف کرتا ہے، اور تعمیری مہارات فن کی بنا پر معمار کا موروثی لقب اسی کے لئے مخصوص کرتا ہے،

یک بود قصر کلامش عجب — زان شدہ معمار مرادرا لقب
گرچہ کم است سالِ دی از سالِ من — بیش بود حالِ وی از حالِ من
نثرِ وے از نظم گہر بار تر — نظم ز نثر آمدہ ہموار تر
دیدہ ز نور سخنش پُر ضیا — طبع ز لطفِ سخنش پُر صفا
گنج ہنر آمدہ در مشتِ او — ہفت قلم راندہ سہ انگشتِ او
گرچہ منم بے سخن استادِ فن — آن یک و ایں یک بود استادِ من

اسی آخری شعر کا شاید یہ مطلب ہو کہ میں اپنے سب سے چھوٹے بھائی کا استاد ہوں، اور بڑا بھائی میرا استاد ہے، اس مثنوی کا خاتمہ اس شعر پر ہوتا ہے،

گرچہ مرا ہست مہندس لقب — ہندسہ زاں ہر سہ برادر طلب

اس سے ثابت ہوا کہ ہندسہ اور عمارت گری کے فن میں یہ تینوں بھائی مہارت رکھتے تھے،

الغرض احمد معمار کے ان تین باکمال بیٹوں کے نام بہ ترتیب یہ ہیں، :

۱۔ عطاء اللہ رشیدی نادر العصر

۲۔ لطف اللہ مہندس

۳۔ نوراللہ معمار

ابھی حال میں (جولائی ۱۹۳۵ء میں) لطف اللہ کی ایک اور تصنیف سحر حلال کا پتہ چلا، یہ مختصر رسالہ مدرسہ محمدی مدراس کے کتب خانہ میں ہے، جس کا نمبر ۲۶۸۲ ہے، اس کا

دوسرا نسخہ بمبئی یونیورسٹی کے کتب خانہ میں ہے،

اس رسالہ میں بھی لطف اللہ نے اپنے باپ اور اس کے تینوں بیٹوں کا حسب ذیل عبارت میں جو بصورتِ معمہ ہے تذکرہ کیا ہے:-

"احمد معمار والد مملوک داو ارسہ ولد دارد، اوّل عطا، اللہ سلمہ اللہ سالک مسالک علم..... عالم و عامل و علامۂ عصر..... رسالہا در علم اعداد مستور کردہ...... وولد دوم اوسط ہر سہ مملوک درگاہ کردگار واسم مملوک حامل دو کلمہ آمد کلمۂ دوم اللہ.... وکلمۂ اوّل لام وطا و معادل عدد عطا و ولد سوم در مسالک علم و عامل.......... واسم او ہم دو کلمہ دارد، کلمۂ دوم اللہ.................. وکلمۂ اوّل معادل مطادر......"

احمد معمار کے بڑے بیٹے کا نام عطا اللہ تو صاف ہے، منجھلے بیٹے کے جو مصنفِ کتاب ہے، نام کا دوسرا جزء اللہ اور پہلا جز لام اور طا، اور ایک ایسا حرف ہے جس کا عدد لفظ عطا کے برابر ہے یعنی ۸۰ جو حرف، ف کا عدد ہے، یہ سب مل کر "لطف اللہ" ہوتا ہے،

چھوٹے لڑکے کے نام کا بھی دوسرا جزء اللہ اور پہلا جز مطار کا مساوی العدد "ور" و "ہے" مطار کا عدد ۵۰ ہے، جو حرف ن کا معادل ہے، حرف ن کو واؤ اور ر سے ملانے سے پورا نام "نور اللہ" نکلتا ہے،

ان تینوں باکمالوں کے نام مختلف عمارتوں کے کتبوں کے گوشوں میں لکھے ہوئے ملتے ہیں لیکن اگر دیوان مہندس کا یہ نسخہ ہاتھ نہ آتا، تو اس خاندان کے ان مختلف افراد کے یہ باہمی تعلق کا واقعہ دنیا سے پوشیدہ رہتا،

نور اللہ معمار | یہ استاد احمد کا سب سے چھوٹا لڑکا اور لطف اللہ مہندس کا سب سے چھوٹا بھائی ہے اس کی

کی کوئی تصنیف اب تک نہیں ملی ہے، مگر ہندسؔ کے بیان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ بھی معماری کے فن میں امتیاز رکھتا تھا، کہتا ہے،

لیک بود قصرِ کلامش عجب　　　　زاں شدہ معمار مرادر لقب

سب بھائیوں میں سے معمار کا موروثی لقب اسی کو حاصل تھا، اس کے علاوہ وہ اپنے وقت کا بہت بڑا خطاط تھا، اسی لئے ہندسؔ نے اس کی نسبت کہا ہے،

گنج ہنر آمدہ در مشتِ او　　　　ہفت قلم راندہ سرِ انگشتِ او

یعنی وہ خط کے ساتوں قلموں میں ماہر تھا، ہندسؔ کے بیان کی شہادت آج بھی دنیا میں موجود ہے، دلی کی شاہجہانی جامع مسجد میں بیرونی محرابوں کے اوپر کی دیوار میں مسجد کے بنائے جانے کی جو تاریخ طویل فارسی نثر عبارت میں بخط نسخ تحریر ہے، وہ اسی باکمال کی انگلیوں کا معجزہ ہے، چنانچہ کتبہ کے آخر میں بسمت شمال ایک گوشہ میں کتبہ نور اللہ احمد لکھا ہوا ہے،

عطاء اللہ رشیدی　　عطاء اللہ رشیدی احمد معمار کا سب سے بڑا لڑکا، اور لطف اللہ ہندسؔ یعنی احمد کے منجھلے بیٹے کا استاد ہے، ہندسؔ کے اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ بہت سی کتابوں کا مصنف بھی تھا، کہتا ہے :-

مخزنِ علم آمدہ تالیفِ او　　　　گنج ہنر ہاست تصانیفِ او

سحر حلال میں بھی اس کے متعلق حسب ذیل الفاظ ہیں،

"سالک مسالک علم و عامل و علامہ عصر رسالہا در علم اعداد مسطور کردہ"

اس کی ان متعدد تصنیفات میں سے ہم کو تین کا علم ہے، اور یہ تینوں علم اعداد یعنی حساب ہی میں ہیں، ان میں سے ایک کا نام بیج گنت اور دوسرے کا نام خلاصۂ راز ہے بیج گنت سنسکرت کا لفظ " ویجا گنیتا" ہے، جس کے معنی علم جبر و مقابلہ کے ہیں، یہ سنسکرت میں

بھاسکر چاریا کی تصنیف ہے، عطاء اللہ نے فارسی میں اُس کا ترجمہ کیا، اُس کے نسخے برٹش میوزیم، میونک یونیورسٹی اور ندوۃ العلماء لکھنو کی لائبریریوں اور کتب خانۂ سعیدیہ حیدرآباد میں ہیں، اس میں مصنف اپنا نام عطاء اللہ رشیدی بن احمد نادر" بتاتا ہے، رسالہ کا آغاز اس شعر سے ہے،

اوّل زستائش الٰہی گویم   پس نعت رسول او کما ہی گویم

یہ شعر میرے خیال میں فیضی کے جواب میں ہے، فیضی نے سنسکرت کی حساب کی مشہور کتاب لیلاوتی کا جو ترجمہ اکبر کے زمانہ میں کیا ہے، اس کے آغاز میں یہ شعر لکھا ہے، جو سراسر خوشامد ہے،

اوّل زثنائے بادشاہی گویم   وانگہ زستایشِ الٰہی گویم

رشیدی گویا اس کے جواب میں کہتا ہے،

اوّل زستایشِ الٰہی گویم   پس نعتِ رسول او کما ہی گویم

ندوۃ العلماء لکھنو اور کتب خانۂ سعیدیہ حیدرآباد کے نسخے میری نظر سے گذرے ہیں، دیباچہ میں ہے،

"اما بعد! می گوید بندۂ محتاج بخدا وند قادر عطاء اللہ رشیدی ابن احمد نادر کہ بتوفیق الٰہی در سنہ اربع واربعین والف ہجری (۱۰۴۴ھ) مطابق ہشتم سال جلوس حضرت صاحبقرانی بر اورنگ سلطنت وجہانبانی کتاب جبر و مقابلہ بہندی موسوم بہ بیج گنت تصنیف بھاسکر اچارج صاحب لیلاوتی را کہ در علم حساب کتابی است بحقائق رائقہ و مفاتح است بدقائق فائقہ و محتویست بر فوائد بلند و مطالب ارجمند کہ در لیلاوتی مذکور نیست، و در ہیچ نسخہ فارسی و عربی مسطور نہ از زبان ہندی بفارسی آوردم و دیباچۂ کتاب را بکتابۂ دعائے دولت حضرت خاقانی، وارث ملک سلیمانی

مرتقی مدارجِ عز و جلال .... ابوالمظفر شہاب الدین محمد صاحب قرانی ثانی شاہجہان

نامی بادشاہ غازی ...."

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب جو لیلاوتی کے مصنف بھاسکراچاریہ کی دوسری کتاب کا ترجمہ ہے، شاہجہان کے آٹھویں سال جلوس ۱۰۴۴ھ میں مکمل ہوئی ہے اسعیدیہ کا نسخہ محمد شاہ کے زمانہ میں ۱۱۴۵ھ میں منقول ہوا ہے، ندوہ کے نسخہ کا نمبر کتب خانہ میں نمبر ۶۵ ریاضی ہے، برٹش میوزیم اور میونک یونیورسٹی کی لائبریریوں کی فہرستوں میں اس نسخہ کا مختصر حال درج ہے کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن میں بدر الحساب کے نام سے بیج گنت کا ایک اور ترجمہ موجود ہے، جو ۱۰۷۵ھ میں برہان پور میں کیا گیا ہے،

عطاء اللہ رشیدی کی دوسری کتاب خلاصۂ راز کا نسخہ برٹش میوزیم کے کتب خانہ میں ہے اس میں اس نے اپنا نام یہ لکھا ہے "عطاء اللہ بن استاد احمد معمار" اس کا آغاز اس شعر سے ہے،

حمد بے حد بفرد لم یزلی ... شکر بے حد بواحد ازلی

رسالہ کا موضوع حساب، مساحت اور جبر و مقابلہ ہے، زبان فارسی نثر ہے اور رسالہ کی تقسیم دس بابوں پر ہے، رسالہ کے دیباچہ میں شاہجہان بادشاہ اور شاہزادہ داراشکوہ کی ستائش ہے، اور رسالہ شاہزادہ کے نام سے معنون ہے، داراشکوہ ۱۰۶۹ھ میں قتل ہوا ہے، اس سے سمجھنا چاہئے کہ یہ رسالہ اس سے پہلے تالیف پاچکا تھا،

اس کی تیسری کتاب خزینۃ الاعداد ہے، جو علم حساب، الجبرا، اور عملی اقلیدس میں ہے، مقدمہ میں اس نے بیان کیا ہے کہ اس نے یہ کتاب مبتدیوں اور سرکاری مالی دفتروں کے ملازموں، تاجروں، اور مذہبی عالموں کے لئے لکھی ہے، اس رسالہ کا آغاز ان لفظوں سے ہوا ہے،

"الحمد للہ الذی جعل الشمس ضیاءً والقمر نوراً قدر منازل ......"

مؤلف ایں رسالہ و مترجم ایں مقالہ المفتقر الی رحمۃ اللہ الفقیر الحقیر عطاء اللہ"

رسالہ میں ایک مقدمہ، دو مفتاح، دس باب، ایک کشکول، اور ایک خاتمہ ہے، کتاب کا نام (خزینہ) تاریخی ہے، جس سے ۱۰۶۷ھ نکلتا ہے، جیسا کہ اس شعر سے معلوم ہوتا ہے،

زتاریخ اتمامش آگہ شوی | چوں نام دے آری تواند حساب

یہ نادر نسخہ بمبئی یونیورسٹی کے کتب خانہ میں ہے جس کا نمبر ۱۰۰ ہے[1]،

عطار اللہ رشیدی جیسا کہ اس کے بھائی لطف اللہ نے اپنی مثنوی میں لکھا ہے، شاعر بھی تھا، اور رشیدی تخلص کرتا تھا، مگر اس کا کوئی شعر ہم تک نہیں پہنچا ہے، بجز اس کے کہ لطف اللہ کے ہاتھ کی ایک کتاب صورصوفی کا جو اصل نسخہ مسلم یونیورسٹی لائبریری میں ہے، اُس کے آخر میں ایک صفحہ پر عطار اللہ کے قلم کی ایک مشق ہے، جس میں آفتاب اور سہا کے تناسب سے کچھ فقرے لکھے ہیں، اور آخر میں یہ شعر درج ہے،

عطار اللہ کہ گر نامش نبی ہیچ | زغیرت ہیچ افتد در خم و پیچ

عطار اللہ کے یہ تو علمی کارنامے ہیں، لیکن اس کا ایک عملی کارنامہ بھی دنیا میں موجود ہے، اور وہ شہنشاہ عالمگیر اورنگ زیب کی محبوب بیوی ملکہ رابعہ دورانی کا مقبرہ ہے، جو اورنگ آباد دکن میں واقع ہے، یہ مقبرہ تمامتر روضۂ تاج محل کی نقل ہے، خیال ہوتا ہے کہ چونکہ اس کے باپ احمد معمار نے تاج کا روضہ بنایا تھا، اس لئے قرین قیاس سمجھا گیا کہ اس کا خلف الرشید اس نقش اول کا

---

[1] فہرست کتب عربی و فارسی و اردو کتب خانہ جامعہ بمبئی مرتبہ شیخ عبدالقادر، فاضل مرتب نے عطار اللہ ابن احمد کو اس رسالہ کا مصنف ظاہر کرنے کے باوجود اس کا سال تصنیف "خزینۃ الاعداد" کے دونوں جزوں کے اعداد کو گن کر ۱۱۰۱ھ ظاہر کیا ہے، جو ظاہر ہے کہ صحیح نہیں، کیونکہ یہ تاریخ مصنف کی زندگی کے بہت بعد ہے، لیکن اگر نام کے دونوں جزوں کے اعداد لئے جائیں، اور ۱۱۰۱ھ صحیح ہو تو پھر یہ کسی دوسرے عطار اللہ کا رسالہ سمجھا جائے گا،

بہترین نقش ثانی تیار کرسکتا ہے، مگر ظاہر ہے کہ آگرہ میں جو سامان تعمیر شاہجہاں کے عہد میں مہیا ہو سکتا تھا، وہ اورنگ آباد دکن میں عالمگیر کے عہد میں میسّر نہیں آسکتا تھا، پتھر اور اینٹ کے فرق کے علاوہ جو نزاکت، لطافت اور تناسب روضہ کی خصوصیات ہیں، اُن کی نقل اُتاری نہ جا سکی۔

رابعہ دورانی کے مقبرہ کے صدر دروازہ پر پیتل کا پتھر چڑھا ہوا ہے، اس پر ایک طرف یہ عبارت لکھی ہے:۔

"این روضہ منورہ در معماری عطاء اللہ بعمل ہیبت رائے طیار شدہ ۱۰۶۱ھ"

لطف اللہ مہندس | احمد معمار کے دوسرے بیٹے لطف اللہ مہندس کی اس وقت متعدد یادگاریں دنیا میں باقی ہیں، اور کہنا چاہیے کہ یہی وہ سپوت ہے، جس کے ذریعہ اس کے باپ کا نام دنیا کو معلوم ہو سکا، سندیلوی نے اپنے تذکرہ مخزن الغرائب میں جو ۱۲۱۸ھ کی تصنیف ہے، مہندس کے بیٹے امام الدین ریاضی کے تحت میں مہندس کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے،

"مولوی لطف اللہ مہندس بودہ است ایشاں ہم بگفتن اشعار میل تمام داشتند و مہندس تخلص می کردند و در علم ریاضی مثل این ہر دو پدر و پسر در بلاد ہند نبودند"

(نسخہ قلمی دار المصنفین ۱۵۴)

اور سفینۂ خوشگو میں ہے:۔

"خلف ملا لطف اللہ مہندس تخلص لاہوریست کہ قلعۂ ارک دار الخلافہ شاہجہان آباد بتجویز و صواب دید او بنا یافتہ"

یہی فقرہ حسین قلی خاں کے نشتر عشق میں ہے، اس کی سات تصنیفات کے نام ہم کو معلوم ہو سکے ہیں، جن کے نسخے اس وقت ہندوستان اور یورپ کے کتب خانوں میں موجود ہیں، لیکن ان تصانیف کے علاوہ اس کی عجیب و غریب یادگار اس کا ایک آہنی کتبہ ہے، جو سلاطین مالوہ کے

پایہ تخت مانڈو میں وہاں کے مشہور بادشاہ ہوشنگ غوری (۸۰۸ھ تا ۸۳۸ھ) کے مقبرہ کے دروازے کے داہنے ہاتھ پر لگا ہوا ہے، ۹ انچ لمبا اور ۴½ انچ چوڑا کتبہ ہے، جس میں بخط خفی حسب ذیل عبارت چار سطروں میں منقوش ہے،

۱۔ بتاریخ نہم ربیع الثانی سنہ ہزار و ہفتاد ہجری

۲۔ فقیر حقیر لطف اللہ مہندس ابن استاد احمد معمار شاہجہانی،

۳۔ و خواجہ جادورائے، و استاد شیورام رائے و استاد احمد،

۴۔ بجہت زیارت آمدہ بود،

اثریات ہند کے ماہر جناب ظفر حسن صاحب بی اے، (محکمۂ آثار قدیمۂ ہند) نے مانڈو کے کتبات پر انگریزی میں جو مقالہ لکھا ہے اس میں یہ کتبہ سترہویں پلیٹ پر چھاپ دیا ہے، اور وہ اس وقت میرے سامنے ہے،

غالباً ان معمار سیاحوں کے لئے اس کتبہ کے یہاں لگانے کا محرک یہ امر ہوا ہے کہ یہاں اکبر بادشاہ نے اپنے سفر و گذر کی تاریخیں ثبت کرائی ہیں، انہی کو دیکھ کر ان معماروں نے بھی اپنا یادگاری کتبہ لگا دیا ہے،

اس کتبہ سے متعدد باتوں پر روشنی پڑتی ہے،

۱۔ اس عہد کے استادانِ تعمیر دوسری عمارتوں کو بھی فن کی حیثیت سے دیکھنے کے لئے جایا کرتے تھے،

۲۔ ہندو مسلمان باکمالوں میں فن کی یکجہتی کا رشتہ خاصہ مستحکم اور مضبوط تھا،

۳۔ ہندو شاہی معماروں کے ناموں کے ساتھ خواجہ اور استاد کا ہونا کیا عام تھا، خواجہ جادورائے اور استاد شیورام کبھی کیسی عزت کے الفاظ تھے،

۴۔ لطف اللہ مہندس گو شاعر و مصنف تھا، تاہم اس میں اس کے موروثی فن تعمیر کا ذوق اتنا تھا کہ وہ دوسرے معماروں کے ساتھ کسی عمارت کے دیکھنے کے لئے سفر کی زحمت گوارا کر سکتا تھا،

لطف اللہ کی جن سات کتابوں کے نام ہم کو ملے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ صور صوفی

۲۔ رسالہ خواص اعداد

۳۔ شرح خلاصۃ الحساب

۴۔ منتخب الحساب

۵۔ تذکرۂ آسمان سخن

۶۔ دیوان مہندس،

۷۔ سحر حلال،

پہلی کتاب ہیئت میں اور بعد کے تین رسالے علم حساب میں ہیں، اور دوسری کو چھوڑ کر کہ وہ عربی میں ہے، بقیہ چھ کی زبان فارسی ہے جن میں سے تین اوّل الذکر اور آخری نثر میں ہیں اور چوتھی اور پانچویں دو کتابیں نظم میں، اب ذیل میں ہم ہر ایک تصنیف پر مختصر تبصرہ کرتے ہیں،۔

۱۔ صور صوفی مشہور مسلمان ہیئت داں عبد الرحمٰن الصوفی المتوفی ۳۷۶ھ نے ستاروں کے اشکال و صور پر جو بلند پایہ تصنیف صور الکواکب کے نام سے لکھی تھی، لطف اللہ نے ۱۰۸۵ھ میں اپنے باپ احمد معمار کے حکم سے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا، اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس کی عمر کا پہلا کام ہے کیونکہ کا دیباچہ کسی بادشاہ کے نام کے بجائے خود اس کے باپ کے نام نامی سے مزین ہے، اور اس میں یہ نوجوان مصنف یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کی محنت کا بہترین صلہ یہ ہے کہ اس کا باپ اس کے اس کام کو دیکھ کر خوش ہوا، اس کتاب کا اصل مسودہ جو خود لطف اللہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے مسلم یونیورسٹی

لائبریری نمبر ۱۳ فارسی علوم) میں موجود ہے، دیباچہ کی عبارت یہ ہے:۔

" رخشندہ ترین کواکبے کہ از مشرق طبع بفلک ظہور آمد حمد مبدعے وشکر مخترعے .....

اما بعد ۔ چنیں گوید محتاج الی اللہ الغافر لطف اللہ بن احمد المہندس المعمار مد اللہ ظلہ علی رؤس الاولاد بحرمۃ النبی وآلہ الامجاد کہ چوں اشارۂ آنحضرت بسوے ایں فقیر حقیر شد کہ کتاب عمدۃ الاسلام قدوۃ الامام مولانا عبدالرحمٰن بن صوفی افاض اللہ علیہ شآبیب الغفران واسکنہ فرادیس الجنان کہ در معرفت نجوم ثابتہ کتابیست متعدد رسالۂ ایست کافیہ بجہت عموم فائدۂ کلام وسہولت فہم مرام، بعبارت فارسی سادہ ترجمہ کردہ آید تا بر ترغیب خاطر فارسی خوانان حقیقت طلب باعث تر شود کمر اطاعت بر میان جان بستہ دست بانوشتن نگارین کرد، امید کہ بایں ہجیۂ مرضیہ من در عقبی ماجور، وترجمہ من در دنیا مقبول باشد وطالبان ایں فن ازیں ترجمہ مستفید شوند، چنانچہ از اصل ایں دگر خطاے باشد، اصلاح فرمایند، الحمد للہ والمنۃ کہ در فرصتے اندک ہمگی بوجہ احسن و شایستہ میسر شد و سنہ یکہزار و پنجاہ ہجری اتمام پذیرفت، امید از احسن وشایستہ تر دقتے کہ از نظر مبارک والد بزرگوار من بگذرد بعین عنایت وچشم کرمت نگاہ کنند و قبول فرمایند"

خاتمہ کی عبارت :۔

"...... ہزار در ہزار حمد ایزد دانا درکہ ترجمۂ کتاب صور صوفی حسب الحکم قبلۂ صورت و معنی کعبۂ ظاہر و باطن، خداوند حقیقت و مجاز ابو یمم السمی باحمد المخاطب بنادر العصر سلمہ اللہ تعالیٰ من طلبات الزمان و آفات الدہر بآخر رسید واتمام پذیرفت"

بقلم شکستہ رقم لطف اللہ کہ مؤلف ایں رسالہ و مترجم ایں مقالہ است کتاب باتمام رسید الحمد للہ علیٰ نعمائہ والصلوٰۃ علیٰ انبیائہ لاسیما علیٰ محمد و آلہ واصحابہ اجمعین، واغفرلی و

و والدی بحرمتہم یا ارحم الراحمین"

کتاب کے آخری صفحہ پر آفتاب اور سہا کی مناسبت سے کچھ فقرے مشق کئے گئے ہیں، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خاندانی یادگار کے طور پر اس گھر کے ارکان نے محفوظ رکھا تھا، یہ مشق میرے خیال میں اُس کے بھائی عطاء اللہ کے قلم سے ہے: کہ آخر میں ایک شعر میں جو اوپر عطاء اللہ کے حال میں نقل کیا جا چکا ہے، اس کا نام لکھا ہے،

۲- رسالہ خواص اعداد، یہ فارسی میں علم حساب پر سات صفحوں کا رسالہ ہے، اور چار مقالوں پر منقسم ہے، اس میں اعداد کے خواص اور قیمتوں پر بحث کی گئی ہے، اس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم کے کتب خانہ میں ایک مجموعہ کے اندر ہے، جس میں دو رسالے لطف اللہ کے ہیں، اور تیسرا عطاء اللہ کی وہی خلاصۂ راز ہے، جس کا ذکر اوپر آچکا (نمبر ۲۔۱۹۲۲) اس کا آغاز یہ ہے :

الحمد للہ..... می گوید فقیر لطف اللہ متخلص بہ مہندس"

اس کا دوسرا نسخہ کتب خانہ سعیدیہ حیدرآباد دکن میں نظر سے گذرا ہے، نسخہ جدید الخط ہے، ۱۲۷۷ھ میں نقل ہوا ہے، آغاز یہ ہے :

" الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ علی رسولہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین،

اما بعد! می گوید فقیر لطف اللہ متخلص بہ مہندس ابن استاد احمد لاہوری کہ ایں رسالہ

ایست مختصر در علم ارسماطیقی (ارثماطیقی) یعنی خواص اعداد، بدان اسعدک اللہ

فی الدارین،

اس رسالہ کا کوئی خاص نام نہیں معلوم ہوتا، کتب خانہ سعیدیہ میں اس کا نام رسالہ ارسماطیقی مندرج ہے، اور اسی نام سے یہ رسالہ خاندان دیوان مدراس کے کتب خانہ میں بخط مولوی محمد غوث شرف الملک موجود ہے،

۳۔ شرح خلاصۃ الحساب، علم حساب میں بہاء الدین محمد بن حسین آملی المتوفی سنہ ۱۰۳۰ھ کی مشہور عربی تصنیف خلاصۃ الحساب کی ممزوج شرح ہے، اس کی شرحیں متعدد علماء نے لکھی ہیں، جن میں خود اس کے معاصر عصمۃ اللہ سہارنپوری کی عربی شرح جو سنہ ۱۰۰۸ھ میں لکھی گئی ہے، بہت مفصل ہے، اور چھپ بھی چکی ہے، اور جس کا نام انوار خلاصۃ الحساب ہے، دوسری یہ لطف اللہ مہندس کی ہے، اس کا ایک نسخہ انڈیا آفس کے کتب خانہ میں ہے، (نمبر ۱۰۶، مخطوطات عربی) اس میں مصنف کا نام لطف اللہ المتخلص بالمہندس بن الاستاذ احمد المعمار لکھا ہے، اور اس کا آغاز ان لفظوں سے ہے، الحمد للہ الواحد الفرد الصمد، یہ نسخہ ایک خاص حیثیت سے ممتاز ہے، جس کا ذکر آگے آئے گا، اس کتاب کا دوسرا نسخہ ہندوستان میں رام پور کے کتب خانہ میں ہے (نمبر ۴۵ ریاضی) اس نسخہ کے صفحات کی تعداد ایک سو بیس[۱۲] ہے،

۴۔ منتخب:۔ یہ بہاء الدین آملی کی مذکورۂ بالا تصنیف خلاصۃ الحساب کا فارسی ترجمہ اور خلاصہ ہے، انگلستان اور ہندوستان میں اس کے متعدد نسخے ہیں، دو نسخے انڈیا آفس کے کتب خانہ میں ہیں، تیسرا برٹش میوزیم لائبریری میں، چوتھا کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن میں[۱]، پانچواں مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں، چھٹا جامعہ ملیہ دہلی میں اور ساتواں کتب خانہ دیوان مدراس میں بخط سید محمد قاسم مکتوبہ سنہ ۱۲۱۸ھ ہے، اس رسالہ کا منتخب نام تاریخی ہے، اس سے سنہ ۱۰۹۲ھ کی تاریخ نکلتی ہے، مقدمہ میں لکھا ہے کہ یہ کتاب خاندانِ وزارت کے رکنِ رکین میر محمد سعید بن میر محمد یحییٰ کی فرمایش سے لکھی گئی ہے،

اس کا آغاز اور دیباچہ حسب ذیل ہے،

---

[۱] برٹش میوزیم کے نسخہ کا نمبر ۱۶۷۴۴ اور انڈیا آفس کے نسخہ کا نمبر ۲۲۵۳ اور ۲۲۵۴ اور آصفیہ باب ریاضیات فارسی کا نمبر ۱۱۱ ہے،

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ محمد و آلہ و اصحابہ اجمعین،

اما بعد! می گوید فقیر لطف اللہ مہندس بن استاد احمد معمار لاہوری غفر اللہ لہ ولوالدیہ واحسن الیہما والیہ کہ کتاب حساب را کہ تصنیف است از محقق و تحریر مدقق شیخ بہا محمد بن حسین عاملی (آملی) رحمۃ اللہ علیہ مشتمل بر قواعد شریفہ و فوائد لطیفہ باشارات خلاصۂ دودمان سیادت، منتخب خاندان وزارت میر محمد سعید بن میر محمد یحییٰ ادام اللہ اقبالہ و ضاعف اجلالہ ترجمہ کردم کہ چوں آن نسخہ خلاصہ نام داشت، ایں نسخہ را منتخب نہادم،...... تاریخ تالیف ایں رسالہ است و این رسالہ بنا بر ترتیب کتاب مرتب است بر مقدمہ و ابواب"

آخر میں ایک حسابی مسئلہ کا حل نظم میں ہے، جس کا خاتمہ ان دو شعروں پر ہے:-

منکہ ہستم فقیر لطف اللہ   بمہندس شہیر در افواہ
خاکپائے ہنر دران کبار   پور استاد احمد معمار

انڈیا آفس لائبریری کا نسخہ نمبری نمبر ۲۲۵۴/۵ ، ۳ شعبان ۱۱۴۵ھ کا لکھا ہوا ہے، اور حیدر آبادی نسخہ کی تاریخ ۱۲۴۳ھ ہے، اور کتب خانہ میں اس کا نمبر ۲۱۱ ریاضیات فارسی ہے۔ مسلم یونیورسٹی کا نسخہ سبحان اللہ خاں لائبریری میں ہے، اس کا نمبر ۵۱۱/۳ ہے، اور وہاں اس کا ترجمۂ خلاصۃ الحساب ہے، اور کتابت کا سال ۱۰۳۹ھ ہے، جامعہ ملیہ کے نسخہ کا نمبر ۹، سلسلۂ مخطوطات ہے، اور تاریخ سے خالی ہے،

۵- آسمانِ سخن:- دولت شاہ سمرقندی کا فارسی شعراء کا تذکرہ جو ۸۹۲ھ میں تالیف پایا ہے، باایں ہمہ اغلاط دلچسپ ضرور ہے، اور اسی لئے اہلِ سخن کی محفلوں میں اس کا تذکرہ رہا کیا ہے، یہ کتاب فارسی نثر میں ہے، اور سات طبقوں پر منقسم ہے، اکبر کے زمانہ میں فائضی کربانی

نام ایک شاعر نے اس کو نظم کر ڈالا اور سات طبقوں کے بجائے اس کو دس طبقوں میں مکمل کیا،
لطف اللہ مہندس نے فانیٔ کے نسخہ میں دو اور طبقوں کا اضافہ کرکے اس کو ۱۲ طبقوں میں
پورا کر دیا، اور بارہ برجوں کی مناسبت سے اس کا نام "آسمان سخن" رکھا،

یہ تمام واقعات لطف اللہ مہندس نے کتاب کے دیباچہ میں ذکر کئے ہیں، اس کا نسخہ
شاہ اودھ کے کتب خانہ میں تھا، ڈاکٹر اسپرنگر نے اس کتب خانہ کی فہرست میں ص ۱۶ پر اس
کتاب کا ذکر کیا ہے، اب کسی اور کتب خانہ میں اس کا نشان نہیں ملتا، معلوم نہیں گردش چرخ
نے اس آسمانِ سخن کو کس خاک میں ملا دیا، لطف اللہ مہندس کے اس اضافہ میں کل ۲۵۰ بیتیں تھیں
ایک ایک بیت میں ایک ایک شاعر کا بیان تھا، اس کا پہلا شعر یہ تھا،

نخست شکر خدائے کہ آسمانِ سخن ‏ ‏ ‏ بیا فرید محیط نہ آسمانِ کہن

فہرست مذکور میں ڈاکٹر اسپرنگر نے اس کے بارہویں طبقہ کے ۱۳ شعر نقل کئے ہیں، ان
شعروں میں شاہجہانی شعرا کے نام نظم کئے گئے ہیں، اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ لطف اللہ نے
دورِ اکبری کے بعد جو دو طبقے بڑھائے تھے، ان میں سے پہلے میں جہانگیری عہد کا اور دوسرے
میں شاہجہاں کے زمانہ کے سخنوروں کے نام ہوں گے، وہ ۱۳ شعر یہ ہیں،

وحید دہر امانی ابن مہابت خاں ‏ ‏ ‏ دلے بجان زمان است شہرۂ دوراں
دگر یگانہ ظفر خاں تخلص احسن ‏ ‏ ‏ ربودہ گوئے سخن از سخنوراں در فن
دگر وحید زمن آشنا عنایت خاں ‏ ‏ ‏ بود بحرِ سخن آشنا عنایت خاں
دگر وحیدِ زمن شادمانِ غم پرور ‏ ‏ ‏ بیان شادی و غم در کلام او مضمر
دگر سخنور کشمیر محسن فانی است ‏ ‏ ‏ بقائے نام وے از دولتِ سخندانی
مہ سپہر سیادت یگانہ میر عماد ‏ ‏ ‏ کہ بود در غزل و مدح و مثنوی استاد

لبیب عصر محمد حسین آشوب است | سخنورے کہ سخنہائش جملہ مرغوب آست
دگر وحید زمان است طالبائے کلیم | کہ شعر او ید بیضا است نزد طبع سلیم
دگر فرید جہاں قدسی محمد خان | بعہد شاہ جہاں گور بودہ از اقران
الٰہی ہمدانی است در سخن استاد | سخنورے است کہ داد سخنوری می داد
لبیب از منہ ٔ اُمّی نخواندہ ہیچ کتاب | ز فیض حق شدہ مفتوح بر رخش صد باب
دگر وحید زمن باقیا ترانۂ او | خوش است ہمچو غزلہائے عاشقانۂ او
فصیح ازمنہ فنا کہ چوں غزل می گفت | چو عندلیب غزل خواں در و گہر می سفت

نویں شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ لطف اللہ نے یہ دادِ سخن عہدِ شاہجہانی (۱۰۶۸ھ) کے بعد دی ہے،

۲- دیوانِ مہندس یہ پورا دیوان چھوٹی تقطیع کے چھیانوے (۹۶) صفحوں میں ہے، سب سے پہلے دیوان کے شروع میں دس صفحوں میں چار قصیدے ہیں، پہلا نعت میں ہے، دوسرا داراشکوہ کی مدح میں، اور تیسرا شاید داراشکوہ کے بیٹے سلیمان کی مدح میں ہے، اور چوتھا کسی معشوق کا سراپا ہے، اس کے بعد نئی بسم اللہ سے غزلیں شروع ہوتی ہیں، جو حروف تہجی پر مرتب ہیں، یہ گیارہویں صفحہ سے شروع ہو کر ص ۸۷ پر تمام ہوتی ہیں پھر نئی بسم اللہ کے بعد سے مثنوی شروع ہوتی ہے جس میں اس نے اپنے خاندان کا احوال لکھا ہے پھر ایک دو مختصر مثنویاں اور چند قطعے ہیں، جن میں سے دو چار قطعے تاریخی ہیں، پہلے نعتیہ قصیدہ کی تشبیب بہت پُرزور ہے،

خسرو دہر چو بنشست برادرنگ عمل | رستم روز در اقلیم شب افگند خلل
رومی روز برافراختہ رایت بمصاف | زنگی شب سپر انداخت ہنگام جدل

کیمیا ساز بود است گر این حال رو ❊ مس شب را بزر روز چرا کرده بدل
روز افزوده و شب کاسته زانرو که دهر ❊ کرده آئینه ایام و لیالی صیقل
سنگ از تربیت مهر شود لعل و کنون ❊ اخگر از تربیتش لعل شود در منقل
وقت آنست که در قافله از فیض بها ❊ آب زمزم شود اکنون نمی باشد ل
وقت آنست که واعظ چو نهد مجلس وعظ ❊ صورت شیشه شود نسخهٔ واعظ به بغل

اس قصیدہ کے آخر میں شاعر نے اپنا اور اپنے باپ کا نام اور اپنے مشاغلِ درس و تدریس کا ذکر کیا ہے،

دل دانا سے مرا فخر بعلم است و بفضل ❊ جاہل است آنکه نیاز د بحلی و بحلل
باش لطف الله احمد چه کنی فخر بعلم ❊ جہل ازیں علم تو بہتر که نیاید بعمل
عمر در درس بسر بردی و در آخر کار ❊ ہیچ حاصل نشد از مدرسه جز بحث و جدل

داراشکوہ کے مدحیہ قصیدہ میں اپنی مدح خود ان شعروں میں کرتا ہے،

مهندسم که کنم صورت فلک تصویر ❊ کشم بروی زمین گر خطوط پرکاری
چناں بلند نهادم اساس قصر خرد ❊ که بر سپهر زنم طعنهٔ نگوں ساری
چناں منیر شود شیشهٔ عمارت من ❊ که نور مهر بود نزد نور او تاری
دمے که من بعمارت گری شوم مشغول ❊ ملک مصالح کار آورد بسر باری
بدستیاری لطف شه بلند اقبال ❊ بلند پایه زمین گشت قدر معماری
سپهر مرتبه داراشکوه دریا دل ❊ که همچو ابر کفش می کند گهرباری
بعهد دولت تو راجه‌های کوهستان ❊ ز فرق خویش نهاده کلاه جباری
بیک نگاه که کردی بسوی کوهستان ❊ گرفته پست و بلندی کوه همواری

ان اشعار میں جن واقعات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اس کا پتہ موجودہ تاریخوں میں نہیں چلا،

لطف اللہ مہندس کے اکثر اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ نام دنمود کا حریص اور معماری جیسے پیشہ سے اپنے کو بلند سمجھتا ہے، چنانچہ اس قصیدہ میں وہ کہتا ہے،

شہا اگرچہ عمارت گریست پیشۂ من | دگر چہ نیست ضمیرم ازیں ہنر عاری
کنوں کہ ملک دلم شد خراب عشق بتاں | تو خود بگو کہ چہ نسبت مرا بمعماری

غزلوں کا عام انداز وہی ہے جو اس عہد کے دوسرے ملاشاعروں کے کلام میں ہے، زبان میں کہیں کہیں ہندیت ہے، اس کے مقطعوں میں خاص خصوصیت یہ ہے کہ وہ اس میں مہندس کی مناسبت سے کوئی بات ضرور پیدا کرتا ہے، مثلاً

مہندس اگرچہ آگہ بود زیں پیش | فرامش کرد قانونِ شفا را
باشد ز فلک مہندس آگاہ | با آنکہ نشستہ بر زمین است
ای مہ بے مہر در چشم مہندس بے رخت | از حضیضِ خاک تا اوجِ ثریا آتش است
رو مہندس بعلم یک دو شکل | ایں ہمہ افتخار بے معنی است
اے مہندس رو کہ در علم نظر | احتیاج مسطر و پرکار نیست
ال حرف زمیں بگو مہندس | تا کے ز فلک کنی حکایت
از مہندس مپرس سر فلک | کیں معما ز ہیچ کس نکشود

ذیل کے مقطعوں میں اس مہندس کے لفظ سے کتنا لطیف استدلال کیا ہے:-

در حقِ من گمانِ خطامی بری خطاست | ہرگز شنیدۂ کہ مہندس خطا کند
تا کے شکلِ زمیں خواہی کشید | رو مہندس صورتِ افلاک کش

کہنہ شد آسمان ہندس خیز | تا بنا ہائے نو نہادہ شود

حسب ذیل غزل اُس کے بہترین کلام میں سے ہے،

یاراں ہلالِ عید بر آمد نظر کنید | ماہِ صیام رفت مغاں را خبر کنید
یاراں دگر بکوریِ مفتی و محتسب | امروز خاک مے کدہ کحلِ بصر کنید
آنکس کہ از بر آمدنِ مہ خبر کند | او را با حترام دہن پُر شکر کنید
اکنوں رسید کو کبۂ عیش و انبساط | اے درد و غم ز مملکتِ دل سفر کنید
گر درمن دنگار ہندس شود حجاب | دستش گرفتہ زود ز محفل بدر کنید

ذیل میں اس کے دیوان کے وہ اشعار نقل کئے جاتے ہیں جن سے اس کے کچھ حالات معلوم ہوتے ہیں، اس کا نام :-

باش لطف اللہ احمد چہ کنی فخر بعلم | جہل ازیں علم تو بہتر کہ نیاید بعمل
خواہم کہ کشم بادہ چو لطف اللہ احمد | تا چند کشم محنت دور قمری را
ہمچو لطف اللہ احمد کو سِ دانش می زدم | چوں شدم عاشق بجہل خویش کردم اعتراف

ان شعروں میں خود لطف اللہ ہندس کا، اور اس کے باپ احمد کا نام ہے، لاہور اس کا وطن تھا،

کے بود آمدنِ قاصد فرخندہ پیام | مدتے شد کہ ز لاہور نیامد خبرے

ہندسہ و منطق و حکمت میں اس کو غلو تھا،

بر من ہیچ مداں کشف شد از فیض ازل | راز سر بستہ کہ بر ہندسہ داں مشکل بود
صرف در منطق و حکمت شدہ ایں عمر عزیز | لیک آں نکتہ نخواندم کہ در دو حاصل بود

معماری و ہندسی میں نامور تھا،

لطف اللہ معمار ہندس شد استاد | گر کار درایت نکند پس چہ کند کس

درس و تدریس کا بھی شغل تھا،

عمر در درس بسر بردی و در آخر کار | ہیچ حاصل نہ شد از مدرسہ جز بحث و جدل

کسی شاہزادہ کے نام ایک مثنوی ہے، جس سے مراد غالباً داراشکوہ ہے کہ "شہزادہ بلند اقبال" کے نام سے وہی مخاطب تھا، اس میں وہ کہتا ہے،

لطفِ شہ می کند مددگاری | ورنہ آگہ نیم ز معماری

خواندہ ام یک دو نسخہ از ہر باب | ہیئت و ہندسہ و نجوم و حساب

نہ نویسم ز بیم بے ادبی | کہ چہا خواندہ ام من از عربی

. . . . | . . . .

لطف شہزادۂ بلند اقبال | گر شود بندہ را معاون حال

خدمت بندہ را بفرماید | کہ از و علم رفتہ باز آید

گر یکے از مقربانِ بساط | در دمِ عیش و در زمان نشاط

ایں سخن از مقیم ایں درگاہ | برساند بسمعِ حضرت شاہ

آنچہ باید کردگار کریم | نہ کہ اجرِ قلیل اجرِ عظیم

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ داراشکوہ کے توسط سے شاہجہان تک پہنچنا چاہتا ہے، کہیں کہیں غزلوں کے مقطع میں بھی ادھر اشارہ ہے،

ہاں مہندس بندۂ شاہ بلند اقبال باش | آنکہ گر فرمان دہد خورشید فرماں بر شود

ایک مثنوی میں کسی ایسے خانوادۂ وزارت کے کسی رکن کی مدح کرتا ہے جس کو سیادت کی عزت بھی حاصل تھی،

اخترِ برجِ حشمت و جلال | گوہرِ درجِ دولت و اقبال

نیر آسمانِ بینائی | آفتابِ سپہرِ دانائی
منبع جود و مخزنِ احسان | مظہرِ فیض و معدنِ اقبال
زبدۂ دودمانِ مصطفوی | نخبۂ خاندانِ مرتضوی
امرا را شرف امارت اد | وزرا را شرف وزارت اد
امرا از امارتش منصور | وزرا از وزارتش دستور
آبِ شرع است سیفِ مسلولش | دستِ عدلست رمحِ مصقولش

میرا خیال ہے کہ اس مدح کا موضوع وہی ہستی ہے جس کے نام پر شاعر نے اپنی کتاب منتخب الحساب لکھی ہے، یعنی "خلاصۂ دودمانِ سیادت منتخبِ خاندانِ وزارت میر محمد سعید بن میر محمد یحییٰ آدام اللہ اقبالہ و ضاعف جلالہ"

لطف اللہ اور اس کے بھائیوں کی تصانیف سے یہ ہویدا ہے کہ ان لوگوں کو شاہجہاں کے بعد جس سے تعلق رہا ہے، وہ شاہزادۂ داراشکوہ ہے، چنانچہ لطف اللہ کے بھائی عطاء اللہ رشیدی نے اپنا رسالہ خلاصۂ راز شہزادۂ موصوف ہی کے نام سے معنون کیا ہے، لطف اللہ کے اس دیوان کے اکثر اشعار سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ اس کو اسی شہزادہ کے دربار میں رسوخ و اعتبار حاصل تھا، نعت کے بعد جو پہلا قصیدہ اس دیوان میں ہے، وہ اسی کی مدح میں ہے،

بدستیاریِ لطفِ شہِ بلند اقبال | بلند پایہ زمین گشت قدر معاری
سپہر مرتبہ داراشکوہ دریا دل | کہ ہمچو ابر بکفش می کند گہر باری

اسی کی ایک غزل کا ایک مطلع ہے،

گر بادشہ بلطف نظر بر گدا کند | بر بادشہ نظر بعنایت خدا کند

اسی کی دوسری غزل کا مطلع ہے،

اے شاہ زمن بیا دبنگر　　در دل من بیا دبنگر

ایک پوری غزل مدح میں ہے،

اے زجود تو کامرانیِ دہر　　ذرہ وجود تو پاسبانی دہر
بخدائے خدا یگانِ زماں　　تو زیبا خدا یگانی دہر
دہر را مدح تو وظیفہ بود　　گوش کن بر وظیفہ خوانی دہر
تو زیبا است خلعتِ شاہی　　ز تو پیدا است کامرانی دہر
باشد از لطفِ تو ہندسِ شاد　　اے زلطفِ تو شادمانی دہر

ان موقعوں پر لفظ لطف کا لطف اہلِ ذوق سے پوشیدہ نہیں،

ایک اور مدحیہ غزل سنیے جس کے مطلع میں دادا، بیٹا اور پوتا تینوں کے نام یکجا ہیں،

داراشکوہ، شاہجہاں بانی جہاں　　بروے مبارک است سلیمانی جہاں

شاہجہاں، داراشکوہ بن شاہجہاں، اور سلیمان شکوہ بن داراشکوہ بن شاہجہاں،

پروردگار با د نگہبانِ دولتت　　زانرو کہ کار تست نگہبانی جہاں
تا ز آب و آتش است نشاں در زمانہ　　روشن ز خاکِ پائے تو پیشانی جہاں
اے بانی جہاں کہ جہاں در ثنائے تست　　یک لحظہ گوش دار ثنا خوانی جہاں

تا کہ ہندس است پریشاں چو زلف یار -
اے از تو دور گشتہ پریشانی جہاں

ایک قطعہ ہے:-

دولت جاوید و بخت سرمد و ملک دوام　　ہمعنان و ہمدم شاہ بلند اقبال باد
از کفِ دستش زر و گوہر برد در بارگاہ　　تا ابد دریا و کان زین فیض مالا مال باد

می کند احسان او در ماندگان ایادری
یاد آور ایزد ذو المجد و الافضال باد

دوسرا قطعہ :۔

ثنا خوان ترا شاہا چہ حاجت مدح جم گفتن
بجام بادہ حاجت نیست مست جام سرمدرا
چو می خواہد کہ باشد بانی قصر ثنائے تو
بکار خشت و گل مگذار لطف اللہ احمد را

اس قطعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ معماری کے پیشہ کو اپنے سے کم درجہ جانتا تھا،
داراشکوہ نے اس سے اپنا محل بنوایا ہے، اس کی تاریخ نکالتا ہے،

چو بنا کردہ قصر جاہ و جلال
ظل حق بادشاہ عالی ملک
شبہۂ ایں عمارت والا
تا فتد چوں مہر حوالی ملک
گفت معمار قصر تاریخش
قصر داراشکوہ والی ملک

اس مصرع سے تاریخ بنا ۱۰۵۰ھ نکلتی ہے، اور اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے، کہ داراشکوہ کا یہ قصر اسی شاعر معمار نے بنایا تھا، داراشکوہ نے کوئی کنجی بنوائی ہے، اس کی تاریخ لکھی ہے،

چوں طیار شد ایں کلید ظفر
بفرمان دین پرور حق پژوہ
پے سال تاریخ انجام وے
خرد گفت "مفتاح داراشکوہ"

"مفتاح داراشکوہ" سے ۱۰۶۸ھ نکلتے ہیں، جس کے ایک سال کے بعد داراشکوہ کی تاریخ کا صفحہ بدل جاتا ہے، داراشکوہ کے بیٹے سلیمان شکوہ کی کدخدائی کی تاریخ یہ لکھی ہے،

کدخدا گشت باقبال بلند
پور دارائے زمان شاہ زمیں
در زمانے کہ مرادات جہاں
بود در دست چو در دست نگیں

گفت جبریل امین تاریخش	بسلیماں شدہ بلقیس قرین

آخری مصرع سے ۱۰۶۶ھ نکلتے ہیں،

اوپر کے اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ اس کا اور اس کے خاندان کا تمامتر تعلق داراشکوہ سے تھا، اس تاریخ سے اس واقعہ سے دوسرا نتیجہ پیدا کرنا بہت آسان ہے، یعنی یہ کہ اس کو داراشکوہ سے جس قدر وابستگی ہوگی، اسی قدر عالمگیر کے دربار سے اس کو دوری ہوگی، داراشکوہ کے مدحیہ قصیدہ میں کچھ ایسے شعر بھی ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں داراشکوہ کے حریف مقابل یعنی اورنگزیب پر طعن وتعریض ہے، مثلاً

زہیبتش نہ تواں یافت نیم قطرۂ خوں | ہزار بار دل خصمش ار بیفشاری
بزخم تیر کہ زد در دلِ معاندِ او | ربودہ رنگِ دلم را سپہر زنگاری
دراں دیار کہ بخت حسود تست بخواب | ندیدہ دیدۂ مردم بخواب بیداری
مدام باد ہوا خواہ دولت تو بعیش | نصیب خصم تو جاوید باد خونخواری

ان اشعار میں "خصم" اور "معاند" "حسود" سے غالباً اورنگزیب ہی کی طرف اشارہ ہے، اس بنا پر ۱۰۶۸ھ کے انقلاب میں جب "شاہزادہ بلند اقبال" کی جگہ اورنگزیب عالمگیر زیب اورنگ شاہی ہوا، تو اس شخص کی کس مپرسی محتاج بیان نہ ہوگی، لطف اللہ کے دیوان میں ایک قطعہ بند غزل ہے،

شہا گوش بر داد خواہی نداری | بحالِ گدایاں نگاہے نداری
رقیباں بقتلم نوشتند فتوی | دگر نہ تو ہرگز گناہے نداری
جہاں سر بسر خیر خواہ تو باشد | ولے ہمچو من خیر خواہے نداری
نیا دی صبا سوے بلبل پیامے | مگر سوے گلزار راہے نداری
نہ ندس ازاں رو نداری دفا کہ | کہ چوں زاہداں خانقاہے نداری

میرے خیال میں اس غزل کا خطاب اورنگزیب ہی کی طرف ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ اس کو داراشکوہ کے عہد میں اس گلہ و شکایت کا موقع نہ تھا، اور نہ زاہدوں کی خانقاہ پر تعریض کی حاجت تھی،

اوپر کے اشعار میں مہندس نے اپنی تعمیری مہارت فن کا بھی جا بجا اظہار کیا ہے کہتا ہے ع

بلند پایہ زمن گشت قدر معماری

ایک جگہ فخریہ کہتا ہے :- ع

ماہمہ معمار و عمارت گریم

ایک جگہ کہتا ہے کہ "میرے بنائے ہوئے نقشے آفتاب کی طرح روشن ہوتے ہیں"

چناں منیر شود شبیہ عمارت من　　　　که نور مہر بود ذرہ و نور ادتا ری

دمے کہ من بعمارت گری شوم مشغول　　　　ملک مصالح کار آورد بسر یاری

مگر بایں ہمہ یہ نہیں معلوم کہ اس کی بنائی ہوئی عمارتیں کون ہیں، اوپر کے ایک تاریخی قطعہ سے داراشکوہ کے ایک محل کے بنانے کا حال معلوم ہوتا ہے، تذکرہ سفینۂ خوشگو، اور نشتر عشق حسین قلی خاں میں ۱۲۹۵ھ میں مہندس کے بیٹے ریاضی کے حال کے ضمن میں ہے،

" ملا لطف اللہ مہندس تخلص لاہوری است کہ قلعۂ ارک دارالخلافہ شاہجہان آباد بتجویز و صواب دید او بنا یافتہ"　　　　(خوشگو)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قلعۂ دہلی کی شاہجہانی عمارت کی تعمیر میں یہ بھی اپنے باپ اور چچا کے ساتھ شریک تھا، سحر حلال میں یہ اپنی نسبت لکھتا ہے،

" مملوک ہوا دار دلدا حمد معمار گو ہر عمر را در کارگاہ و گل کاسد کردہ ....."

اس فقرے سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کی عمر کا بڑا حصہ عمارت گری میں صرف ہوا،

۷۔ سحرِ حلال: یہ فارسی رسالہ علم اخلاق میں ہے، اور صنعت غیر منقوطہ میں لکھا گیا ہے، اسی لئے مصنف کا نام لطف اللہ کے بجائے "ولد احمد معمار" لکھا گیا ہے، اس کے شروع کی عبارت یہ ہے:۔

"اللہ علا اسمہ درادل کلام حمد کردگار آورد دم، مالک ملک اعلام واحد صمد سلام....."

حمد و نعت کے ۹ صفحوں کے بعد دو صفحوں میں "مدح داور کامگار دام اللہ ملکہ" کے عنوان سے بادشاہِ عصر کی تعریف ہے، ممدوح کا نام حسب ذیل صورت معمہ میں ہے:۔

"اسم اکرم او: حال، دو کلمہ آمد، کلمۂ اول، سرِ عدل (ع) دو دل داو (الف) و دل علم (ل) میرا مراد (م)
کلمۂ دوم: سرِ گل (گ) و دل سرد (ر) و در سرِ گل دو دل سردہ (ی) در آمدہ، ملک علام و صمد
سلام ہموارہ سرد اورا محور سماے کرم و گل ادرا محسود دوحۂ ارم دارا د"

اس صورتِ معمہ سے جو نام نکلتا ہے، وہ عالمگیر ہے، تعجب ہے کہ دارا شکوہ کے مداح نے عالمگیر کی مدح کیونکر لکھی، شاید اس اخلاقی رسالہ کو عالمگیر کے نام سے پیش کرکے اس کی ہمدردی اپنی طرف مائل کرنی چاہی، جو معلوم نہیں کہ ہوئی یا نہیں،

بادشاہ کی مدح کے بعد "مدح رسالہ و حال محمد صلی اللہ علیہ" کے عنوان سے تین صفحوں میں اپنا اور اپنے رسالہ کا حال لکھا ہے، جس کا اقتباس درج ذیل ہے،

"مملوک ہوادار ولد احمد معمار رسالۂ کہ مدار او کل مدائح اہلِ حال آمد........
حاصلِ سطور معدودہ کردہ در درگاہ سالار کامگار دام اللہ ملکہ آوردہ.........
مامول کہ در حال سعد..... در مطالعہ والا در آمدہ معلوم مدرکۂ اکرم گردد...........
سردار مملوک ہوادار ولد احمد معمار گوہر عمر را در کارگاہ و گل کاسد کردہ ... .

مسئول کہ ہر کس در مسالکِ علم.... اطلاع دارد، رسالۂ مملوک ہوا و اراصلاح د ہذا حمد معاد و الد مملوک داو ار سہ ولد دارد، اوّل عطار اللہ سلمہ اللہ سالک مسالک علم و عمل ور احل مراحلِ صعود و کمال عالم و عامل و علامۂ عصر کہ در او علم و عمل آمدہ حصر رسالہا در علم اعداد مسطور کردہ حال صحاح و کسور و ولد دوم اوسط ہر سہ مملوک درگاہ کردگار دا اسم مملوک حال دو کلمہ آمد، کلمۂ دوم اللہ طلا اسمہ کلمۂ اوّل لام و طا ہم معادل عدد عطا، و ولد سوم ہو مسالکِ علم و حال و مراحل صعود و کمال مسا ہم عطا ار اللہ آمد و اسم او ہم دو کلمہ دارد کلمہ دوم اللہ "علا اسمہ" و کلمۂ اوّل معادل عدد عطا و ورار اصلح اللہ عالہ حصص اللہ آما لہم معلوم اہل علم گردد کہ اسم رسالہ دال سحر حلال آمد..... معلوم اہل کمال کہ سحر حلال را کہ در ماہ محرم الحرام مسطور کردۂ سال رسم سحر حلال لہم اہل حال و معلوم اہل کمال را سوال کردم صدا در داد کہ سحر حلال درو اہل حال آمد دو درس لوح کمال"،

اس آخری فقرہ سے اس رسالہ کی تصنیف کی تاریخ ۱۰۰۰ھ نکلتی ہے،

اس تمہید کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے جس میں مختلف اخلاقیات کو سرعنوان بناکر مدح و ذم لکھا گیا ہے، مثلاً مدح عدل، مدح سماع، محرم امساک، محرم حسد، محرم طول امل محرم حرص و طمع، محرم کسل مدح کد، مدح علم، مدح ودادِ حال اہل دل، ہوس وصل وداد، حصول وصل و داد محرم ہوس و دوام وصل، مدح دل، مدح سرود، کلام اہل دل، اسی پر رسالہ ختم ہو گیا ہے،

اس رسالہ کے دو نسخوں کا مجھے علم ہے، پہلا رسالہ مدرسہ محمدی مدراس کے کتبخانہ کا جس کا نمبر ۲۶۸۶ ہے، اس نسخہ کو غلام عبدالقادر المخاطب بہ قادر عظیم خاں نے ۱۲۲۱ھ میں نقل کیا ہے جو مدراس کے ایک مشہور علمی خاندان کے رکن[1] تھے، یہ نسخہ ۲۹ صفحوں میں ہے،

---

[1] اس خاندان کے نوجوان رکن جناب محمد غوث صاحب ایم اے (حیدرآباد دکن) کا ممنون ہوں کہ انھوں نے میرے لئے اس رسالہ کے اقتباسات میری فرمائش پر نقل کرکے بھیجے،

دوسرا نسخہ بمبئی یونیورسٹی کے کتب خانہ میں ہو جس کا نمبر اس کے کٹیلاگ میں جلد ۱۰ ہے ۱۱ صفحہ ۱۷۱ اس کو ابھی ابھی ہمارے مخلص دوست پروفیسر شیخ عبدالقادر (پونہ) نے مرتب کرکے شائع کیا ہے [1]؛

(۳)

امام الدین الریاضی | یہ لطف اللہ مہندس کا بیٹا اور استاذ احمد کا پوتا ہے،

ریاضیات کے اس ریاض علم کا یہی وہ نونہال ہے جس کے تذکرہ کی خوشبو بارہویں صدی کے اہل تذکرہ کی محفل تک پھیلی ہے، خوشگو نے اپنے سفینہ میں حسین قلی خان عظیم آبادی نے اپنے نشتر عشق میں گشن چند اخلاص نے اپنے ہمیشہ بہار میں اور احمد علی خان سندیلوی نے اپنے مخزن الغرائب میں اُن کے حالات لکھے، اور اُن کے فارسی اشعار نقل کئے ہیں، اور اسی ضمن میں اُن کے بعض بزرگوں اور عزیزوں کے احوال کی طرف بھی اشارات کئے ہیں، سفینۂ خوشگو میں ہے:۔

"مولوی امام الدین ریاضی تخلص خلف ملا لطف اللہ مہندس تخلص لاہوریست کہ قلعۂ ارک دار الخلافۂ شاہجہان آباد، بتجویز صواب دید او بنا یافتہ واز عہد جد خود بدار الخلافہ سکونت دارد، در جمیع علوم رسمی یگانہ و منفرد بود، خصوص در ریاضیات تصانیف معتبر دارد، و با ایں ہمہ قناعت در ریاضت را دستور حال و آل خود ساختہ، بدرس و افادت مشغولی داشت، و درین جزو زماں از مغتنمات بود ہ، اگرچہ بنا بر اشتغال علمی بفکر سخن کم می پرداخت لیکن سلیقۂ بسیار درست داشت، و در جواہائے پائے کم نمی آورد، و درسال ہزار و صد و چہل و پنج رحلت کرد، و امروز ملا ابوالخیر موسوف بخیر اللہ برادر

[1] اس کٹیلاگ کے فاضل مرتب نے اس رسالہ کا مصنف لطف اللہ کے چھوٹے بھائی نور اللہ کو ظاہر کیا ہے اور یہ کسی غلط فہمی پر مبنی ہے:

اعیانی او......(اس کے بعد خیر اللہ کی رصد بندی کا تذکرہ ہے، جس کا ذکر اس کے حال میں آئے گا)

پھر مولانا ریاضی کے چند فارسی اشعار کا انتخاب کیا ہے،
حسین قلی خاں عظیم آبادی نشترِ عشق میں لکھتے ہیں:۔

"مولانا امام الدین نام خلف مولانا لطف اللہ مہندس لاہوری است کہ قلعۂ ارک شاہجہان آباد برراۓ وے بنیاد شدہ، تدۂ عمر خود، در شاہجہان آباد گذرانیدہ چوں وے بعلم ریاضی تفوق برابناۓ جنس داشت و در ورع و پرہیزگاری بے مانند بود لہذا تخلص خود ریاضی می کرد، وگاہ گاہے بفکر بہ تلاش سخن ہم می گماشت ......
در سنہ یک ہزار و یک صد و چہل و پنج بگلگشت ریاض جناں شتافت،
حسین قلی خاں نے اُن کی تاریخ وفات کا یہ قطعہ لکھا ہے،

بگفتہ عاشقے با آہ دلِ سوز	برفتہ چوں امام الدین ز دنیا
بدیع وصرف ومعنی وریاضی	شدند اای وای بے ادیب سرو پا

کشن چند اخلاص نے اپنے تذکرہ ہمیشہ بہار[۱] میں اُن کا تذکرہ بڑے اخلاص کے ساتھ چند صفحوں میں لکھا ہے، جس کی ایک ایک سطر سے اس کی عقیدت مندی اور نیازمندی کا اظہار ہوتا ہے، خصوصاً اُن کے زہد و استغنا اور سلاطین و امراء کے درباروں سے اُن کی بے نیازی کی تعریف کی ہے، ابتدائی سطریں یہ ہیں:،

.....اصل وطن ایشاں دارالسلطنت لاہور است و جد شریف آں دانائے اسرار کوفی والئی آمدہ، در دارالخلافہ شاہجہان آباد اقامت گزنتہ، والد شریف ایشاں مولوی

---

[۱] اس کا نسخہ بانکی پور لائبریری میں نظر سے گذرا،

لطف اللہ مہندس کہ ایشان ہم گاہے گاہے میل بشعری کردند و مہندس تخلص می فرمودند و در علم ریاضی خیلے ید علیا داشتند"

پھر چند صفحوں میں اُن کے زہد و اتقا کے حالات لکھے ہیں، اور اُن کے شاعرانہ کمال کے ایک دو واقعے نقل کئے ہیں،

احمد علی خان سندیلوی نے تذکرۂ مخزن الغرائب میں جو ۱۲۱۸ھ میں لکھی گئی ہے ، ذرہ سے لفظی تغیر سے وہی کچھ لکھا ہے جو اخلاص نے بیان کیا ہے، چنانچہ اس میں ہے،

"مولانا امام الدین ریاضی اصل وطن ایشان بلدۂ لاہور است، جدش توطن در دہلی اختیار کردہ پدرش مولوی لطف اللہ مہندس بودہ است، ایشان ہم گفتن اشعار میل تمام داشتند و مہندس تخلص می کردند، و در علم ریاضی مثل این ہر دو پدر و پسر در بلاد ہند نبودہ اند"

ہر چند مولانا ریاضی بگفتن شعر توجہ نداشت، روز و شب بہ تدریس مشغول بود،

تذکرۂ صبح گلشن میں ہے،،

"ریاضی امام الدین فرزند مولانا لطف اللہ مہندس لاہوری کہ قلعہ ارک شاہجہان آباد بصواب دید رائے رزینش بنیاد گرفتہ، ریاضی متوطن شاہجہان آباد گردیدہ از شہر مذکور بیرون نرفتہ اہر علوم درسیہ بودہ و در سبق علم ریاضی از معاصرین قصب السبق ربودہ در عبادت و ریاضت و ورع و زہد عدیل خود نداشتہ"

تاریخ علماے ہند میں یہ سطریں ہیں:۔

"ملا امام الدین دہلوی در اصل لاہوری است ریاضی داں بود کہ بدہلی توطن گرفتہ شرح مختصر بہ تشریح الافلاک مصنفہ بہاء الدین آملی در سال یازدہ صد و سہ ہجری نوشتہ کہ بنام التصریح فی شرح التشریح شہرت دارد" (ص ۲۶۲ نولکشور)

عام طور سے اس کی یہی تصنیف تصریح جو بہاء الدین آملی کے مشہور متن تشریح الافلاک کی شرح ہے، لوگوں میں مشہور ہے، حالانکہ اس سے پہلے عصمت اللہ سہارنپوری نے ۱۰۸۶ھ میں اس کی مفصل شرح لکھی ہے، جس کا نام باب تشریح الافلاک ہے، اور جو چھپ بھی گئی ہے تاہم علم ہیئت میں عربی درس گاہوں کی سب سے ابتدائی اور مختصر ترین کتاب یہی ہے، اسلئے بہت متداول ہوئی مصنف نے دیباچہ میں اپنا نام اس طرح لکھا ہے،

اما بعد فیقول العبد الضعیف امام الدین بن لطف اللہ المہندس اللاہوری ثم الدہلوی" (دیباچہ تصریح)

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ خاندان گو در اصل لاہور کا رہنے والا تھا، مگر بعد کو شاید شاہی تعمیرات کے تعلق سے دہلی اگرآباد ہوگیا تھا،

امام الدین نے اپنی اس تالیف (تصریح) کا سنہ دیباچہ میں ۱۱۰۳ھ لکھا ہے ہم کو معلوم ہے کہ لطف اللہ کم از کم ۱۰۹۲ھ تک زندہ تھا کہ اوس کی تصنیف منتخب اسی سال تالیف پائی ہے، اور اس کے گیارہ برس کے بعد اس کا بیٹا تصریح لکھتا ہے، اس سے یقینی طور سے ثابت ہوتا ہے کہ باپ ہی کے عہد میں بیٹا علوم و فنون کی تکمیل کرچکا تھا، یا کر رہا تھا، اس سے ہم کو یہ قیاس کرنے کا حق ہوتا ہے کہ غالباً اس نے اپنے باپ ہی سے علوم ریاضی کی تعلیم حاصل کی ہوگی، تذکروں میں اس کی تاریخ وفات ۱۱۴۵ھ (سنہ خمس واربعین و مائۃ والف) لکھی ہے،

تصریح کے دیباچہ میں ہے کہ یہ شرح اوس نے بھائیوں اور دوستوں کی فرمایش سے لکھی اس سے مراد اس کے شاگردوں کی جماعت ہے، اس سے معلوم ہوگا کہ وہ خود بھی درس و تدریس کے موروثی پیشہ میں مشغول تھا، چنانچہ سندیلوی نے تصریح بھی کی ہے کہ

روز و شب بہ تدریس مشغول بود"

رام پور کے کتب خانہ میں اس کی کتاب تصریح کے دو نادر نسخے ہیں جن میں سے ایک کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ تصنیف کی تاریخ سے بارہ برس کے بعد ۱۱۱۵ھ میں لکھی گئی ہے اور دوسرے کی اہمیت یہ ہے کہ وہ ۱۲۰۰ھ میں اس نسخے سے منقول ہے، جو خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا، پہلے نسخہ کا نمبر ۱۵، اور دوسرے کا ۱۶ (فن ہیئت) ہے،

مصنف نے اپنی شرح پر حواشی بھی لکھے تھے، چنانچہ رام پور کے نسخہ نمبر ۱۶ پر مصنف کے یہ حواشی موجود ہیں، ہمارے استاذ مولانا حفیظ اللہ صاحب سابق مدرس اعلیٰ مدرسہ عالیہ رامپور و دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ نے تصریح پر جو حاشیہ اپنے قیام رامپور کے زمانہ میں ۱۳۱۰ھ میں لکھا تھا، اور جو مطبع مجتبائی دہلی میں چھپا ہے، اوس کے آخر میں محشی نے تصریح کی ہے کہ انھوں نے شارح کے ان حواشی سے جو اس کے ہاتھ کے نوشتہ نسخہ سے منقول ہیں استفادہ کیا ہے، (خاتمہ حاشیۂ تصریح مطبوعہ مجتبائی دہلی)

امام الدین نے دو اور کتابوں پر بھی حاشیے لکھے ہیں، جن میں سے ایک قاضی زادہ رومی کی مشہور فلکی تصنیف شرح چغمنی پر ہے، نواب اودھ کے زمانہ میں علی بخش خاں کے مطبع علوی میں مقبول الدولہ احسان الملک کپتان مرزا مہدی علی خان بہادر ثابت جنگ قبول کے زیر اہتمام شرح چغمنی کا جو نسخہ متعدد علماء کے حواشی اور تعلیقات کے ساتھ چھپا ہے، اُن میں ایک امام الدین الریاضی بن لطف اللہ المہندس الدہلوی" کے حاشیہ کے بھی منقولات اور حوالے ہیں، چنانچہ کتاب کے خاتمہ میں حاشیہ کا ذکر ہے۔[۱]

امام الدین کا دوسرا حاشیہ خود اس کے باپ کی کتاب شرح خلاصۃ الحساب پر ہے،

امام الدین بھی اپنے باپ کی طرح فارسی کا شاعر تھا، اور ریاضی اُس کا تخلص تھا،

کشن چند اخلاص اور سندیلوی کا بیان ہے کہ گو مولانا ریاضی کو اپنے درس و تدریس

[۱] کتب خانہ انڈیا آفس نمبر ۱۷۶۱

سے شعر گوئی کی فرصت نہیں ملتی تھی تاہم انھوں نے طالب آملی کے ایک مطلع کا جس کا جواب نہیں ہو سکتا تھا، ایسا جواب لکھا جو بڑے بڑے شعرا کی قدرت سے باہر ہے، طالب کا مطلع تھا،

بتن بو یا کند گلہائے تصویر خیالی را | بپا بیدار سازد خفتگانِ نقشِ قالی را

اخلاص اور سندیلوی کہتے ہیں کہ اس کا جواب شاعروں سے اب تک نہیں ہو سکا تھا، یہاں تک کہ میاں ناصر علی کو اُن کے دوستوں نے اس زمین میں کچھ کہنے کی فرمایش کی، تو صاف کہا کہ "این زمین را طالبا بر دچیزے کہ ماندہ است درد است" مرزا صاحب جیسے "شاعر عزا" نے جب اس غزل کا جواب لکھا، تو سپر ڈال دی، اور قالی اور نہالی کا مطلع نہیں لکھا بلکہ یہ مطلع کہا کہ

"تکلف نیست در گفتار رندلاابالی را | چنانت دوست می دارم کہ عاشق شعر حالی را"

لیکن مولانا ریاضی نے اُس کا جواب برجستہ لکھدیا،

رگ گل کرد آن گل چہرہ ہر تارِ نہالی را | ازیں اندیشہ گلہا داغ شد بر سینہ قالی را

مولانا کا مطلع جس نے سُنا اُس نے کہا :

"ظاہرا این زمین بہ دو صاحب داشت یکے را طالبا بر دو دُمی تا حال در جواہر خانہ قضا و قدر پنہاں بود کہ نصیب مولانا شد"

ان تذکروں میں اُن کے یہ چند شعر نقل کئے ہیں :

عنقا خدنگ حسرتِ گمنامی نست | در قید نام بود اگر چہ نشاں نداشت

رفتی، در فت لشکرِ دل در رکاب تو | ہم رنگ مجلس تصویر جاں نداشت

روشن دلیم و خاک نشینی عیار ماست | سیماب وار کشتہ شدن اعتبار ماست

آزادہ ایم مطلب ما ترکِ مطلب است | باز آمدن زحاصلِ ہر کار کار ماست

ما خارِ غم بسینہ چو ماہی نہفتہ ایم | گلزارِ عشق داغِ دلِ خاکِ ماست
دریا دل است او و نم از ما دریغ داشت | خشک و تری بپائے گل افسوس خار ماست
ز عشقِ یار چہ گویم کہ حالِ من چون است | غمم بدور خطش از احاطہ بیرون است
ندانم ار چہ شدی سنگدل کہ بیمار است | بجاں رسید و نپرسی کہ حالِ او چون است

ساتویں شعر میں دیکھیے کہ ریاضی کی جھلک دور، خط اور احاطہ میں موجود ہے، سفینۂ خوشگو میں آٹھ شعر اور ہیں،

پایۂ عشق بلندی ز سرِ دار گرفت | ہر کہ دریافت چو منصور سرِ سر دار است
در سفستانِ معانی است ریاضی سخنت | چاک پیراہن نظم تو عجب بازار است

امام الدین ریاضی نے تصریح کے دیباچہ میں جو چند لفظ لکھے ہیں، اُن سے اور کشن چند اخلاص کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی تربیت کے دامن میں ریاضیات کے کئی مستعد شاگرد پل کر جوان ہوئے، اخلاص کے تذکرہ ہمیشہ بہار میں ہے،

"یکے از شاگردان ایشان بر مجسطی شرح فارسی نوشتہ خیلے بتفصیل"

پھر لکھا ہے :۔

"عزیزے در حق بعضے از شاگردان ایشاں گفتہ" ع

توئی در ہر فنے چوں مردمک فن

اس کے بعد ہے :۔

"شاگردان ایشاں در ریاضی تصانیف رائقہ فائقہ دارند"

خیر اللہ بن لطف اللہ | لطف اللہ مہندس کا یہ دوسرا لڑکا ہے، اس کا پورا نام ابوالخیر الملخاطب "خیر اللہ خاں مہندس ہے، محمد شاہ کے عہد میں اس نے اپنا نام روشن کیا، اور لفظ الملخاطب سے ہویدا ہے"

کہ بادشاہ کے دربار تک اس کو رسائی حاصل تھی، اپنے باپ کی طرح یہ بھی اپنے نام کے ساتھ مہندس لکھتا ہے، غالباً اُس نے تعلیم اپنے بڑے بھائی امام الدین سے پائی ہوگی، جس نے سنہ ۱۱۳۵ھ تک زندگی پائی ہے، تصریح کے دیباچہ میں امام الدین نے لکھا ہے کہ اُس نے اپنے دوستوں اور بھائیوں کی فرمائش سے یہ شرح لکھی ہے عجب نہیں کہ ان بھائیوں میں اس کا یہ بھائی بھی ہو کشن چند اخلاص کے تذکرہ ہمیشہ بہار میں امام الدین ریاضی کے ذیل میں ہو "یکے از شاگردان ایشان بہ تحصیلی شرح فارسی نوشتہ خیلے بتفصیل ....." آگے معلوم ہوگا کہ یہ شاگرد خود اُس کا بھائی خیر اللہ ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خیر اللہ اپنے بھائی امام الدین کا شاگرد تھا، اس کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ محمد شاہ کے زمانہ میں راجہ جے سنگھ نے بادشاہ کے حکم سے دہلی، جے پور، بنارس، اور اجین میں جو رصد خانے قائم کئے تھے، اُن کا بانی اور نگراں کار یہی نادرۂ روزگار تھا، آج سے پچیس چھبیس برس پیشتر میں نے یہ بات قیاساً لکھی تھی[1]، لیکن بحمد اللہ کہ آج اُس کے ایک معاصر تذکرہ نویس بندرا بن خوشگو المتوفی سنہ ۱۱۷۰ھ کی معاصرانہ شہادت سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ گئی، خوشگو اپنے تذکرہ سفینۂ خوشگو میں جس کا قلمی نسخہ بانکی پور لائبریری میں نظر سے گذرا، امام الدین ریاضی کے حال میں لکھتا ہے: :

"و امروز ملا ابو الخیر معروف بخیر اللہ برادر اعیانی وے در ہیئت و ہندسہ واکثر علوم یگانۂ روزگار است، چنانچہ راجہ دھیراج جے سنگھ سوائے زمیندار عنبیر، در ایں ایام خیال رصد بستن در پیش داشتہ، قریب بست لک روپیہ در بست سال صرف ایں کار نمودہ باستصواب ابو الخیر مذکور است و حق آنست کہ ذات او در زمانہ منت است ......"

(سفینۂ خوشگو نمبر ۲۵ ص ۱۲۳)

---

[1] الندوہ سنہ ۱۹ میں مضمون اسلامی رصد خانے،

دلّی میں اس رصد خانہ کے کام کے علاوہ ریاضیات کا درس بھی دیا کرتا تھا، (دیباچہ تقریب التحریر)
چنانچہ اس کے شاگردوں میں سب سے پہلا نام اس کے بیٹے محمد علی کا ہے،
اس کی ایک معنوی یادگار انڈیا آفس لائبریری لندن اور کتب خانۂ نواب سالار جنگ بہادر حیدرآباد دکن میں اور دو بانکی پور کے مشرقی کتب خانہ میں ہیں، اُن میں سے ایک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی لائبریری میں بھی ہے، اور چوتھے کا ذکر علامہ غلام حسین جونپوری نے جامع بہادر خانی میں کیا ہے،
۱۔ تقریر التحریر: یہ خواجہ نصیر الدین طوسی المتوفی ۶۷۲ھ کی تحریر اقلیدس" کا فارسی ترجمہ ہے، محمد شاہ کے زمانہ میں ۱۱۴۴ھ میں یہ ترجمہ جیسا کہ کتاب کے دیباچہ میں تصریح ہے، اس نے ختم کیا، کتاب کا آغاز ان فقروں سے ہے،

"شکر است مر خدائے راکہ از دست ابتدا بسوئے او دست انتہا دیدست، دست اختیار
ہمہ چیزہا"

نواب سالار جنگ بہادر (حیدرآباد دکن) کے کتب خانہ میں اُس کا جو نسخہ ہے، اس میں مترجم کا نام ابو الخیر بن لطف اللہ مہندس اور انڈیا آفس کے نسخہ (نمبر ۲۳۴۶) میں "خیر اللہ خاں بن لطف اللہ مہندس" درج ہے، جیسا کہ اس کی فارسی فہرست (جلد اول ص ۱۲۳۴) سے معلوم ہوتا ہے،
اس حیدرآبادی نسخہ میں کتاب کا نام صاف "تقریر التحریر" ہے، لیکن انڈیا آفس لائبریری کی فہرست میں اس کا نام ترجمہ تحریر اقلیدس" لکھا ہے، حالانکہ یہ نام نہیں ہو سکتا، "تقریب التحریر" جس کا نام آگے آتا ہے، اور جس کا نسخہ بانکی پور اور علی گڑھ کی لائبریریوں میں ہے، اُس کے دیباچہ میں مصنف کے فرزند نے بھی اس کا نام "تقریر التحریر" بتایا ہے، جو بجائے خود اور دوسری تصنیف کے نام کی مشابہت سے بھی نہایت موزوں ہے، انڈیا آفس کے نسخہ کی کتابت کی تاریخ یکم رجب ۱۱۹۴ھ ہے، اس کے پہلے صفحہ پر ایک حاشیہ ہے، جس میں مذکور ہے، کہ یہ نسخہ راجہ نندا رام پنڈت نے مسٹر جیڈ جانسن

کے لئے لکھنؤ میں تیار کیا تھا تعجب ہو گا کہ کبھی ہمارے بزرگوں کی ریاضی کی تصانیف سے استفادہ کے انگریز شائقین علم بھی مشتاق تھے، حیدرآبادی نسخہ کو کسی شیخ احمد نے ۱۲۴۵ھ میں لکھا ہے،

۲ - تقریب التحریر، یہ خواجہ طوسی کی دوسری کتاب تحریر مجسطی کا فارسی خلاصہ ترجمہ مع شرح ہے، مصنف کا نام اس میں "ابوالخیر المعروف بہ خیر اللہ المخاطب بہ خیر اللہ خان، المتخلص بالمہندس ابن لطف اللہ ہے، کتاب کا آغاز یہ ہے،

"ثنائے کہ از اندازۂ ہندس خرد بیرون است، شایان صانعی کہ خالق سبع سماوات"

(فہرست کتب خانۂ مشرقی بانکی پور جلد یازدہم ص ۷۰)

مصنف نے اس کے دیباچہ میں یہ بیان کیا ہے کہ تحریر اقلیدس کے ترجمہ کے بعد اس نے یہ کتاب محمد شاہ (۱۱۳۱ھ / ۱۷۱۹ء - ۱۱۶۱ھ / ۱۷۴۸ء) کی تخت نشینی کے اخیر ثلث (۱۱۶۱ھ) میں تالیف کی، اس کی شرح میں اس نے مولانا عبد العلی برجندی کی شرح تحریر مجسطی سے مدد لی ہے، کتاب کا عام انداز یہ ہے کہ پہلے خواجہ طوسی کے عربی متن کا ایک فقرہ ہے، پھر اس کا فارسی ترجمہ، پھر حسب ضرورت برجندی کی عربی شرح اور پھر خود خیر اللہ کی فارسی شرح ہے،

اس کا ایک نسخہ بانکی پور کے مشرقی کتب خانہ میں ہے، ۲۲ رشوال ۱۲۵۱ھ کتابت کا سال ہے، کتاب کا نمبر ۵۰ ریاضیات فارسی ہے، اور دوسرا مسلم یونیورسٹی لائبریری (نمبر ۲ علوم فارسی) میں ہے) فہرست میں اس کا نام ترجمہ مجسطی لکھا ہے، دونسخے نظر سے گذرے ہیں،

کتاب کا آغاز اس طرح ہے،

یارب آساں کن بفضل شامل خود فتح باب   پس بلطف کامل خود ساز انجام کتاب

"قال الفاضل الکامل، المحقق والعامل الماہر المدقق استاذ الکل فی الکل عالم العلوم

بالحیل الشارح المترجم بالفارسیۃ ابو العلوم العربیۃ ابو الخیر المعروف بخیر اللہ المخاطب بخیر اللہ خاں سلمہ الرحمن المتخلص بالمہندس ابن لطف اللہ غفر اللہ لہما الحمد للہ رب العالمین ...... اما بعد ...... پوشیدہ نماند کہ چوں در سالف زماں ترجمۂ تحریر اقلیدس کہ از محقق طوسی، با زیادت شرح بعض مقدمات بزبان فارسی برائے عموم فیض اتفاق افتادہ بود و بتقریب التحریر موسوم گردیدہ، خواست کہ برائے اتمام خدمت عباد اللہ ترجمۂ تحریر مجسطی ہم کہ ازان ادق است با ایراد بعض فوائد مرقوم سازد، چنانکہ بفضل الٰہی جل جلالہ دعم نوالہ مسودۂ آن کتاب عظیم النفع در ثلث اخیر مدت سلطنت شاہ خلائق پناہ، انجم سپاہ، فردوس آرامگاہ محمد شاہ بادشاہ غازی علیہ الرحمہ و الرضوان فراغ دست دادہ بود، و بتقریب التحریر مسمی شدہ، بسبب عدم دریافت قدر دانی ارکان در حیز تعویق افتادہ بود، بہ ترغیب بعض دوستان طالب این فن در اواسط سنۂ احد جلوس بادشاہ عالیجاہ احمد شاہ بہادر، از مسودہ اتفاق شروع بمبیضہ افتاد در سنہ یک ہزار و یکصد و شصت و یکم ہجری مقدسہ صلعم"

علی گڑھ کا نسخہ جا بجا سے کرم خوردہ ہے، اور بانکی پور کا نسخہ اچھا اور محفوظ ہے، اوپر کی عبارت دونوں نسخوں کی تطبیق سے درست کی گئی ہے، خاتمہ کی عبارت دونوں میں یہ ہے :

"بعد از بیان سعی در حل این کتاب و وصف خوبی ہائے آن اعتذار سہو و خطا و طلب دعائے خیر ختم بر صلوٰۃ و سلام حضرت رسالت پناہ را ...... فارغ شدم از تحریر این شرح و تصحیح آن روز یکشنبہ اوائل ذی قعدہ سنہ نہصد و ہشت و یک ہجریہ نبویہ ...... بن لطف اللہ مہندس بن احمد"

"سنہ نہصد و ہشت و یک" سراسر تحریف ہے، یہ حقیقت میں "ہزار و یک صد و شصت و یک" سنہ ۱۱۶۱ھ

ہو گا کہ یہی سال محمد شاہ کی وفات کا ہے، اور اس نسخہ کے آغاز میں تصریح ہے کہ اس وقت بادشاہ ممدوح کی وفات ہو چکی تھی، گویا کتاب کا مسودہ محمد شاہ کی زندگی میں تیار ہو چکا تھا، مگر ارکان سلطنت کی ناقدردانی سے یہ پڑا رہا۔ بالآخر شاہ مرحوم کی وفات پر ریاضی کے شائقین کے اصرار سے احمد شاہ کے پہلے سال جلوس میں اس کا یہ مبیضہ تحریر میں آیا،

۳۔ حاشیہ بر شرح بیست باب در معرفت اسطرلاب" بیست باب در اسطرلاب" خواجہ نصیر طوسی کا ایک مشہور رسالہ ہے، اس کی شرح علامہ عبدالعلی برجندی نے ۸۹۰ھ میں لکھی، اس پر خیراللہ مہندس نے یہ حاشیہ لکھا ہے، یہ حواشی بانکی پور لائبریری کی شرح بست باب کے نسخہ نمبر ۱۰۴۵ کے کناروں پر لکھے ہوئے موجود ہیں، اس پر محشی کا نام حسب ذیل تحریر ہے،

"خیر المہندسین ابو الخیر نجم المخاطب بخیر اللہ خان مہندس"

اس نسخہ کی کتابت کا سال ۲ رجمادی الآخری ۱۱۶۵ھ ہے، (فہرست کتب خانہ مذکورہ ج ۱۱ص ۶۲) جو مصنف کی زندگی کا زمانہ ہے،

۴۔ شرح زیج جدید محمد شاہی، راجہ جے سنگھ سوائی بانی جے پور و صوبہ دار آگرہ و مالوہ (المتوفی ۱۱۵۶ھ ۱۷۴۳ء) نے محمد شاہ بادشاہ دہلی کے حکم سے دہلی، جے پور، اجین، بنارس، اور متھرا میں رصد خانے قائم کئے تھے، اور جن کے بنانے میں علاوہ دوسرے ہندو مسلمان اور انگریز ہیئت دانوں کے یہ خیراللہ مہندس بھی شریک تھا، ان رصد خانوں کی تحقیقات خود راجہ کے نام سے زیج محمد شاہی کے عنوان سے ۱۱۴۰ھ میں تصنیف ہوئی تھی خیراللہ نے اس زیج کی ایک شرح لکھی جس میں جابجا اس نے تشریحات اور استدلالات میں اپنے ذاتی مشاہدوں کا ذکر کیا ہے، اس شرح مذکور کا حوالہ علامہ غلام حسین جونپوری نے اپنی مشہور تصنیف جامع بہادر خانی میں دیا ہے،

" مرزا خیراللہ مہندس در شرح زیج محمد شاہی دعوی فرمودہ است اکہ ما دار

خارج المرکز شمس بلکہ مدارات جمیع حوامل را بشکل بیضوی یافتہ ایم"

۵۔ شرح زلالی و شرح حافظ و شرح سکندر نامہ، خیر اللہ کو اپنے خاندان کے موروثی جوہر سخنوری سے بھی حصہ ملا تھا، اس ذوق کا یہ اثر تھا کہ اس نے دیوانِ زلالی، اور دیوانِ حافظ کی شرحیں لکھیں، ان شرحوں کا ذکر اس کے بیٹے نے تقریب التحریر کے دیباچہ میں کیا ہے،

اسی قسم کی اس کی ایک اور کتاب سکندر نامہ کی شرح ہے یہ دو جلدوں میں تمام ہوئی ہے اور عجیب تر یہ ہے کہ پرانے زمانہ میں وہ چھپ بھی چکی ہے، اس کی دوسری جلد جامعہ ملیہ دہلی کے کتب خانہ میں نظر سے گذری، یہ مطبع شرف المطابع دہلی میں ۱۲۶۵ھ میں طبع ہوئی تھی، اس مصنف کا نام و لقب "مرزا خیر اللہ خاں مہندس خیر الشارحین" لکھا ہے:

محمد علی ریاضی بن خیر اللہ مہندس | خیر اللہ مہندس نے اپنی ایک جسمانی یادگار بھی چھوڑی جس کا نام محمد علی ہے، یہ بھی اپنے خاندان کی موروثی علوم ریاضی و ہندسہ کا امانت دار تھا، اور اسی لئے "الریاضی" کے لقب سے مشہور ہوا، اس کے باپ نے اپنی کتاب تقریب التحریر مسودہ کی حالت میں چھوڑی تھی، اور مبیضہ کا صرف دیباچہ لکھا تھا کہ وہ دوسری کتابوں کی تصنیف اور طلبہ کے درس و تدریس میں مصروف ہو گیا، محمد علی نے اس کتاب کو صاف کر کے اشاعت و استفادہ کے قابل بنایا، چنانچہ اس کتاب پر خود محمد علی نے ایک دیباچہ بڑھایا ہے، جس میں یہ واقعہ درج کیا ہے:

"می گوید بندۂ خاکسار ذرۂ بے مقدار الراجی الی الرحمۃ ربہ القوی محمد علی الریاضی آنکہ چوں والداین احقر العباد بر تحریر اقلیدس شرح مبسوطی کہ مسمی بتقریر التحریرات بزبان فارسی نوشتند ...... خواستند کہ بر تحریر کتاب مجسطی کہ مشکل ترین کتب علم ہیئت است یا براہین ہندسی دورین رصد بے نظیرے کہ دست فکر ہر کس از ریاضی دان

بدامن مطلبش نمی تواند رسید و زور خیال وہر کے از ہیئت دان لشکر معانیش نتواں جنبانید-
نیز شرح بزبان فارسی یا فوائد دیگر بنویسند کہ برائے ہر طالبے بکار آید ...... و در آخر
سلطنت فردوس آرام گاہ محمد شاہ مسودہ آں تمام تحریر یافت و بسبب بعضے از موانع
کہ شغل مطالعہ کتب دیگر باشد و عدم فراغ از دیگر امور مبیضہ آن در حیز تعویق افتاد
اکحال من بے بضاعت عاکف زاویہ جہالت خصوصاً در علم ریاضی کہ دراں ریاضت
معتد بہ نکردہ و آشنائے پیدا نساختہ و از وے ریاض ریاضی نمودند ؟ والد گرامی
خواست کہ آں مسودہ را مبیضہ نویسد بحسب آنچہ در خاطر فاتر این ناقص درآید متن را
......"

اس کے بعد خیر اللہ کے مبیضہ کا دیباچہ ہے، جو اوپر نقل کیا جا چکا ہے، اس کے بعد محمد علی
کی یہ عبارت ہے:

"من مترجم می گویم کہ ایں اخبار شارح بہ مبیضہ ساختن تا نوشتن دیباچہ بود، بنا بر
ازاں سبب بعضے از مشاغل اتفاق نیفتاد، چنانچہ ساختن شرح زلالی و شرح خواجہ
حافظ و درس کتب ریاضی ایں حقیر فقیر خواست کہ تا آیں محنت ضائع نشود، جرات در
نوشتن مبیضہ نمود، والا چہ نسبت خاک را با عالم پاک ....."

محمد علی ریاضی، احمد معمار کے سلسلۂ نسل کی آخری کڑی ہے، جس کا حال ہمیں معلوم
ہو سکا ہے، اور اسی نام پر اس خاندان کے تذکرہ کا خاتمہ ہوتا ہے، جس نے کم از کم سوا سو
برس تک لاہور اور دہلی میں تعمیرات و ہندسہ و ریاضی کی زندہ جاوید خدمتیں انجام دیں،
اس تفصیل کے بعد ضرورت ہے کہ لطف اللہ مہندس کی اس مثنوی کو مسلسل یکجا نقل کر دیا جائے،
جس میں اس نے اپنے باپ اور بھائیوں کا اور خود اپنا حال لکھا ہے، تاکہ اب ناظرین کو اسکی

خاندانی حیثیت کے واضح ہو جانے کے بعد اس کی صداقت بیان کا پورا وثوق ہو جائے، اور معلوم ہو جائے کہ تاج اور لال قلعہ کی عمارتوں کا اصل معمار اور مہندس کون تھا،

شاہ جہاں داور گیتی ستاں — روشنیٔ دودۂ صاحب قراں
عرش بریں قبۂ خرگاہ اوست — رشک فلک سدۂ درگاہ اوست
احمد معمار کہ در فن خویش — صد قدم از اہل ہنر بود بیش
واقف تحریر و مقالات آں — آگہ اشکال و حوالات آں
حال کواکب شدہ معلوم او — سر مجسطی شدہ مفہوم او
از طرف داور گیتی جناب — نادر عصر آمدہ اورا خطاب
بود عمارت گر آں بادشاہ — داشت دراں حضرت فرخندہ راہ
آگرہ چوں شد مضرب ایات شاہ — بس کہ برو بود عنایات شاہ
کرد بحکم شہ کشور کشا — روضۂ ممتاز محل را بنا
باز بحکم شہ انجم سپاہ — شاہ جہان داور گیتی پناہ
قلعۂ دہلی کہ نہ دارد نظیر — کرد بنا احمد روشن ضمیر
ایں دو عمارت کہ بیاں کردہ ایم — در صفتش خامہ رواں کردہ ایم
یک ہنر از گنج ہنرہاے اوست — یک گہر از کان گہرہاے اوست
چوں نبود عالم فانی مقر — کرد سوے عالم باقی سفر
پس سہ پسر ماند زمرد سترگ — زاں سہ عطاء اللہ رشیدی بزرگ
نادر عصر خود و مشہور شہر — عالم و علامہ و داناے دہر
مرد ہنر پرور و استاد فن — فاضل و دانشور و حبر زمن

مخزنِ علم آمدہ تالیفِ او — گنجِ ہنر ہاست تصانیفِ او
نثرِ وے از آبِ رواں پاک تر — نظمِ خوشش غیرتِ سلکِ گہر
منکہ سخن پرور و دانش ورم — بندۂ آں جوہرِ سخن پرورم
منکہ ربودم ز جہاں گوئے علم — از چمنش یافتہ ام بوئے علم
منکہ شدہ آگہِ سرِّ نہاں — از دمِ او یافتہ ام قوتِ جاں
ثانیِ آں ہرسہ برادر منم — ہندسہ یکفن بود از صد فنم
گرچہ مہندس لقبم از شہ است — نامِ من دل شدہ لطف اللہ است
ثالثِ آں ہرسہ برادر بلال — آمدہ نور اللہ صاحب کمال
ما ہمہ و معمار عمارت گریم — ما ہمہ استاد و سخن پروریم
لیک بود قصر کلامش عجیب — زاں شدہ معمار مراورا لقب
گرچہ کم است سالِ وی از سالِ من — بیش بود حالِ وی از حالِ من
نثرِ وے از نظم گہربار تر — نظم ز نثر آمدہ ہموار تر
دیدہ ز نورِ سخنش پُرضیا — طبع ز لطفِ سخنش پُرصفا
گنجِ ہنر آمدہ در مشتِ او — ہفت قلم راندہ سہ انگشتِ او
گرچہ منم بے سخن استادِ فن — آں یک و دیں یک بود استادِ من

گرچہ مرا ہست مہندس لقب
ہندسہ زاں ہرسہ برادر طلب

(معارف فریدی، مارچ، اپریل ۱۹۳۶ء)

---

(۴)

استاد احمد معمار کے خاندان کی ایک اور یادگار

زیب النسا بیگم کے دربار کی ایک اور تصنیف

شاہ اورنگزیب عالمگیر کی بیٹی شہزادی زیب النسا بیگم کے علمی دربار کی جو یادگاریں اب تک معلوم تھیں، اُن میں ایک اور تصنیف کا اضافہ ہوا ہے، یہ استاد احمد معمار کے پوتے اور ہیئت کی مشہور درسی کتاب تصریح شرح تشریح الافلاک کے مصنف مُلا امام الدین ریاضی بن مُلا لطف اللہ مہندس لاہوری کا معانی و بیان میں ایک رسالہ ہے جس کا نام بیانیہ ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ نواب سیّد علی حسن خاں مرحوم (بھوپال ہاؤس لکھنو) کے کتب خانہ میں نظر سے گذرا،

رسالہ کی زبان فارسی ہے، اور اس میں اکثر عربی اور بعض فارسی اشعار سے مثالیں دی گئی ہیں، مصنف نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ اُس نے اپنی طالب علمی میں یہ رسالہ لکھا تھا، اور یونہی پڑا تھا، جب اس کی خبر شہزادی کو معلوم ہوئی تو اُس نے اس کو دربار میں پیش کرنے کا حکم دیا، اس حکم کی تعمیل میں سنہ ۱۱۰۰ھ میں یہ رسالہ صاف کیا گیا،

دیباچہ کی عبارت یہ ہے :-

" حمد منزہ بے را سزد کہ ذات و صفاتش از مونت تشبیہ و تمثیل بے نیاز است، ...

اما بعد! چنیں گوید افقر عباد اللہ الغنی امام الدین الریاضی بن لطف اللہ المہندس اللاہوری ثم الدہلوی کہ در خلال ازمنہ تحصیل دآونہ اکمال وتکمیل قواعد چند کہ اساس علم بیان رفیع البنیان است تحریر نمودہ لیکن بسبب اشتغال بعض امور مامورہ نقل آن از مسودہ بمبیضہ بمقتضاے وقت نمی نمود ثانی الحال چوں سنہ الف ومایۃ سبع ہجری مطابق سنہ سی وجلوس امیر کبیر سیار بخش اکم پذیر اورنگ زیب بہادر عالمگیر ایں معنی بعرض جناب عالیان آب بادشاہزادہ ذوالقدر الرفیع فیاض جہاں ملکہ دوراں حافظۂ قرآن قرۃ العین خلیفۃ الرحمن نواب قدسیہ القاب زیب النساء بیگم سلمہا اللہ تعالیٰ وابقی اظلال رافتہا علی العالمین خصوصًا رسید حکم جہاں مطاع عالم مطیع شرف صدور وعز ورود بخشید کہ آں را مرتب ومہذب سازد تا بشرف مطالعہ لامعۂ طبع مشرق باشراقات انوار الٰہی مشرف شود، فان وقع فی حیز القبول فہو منتہی المقصود واقصی المامول لہذا سمعًا وطاعۃً بانیان ایں امر وامتثال ایں حکم پرداختہ بتہذیب وتدوین ساختہ، بہ بیانیہ موسوم نمود،،

اس نسخہ کی کتابت ۱۲۴۵ھ میں ہوئی ہے،

مصنف کے الفاظ "بسبب اشتغال بعض امور مامورہ" سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کو کوئی بادشاہی عہدہ بھی ملا ہوا تھا،

(معارف مئی ۱۹۳۶ء)

(۵)

مُلا خیر اللہ مہندس کے چند نئے رسائل

اُستاد مُلا احمد معمار جس نے لال قلعہ، جامع مسجد دہلی اور تاج محل کی عجائب روزگار عمارتیں تعمیر کی تھیں، اُس کے اور اُس کے فاضل نامور فرزندوں اور اخلاف کے احوال پر میں نے جو مقالہ کچھ سال پہلے ادارۂ معارفِ اسلامیہ لاہور کے جلسہ میں پیش کیا تھا، اور جو بعد کو معارف میں چھپ کر شائع ہوا، وہ بظاہر اس قدر مکمل تھا کہ اس میں اضافہ کی گنجائش نہ تھی لیکن چونکہ تلاش و تفحص کا سلسلہ برابر جاری رہا، اس لئے اُن میں سے بعض کی کچھ اور تصنیفات دستیاب ہوئیں، اور اُن کی بنا پر اُن کے متعلق مزید معلومات کا اضافہ ہوا، چنانچہ مضمون مذکور کے چھپنے کے بعد مُلا لطف اللہ مہندس کی تصانیف میں ایک نیا رسالہ بیانیہ ندوہ کے کتب خانہ[1] میں ملا جو فارسی زبان میں فصاحت و بلاغت کے فن میں مصنف نے شاہزادی زیب النساء کے لئے تصنیف کیا تھا، خیال آتا ہے کہ معارف میں اس پر ایک مختصر مضمون حوالۂ قلم ہو چکا ہے، ندوہ ہی کے کتب خانہ میں حسنِ اتفاق سے لطف اللہ کے بیٹے مرزا خیر اللہ مہندس کے رسالوں کا ایک قلمی مجموعہ کئی سال ہوئے نظر سے گذرا تھا جس کی یادداشت اسی وقت میں نے لے لی تھی لیکن اس کو مکمل اس لئے نہ کر سکا کہ دل و دماغ اب ان مباحث کی طرف راغب نہیں

---

[1] نواب صدیق حسن خان کی کتابوں میں [2] واحد علی سندیلوی کی کتابوں میں۔

اور طبیعت پر کوئی اور رنگ غالب ہوتا جارہا ہے، مگر ظاہر ہے کہ مدت کا چڑھا ہوا رنگ ایک دم زائل بھی نہیں ہو سکتا؛ چنانچہ ابھی ایک صاحب نے "مضامین سید سلیمان ندوی" کے نام سے میرے بیس پچیس مضمونوں کا ایک مجموعہ[1] چھاپا ہے، اس میں یہ مقالہ نظر آیا، تو خیال ہوا کہ اس کا تتمہ بھی لکھ کر چھاپ دیا جائے، کہ تحقیق کا میدان ایک قدم اور وسیع ہو جائے۔

رصد خانۂ محمد شاہی کے نگران ملا خیر اللہ مہندس کے رسائل کا یہ مجموعہ تین رسالوں پر مشتمل ہے، پہلا طب میں ہے، دوسرا تصوف میں، اور تیسرا نجوم میں، اس سے یہ معلوم ہوا کہ مرزا موصوف نہ صرف ہندسہ اور تعمیر میں ید طولیٰ رکھتے تھے، بلکہ وہ طبیب بھی تھے، صوفی بھی تھے، اور منجم بھی۔ اب ذیل میں تینوں رسالوں کا تھوڑا تھوڑا حال لکھا جاتا ہے،

۱۔ پہلے رسالہ کا نام السبع الثوابت ہے، یہ طب میں ہے، اور عربی زبان میں ہے، دیباچہ سے ظاہر ہوتا ہے، کہ اُن کے کسی معاصر طبیب نے السبع السیارات کے نام سے سات مسئلوں کی تحقیق میں ایک رسالہ لکھا تھا، اسی لئے اس کا نام السبع السیارات رکھا تھا، مرزا خیر اللہ نے اس کے جواب میں السبع الثوابت کے نام سے یہ رسالہ لکھا ہے، رسالہ میں جن سات مسئلوں پر بحث ہے، وہ یہ ہیں: درد سر کی حقیقت، دوائے معتدل کے معنی، حاط کی تعریف، اخلاط کی تعداد، مرکب اور مفرد اعضاء کے بیان میں، کھوپڑی کے کچھ حصہ میں کیا کھوکھلا پن ہے، اور طبعی عمر کی حقیقت،

رسالہ کی تالیف کی تاریخ سنہ ۱۱۱۹ھ لکھی ہے،

۲۔ دوسرے رسالہ کا نام الرسالۃ القدسیہ فی مذہب الصوفیہ الحقیقیہ ہے، یہ تصوف

---

[1] پتہ:۔ شفیق احمد، سکونت کلاں، بہار شریف پٹنہ، اور محمد سلیمان اشرف نمبر ۶۸ بنیا پوکھر، روڈ، کلکتہ، نمبر ۱۴،

میں وحدۃ الوجود کی تحقیق میں ایک عربی رسالہ ہے، جس میں اس مسئلہ کے باب میں چند شکوک کا ازالہ کیا گیا ہے، رسالہ کی تاریخ تالیف ۱۱۳۶ھ ہے،

۳- تیسرے رسالہ کا نام مدخل ہے، یہ فارسی نظم میں نجوم کا رسالہ ہے، اس رسالہ سے ظاہر ہے کہ مرزا موصوف شاعر بھی تھے، اس رسالہ کے شروع میں اس رسالہ کے نظم کرنے کے سبب میں اپنے خاندان کا کچھ حال لکھا ہے، جو درج ذیل ہے،

فی سبب نظم الرّسالۃ

بندۂ ذرہ دار خیر اللہ / کہ ندارد بہ اہلِ دنیا راہ
لیکن از محض فضلِ لطف و عطا / شاہ دالا نژاد بحر سخا
بازوے داور زمین و زماں / وارثِ حاکم مکین و مکاں
مرشد فیض بخش، دیں پرور / قبلۂ اہلِ حق بلند اختر

دوسرے شعر میں "لطف و عطا" میں ایک خاص لطف ہے، لطف اللہ مہندس اس کے باپ کا، اور عطاء اللہ اُس کے چچا کا نام تھا،

تیسرے اور چوتھے شعروں میں غالباً ولی عہد سلطنت یا کسی شہزادہ کے نام کی طرف اشارہ ہے، یہ نظم ۱۱۵۰ھ میں لکھی گئی ہے، جیسا کہ آگے آتا ہے، یہ زمانہ محمد شاہ کا ہے، اس لئے اُس کے شاہزادوں میں سے کسی کی طرف اشارہ ہوگا، اس وقت اس کے شہزادوں کے نام پیشِ نظر نہیں، اس لئے تعین نہ کرسکا،

اس کے بعد ایک مختصر باب "فی معرفۃ اصل المؤلف والتاریخ" کے عنوان سے ہے، جس میں مؤلف نے اپنے بزرگوں کا حال بتایا ہے،

یہ ہندس شہیر در افواہ | والد این فقیر لطف اللہ
کسب این علم از پدر فرمود | نادر العصر آن کہ احمد بود
ہست از علم این حقیر نحیف | در ریاضی رسالہاے شریف
در ریاضی ہمین برادرِ من | چند تصنیف ہست در ہر فن
ہم ازین ذرہ دار تصنیفات | ہست کز زیج جہل داد نجات
در ہزار است و یک صد و پنج | نظم این چند گوہر و نخواہ

پہلے شعر میں مصنف نے اپنے باپ لطف اللہ ہندس کا نام لیا ہے، دوسرے میں اپنے دادا نادر العصر احمد کا نام بتایا ہے، پھر اپنی اور اپنے بڑے بھائی کی تصنیفات کا ذکر کیا ہے، بڑے بھائی کا نام نہیں بتایا ہے، مگر مقالہ کے گذشتہ نمبر میں اس کا نام مذکور ہے یعنی ملا امام الدین مؤلف تصریح الافلاک،

اس مجموعہ کے آخر میں ہے۔

"از تصانیف نادر العصر معلم عالمیان مرزا ابو الخیر عرف خیر اللہ غفر لہ ذنبہ لقلبہ"

جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ خط اسی کے دست و قلم کا ہے،

کُل تصنیفات کی تاریخوں کے موازنہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۱۱۱ھ سے ۱۱۶۵ھ تک تقریباً چالیس برس تک اس کا قلم مختلف علوم و فنون کی کتابوں کی تصنیف میں رواں رہا ہے، چنانچہ ذیل میں اس کی تصنیفات کے سنین لکھ دیئے جاتے ہیں،

۱-	الرسالۃ القدسیہ	۱۱۱۱ھ	۴-	مدخل فی النجوم	۱۱۵۰ھ
۲-	السبع الثوابت	۱۱۱۹ھ	۵-	تقریب التحریر	۱۱۶۱ھ
۳-	شرح زیج محمد شاہی	۱۱۴۰ھ کے بعد	۶-	حاشیہ شرح بست باب	۱۱۶۵ھ

اب تک تو ہمیں یہ معلوم تھا کہ یہ خاندان پہلے لاہور میں تھا، پھر یہ دہلی چلا آیا، لیکن اس مجموعہ میں مرزا خیر اللہ مہندس کے نام کے ساتھ بانگرموی لکھا ہے، بانگرمئو کانپور کے پاس موجودہ ضلع اناؤ کے حدود میں ایک بستی ہے، سمجھ میں نہیں آتا، کہ مرزا خیر اللہ کا تعلق بانگرمئو سے کیونکر پیدا ہوا، کیا یہ مان لیا جائے کہ دہلی کے احمد شاہی یا نادر شاہی ہنگامہ سے گھبرا کر یہ پورب کے امن کے مقام میں چلا آیا تھا، مگر یہ بہت ہی مشکوک بات ہے،

امام الدین کا تتمہ امام الدین ریاضی بن ملا لطف اللہ مہندس بن ملا احمد معمار کی تصنیفات کے ذکر میں حاشیہ شرح چغمینی کا ذکر آیا ہے، امام الدین نے اپنی کتاب تصریح میں اپنے اس حاشیہ کا خود حوالہ دیا ہے (دیکھیے تصریح ص ۱۲ و ۴۲ مطبوعہ مجتبائی)

امام الدین نے تصریح میں (ص ۱۵ مجتبائی) اپنے ایک اور رسالہ کا نام لیا ہے جس کا ذکر گذشتہ مضمون میں نہیں آیا ہے، اور وہ اضافہ کے قابل ہے، زمین کے کروی ہونے پر زمین کی سطح پر بڑے بڑے اونچے پہاڑوں اور گہرے غاروں کی بنا پر اعتراض کیا گیا ہے، اس کے جواب میں محقق طوسی اور قطب شیرازی نے کہا ہے کہ دنیا کے بہت سے پہاڑ کی اونچائی کی نسبت زمین سے ایسی ہے، جیسے ایک ہاتھ کے کرے کے قطر کو جو کے عرض کے ساتویں حصہ سے، اس لئے وہ لحاظ کے قابل نہیں، محقق رومی نے شرح چغمینی کے حاشیہ میں جواب پر اعتراض کیا ہے، امام الدین نے اس کے جواب میں یہ رسالہ لکھا ہے،

(معارف ستمبر ۱۹۵۰ء)

قنوج

بعض عرب سیاحوں اور جغرافیہ نویسوں نے سندھ کے علاقہ میں ایک شہر کا نام قنوج بتایا ہے، ایک خیال تو یہ ہے کہ قنوج ایک ہی ہے، جو اودھ میں موجودہ کانپور کے پاس موجودہ فرخ آباد کے ضلع میں واقع ہے، اس کے علاوہ سندھ میں کوئی دوسرا قنوج نہ تھا، اور ان عرب جغرافیہ نویسوں اور سیاحوں نے جنھوں نے سندھ میں کسی قنوج کا ذکر کیا ہے، غلطی کی ہے، دوسرا خیال یہ ہے کہ ان جغرافیہ نویسوں نے سندھ میں ایک قنوج کا ذکر اس طرح متعین طور سے کئی دفعہ کیا ہے کہ اس میں غلط بیانی کا گمان نہیں ہو سکتا،

ایلیٹ صاحب نے جب سے ان عربی جغرافیوں کے اقتباسات انگریزی میں جمع کر دیئے ہیں جن میں سندھ کے قنوج کا بھی ذکر ہے، ہندوستان کے یورپین مورخوں نے بھی اس کا کہیں کہیں ذکر کیا ہے، اور اس وقت سے یہ بحث الجھی ہوئی چلی آتی ہے، ونسنٹ اسمتھ صاحب نے بنگال ایشیاٹک سوسائٹی جرنل جولائی ۱۹۰۹ء میں قنوج کی "تاریخ پر ناقدانہ مضمون لکھا ہے، اس میں بھی یہ غلط بحث موجود ہے، وہ فرق کے لئے سندھ کے شہر مذکور کا نام قِنّوج بکسر کاف و تشدید نون اور اودھ کے قَنَوج کو بفتح قاف و تخفیف نون لکھتے ہیں، بمبئی گزیٹیر میں قنوج سندھ کے حالات جو عربوں نے لکھے ہیں، وہ قنوج اودھ میں ملا دیئے گئے ہیں، راورٹی صاحب نے بنگال ایشیاٹک سوسائٹی جرنل ۱۸۹۲ء میں گزیٹیر کی اس غلطی کی تصیح کی ہے،

تاریخ ایلیٹ کے محشی پروفیسر ڈوسن صاحب اس غلطی کو سمجھتے تھے، مگر وہ اُس کی تہ تک نہ پہونچ سکے، عرب و ہند کے تعلقات "لکھتے وقت میں بھی متردد تھا، اور اُس وقت سے اب تک اُس کی تحقیق میں لگا تھا، اتنی کاوش کے بعد اب حقیقت کی تصویر زیادہ صاف دکھائی دیتی ہے، اور یہی تصویر اب میں دوسروں کو دکھانا چاہتا ہوں، اور اس کے لئے ضرورت ہے کہ عربی جغرافیوں اور تاریخوں کے اُن سارے حوالوں کو جن میں قنوج کا نام آیا ہے، ترتیب سے ایک جگہ کر دوں،

اشتباہ کی بڑی وجہ ابوزید سیرافی کا سفرنامہ ہے، جس نے تیسری صدی ہجری کے وسط میں لکھا ہے، (سنہ ۲۶۴ھ)

وقوم یظہرون التخاییل و	اور کچھ لوگ نظر بندی اور شعبدہ بازی
ویبدعون فیہا ذالک	کرتے ہیں، اور اس میں نئی نئی باتیں
بقنوج خاصۃ وھو بلد	کرتے ہیں، اور یہ فن خاص طور سے
عظیم فی مملکۃ الجوز،	قنوج میں ہے، جو جوز کی سلطنت میں
(ص ۱۲۷)	میں بڑا شہر ہے،

اُس نے قنوج کو جوز میں قرار دیا ہے، جوز کوئی ملک نہ تھا، یہ کتاب ۱۸۱۱ء میں پیرس میں فرنچ ترجمہ کے ساتھ چھپی ہے، اڈیٹر نے اس کی دوسری قرأت "جزر" کی ہے، اور جزر کے بادشاہ کا نام بار بار اس کتاب میں آیا ہے، اس سے ادھر دھیان گیا کہ یہ جوز بھی جزر ہے، اور اس سے مراد صوبہ گجرات ہے،

پھر بشاری مقدسی نے ۳۷۵ھ میں اپنے سفرنامہ "احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم" میں سندھ کے سلسلہ میں قنوج کا نام لیا ہے، اور اُس کی کیفیت لکھی ہے، اور بتایا ہے کہ "اب اس شہر پر

مسلمانوں کا قبضہ ہے، یہاں جامع مسجد ہے، اور گوشت سستا بکتا ہے" ظاہر ہے کہ یہ وصف اودھ کے قنوج پر صادق نہیں آتا، اس لئے خیال ہوا کہ یہ قنوج نام کا دوسرا شہر تھا، جو سندھ میں واقع تھا، پھر چونکہ قنوج کا ذکر محمد بن قاسم کے حملۂ سندھ کے سلسلہ میں بھی ۹۲ھ میں چچ نامہ میں آیا ہے، خیال ہوتا تھا کہ محمد بن قاسم کی نظر اودھ کے اس قنوج تک کہاں پہونچی ہوگی، جو سیکڑوں میل سندھ سے دور تھا، اس لئے اس سے مقصود قنوج نام سندھ ہی کی کوئی چھوٹی موٹی ریاست ہوگی، لیکن پوری تحقیق اور فکر و تلاش نے اب حقیقت کا پردہ چاک کر دیا ہے،

علی بن حامد بن ابی بکر کوفی کی فتوح السند میں جس کے فارسی ترجمہ کا مشہور نام چچ نامہ (۶۱۳ھ) ہے، کئی جگہ قنوج کا نام اور ذکر آیا ہے، فتوح السند کی تالیف کی تاریخ نہیں معلوم ہے، لیکن اس کا یہ فارسی ترجمہ سلطان التمش کے حریف و ہمسر امیر قباچہ والی سندھ کے زمانہ میں ۶۱۳ھ میں کیا گیا ہے، ابھی تک گو اس کی عربی اصل اہل علم کو نہیں مل سکی ہے، لیکن اس کے طرز تحریر اور سلسلۂ روایت اور عربی اشعار سے یہ بات ثابت ہے کہ اصل کتاب پرانے زمانہ میں عربی میں لکھی گئی تھی، مترجم کو یہ عربی کتاب اچھ کے قاضی اسماعیل ابن علی بن موسیٰ ثقفی کے کتب خانہ میں ملی تھی، اس قسم کی فتوحات کی کتابیں عرب مصنفوں نے تیسری صدی ہجری یعنی نویں صدی عیسوی کے اوسط میں لکھی ہیں، چنانچہ فتوح البلدان کا مصنف احمد بلاذری بھی اسی زمانہ میں تھا، اس نے ۲۷۹ھ میں وفات پائی ہے،

چچ نامہ میں قنوج کا نام تین دفعہ آیا ہے، پہلی دفعہ اس وقت آیا ہے جب سندھ میں چچ اور اس کے حریف اکھم میں لڑائی ہوتی ہے، اور اکھم شکست کھا کر رائے قنوج سے مدد طلب کرتا ہے،

"دران وقت ملک ہندوستان یعنی کنوج، سیار بن رائے بدل رائے بود،

اکنوں نوشتها فرستاد وازوے مدد خواست"

(ص ۱۹ نسخہ قلمی دارالمصنفین)

اس عبارت میں ہندوستان کی تعبیر کنوج سے کی گئی ہے، یعنی کنوج کے راجہ کو ہندوستان کا راجہ کہا گیا ہے، اس کے بعد سیوستان کا راجہ بھاگ کر قنوج کے راجہ کے پاس جاتا ہے،

"پس دهته ملک سیوستان بنزدیک شاہ کنوج رفتہ بود و دراں عہد ملک ہندوستان بارانسی بود و کنوج درتحت فرمان سیہرس بن راسل بود"

(چچ نامہ قلمی ص ۲۳)

بارانسی بنارس اور کنوج قنوج ہے، جس سے اس سلطنت کے مرکزی شہر معلوم ہوگئے، اس کے بعد وہ وقت آتا ہے جب سنہ ۹۲ھ میں محمد بن قاسم ثقفی سندھ کو فتح کرکے قنوج کی طرف توجہ کرتا ہے :-

"پس ابوحکیم شیبانی را با دہ ہزار سوار بقنوج فرستاد و نامثال دار الخلافت بدعوت اسلام دمال دخراز بیت المال بروے عرض دارد و باوے بیعت کند، وخود بالشکر بر سرحد کشمیر کہ پنج ماہیات گویند بموضعے کہ پدر داہر چچ سیلائج درخت صنوبر یعنی بیدرا نشاں کردہ بود و داع نمودہ بود . آنجا رسید وآں حد را بتجدید تعیین کردند رائے قنوج دراں وقت جیتل رائے بود چوں لشکر باودہا ر رسید، ابوحکیم شیبانی بفرمود تا زید ابن عمرالکلابی را بیاوردند، پس گفت اے زید! ترا برسالت رائے ہرچند جیتل بباید رفت، وفرمان مطاوعت اسلام بدیشاں رسانید وگفت کہ از دریاے محیط تاحدِ کشمیر را ملوک کہ ہست تحت اقتدار وتمکین اسلام شد وامیر عماد الدین (محمد بن قاسم) راکہ لشکرکش عرب . کنندۂ کفار است مطاوعت نمودند، و بعضے در ربقۂ اسلام آمدند

وباقی برخود مال معین کردند تا بخزانہ دار الخلافت تسلیم کنند، رائے ہر چند گفت، جواب داد کہ ایں ولایت قریب یکہزار و شش صد سال است کہ در ضبط و تصرف ما است و در ایالت فرمان ہیچ مخالفے را زہرہ نبودہ است کہ در ذیل حدود ما را بسپردے و با ہیراہن مخاصمت ما گشتہ و دست تصرف و تعرض در مملکت ما زدے، و از شما ما را چہ نہیب، کہ ایں مقالات و محالات کہ در خاطر می اندیشی، (ص ۱۰۱)

اس عبارت میں پنج ماہیات کی اہمیت ؛ الیٹ کے خیال میں پنج ماہیات یعنی پنج آب ہے جس کو عربوں نے عموماً سرحد کشمیر قرار دیا ہے،

ان اقتباسات سے صاف ظاہر ہے کہ قنوج کی ایک مستقل مضبوط سلطنت تھی، جو سندھ سے باہر ہندوستان میں تھی لیکن دونوں کی سرحدیں پنجاب میں ملتی تھیں، اور یہ بھی ثابت ہوا کہ محمد بن قاسم ثقفی کے حملہ کے پہلے ہی سے ان دونوں سلطنتوں میں فوجی امداد و اعانت کے مراسم قائم تھے، یعنی سندھ کے راجہ قنوج کے راجہ سے کمک مانگا کرتے تھے، اس پہلو کو سامنے رکھکر قنوج کی طرف محمد بن قاسم کی پیش قدمی کا مسئلہ صاف ہو جاتا ہے،

سفرنامۂ ابوزید سیرافی موجود ۲۶۴ھ میں ہے،

وللھند عباد واھل علم یعرفون	اور ہندوستان کے عابدوں اور علم
بالبراھمۃ وشعراء یغشون الملو	والوں کو برہمن کہتے ہیں، اور ہندوستان
ک ومنجمون وفلاسفۃ وکہان	میں شاعر ہیں، جو راجاؤں کے دربار
واھل زجر للغربان وغیرھا	میں رہتے ہیں، اور منجم اور فلسفی، اور
وبھا سحرۃ وقوم یظھرون	کاہن اور کوؤں وغیرہ سے فال
التخاییل ویبدعون فیہ و	نکالنے والے اور اس میں جادوگر ہیں

ذٰلك بقنوج خاصّة وهُوَ	اور کچھ ایسے لوگ ہیں، جو نظر بندی اور
بلدٍ عظیمٍ فی مملکة الجوزر	شعبدہ بازی کرتے ہیں، اور اس میں
(ص ۱۲۶- پیرس)	نئی نئی باتیں پیدا کرتے ہیں، اور یہ فن
	قنوج میں خاص کر ہے، جو جوز کی
	سلطنت میں بڑا شہر ہے،

اس کے بعد وہ عبارت آتی ہے جو غلط فہمی کا سب سے بڑا سبب ہے، یہ شامی سیاح بشاری مقدسی کا بیان ہے، یہ ۳۷۵ھ میں ملتان اور سندھ آیا تھا، اس نے اپنے سفرنامہ میں جس کا نام احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم ہے، قنوج کا ذکر چار جگہ کیا ہے، اور ہر جگہ نیا مغالطہ پیدا کیا ہے، سب سے پہلے "اقلیم السند" کو پانچ بڑے صوبوں میں بانٹا ہے، اور اسی کے ساتھ مکران کا ایک نام اور بڑھا کر چھ کر دیا ہے، کہتا ہے،

فاولہا من قبل کرمان مکران	سندھ کا آغاز کرمان کی طرف سے
ثمّ طوران ثم السند ثم ویہند	مکران ہے، پھر طوران، پھر سندھ
ثمّ قنوج ثم ملتان،	پھر ویہند، پھر قنوج، پھر ملتان،

(ص ۴۷۴- لیڈن)

شیراز میں ایک عالم سے جس نے ہندوستان کی سیاحت کی تھی، وہ ملا تھا، اس کی زبانی یہ بیان نقل کرتا ہے:-

واما قنوج فانها القصبة ایضًا	لیکن قنوج تو وہ بھی پایۂ تخت ہے، اور
ومن مدنها قد اذ اباد، بهارہ،	اس کے شہروں میں سے قدار، ابار،
بارد، وجلین، اودہ، ذھوھر	لبارہ[1]، بارد، وجلین، اودھ، زھوھر،

[1] کیا لبارد، یعنی لاہور؟ سکھ کیا اجین،

برھیروا، (ص ۲۷۹) | برہیرواہے،

وہندا اور ملتان کے بیچ میں قنوج کی نسبت یہ تفاظی کرتا ہے،

قنوج قصبة کبیرة لها ربض	قنوج بڑا شہر ہے، اس میں حصار
ومدینة بها لحوم کثیرة	کی چار دیواری ہے، وہاں گوشت
ومیاہ غزیرة وبساتین	بہت، پانی بہت، باغ شہر کے ارد
محیطة ووجوہ حسنة وماء	گرد، خوبصورت لوگ، پانی اچھا،
صحیح وبلد فسیح متجر ربیح	شہر کشادہ، تجارت نفع بخش، اور
وکل صبیح وموز رخیص إلا	ہر چیز اچھی، کیلے سستے، لیکن وہاں
أنها کثیرة الحریق قلیلة	آگ بہت لگا کرتی ہے، آٹا کم پیدا
الدقیق، أکلهم الأرز ولبسهم	ہوتا ہے، اُن کی خوراک، چاول
الأزر وبناء خسیس وصیف	اور لباس دھوتی ہے، مکان بہت
بغیض، منها إلی الجبال أربعة	معمولی، اور گرمی بہت سخت، شہر سے
فراسخ والجامع فی الربض	پہاڑ تک چار فرسنگ، اور جامع مسجد
رخیصة اللحوم والنهر یخلل	شہر پناہ کے اندر ہے ۔۔۔۔۔ دریا شہر
البلد، أکثر طعام المسلمین	کے اندر سے بہتا ہے، اور مسلمانوں کی
الحنطة وبها علماء وأجلة	خوراک گیہوں ہے، اور وہاں علماء

(ص ۴۸۰) | کابر ہیں،

اس کے بعد قنوج کے متعلق اس کا آخری بیان یہ ہے،

والغلبة بقنوج وبیهند للکفار ود	اور غلبہ قنوج اور وہیند میں ہندوؤں

للمسلمین سلطان علی سل تو، کوہے، اور مسلمانوں کا ایک حاکم:

(ص ۳۸۵) الگ ہے،

وہینڈ کے متعلق یقینی طور سے معلوم ہے کہ وہ قندھار اور دریائے سندھ کے بیچ میں پشاور سے تین منزل جنوب میں واقع تھا، اور ایک سلطنت کی مستقل راجدھانی تھی، سلطان محمود نے سنہ ۲۹۲ میں پشاور لینے کے بعد اس کو فتح کیا تھا[۱]) بشاری نے وہینڈ کے بعد قنوج کو جگہ دی ہے، مگر اس سے مقصود شہر قنوج نہیں، بلکہ قنوج کی سلطنت ہے، جس کے کنارے پنجاب سندھ، اور مالوہ تک پھیلے تھے، قنوج کے اندر جن شہروں کے نام شیراز کے ایک سیاح نے بشاری کو بتائے تھے، اُن میں ایک شہر کی صورت تو صاف ہے یعنی ذجین جو ہمارا اجین (مالوہ) ہے، دوسرے شہر کی صورت کچھ دھندلی سی ہے، اور وہ اودھ ہے، میرے خیال میں اس کی جگہ د ہے یعنی اودھ یعنی اجودھیا یا یودھیا جس کو مسلمانوں نے اودھ بنا لیا تھا،

مشکلات کو حل کرنے کے لئے ایک بات صاف کر لینی چاہئے، پرانے ہندوستان میں راجدھانیوں کی بڑی اہمیت حاصل رہی ہے، اور دائرۂ حکومت یا حدودِ سلطنت کے نام یا تو راجدھانیوں کے نام بعینہٖ رکھے یا پکارے گئے ہیں، یا ان حکمران خاندانوں کے نام پر اُن کے نام رکھے گئے ہیں، اُن کی مثالیں پچھلی تاریخوں میں بھی ملتی ہیں، اور اب بھی تمام ریاستوں کے ناموں میں یہی طریقہ رائج ہے، اور بہار، حسن پٹی، اور بہار کی مثالیں انگریزی علاقوں میں پائی جاتی ہیں،

ایک بات اور ذہن میں رہے، بشاری بڑا محتاط سیاح ہے، اُس نے اپنا سفرنامہ بڑی احتیاط سے لکھا ہے، اس کی احتیاط ہی کا نتیجہ یہ ہے کہ اُس نے ہندوستان کے حال میں صاف صاف لکھ دیا ہے، کہ باوجود لوگوں سے تحقیق اور دریافت کے میں ہندوستان کے وصف میں صحت

---

[۱] گردیزی ص ۷۰ برلن

کی ذمہ داری نہیں لیتا، کہتا ہے،

ومع هذا فلا اضمن عن صفة ما اضمن من غيره ولا اصف الا مصادره ولا استقصي في شرحه لما روي كفى بالمرء كذبا ان يحدث بكل ما سمع ولقوله صلعم ليس الخبر كالمعاينة ولولا خشية ان يختل هذا الاصل ويبقى من الاسلام صدر لا عرضنا من الكلام فيه
(ص ۴۷۵)

باوجود اس کے کہ میں ہندوستان کے بیان کی ذمہ داری نہیں لیتا، جو اس کے علاوہ دوسرے ملکوں کی لیتا ہوں اور میں صرف اس کے شہروں کا حال بیان کرتا ہوں، اور اس کی ساری تشریح نہیں کرتا، کیونکہ حدیث میں ہے کہ انسان کے جھوٹا ہونے کے لئے یہ کافی ہے کہ جو کچھ سنے وہ بیان کردے اور اس لئے کہ سننا دیکھنے کے مانند نہیں، اگر مجھے یہ ڈر نہ ہوتا کہ یہ اصل یعنی اسلامی ملکوں میں سے کسی کا حال چھوٹنے نہ پائے ٹوٹ جائیگی تو میں ہندوستان کا بیان چھوڑ دیتا،

اس ملک کے جغرافی بیان کے متعلق اس نے تصریح کی ہے کہ اس کو اصطخری فارسی کے جغرافیہ سے نقل کیا ہے، (ص ۴۵۸) یا دوسرے سیاحوں سے سن کر اور پوچھ کر لکھا ہے، اس لئے قنوج کی جائے وقوع کی نسبت اس کا بیان اعتبار سے خارج ہے،

مگر اتنا صحیح ہے کہ تیسری صدی کے خاتمہ پر عرب جہازرانوں کے کانوں تک قنوج کا نام پہونچ چکا تھا، بزرگ بن شہریار ناخدا جو تیسری صدی کے خاتمہ پر تھا، قنوج کا نام لیتا ہوا

ایک عرب سیاح کی زبانی بیان کرتا ہے:-

ان بقنوج من بلدان الهند	ہندوستان کے شہروں میں قنوج
من تاخذ الفو فلة بين شفرتها	میں ایسے لوگ ہیں، جو ڈلی کو اپنے دونوں
فتکسرها قطعاً من شدة	ہونٹوں میں لے کر اس زور سے دباتے
ما تضغطها،	ہیں کہ وہ ٹوٹ جاتی ہے،

(عجائب الہند ص ۶)

سنہ ۳۰۳ھ میں مسعودی ہندوستان آیا، اس نے گو یہ غلطی کی ہے کہ قنوج کے راجہ کو سندھ کے بادشاہوں میں شمار کیا ہے، مگر اس کی توجیہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں قنوج کی سلطنت سندھ تک تھی اسلئے قنوج کے راجہ کو سندھ کے راجاؤں میں شمار کیا ہے، اس ایک بات کے علاوہ مسعودی کا سارا بیان بہت کچھ غلط فہمیوں کو دور کرنے والا ہے،

مسعودی نے قنوج کا ذکر تین موقعوں پر کیا ہے، پہلے باب ص ۸۰ میں ہے،

ونیا ویہ (بلهرا) من ملوک	اور بلہرا راے کا حریف
الهند ممن لا بحرله بؤوره	ہندوستانی راجاؤں میں سے جس کے
صاحب مدینة لقنوج وهذا	پاس سمندر نہیں، بورہ قنوج کا راجہ ہے،
الاسم سمة لكل ملك يلي	اور یہ بورہ لقب ہر اس راجہ کا ہوتا ہے،
هذه المملكة وله جيوش	جو اس ملک پر راج کرتا ہے، اور اس
مرتبة على الشمال والجنوب	کی فوجیں اتر، دکھن، پورب اور پچھم
والصبا والدبور لانه يلي	ہر رخ پر رہتی ہیں، کیونکہ ہر رخ پر اس
كل وجه من هذه الوجوه	کے اس سے کوئی نہ کوئی لڑنے والا ہے،

یلفاہ ملک محاب لہٗ،

(طبیع لیڈن)

یہ بورہ عجب نہیں کہ بھوج رائے کا عربی تلفظ ہو جو قنوج کے مشہور راجہ بھوج رائے کے بعد یہاں کے راجاؤں کا موروثی لقب قرار پاگیا تھا،

اس کے بعد مسعودی[1] قنوج کا دوبارہ ذکر ان لفظوں میں کرتا ہے،

ملک قنوج بن ملوک السند بوورہ	سندھ کے راجاؤں میں سے ایک قنوج
ھذا اسم کل ملک یلی القنوج	کا راجہ بورہ ہے، اور یہ بورہ ہر اس راجہ
وھناک مدینۃ یقال لھا بوورہ	کا لقب ہے، جو قنوج پر راج کرے اور
باسم ملوکھم وقد صارت	یہاں ایک شہر بھی اسی کے نام سے ہے
الیوم فی حیز الاسلام وھی	جس کا نام بورہ، وہاں کے راجاؤں کے
من اعمال الملتان ومن	نام سے ہے، اور وہ آج کل اسلام کی
ھذہ المدینۃ یخرج احد	حکومت میں داخل ہے، اور وہ ملتان
الانھار التی اذا اجتمعت کانت	کے علاقوں میں شامل ہے، اور اسی شہر
نھر مھران السند ..... وبوورہ	سے ان دریاؤں میں سے ایک دریا
ھذا الذی ھو ملک القنوج ھو	نکلتا ہے، جن کے مل جانے سے دریائے
ضد البلھرای ملک الھند	سندھ بنتا ہے ....
	اور یہ بورہ جو قنوج کا راجہ ہے وہ ہندوستان
	کے راجہ بلہرا کا مخالف ہے،

---

[1] ص ۳۷۲ جلد اول لائیڈن،

مسعودی کی اس عبارت سے ظاہر ہے کہ قنوج کی سلطنت سندھ سے ملی تھی، اور سندھ کا علاقہ مسعودی کے بیان کے مطابق کشمیر سے ملا ہوا تھا، (ص ۴، ۴) گویا پنجاب کا علاقہ بھی سندھ ہی میں شمار ہوتا تھا، اب وہ کہتا ہے کہ یہاں یعنی سندھ کے پاس اس راجہ کے نام بھوج رائے کے نام سے ایک شہر بھی آباد تھا یعنی اس کا نام بھی بھوج رائے ہے، اور یہ اُن پانچ دریاؤں میں سے کسی ایک کے دہانے پر واقع ہے جن سے مل کر دریائے سندھ بنتا ہے، ان پانچ دریاؤں میں سے ہر ایک دریا موجودہ پنجاب میں ملتا ہے، اس سے ظاہر ہے کہ وہ موجودہ پنجاب میں دریائے ستلج کے کنارے جو ہندوستان خاص اور پنجاب کی طبعی سرحد ہے کہیں بستا ہوگا، اور وہ بھوج رائے یا قنوج کی سلطنت کا اس سمت میں آخری شہر ہوگا، اور اس لئے وہ حکمراں خاندان کے نام پر بھوج رائے اور راج دھانی کی حکومت کی نسبت سے قنوج کہلاتا ہوگا، جیسے آج بھی حیدرآباد، میسور، بڑودہ، بھوپال، رام پور وغیرہ ہماری ہندوستانی ریاستوں کا ہر شہر، اس کے والی یا اس کے پایۂ تخت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، اس سے بشاری مقدسی کے اس بیان کی مشکل کہ سندھ کے شہروں میں سے ایک کا نام قنوج ہے حل ہو جاتی ہے، اور قنوج میں مسلمانوں کی آبادی، جامع مسجد، اور گوشت کی کثرت کی توجیہ بھی ہو جاتی ہے، کیونکہ مسعودی کے بیان کے مطابق ۳۰۰ھ میں یہ شہر ملتان کی اسلامی عمل داری میں داخل ہو چکا تھا،

مسعودی کے دوسرے بیان سے ہمارا خیال اور زیادہ صاف ہو جاتا ہے، وہ قنوج کی سرحدوں کا حال یہ بتاتا ہے:

فاما مملکة بؤورہ وھو ملک	لیکن بورہ کا راج، اور وہ قنوج کا
القنوج فان مسافة مملکته	راجہ ہے، تو اس کے راج کی وسعت
نحو من عشرین ومائة فرسخ	ایک سو بیس فرسنگ لمبائی میں، اور

في مثلها فراسخ سنديّة الفرسخ
ثمانية اميال بهذا الميل وهذا
الملك الذي قدّمنا ذكره
فيما سلف ان له جيوشاً اربعة
على مهاب الرّياح ان ربع بكل
جيش سبع مائة الف وقيل
تسع مائة الف فيحارب بجيش
الشمال صاحب المولتان ومن
معه في ذالك الثغر من المسلمين
ويحارب بجيش الجنوب لبلهرى
ملك المانكير وبالجيوش الباقية
من يلقاه من كل وجه من
الملوك ويقال ان لمكه يحيط
في مقدار ما ذكرنا من المسافة
من المدن والقرى والضياع
مما يدرك الاحصاء والعدد
الف الف وثمانية مائة الف قرية
بين اشجار وانهار وجبال ومروج
(ص ۴،۳)

اتنی ہی چوڑائی میں سندھی فرسخ سے ایک
فرسنگ اس میل سے ۸ میل کے برابر ہے،
اور یہ راجہ جس کا میں پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں
کہ اس کی چار فوجیں ہوا کے چاروں رخ
پر ہیں، ہر فوج کی تعداد سات لاکھ اور
کہتے ہیں کہ ۹ لاکھ ہے تو وہ اتر کی فوج
سے ملتان کے امیر اور جو اس کے ساتھ
اس سرحد میں مسلمان ہیں، اُن سے
لڑتا ہے، اور دکھن کے لشکر سے دکھن
رائے مان کھیڑہ کے راجہ سے مقابلہ
کرتا ہے، اور باقی فوجوں سے جس طرف
سے کوئی حملہ آور آئے، اُس کا سامنا
کرتا ہے، اور کہتے ہیں، کہ اس کی
سلطنت کی اوس وسعت میں جس
کا ذکر میں نے کیا، شہر، گاؤں،
دیہات کی تعداد، جو گنتی میں آئی
ہے، اٹھارہ لاکھ ہے، درختوں کے جھنڈ
اور دریاؤں اور پہاڑوں اور سرسبز میدانوں
کے درمیان،

بلہرا تو معلوم ہو چکا ہے کہ شمالی گجرات و کاٹھیاواڑ کا راجہ ولبھ راے ہے، اور مانکیر جو کبھی مانگو سمجھا جاتا تھا اب مان کھیڑ ہے، جو ولبھ راے کی راج دھانی تھی، اور جو موجودہ پونہ کے قریب تھا، اب عرب سیاحوں کے قنوج راج کی دو حدیں معلوم ہو گئیں، یعنی اتر کی سمت میں وہ ملتان کی حکومت سے مل جاتا تھا، اور دکھن میں ولبھ راے کی سلطنت سے، اور اس کی وسعت میں اٹھارہ لاکھ شہر اور دیہات آباد تھے، جن میں جنگلوں، پہاڑوں، دریاؤں اور سرسبز میدانوں کے سلسلے تھے،

ابن حوقل بغدادی اوسی زمانہ کا مشہور سیاح ہے، اوس نے $\frac{۳۳۱}{۹۴۳}$ میں بغداد سے اپنا سفر شروع کیا، اور ہندوستان آیا، اوس نے اپنی کتاب میں چار دفعہ قنوج کا نام لیا ہے (ص ۱۴، ص ۱۶، ص ۲۲۷، ۲۲۸ و ۲۸۶ میں)

عرب سیاحوں اور جغرافیہ نویسوں میں یہی سب سے پہلا شخص ہے، جس نے قنوج کو مملکت ہند کا پایہ تخت بتایا ہے، ص ۱۴، اور ص ۱۶ میں اوس نے ہندوستان کی لمبائی اور چوڑائی لکھی ہے اور بتایا ہے کہ ہندوستان کی سرزمین کی لمبائی مکران (بلوچستان) سے شروع ہو کر (منصورہ) اور سندھ ہوتے ہوئے قنوج تک، اور پھر اس کے آگے بڑھ کر تبت تک چار مہینوں کا راستہ ہے، (ص ۱۶)

اس بیان سے واضح ہو گیا کہ شہر قنوج مکران یعنی بلوچستان سے تبت اور کوہ ہمالیہ کی سمت میں کئی مہینوں کے راستہ پر واقع تھا، اور ظاہر ہے کہ یہ شہر سندھ کے اندر نہیں تھا، بلکہ وہ لامحالہ وہی قنوج تھا، جس کو ہم اب بھی قریب قریب اسی مسافت پر جانتے اور پہچانتے ہیں،

ابن حوقل ص ۲۲۷ میں تیسری دفعہ قنوج کا نام لیتا ہے، اور کہتا ہے کہ

وھذہ مدن الھند التی عرفتھا — اور یہ ہندوستان کے وہ شہر ہیں، جن کو

دلھا بواطن واماکن کفر زان	میں نے جانا اور اس کے اندرونی
وقنوج فی المفاوز وھی کلمطة	مقامات ہیں، جیسے فرزان، اور قنوج
وادھشت فی اقطار نائیة و	جنگلوں اور صحراؤں میں اور دوملطہ
اماکن سحیقة لا یصل الیھا	کی طرح اور بڑے بڑے دور اطراف
تاجر الا من اھلھا لانقطاعھا	اور بعید مقامات ہیں، جہاں وہاں
وکثرة الآفات المقطعة	کے باشندوں کے سوا کوئی تاجر نہیں
لقاصدھا،	پہنچ سکتا، کہ وہاں کے جانے والوں
	کو بڑی بڑی آفتوں کا سامنا
	کرنا پڑتا ہے،

اس سے معلوم ہوا کہ قنوج سندھ سے اتنی دور اور جنگلوں اور صحراؤں کے اندر واقع تھا، کہ مسلمان تاجر وہاں تک پہنچ نہیں سکتا تھا،

ابن حوقل نے ص ۲۰۰ پر آخری دفعہ قنوج کا ذکر کیا ہے،

اصطخری سنہ ۳۴۰ھ میں ہندوستان آیا تھا اس نے اپنی کتاب مسالک الممالک میں اپنے پیشروؤں اور ہم عصروں کی فیاضی سے فائدہ اٹھایا ہے، اس نے قنوج کا بیان تقریباً ابن حوقل سے لیا ہے، چنانچہ قنوج کا نام دو دفعہ لیا ہے، ایک دفعہ وہ دنیا کی سلطنتوں کے مشہور دارالسلطنتوں کے سلسلہ میں کہتا ہے،

ومملکة الھند منسوبة الی	اور ہندوستان کی سلطنت اس
الملک المقیم بقنوج،	راجہ کی طرف منسوب ہے، جو قنوج
(ص ۹ لائیڈن)	میں رہتا ہے،

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں قنوج راج کی اہمیت اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ ملک ہند کا پایۂ تخت اکیلے اسی کو بتایا جارہا ہے، آگے بڑھ کر مصنف دنیا کے ملکوں کی مسافت اور پھیلاؤ کا کا حال لکھتا ہے، اس سلسلہ میں ہندوستان کا نام لے کر لکھتا ہے،

واما ارض الھند فان طولھا	لیکن ہندوستان کا ملک تو اس کا طول
من عمل مکران فی ارض المنصورۃ	منصورہ اور بدھ اور باقی سرزمین سندھ
والبدھۃ وسائر بلاد السند	میں مکران کی عملداری سے شروع ہو کر
الی ان تنتھی الی قنوج ثم	قنوج پر ختم ہوتا ہے، پھر اس سے آگے
تجوزہ الی ارض التبت نحو	بڑھ کر تبت تک چار مہینوں کی راہ ہے
من اربعۃ اشھر وعرضھا من	اور اس کا عرض بحر فارس سے قنوج
بحر فارس علی ارض قنوج نحو من	کے ملک تک تین مہینوں کی راہ،
ثلاثۃ اشھر، (ص ۱۱)	

یہ وہی ابن حوقل کی آواز بازگشت ہے، اور اس نے بھی قنوج کی مسافت وہی لکھی ہے،

۳۷۲ھ میں گوزگانان واقع ترکستان قریب فاریاب میں بیٹھ کر ایک مصنف نے حدود العالم من المشرق الی المغرب کے نام سے فارسی میں دنیا کا ایک جغرافیہ لکھا تھا، سنہ ۱۹۳۰ء میں یہ کتاب لینن گراڈ روس میں چھاپی گئی تھی اور ۱۳۵۲ھ میں طہران میں دوبارہ چھپی، یہی نسخہ میرے پیش نظر ہے، اس میں صوبہ سرحد اور پنجاب کے شہروں کے متعلق بعض معلومات بالکل نئے ہیں، مصنف کا نام گو معلوم نہیں، مگر چونکہ ترکستان اور ہندوستان کی تجارتی آمد و رفت برابر قائم تھی، اس لئے یہ معلومات تاجروں کی زبانی مصنف کو حاصل ہوئے ہوں گے،

میرے علم میں یہ پہلی کتاب ہے جس میں لاہور اور جالندھر کا نام آیا ہے، اور قنوج کے متعلق

بھی بعض نئے بیانات اس میں پائے جاتے ہیں، گجرات اور کاٹھیاوار کے شہروں کے نام لیکر کہتا ہے:

"واندریں ہمہ پادشاہ بلہراسیت وازپس ایں پادشاہ قنوج است ...... قنوج شہرے بزرگ ست ومستقر رائے قنوج است ...... وبیشتر از ملوک ہند طاعت او دارند واین رائے بیشتر از خویشتن کس را نه بینید وگویند که او را صد وپنجاه هزار سوار است و ہشت صد پیل که بروز حرب بر نشیند۔" (ص ۴۳) لہور شہریست با ناحیت بسیار و سلطانش از دست امیر ملتان است، واندرو بازارها وبتخانها است واندرو درخت چلغوزه وبادام وجوز ہندی بسیار است وہمہ بت پرستند واندرو ہیچ مسلمان نیست، رامیان شہرے است برسر تلے عظیم، واندروے اندکے مسلمانان اند وایشان را سالاری خوانند، ودیگر ہمہ بت پرستان اند، وآنجا بردہ ہندو وجاز ہندوستان افتد بسیار وسلطان وے از قبل امیر ملتان است ...... جالندھر شہریست بر سر کوہ اندر سردسیر واز وے جامہ بسیار خیزد ساده ومنقش واندر میان رامیان وجالندھر پنج روزہ راه است وہمہ راه درختان ہلیلہ وبلیلہ وآملہ ودارو ہا است کہ ہمہ جہان ببرند واین شہر از حدود ملک قنوج است، سلابور شہرے بزرگ است با بازارہا وبازرگانان وخواستہا وپادشاه از آن رائے قنوج است، ودرہمہ ایشان گوناگون است کہ داد وستد ایشان بدوست ...... وہر یکے را وزنے دیگر است واندرو بت خانہائے بسیار است، ودانشمندان ایشان برہمن اند، ...... بہیون شہریست چون رباطے و ہر سالے اندرو چہار روز بازار تیز باشد وازانجا بقنوج نزدیک ست وحدود را یست واندرو سی صد بتخانه است واندرو آبے است کہ گویند کہ ہر کہ خویشتن را بدان آب بشوید، ہیچ آفتش نرسد وہر گہ کہ مہترے از ایشان بمیرد، وہمہ کہترے کہ اندر

سایۂ او باشند خویشتن مکشند و پادشاہ این شہر بر تخت نشیند و ہر جا کہ رود آن تخت را
بر کتفہا ہمی برند بسے مرد تا آنجا کہ او خواہد، میان این شہر و تبت مقدار پنج روزہ
راہ است اندر عقبہاے سخت، ہیتال ناحیتے است بنزدیک قنوج میان شان کوہ
عظیم و ناحیتے خرد است ولکن مردمان جنگی و مبارز و پادشاہے او از ملوک اطراف
است و میان راے قنوج دشمنیست ....

ر ہند (و مہند) شہرے بزرگ ست و پادشاہے وے جیپال (جیپال) است و این
جیپال اندر طاعت راے قنوج است، و اندر وے مسلمانان اند اندک و جہاز ہاے ہندوستان
بیشتر بدین ناحیت افتد، از مشک و گوہر جامہاے باقیمت، قشمیر شہرے بزرگ است
بانعمت و بازرگانان بسیار و پادشاہ وے راے قنوج راست و اندر وے بتخانہا
بسیار است کہ ہندوان آنجا بزیارت آیند،

(از صفحہ ۴۴ تا ۴۶ حدود العالم، طہران)

حدود العالم کی ان تصریحات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اُس زمانہ میں یعنی ۳۷۲ھ میں قنوج کی حکومت دکھن کی طرف ولبھ راے کی حدود حکومت سے جا کر ملتی تھی، اور اتر طرف پنجاب کے شہر جالندھر سے گذر کر لاہور سے کترا کر کشمیر اور موجودہ سرحدی شہروں تک پہنچ کر وہنید پہ جا کر ختم ہوتی تھی، لاہور کا ہندو راجہ اُس زمانہ میں ملتان کے مسلمان امیر کا ماتحت تھا، غرض قنوج اور سندھ کی سرحدیں پنجاب میں آکر مل جاتی تھیں، اس کے علاوہ کوئی دوسرا قنوج نہ تھا، اور اس کے جس مقدس دریا کا ذکر ہے، وہ یقیناً گنگا ہے جس کے ساحل پر قنوج آباد تھا،

مصر کے فاطمی وزیر مہلبی نے تقریباً ۳۸۶ھ میں جغرافیہ کی کتاب "عزیزی" لکھی ہے، اور

اور چونکہ اس زمانہ میں سندھ کی ریاستیں مصری فاطمیوں کی نگرانی میں داخل ہو چکی تھیں، اور مصر اور سندھ کے درمیان برابر سفیر آتے جاتے رہتے تھے، اس لئے اس کو قنوج کی پوری واقفیت تھی وہ کہتا ہے،

"قنوج ہندوستان کے دور ترین شہروں میں ہے، ملتان کے پورب ہے، ملتان اور قنوج کے بیچ میں دوسو بیاسی فرسنگ کی مسافت ہے، اور وہ ہندوستان کا پایۂ تخت اور سب سے بڑا شہر ہے، لوگوں نے اس کا حال بیان کرنے میں بہت مُبالغہ سے کام لیا ہے، کہتے ہیں کہ اس میں جوہریوں کے تین سو بازار ہیں، اور اس کے راجہ کے قبضہ میں ڈھائی ہزار ہاتھی ہیں، ان میں سونے کی کانیں بھی ہیں"[1]

اب اس کے بعد غزنوی دور شروع ہو جاتا ہے، اور سبکتگین اور پھر محمود غزنوی کے حملے ہندوستان پر پے درپے ہونے لگتے ہیں، اس سلسلہ میں قنوج نام کا کوئی شہر پنجاب یا سندھ کے علاقہ میں نہیں آتا، اور نہ اُس کا کوئی ذکر کسی طرح ہوتا ہے، البتہ اودھ کے مشہور قنوج کا نام بار بار آتا ہے یہاں تک کہ ۴۱۰ھ میں محمود اس کو فتح کر لیتا ہے، ابوریحان البیرونی نے جو سلطان محمود کا معاصر تھا، کتاب الہند میں قنوج کا ذکر بار بار کیا ہے، مگر اس کو اچھی طرح معلوم تھا کہ قنوج سے کون شہر مقصود ہے اور وہ کہاں تھا،

ص ۱۱ میں محمد بن قاسم والے قنوج کا نام وہ اس طرح لیتا ہے،

لما دخل محمد بن قاسم ارض	جب محمد بن قاسم سندھ کی سرزمین میں
السند من نواحی سجستان	سیستان کی طرف سے آیا، اور شہر
وافتتح بلد بمہنواو سماہ منصورۃ	بمہنوا کو فتح کیا، اور اس کا نام منصورہ
وبلد مولتان وسماہ معمورۃ	رکھا، اور مولتان کو فتح کر کے اس کو

[1] تقویم البلدان ابوالفدا ص ۳۶۰ (پیرس)

وادغل فی بلاد الہند الی مدینۃ	معمورہ کے نام سے موسوم کیا، اور
کنوج ووطی، ارض القندھار	ہندوستان کے شہروں میں کنوج
وحد ود کشمیر،	تک چلا گیا، اور قندھار کے ملک اور
	کشمیر کے حدود تک پہنچا،

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس کی مراد وہی کنوج یا قنوج ہے، جس کا ذکر اس نے بار بار کیا ہے، ص ۲۰ میں وہ کہتا ہے ؛

ثم یستعمل فی مدّ دیش اعنی	پھر مدیش یعنی بیچ کے ملک میں اور
واسطۃ المملکۃ وھی ما حول قنوج	وہ قنوج کے چاروں طرف کے شہر
فی جہاتہ ویسمی ایضاً آریاورت	ہیں، اور اُن کو آریہ ورت بھی کہتے ہیں،

ص ۷۹ میں ہے:۔

ویسمونہا مد دیش ای واسطۃ	اور اس کا نام مدیش یعنی بیچ کا ملک ہے،
الممالک وذٰلک من جہۃ المکان	اور یہ نام اس کی جائے وقوع کے لحاظ
لانہا فیما بین البحر والجبل وفیما	سے ہے، کیونکہ وہ دریا اور پہاڑ کے بیچ
بین الجروم والصرود وفیما بین	میں، اور گرم اور سرد ملکوں کے درمیان
حدیہا الشرقی والغربی ومن	میں اور اس کے مشرقی اور مغربی حدود
جہۃ الملک فقد کان کنوج	کے وسط میں اور بادشاہی کے لحاظ سے
مسکن عظماء ھم الجبابرۃ	تو کنوج اُن کے بڑے بڑے جبروت
الفراعنۃ ...... وبلد کنوج	والے راجاؤں کا مسکن ہے ......
موضوع علی غرب نہر گنگ	...... اور شہر کنوج دریائے گنگا کے

کبیرجداً واکثرہ الآن خراب	مغربی کنارہ پر ہے، بہت بڑا شہر تھا،
معطل لزوال مقر الملک عنه	لیکن اس وقت اس کا بڑا حصہ ویران
الی بلد باری وھو فی شرق	ہے، کیونکہ پایۂ تخت وہاں سے ہٹ کر
گنگ وبینھما مسیرۃ ثلثة	اب شہر باری میں آگیا ہے، جو گنگا
ایام او اربعة،	کے پوربی کنارہ پر ہے، اور ان دونوں
	کے بیچ میں تین یا چار دن کی راہ ہے،

اس سے معلوم ہوا کہ قنوج راج، مدھ دیش یعنی بیچ کا ملک تھا، اس کا دوسرا نام آرجا فرت یعنی آریہ ورت تھا، اور شہر قنوج گنگا کے مغربی ساحل پر تھا، جو اب محمود کے حملہ کے بعد ویران تھا،

۳۶۷ھ سے غزنوی بادشاہوں اور ہندوستان کے راجاؤں میں صلح و جنگ کے تعلقات شروع ہوتے ہیں، ۳۶۷ھ میں سبکتگین نے ہندوستان کے سرحدی شہروں پر حملہ کیا، اور شاہیہ خاندان کے حکمرانوں سے اس کا واسطہ پڑا، سبکتگین کے بیٹے محمود نے ۳۹۹ھ میں اجین، گوالیار، کالنجر، دہلی، اجمیر، اور قنوج کے راجاؤں کی متحدہ فوجوں کو شکست دے کر شاہیہ کا خاتمہ کر دیا، اور اس کے چند سال کے بعد ۴۰۹ھ میں قنوج تک پہونچ گیا، راجہ نے صلح کی، اور اپنا پایۂ تخت قنوج سے اٹھا کر گنگا کے شرقی کنارہ پر جاکر بسایا، اور باری اس کا نام رکھا، اسی زمانہ کے مسلمان مصنف عبدالقادر بغدادی المتوفی ۴۲۹ھ نے اپنی کتاب الفرق بین الفرق میں فخریہ لکھا کہ "اب بحمد اللہ ملتان سے لیکر قنوج تک اسلام کی عملداری ہے"[۱]،

ہمارے بعض بزرگوں نے تو قنوج کو اتنا پرانا بتایا ہے کہ سکندر کے زمانہ میں موجود تھا، اور راجہ پورس جس نے سکندر کا مقابلہ کیا تھا، وہ یہیں کا راجہ تھا، جیسا کہ سکندر نامہ میں کہتے ہیں:-

---

[۱] ص ۲۷۲،

بقنوج خواہم شدن سوے خور　　　　خدایا بودم دراں راہ دور

حالانکہ قنوج سکندر کے وقت میں تھا ہی نہیں، البتہ نظامی کے زمانہ میں وہ ہندوستان کا مرکز دوبارہ بن گیا تھا، سکندر نامہ ۵۸۴ھ میں لکھا گیا ہے، اور اس کے چھ برس بعد ۵۹۰ھ میں شہاب الدین غوری نے قنوج کو دوبارہ فتح کیا ہے،

قنوج کی تاریخ کے واقف کار جانتے ہیں، کہ قنوج پر تین مختلف دور گذرے ہیں، اس کا نام تاریخ میں سب سے پہلی دفعہ چھٹی صدی عیسوی میں آتا ہے، ۶۰۶ء سے ۶۴۷ء تک یہاں کا مشہور راجہ ہرش شمالی ہند کا سب سے بڑا طاقت ور بدھ راجہ گذرا ہے،

محمد بن قاسم نے سندھ پر ۷۱۱ء (مطابق ۹۲ھ) میں حملہ کیا، اور ۷۱۲ء میں پورے سندھ پر قبضہ کرلیا، اس لئے محمد بن قاسم نے قنوج کے جس راجہ سے خط و کتابت کی، اور حملہ کی دھمکی دی، وہ راجہ ہرش کے سلسلہ کا راجہ ہوگا، چچ نامہ میں اس عہد کے قنوج کے چند راجاؤں کے نام آئے ہیں، پہلا سیار بن راے بدل راے، دوسرا سیہرس بن راسل اور تیسرا ہرچند رجیتل راے، محمد بن قاسم نے اس آخری راجہ کو خط لکھ کر اسلام کی دعوت دی تھی،

راجہ ہرش کے بعد کے راجاؤں کے نام تاریخ ہند کے صفحات سے گم ہیں، اس لئے یہ نام ان خالی جگہوں کے بھرنے کے لئے کام آسکتے ہیں، البتہ ناموں کی تصحیح کا مرحلہ باقی رہ جائے گا،

اب اس کے بعد ۸۱۶ء کے قریب بھیلمان کے گرجر پرتھار قوم کے راجہ ناگ بھٹ نے قنوج فتح کرلیا، اور کئی صدیوں تک اس کی اولاد اس پر حکمراں رہی، اس کا پوتا بھوج راے ہوا جس نے ۸۴۰ء سے ۸۹۰ء تک قنوج پر حکومت کی ۲۲۵ھ ۲۷۶ھ اور یہی وہ راجہ ہے جس کا نام عربوں

۱؎ قدیم تاریخ ہندونسنٹ اسمتھ ترجمہ جامعہ عثمانیہ ص ۵۷۲،

نے بورہ رکھا ہے،

ابوزید سیرانی نے جو ۲۶۶ھ میں تھا، قنوج کے متعلق جو فقرہ لکھا ہے اس کی دو قرأتیں ہیں، ایک وھو بلد عظیم فی مملکۃ الجوز، اور دوسری فی مملکۃ الجزر، ایک صاحب کی رائے ہے الجوز کو الجوزی پڑھا جائے، اور اس کو بھوج کا عربی تلفظ قرار دیا جائے، کیونکہ یہ زمانہ قنوج میں بھوج کی حکومت کا تھا، میری رائے میں اگر جزر پڑھا جائے اور اس سے گوجر مراد لیا جائے تو بھی صحیح ہو سکتا ہے، کیونکہ یہ راجہ گرجر پرتھار تھے، جیسا کہ ابھی کہا گیا ہے،

بہرحال اس کے بعد مسعودی نے ۳۰۰ھ ۹۱۲ قنوج کے راجہ کو بورہ یعنی بھوج رائے کے نام سے یاد کیا ہے، بھوج اول کے بعد مہندر پال نے اور اس کے بعد اس کے بڑے بیٹے بھوج دوم نے چند سال ۹۱۵ء تک سلطنت کی، اور ۹۱۰ء سے ۹۴۰ء تک بھوج دوم کے بیٹے ہیپال نے حکومت کی، مگر عربوں نے ان سب کو بھوج رائے ہی کہا،

قنوج کا راجہ راجیہ پال جس کو سلطان محمود سے پالا پڑا، اسی نسل کا راجہ تھا جس کو عتبی نے غلطی سے رائے جےپال لکھا ہے[1]

۱۰۹۰ء سے کچھ پہلے قنوج کے یہ گرجر پرتھار راجہ ختم ہوگئے، اور گھڑوار قبیلہ کے راجہ چندر دیو نے قنوج کو فتح کرکے نیا راج کھڑا کیا، ۵۹۰ھ ۱۱۹۴ء میں سلطان شہاب الدین غوری نے جس راجہ سے لڑکر قنوج چھینا تھا، وہ اسی گھڑوار خاندان کا تھا، اس کے بعد قنوج نے اپنی اہمیت ایسی کھوئی کہ نام کے سوا کچھ اور باقی نہیں رہا،

---

[1] ترجمہ ونسنٹ اسمتھ ص ۸۰، ۱۵،

اس سارے طول بیان کا نتیجہ یہ ہے کہ شہر قنوج ایک ہی تھا، جو اب بھی ہے، اور جو ہندوستان کی سب سے بڑی راجدھانی تھی، اور عربوں نے سندھ کی سمت میں جس قنوج یا بورہ کا ذکر کیا ہے، اس سے مقصود سلطنت قنوج کا آخری سرحدی مقام تھا، جس کو اسی لئے بھوج رائے بھی کہتے تھے، جیسے آج بھی سلطنت حیدرآباد کے کسی مقام کو حیدرآباد یا نظام یا بڑودہ کے کسی سرحدی مقام کو بڑودہ یا گیکواڑ کہتے ہیں،

(معارف مارچ ۱۹۴۷ء)

سند معافی جزیہ

ہندوستان کی اسلامی سلطنت میں غیر مسلمان ذمی رعایا سے جزیہ کے نام سے جو ٹیکس وصول ہوتا تھا، اس کی نسبت انگریز مورخوں نے اور اُن کی دیکھا دیکھی ہندو مصنفوں نے جو بے سروپا باتیں پھیلا رکھی ہیں، ان کا جواب بارہا دیا جا چکا ہے، اب ہم کو ایک نئی دستاویز ہاتھ آئی ہے، جس سے یہ معلوم ہوگا کہ یہ کوئی ایسا ٹیکس نہ تھا جو ظلم سے لگایا جاتا تھا، اور کبھی معاف نہیں ہوتا تھا، بلکہ ایسے لوگوں سے جو غریب ہوتے تھے، عموماً معاف کر دیا جاتا تھا، بلکہ ہندوستان کے عام کاشتکاروں سے جو زیادہ تر غریب طبقہ ہے، اکثر معاف کر دیا جاتا تھا،

چند سال ہوئے کہ جامعہ ملیہ دہلی کے کتب خانہ میں ایک قلمی کتاب ملی، جس کا نام نگار نامہ ہے، اور جس کے مصنف کا نام منشی لال چند ہے، گو تاریخ نہیں معلوم، مگر قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عالمگیر کے زمانہ یا اس کے چند دنوں بعد کی تصنیف ہے، اس کتاب کی تالیف کی غرض، دفتر کے منشیوں کو سرکاری فرامین کی تحریر کے نمونوں کی تعلیم ہے، اس میں ایک تحریر کاشتکاروں کے معافی جزیہ کی سند کی نقل ہے، اس کے پڑھنے سے اندازہ ہوگا کہ یہ کس طرح لکھی جاتی تھی، اور رعایا کو دی جاتی تھی،

سندِ مذکور کی اصل عبارت مع ترجمہ یہ ہے:-

سندِ جزیہ معافی کشا ورزاں فلاں	کاشتکاروں کے معافی جزیہ کی سند

دیوان با تقابه محفوظ باشد چوں دریں ولا
بعرض اقدس ارفع رسید که زمینداراں که
کسب او از قوت او و قوت عیال او
زیاده نه باشد بموجب دستور شرعی از و جزیه
نباید گرفت، لهذا از زمره رعایا که کسب
زراعت دارند و مدار قوت و تخم و
گاو آنها بر همه فرض است طلب جزیه
موجب تفرقه آنان می شود، اگر مطابق
شرع شریف حکم صریح در باب عدم اخذ
جزیه آں جماعه صادر گردد، بفراغ بال
کسب پیشه خود که آبادی ملک و امان رعیت
است مشغول باشند و از کشاکش سوار و پیاده
فوجداران و اخذ جزیه خلاصی یابند حکم جہاں
مطاع صادر می شود که موافق شرع انور
بمزارعان بعلت اخذ جزیه مزاحم نشوند
و از تعلقداران و چودھریاں و قانون گویان
و طرف داراں و اہل حرفه و دیگر ساکنان
قصبات و قریات مطابق شریعت مطہر جزیه
باز خواست نمایند، چنانچه دریں.

فلاں دیوان با تقابہ محفوظ و سلامت رہیں،
چونکہ اس وقت بادشاہ سلامت کو اطلاع
دی گئی ہے کہ ان زمینداروں سے جن
کی کمائی ان کی اور ان کے اہل عیال
کی گذر اوقات سے زیادہ نہیں ہوتی
اصول شریعت کے مطابق جزیہ نہیں لینا
چاہئے اس لئے غریب اور معمولی رعایا
سے جو زراعت پیشہ ہیں، اور اُن کی
معاش بیج اور بیل کا بہم پہونچانا سب
پر فرض ہے جزیہ مانگنا اُن کی پریشان حالی
اور انتشار کا سبب ہوگا، اگر اس گروہ سے
جزیہ نہ لینے کا حکم صریح حسب حکم شریعت
صادر کیا جائے تو وہ فارغ البالی کے
ساتھ اپنے پیشہ میں جو ملک کی آبادی
اور رعایا کے امن و امان کا سبب ہے مشغول
رہیں گے، اور پولیس کے سوار اور تحصیل کے
پیادوں سے اور جزیہ سے نجات پائیں گے،
اسلئے بادشاہ سلامت کا حکم صادر ہوا ہے
کہ شریعت کے مطابق کاشتکاروں سے

باب یادداشت واقع درست شده و
شرح آن در ضمن رقم یافته بنا بر آں قلمی
می گردد، کہ آں وزارت پناہ در تعلقہ
دیوانی خود موافق یرلیغ قضا جریان
بعمل آرند و بمزارعاں بجہت اخذ جزیہ
متعرض نہ شوند، و معاف شناسند،

جزیہ لینے کے لئے مزاحمت نہ کریں، اور تعلقہ
داروں، چودھریوں، قانون گویوں، مقدموں
اہل پیشہ اور قصبات اور دیہات کے دوسرے
باشندوں سے شریعت کے مطابق جزیہ طلب
کریں، چنانچہ اس کے مطابق ایک یادداشت
مرتب کی گئی، اور اس کی تفصیل اس ضمن میں
لکھ دی گئی، اس لئے لکھا جاتا ہے کہ آپ اپنے
دیوانی کے تعلقہ میں اس واجب العمل فرمان
پر عمل کریں، اور کاشتکاروں سے جزیہ لینے
کے لئے تعرض نہ کریں، اور ان کو معاف سمجھیں،

(معارف اکتوبر ١٩٣٧ء)

......٭......

خطبۂ صدارت شعبۂ تاریخ ہند ازمنۂ وسطیٰ

(سنہ ۱۲۰۶ء - سنہ ۱۵۲۶ء)

آل انڈیا ہسٹری کانگرس منعقدہ مدراس دسمبر سنہ ۱۹۴۴ عیسوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رفیقو! ممنون ہوں کہ آپ نے اپنی مجلس میں اس کرسی پر مجھے جگہ دی، آپنے اس انتخاب سے اپنے دستور کی کئی دفعوں کو توڑا، ہی آپ نے یہ کرسی ایسے شخص کو دی ہے جس کو آپ کی یونیورسٹی برادری سے دور کا بھی لگاؤ نہیں، بلکہ اس نے آپ کے اسکول اور کالج میں ایک منٹ کے لیے بھی قدم نہیں رکھا، اور وہ صرف مشرقی درس گاہوں کا پروردہ اور نمائندہ ہے، اس لئے اس اعزاز کے لئے اس کا انتخاب آپ کی رواداری اور دل کی بڑائی کا بہت بڑا ثبوت ہے، آپ نے اس طرح میرا حوصلہ بڑھایا ہے، جس کا دل سے شکر گذار ہوں، اور اس کو اس کے لئے نیک فال سمجھتا ہوں کہ شاید آیندہ علمی اور تعلیمی کاموں کے انجام دینے میں مشرقی اور مغربی تعلیموں کے فرق و امتیاز کی خلیج بیچ میں نہ آئے گی، اور ہماری نظر کسی بڑے علمی اور تعلیمی مقصد کو پورا کرنے میں اصل مقصد پر رہے گی، مغربی و مشرقی طرز و انداز کے اختلافات پر نہیں،

اب ہم زمانہ کے دوسرے موڑ پر پہونچ گئے ہیں، جہاں ہم کو اپنی زبان سے محبت ہونی چاہئے

اور اپنی دیسی ہندوستانی زبان میں کام کرنے والوں کے ساتھ اشتراکِ عمل ہونا چاہئے، اور شاید آج کا دن اس مقصد کے اعلان کے لئے موزوں ہے،

اصل موضوع پر کچھ کہنے سے پہلے ہندوستان کی عمومی تاریخ کے ایک خاص نقطۂ نظر کے متعلق ہم کو کچھ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے، ہم جس چیز کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں ہمارے خیال میں اب تک کسی جماعت کی طرف سے اس کی غلطی کو واضح نہیں کیا گیا، اور نہ اس کی غلطی پر ابھی تک ٹوکا گیا ہے، ہماری مراد اس سے وہ غلط قسم کا فرقہ دارانہ رنگ ہے، جو ہماری تاریخ پر ایک زمانہ سے چھایا ہوا ہے،

پالٹکس کے کھیل سے اس ملک کا علم تاریخ بھی بچا ہوا نہیں، بلکہ صاف کہنا چاہئے کہ یہی وہ بیج ہے، جس سے ہندوستان کا مشہور کھیل پھوٹ پیدا ہوتا ہے مسلمانوں کی حکومت کی بڑائی اور اچھائی کی بھی بہت سی باتیں کہی جا سکتی تھیں، مگر اُن کے بعد اس ملک میں جو حکومت آئی، اُس کے زمانہ میں تعلیم کا سررشتہ پورا کا پورا غیر ملکیوں کے ہاتھ میں تھا، ان لوگوں کے ہر جتھے کی ہر طرف سے یہ کوشش تھی کہ اپنے راج کی بڑائی کو ہر ہندوستانی کے دل میں بٹھا دے، اور ساتھ ہی ایک ایسا کرتب کریں جس سے اُن کے دل کے شیشے ٹوٹ کر پھر جڑنے نہ پائیں تعلیم کے سارے مضمونوں میں اس کام کے لئے تاریخ کے سوا کوئی اور چیز مناسب نہ تھی، چنانچہ انھوں نے اس ملک کی لئے تاریخ کی جو کتابیں شروع سے آخر تک لکھیں، اور پڑھائیں، ان میں یہی بات سو سو طرح سے الٹ پلٹ کر سمجھائیں، اور پڑھائیں کہ جو دل اُن سے ٹوٹے تھے وہ پھر اب تک جٹ نہ سکے،

آج سے کوئی پندرہ سولہ برس پہلے اسی مدراس کے ایک شہر ترچناپلی میں ہندو مسلمانوں کے ایک ملے جلے جلسہ میں جس کے صدر ہائی کورٹ کے ایک ریٹائرڈ جج تھے، میں نے کہا تھا کہ وہ زمین جس میں

ہندو مسلمانوں کی پھوٹ کا درخت جنما اور بڑھتا ہے اور وہ C سے شروع ہونے والے دو مکان ہیں یعنی کالج اور کورٹ، میری بات کو ہنسی اور دل لگی نہ سمجھئے، بلکہ سوچئے کہ میرا کہنا کہاں تک سچ ہے پچھلی بڑی جنگ یعنی ماٹیگو چیمسفورڈ ریفارم اسکیم کے بعد سے تعلیم کا کام خود ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں آگیا ہے، جس میں سے ایک تاریخ بھی ہے، اب ہندوستان کی تاریخ اکثر یونیورسٹیوں میں ہندوستانی ہی پڑھاتے ہیں، اور ہندوستانی ہی کورس کی کتابیں بناتے ہیں، اور تاریخ کے مختلف دور کے بادشاہوں کے حالات کی تحقیق پر کتابیں لکھاتے ہیں، لیکن یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ اب چلنے والے گونئے ہیں لیکن اُن کے چلنے کا راستہ ابھی تک وہی ہے، جس کو ان کے پہلے پرانے بدیسی چلنے والے بنا کر چھوڑ گئے ہیں، حالانکہ ضرورت یہ ہو کہ اب نیا ڈگر بنایا جائے، اور علم کے قافلہ کے چلنے والوں کے لئے نئی راہ نکالی جائے، جو پھوٹ کے بجائے میل کی منزل مقصود کو جاتی ہو،

اس فن کے جاننے والے جانتے ہیں کہ تاریخ ایک کچی دھات ہے، اس کچی دھات کو مختلف مسالوں سے جوڑ کر جیسی شکل آپ چاہیں بنا سکتے ہیں، اور اپنی ہمدردی اور بیدردی سے اس کو جس طرح چاہیں رنگ کر دکھا سکتے ہیں، دو تین جزئی باتوں کو ملا کر کلیہ بنا لینا اس فن کا آج کل سب سے آسان چٹکلہ ہے، پرانے زمانے میں تاریخ ایک معصوم فن تھا، جس کا مقصد واقعات کا ریکارڈ تیار کرنا تھا، اور بس، مگر آج کل یہ فن سب سے زیادہ بدنام فن ہوگیا ہے، اور قوموں کی چرب زبانی، اختلاف بیانی، اور واقعات کی توجیہ اور تشکیل کر کے اس کو جدا جدا رنگ دینے کے سبب سے کسی چیز کی تاریخ آج ایک ہی طرح بیان نہیں کیجا سکتی ہے، کچھ نہ سہی پچھلی جنگ ہی کی تاریخ مختلف لڑنے والی قوموں کی زبانوں سے ایک ہی طرح پڑھ کر دیکھ لیجئے، یا اسی لڑائی میں ایک ہی واقعہ کی روایت مختلف ملکوں کے ریڈیو میں سن لیجئے، کہ اس زمانہ میں تاریخ کی حقیقت کیا سمجھی گئی ہے، اور اس سے کیا مصرف لیا جارہا ہے،

بہرحال مجھے یہ کہنا تھا کہ تاریخ کے فن کو قوموں کے پھوٹ اور میل میں بہت کچھ دخل ہے اسلئے وہ لوگ جن کی نظر میں اس ملک کا مستقبل ہے، اور جن کے ہاتھوں میں اس مستقبل کا بنانا یا بگاڑنا ہے ان کو اپنی ذمہ داری کو سمجھنا چاہئے، اور اس حالت میں جب کہ ہم سب کو معلوم ہے کہ ہم کو اب اسی ملک میں جینا اور مرنا ہے، تو عداوت اور نفرت کی پچھلی باتوں کو اس طرح دہراتے رہنا جس سے یہ جذبہ اسی طرح پلتا، اور بڑھتا، اور پھلتا اور پھولتا رہے، اپنے ملک کے ساتھ بڑی بے وفائی ہے،

مسلمانوں میں دو مصنف ایسے گذرے ہیں، جنھوں نے ہندوستان کی خاک کو اپنی آنکھوں کا سُرمہ بنایا، جن میں پہلا گونسل میں ترک تھا، مگر اس کا دل ہندوستان کی مٹی سے بنا تھا، میری مراد امیر خسرو سے ہے، جنھوں نے فارسی اور بھاشا کی آمیزش سے ہندوستان میں مسلمانوں کے عہد میں ایک نئی زبان اور نیا تمدنی ذوق پیدا کرنے کی کوشش کی، اور سب سے پہلے اسی ملی جلی زبان میں شاعری کی بنیاد رکھی، اور موسیقی کی ایک نئی لَے ہندی اور ایرانی سے ملاکر پیدا کی، انھوں نے اپنی فارسی مثنوی "نہ سپہر" میں ایک مستقل باب ہندوستان کی خوبیوں پر لکھا ہے، اور یہاں کے ملکی باشندوں کے علم، آرٹ، اور ہنر کی تعریف میں اپنی شاعری کا پورا جوہر دکھایا ہے،

دوسرے شخص میر غلام علی آزاد بلگرامی ہیں، جن کی وفات کو ابھی ۱۶۳ برس گذرے ہیں، ان سے بڑا ہندوستان کا کوئی مسلمان مورخ اور عربی کا شاعر اس ملک میں پیدا نہیں ہوا، یہ ہندی کے بھی شاعر تھے، بلکہ خاندانی شاعر، انھوں نے سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان عربی میں لکھ کر ہندوستان کی زمین کو آسمان بنادیا، اور حیثیت سے اُسکی اتنی بڑائی کی ہے کہ اس کو رشکِ جہاں بنادیا ہے، مسلمان مورخوں کے لئے اُن کے بزرگوں کا یہ طریقہ اُن کی تقلید کے قابل ہے،

جس عہد کی تاریخ پر ہم آج کی مجلس میں کچھ کہہ سن رہے ہیں، اس پر ہندوستانی اہلِ قلم کے ہاتھوں سے کئی اچھی اچھی کتابیں شائع ہوکر اہلِ نظر کے سامنے آگئی ہیں، خاص کر ہماری یونیورسٹیوں

میں تاریخ کے کام کرنے والوں کے ذریعہ کافی لٹریچر پیدا ہو رہا ہے اگر اس کا بڑا حصہ ایسا ہے جو کسی یونیورسٹی سے کسی ڈگری کے حاصل کرنے کے لئے لکھا گیا ہے، اب تک عموماً طلبہ یا ایسے اساتذہ جنھوں نے اپنی طالب علمی کا زمانہ فوراً ہی ختم کیا ہے، ایک مقررہ مدت کے اندر ڈگری دینے والوں کے خیالات سے متاثر ہو کر اس عہد پر کتابیں لکھتے رہے ہیں، جن میں انھوں نے کم سے کم مدت میں زیادہ سے زیادہ باتیں پیش کرنے کی کوشش کی ہے، اسی لئے اُن میں سے بعض کی تحقیق میں گہرائی، رائے میں پختگی، اور دلیلوں میں وزن نہیں، ان میں کچھ ایسے بھی ہیں، جنھوں نے فارسی نہ جاننے کے باوجود دوسروں پر بھروسہ کرکے اپنی تحقیقات کی ساری عمارت فارسی کی ادبی کتابوں پر کھڑی کر دی ہے، اور بعض ایسے بھی ہیں، جنھوں نے مسلمان حکمرانوں کے مذہب کے اصول و قوانین کا گہرا مطالعہ کئے بغیر کسی دوسرے کی رائے کا حوالہ دے کر یا کسی کے قول کو نقل کرکے اپنے خیال کے مطابق نتائج اخذ کرلئے ہیں، یہ دیکھ کر تعجب اور افسوس ہوتا ہے کہ بعض تاریخی تحقیقات میں اسلامی شریعت کی وضاحت انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی مدد سے کی جاتی ہے، اسلامی فقہ کے نکتے میکڈانلڈ کی کتاب کے ذریعہ سے بتائے جاتے ہیں، اسلامی مسائل کا حل ریورنڈ ہیوز کی ڈکشنری آف اسلام سے پیش کیا جاتا ہے، مسلمانوں کی حکومت، بادشاہی، اور رعایات کے نظریے آرنلڈ اور اگلائی نڈائیز (Aglinidas) کی عینک سے دیکھے جاتے ہیں،

اس غلط طریق کار کا نتیجہ یہ ہے کہ اب گو نہ وہ فاتح رہے ہیں اور نہ مفتوح، مگر زمانہ کے تطاول سے اُن کے زمانہ کے پیدا شدہ جذبات کے سوکھ جانے والے درخت کو پانی دے دے کر ہرا کیا جاتا ہے، اور ہم تحقیق کے نام سے اپنے پیشروؤں کی غلطی کی غلط پیروی میں مصروف ہیں،

یورپین مستشرقین نے اسلامی علوم و فنون کی جو خدمت کی ہے، اس کا اعتراف ہے مگر مذہبی، شرعی اور فقہی معاملات میں ان کی تحقیق یا رائے یا قول پر کسی حال میں بھی اعتماد نہیں کیا جاسکتا،

اس لئے مسلمان فرمانرواؤں کے کسی رویہ یا پالیسی کو اُن کے مذہب کی روشنی میں اگر دیکھنے کی کوشش بھی کیجائے، تو مذہبی معلومات کا ماخذ اور سرچشمہ خود مسلمان علماء و فقہا کی ادبی تخیل، مستند اور معتبر کتابیں ہونی چاہئیں، لیکن زبان کی ناواقفیت کی وجہ سے ان کتابوں کا سمجھنا ممکن نہ ہو تو پھر ایسے موضوع اور مسئلہ پر قلم اٹھانے کا حوصلہ ہی نہ کیا جائے، نیت خواہ کتنی ہی اچھی اور صاف ہو، مگر مذہبی مسائل کی غلط تعبیر اور ملکی امور میں اُن کی غلط تطبیق سے بعض اوقات ایسے مضرت رساں پہلو پیدا ہو جاتے ہیں، جن سے ایک طرف تو حقیقت کا خون ہوتا ہے، اور دوسری طرف قوموں کے جذبات میں تلخی پیدا ہوتی ہے یہاں پر ہمارے دوستوں کو یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ ہندوستان کے مسلمان سلاطین مسلمان ضرور تھے لیکن وہ اسلام کے نمائندے نہ تھے، وہ اسلام کے نام لیوا بن کر گو حکومت کے تخت کو جلوہ دیتے تھے، مگر اُن کی حکمرانی کا طرز اور فرمانروائی کا اصول خالصۃً اسلامی نہ تھا، وہ مذہباً نو مسلم اور نسلاً ترک، پٹھان یا ہندو تھے، اس لئے ایک یا دو یا کئی نسل سے مسلمان ہونے کے باوجود، اسلام کی صحیح تصویر نہ تھے، اور نہ ان کی سیاست اسلامی سیاست تھی، اور نہ اُن کی حکومت ٹھیک اسلامی طرز کی تھی، اور نہ اُن کے سپہ سالار، اور فاتح اپنے مفتوحہ ملکوں کے ساتھ اسلامی طریقہ کا پورا پورا برتاؤ کرتے تھے، اس بحث کے سمجھنے کے لئے سلطان علاء الدین خلجی اور قاضی مغیث الدین کی کی وہ طویل گفت گو پڑھیے، جس کو برنی نے فیروز شاہی میں لکھا ہے، یا محمد شاہ تغلق کی ان خونریزیوں پر ایک نظر ڈالی جائے، جس کے مقتولین میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی تخصیص نہ تھی، غور کیجئے کہ محمد بن قاسم ثقفی کی عربی فوج نے سنہ ۹۲ھ میں جب بودھوں کے بلاوے پر سندھ میں قدم رکھا، تو پہلے ہی دن ان عربوں نے ہندوؤں کی حیثیت شرعی کو متعین کر لیا، اور ان کو وہی حیثیت دی جو ان سے پہلے صحابہ نے اہلِ فارس کی قرار دی تھی یعنی شبہ اہلِ کتاب جس کے معنی یہ ہیں کہ دو باتوں کے سوا یعنی نکاح اور ذبیحہ کے علاوہ اور تمام امور میں ان کے ساتھ اہلِ کتاب کا برتاؤ کیا جائیگا،

نیز یہ کہ یہاں کے مندروں کی حیثیت ایران کے آتشکدوں کی ہے، جس طرح صحابہ نے آتشکدے نہیں توڑے، اسی طرح مصالحت ہو جائے، تو یہ مندر بھی توڑے نہیں جائیں گے، چنانچہ سندھ اور ملتان میں چوتھی صدی تک اسلامی حکومتوں کے باوجود یہ مندر اسی طرح قائم رہے، مورخ بلاذری نے یہ حالات لکھے ہیں، اور اکثر عرب سیاحوں نے اُن کی کیفیت بیان کی ہے،

لیکن افسوس ہے کہ ترک سیاحوں نے جوش جہاد کے علاوہ صلح و جنگ اور فتح و غنیمت اور محاصل و مداخل کے سارے اسلامی اصولوں کو فراموش کر دیا، اور ان کے ان کاموں کی ذمہ داری شریعت اسلام پر رکھی جاتی ہے، حالانکہ اسلامی اصولوں سے ذمیوں کے معاملات کا فیصلہ ایک حد تک باہمی معاہدات کی دفعات پر ہے، اور نیز یہی فقہی مسئلہ ہے کہ پرانے مندر توڑے نہ جائیں گے، اس قسم کے خلط ملط مباحث سے ہندوستان کے مسلمان سلاطین کی تاریخ ایک زمانہ سے جھگڑے کی چیز بن کر رہ گئی ہے، یا تو اُن کی اور اُن کے مذہب کی تصویر بہت ہی بُری اور بھیانک دکھائی جاتی ہے، یا پھر دوسری طرف اُن کی حمایت اور مدافعت میں ہر قسم کا زور صرف کیا جاتا ہے، یا پھر دونوں گروہ ایک دوسرے کی نکتہ چینی کرتے ہیں، کچھ محققین ایسے بھی ہیں جو کسی سلطان کی حکومت کی تاریخ لکھتے وقت اُس کی خوبیاں بھی ظاہر کرتے ہیں، اور اس کی بُرائیاں بھی دکھاتے ہیں، مگر اُن میں ایسے مصنفوں کی تحریریں گمراہ کن ہوتی ہے، جو چند خوبیاں محض اسلئے بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کہ ان خوبیوں کی آڑ میں وہ بڑی سے بڑی بُرائیوں کا زہر پھیلانے میں کامیاب ہوں، اور وہ مخالف نکتہ چیں کے الزام سے بھی بچے رہیں، حالانکہ ضرورت اس کی ہے۔ کہ بغیر تصنع کے حق کو حق، اور باطل کو باطل کہدیا جائے،

غرض مسلمان سلاطین کی تاریخ لکھتے وقت یہ بات ہم سب کے سامنے رہنی چاہئے کہ وہ مسلمانوں کے بادشاہ ضرور تھے لیکن اسلام کے مذہبی پیشوا اور صلحا نہ تھے، جن کا ہر فعل اور عمل ہمارے لئے

اور کمزوریوں سے بالاتر ہوتا، اس لئے انھوں نے اگر اپنی سیاست میں کوئی ناروا اور نامناسب رویہ اختیار کیا تو آج ہم کو اس کے لئے نہ معذرت نامہ پیش کرنے کی ضرورت ہے نہ شرم سے سر جھکانے کی، وہ کونسی قوم ہے جس کے بادشاہ اور کشورکشا ہر معیار پر ہر زمانے میں پورے اترے، اور ہر اعتراض سے پاک گذرے، اچھوں اور بروں سے تاریخ کا کوئی دور خالی نہیں رہا، اس لئے شخص کی بحث میں مذہب کو درمیان میں لانا غلطی ہے، حالانکہ غلطی اس قسم کے موقعوں پر ہندو ہندوستان اور عیسائی ہندوستان کے دور کے بیان میں کبھی زیر عمل نہیں آتی، تاریخ کا مقصد پروپگنڈا نہیں، بلکہ وہ حکومتوں کی کہانی اور قوموں کی سوانح عمری ہے، اور اسی حیثیت سے ان واقعات کا تذکرہ کرنا چاہئے، انگلستان کی تاریخ کیا لڑائیوں کا دنگل نہیں، رومن فتوحات سے موجودہ متحدہ اینگلوسکسن حکومت تک کیا وہاں قوموں کی جنگیں نہیں ہوئیں، کیا اسکاٹ لینڈ، ویلیز، آئرلینڈ اور انگلینڈ کے درمیان بڑی بڑی خونریزیاں نہیں ہوئیں، مگر اب اُن کی تاریخ لکھتے وقت یہ خیال رکھا جاتا ہے کہ یہ واقعات اس انداز میں بیان نہ ہوں کہ پچھلے سوئے ہوئے فتنے پھر جاگ جائیں، انگلستان اور فرانس جو آج ڈیڑھ سو برس سے اتحادی ہیں کیا اُن کی تاریخ کی زمین دونوں قوموں کے خون سے رنگین نہیں، تاہم گذشتہ ناگواری کے اظہار میں قلم اس قدر محتاط رہتا ہے، کہ موجودہ خوشگواری کے شیشہ میں بال بھی آنے نہیں پاتا، اسی طرح پرانے ہندوستان کے راجاؤں کے عہد میں کس قدر لڑائی بھڑائی اور ایک دوسرے کے راج کے لینے دینے میں نہیں گذرا، پھر بھی بودھ، جین، ویدک، برہمنی، آریائی، اور سیتھین، اور یہاں کی قدیم باشندہ قوموں کی لڑائیوں کے بیان میں مورخوں نے اپنی قلمی لڑائیوں کا سلسلہ نہیں چھیڑا ہے، حالانکہ ان میں سخت مذہبی اختلافات بھی تھے، اور یہ صحیح قدم ہے، اسی طرح کا مصالحانہ قدم اسلامی تاریخ کے اس دور کے میدان میں بھی رکھنا چاہئے، اسیری یہ تمہید گو لمبی ہو گئی، اور ممکن ہے کہ اس بیان میں کہیں کہیں سختی بھی آگئی ہو، مگر جس درد سے یہ باتیں کہی

گئی ہیں، امید ہے کہ اسی درد سے سُنی بھی گئی ہوں گی، اور ہمارے مورخ دوستوں کی توجہ کے قابل ٹھہریں گی، اس مجلس سے بہتر اور کونسا موقع اس درد کے اظہار کا ہو سکتا تھا،

اب ہم ہندوستان کے اسلامی عہد کی تاریخ کی نسبت کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں، جو ہمارے پیش نظر ہے، اس عہد کی تاریخ لکھنے میں سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ اس دور کی تاریخ کا سرمایہ ہمارے پاس بہت کم ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تیموریوں کی طرح اس زمانہ کے بادشاہوں نے اپنے عہد کی تاریخ نویسی کو سرکاری کام نہیں قرار دیا تھا، بلکہ عموماً اہل تاریخ اس کام کو اپنے شوق سے انجام دیتے تھے، گو وہ کسی نہ کسی طرح بادشاہ کے دامن سے ضرور لپٹے تھے تاہم وہ اس کام کے لئے متعین نہ تھے، آج کل قوموں کی تاریخ کی نقش آرائی میں خون ہی کا رنگ درکار نہیں، بلکہ اس زمانہ کے تمدن، اقتصاد، تعمیر، معاشرت، علم و فن اور طریق جنگ وغیرہ کے ایسے معلومات کی بھی ضرورت پڑتی ہے، جن سے اس قوم کی پوری تصویر کھڑی ہو جائے لیکن اس زمانہ کے پُرانے مورخوں نے اپنے مذاق کے مطابق اپنی تاریخیں لکھیں، اس لئے جو مسائل اُن کے نقطۂ نظر سے اہم تھے، وہ ہمارے لئے غیر اہم ہیں، اور جن مسائل کو ہم ضروری سمجھتے ہیں، اُن کو انھوں نے غیر ضروری سمجھ کر یا تو نظر انداز کر دیا، یا بہت ہی اختصار کے ساتھ لکھا ہے تاہم اگر آج کل کے لکھنے والوں کے حوصلے بلند اور ارادے اچھے ہوں، تو ان ہی معاصر تاریخوں سے اپنی ضرورت کا اچھا خاصا مواد فراہم کر سکتے ہیں، میرے استاذ مولانا شبلی مرحوم فرمایا کرتے تھے، کہ وہ اپنی تحقیق میں چیونٹیوں کے منہ سے شکر کے دانے جمع کر کے مٹھائی تیار کیا کرتے ہیں، اگر اسی طرح صبر، محنت، اور استقلال کو راہ دے کر کوئی ریسرچ کرنے کی کوشش کرے، تو کوئی وجہ نہیں کہ ہر موضوع پر اس کو ہر قسم کے معلومات نہ ملتے جائیں، مگر موجودہ دور کے محققین کے مشاغل اس قدر گوناگوں ہیں، اور محنت کے بھی وہ ابھی زیادہ عادی نہیں ہوئے ہیں، اس لئے اُن کی کوشش صرف یہ ہوتی ہے کہ معاصر تاریخوں میں جو واقعات اور تفصیلات فارسی

زبان میں سیدھے سادے طریقے پر درج ہیں، وہ اپنے اپنے ذوق کے مطابق انگریزی، اردو، اور ہندی زبان میں تھوڑی تنقید اور نکتہ چینی کے ساتھ منتقل کر دیں، اسی طرح انگریزی، اردو، اور ہندی میں لٹریچر فراہم ہو کر ان زبانوں کی خدمت ہو جاتی ہے، یا اوسط درجہ کے علم اور تاریخی مذاق رکھنے والے اور یونیورسٹی کے طالب علموں کے لئے تو کتابیں حاصل ہو جاتی ہیں، مگر ان تحقیقات سے صحیح معنوں میں گذشتہ عہد کی قوموں کی موجودہ نسلوں کی نہ ذہنی پیاس بجھتی ہے اور نہ وہ اپنے ماضی کی صحیح تصویر دیکھ کر اپنے مستقبل کو امید افزا پاتے ہیں کیونکہ ماضی اگر شاندار ہو تو مستقبل کو شاندار بنانے میں حوصلہ بڑھتا ہے، اور قومی خودی پیدا ہوتی ہے، اس لئے کسی قوم کو نقصان پہنچانے کا ایک کارگر حربہ یہی ہوتا ہے کہ اس کا ماضی خود اس کے سامنے بہت ہی برے اور نفرت انگیز طریقے پر پیش کیا جاتا ہے جس سے وہ شعوری اور غیر شعوری طور پر متاثر ہو کر اپنی تمام تاریخی اور تمدنی روایات سے رفتہ رفتہ متنفر ہو جاتی ہے، اتفاق سے اس قسم کے حربے سے فائدہ اٹھانے کے لئے معاصر تاریخوں میں ہر طرح کا مسالہ موجود ہے،

یہ معاصر فارسی تاریخیں عہد سپہ گری میں ایرانی مذاق کے مطابق لکھی گئیں، اس زمانہ میں سب سے بڑا ذاتی وصف سپہ گری میں کمال حاصل کرنا تھا، ہر فرد اپنا جوہر میدانِ جنگ میں دکھانا فخر سمجھتا تھا، اہلِ قلم اہلِ سیف کی طرح لڑائی کے میدان میں شریک نہ ہو سکتے تھے، تو اپنی سپہ گری کے سارے جذبات کاغذ کے صفحات پر منتقل کرنے کی کوشش کرتے تھے، اسی لئے ان کی ساری تاریخیں جنگ و جدل اور معرکہ آرائی کا مرقع ہیں جن کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس عہد کی تاریخ محض کشت و خون کی داستان ہے، مورخوں کے ان ذاتی رجحانات کی بنیاد پر تاریخ کے بہت سے اہم رخ پردے پڑ گئے ہیں، اور اب معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کے سلاطین لڑنے بھڑنے کے سوا کوئی اور کام ہی نہیں کیا، انگریزی داں طبقہ پر یہ خیال سر ایچ ایم ایلیٹ کی تاریخ ہند کے ذریعہ سے آ

بھی زیادہ گہرے طور پر منقوش ہوا، ہنری الیٹ کا یہ احسان ناقابلِ فراموش ضرور ہے کہ اس نے غیر معمولی تلاش و جستجو سے ہندوستان کی کمیاب اور نادر عربی جغرافیوں اور فارسی تاریخوں کا پتہ لگا کر اُن کے انگریزی ترجمے اور اقتباسات اپنی مذکورۂ بالا کتاب میں محفوظ کر دیئے ہیں، اور آج بہت سے محققین کے لئے وہ ہدایت کا چراغ ہے، مگر یہ کہنا پڑے گا کہ الیٹ نے ان ترجموں میں دیانت داری سے کام نہیں لیا، جن کتابوں کے ترجمے اور اقتباسات اس نے اپنی کتاب میں شامل کئے ہیں، ان میں جابجا علمی، تمدنی، عمرانی اور غیر سیاسی تفصیلات کچھ نہ کچھ ضرور ہیں لیکن ان کو اُس نے قصداً حذف کر دیا ہے، اب فارسی سے ناآشنا اور الیٹ کی کتاب کو اپنا گائیڈ بنانے والا محقق مسلمان سلاطین کے عہد کو صرف خون آلود اور خون آشام پاتا ہے، جس کے ذہنی اثرات مدتوں کی تحقیق و کوشش کے بعد بھی مشکل سے مٹ سکیں گے، الیٹ شروع انگریزی عہد کا آدمی ہے، اور یہ ایک گونہ سرکاری حیثیت بھی رکھتا ہے، اور اس نے اپنے کام کا مقصد چھپا کر نہیں رکھا ہے، اُس نے صاف طور سے یہ ظاہر کر دیا ہے، کہ اُس کے پیشِ نظر تمامتر یہ ہے کہ اپنے اگلے پیشرو اور حاکموں کے غیر منصفانہ عہد کی تاریکی کو دکھا کر، اپنی قوم کے عہدِ حکومت کی روشنی دکھائے تاکہ ہندوستان کے رہنے والے اس کو سایۂ رحمت سمجھ کر، اُس کو اطاعت مندانہ اخلاص کا خراج ہمیشہ پیش کیا کریں،

(دیباچہ ص ۲۲)

ابھی عرض کیا گیا ہے کہ ہندوستان کی تاریخیں ایرانی ذوق کے مطابق لکھی گئی ہیں، مختلف مؤرخوں نے تاریخیں لکھ کر زیرِ نظر عہد کے سیاسی واقعات تو مسلسل اور مربوط طریقہ پر مرتب کر دیئے ہیں، لیکن ان ایرانی مذاق کے مورخوں نے بادشاہی درباروں سے باہر نکل کر دنیا کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی، اُن کے نزدیک بادشاہ کا دربار ہی ساری دنیا تھی، عرب اور ایرانی مورخوں کے نقطۂ نظر میں بڑا فرق ہے، عرب مؤرخ دربار کا مؤرخ نہیں ہوتا، بلکہ زمانہ کا مؤرخ ہوتا ہے، اسی لئے اس کی

تاریخ کی تقسیم بادشاہوں کے نام پر نہیں، بلکہ سال پر ہوتی ہے، طبری، ابن اثیر، ابو الفداء وغیرہ مورخوں نے اسی طرز پر اپنی تاریخوں کی بنیادیں ڈالی ہیں، عرب کا مورخ نہ صرف بادشاہوں کی جنگ و صلح کے واقعات زیر تحریر لاتا ہے، بلکہ ضمناً اس زمانہ کے تمدنی، علمی، اور معاشی حالات بھی ضرور قلم بند کرتا جاتا ہے، گو ان میں ترتیب نہیں ہوتی، ایک ابن بطوطہ کو دیکھ لیجئے، کہ مغرب اقصیٰ کے اس سیاح کے ہاتھوں محمد تغلق کے عہد کا جتنا واضح اور روشن مرقع ہمارے سامنے موجود ہے، وہ اس دور کے کسی اور سلطان کی حکومت کا نہیں، ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں بہت سے سیاسی واقعات ایسے بھی لکھے ہیں، جن کا فارسی تاریخوں میں بہت کم پتہ چلتا ہے لیکن تحقیقات نے ان کی صحت و درستی کو ثابت کر دیا ہے، معبر یعنی کارومنڈل میں حسن کیتھلی کی اسلامی ریاست کا اس نے ذکر کیا ہے، اس کا ثبوت آثار قدیمہ کے سکوں نے بہم پہنچایا، اور حیدرآباد کے حکیم شمس اللہ قادری نے ۱۹۲۵ء میں سلاطین معبر کے نام سے اس پر ایک اچھا مقالہ لکھا ہے، ملتان کے مدرسہ کا نام صرف ابن بطوطہ نے بتایا ہے، سندھ کے سومری بادشاہوں کی حقیقت بھی ابن بطوطہ سے معلوم ہوئی، ہندوستان اور چین کی بحری تجارت کا حال اور جہازوں کی آمد و رفت کی کیفیت بھی اُسی سے معلوم ہوئی، بنگال کا نقشہ اس نے فارسی کے دو حرفوں میں کھینچا ہے، جہنم پر از نعمت، ترکستانی ترکوں نے بھی اس کو یہی لقب دیا تھا، ملیبار میں اسلامی آبادیوں کا ذکر اسی نے کیا ہے، سندا پور یعنی گوا کی عرب اسلامی سلطنت کا حال اسی سے معلوم ہوا، ہونور اخاطہ مبئی کے عرب سلطان کی داستان اُسی نے سنائی، ملیبار اور جزائر کے ہندو راجاؤں کے قصے اسی سے معلوم ہوئے،

محمد تغلق نے چونکہ مصر کے عباسی خلیفہ سے تعلق پیدا کر لیا تھا، اس لئے ہندوستان اور مصر کے درمیان سفیروں، سیاحوں، اور علماء کی آمد و رفت کا دروازہ کھل گیا تھا، اور اس راہ سے اس زمانہ کے ہندوستان کی تاریخ کا بہت سا سامان عرب مورخوں کے بھی ہاتھ آیا، چنانچہ اس عہد کے

مصری مورخ ابن فضل اللہ المتوفی ۷۴۹ھ ۱۳۴۸ء نے اپنی مسالک الابصار فی ممالک الامصار میں اس زمانہ کے ہندوستان کے جو تمدنی و تجارتی اور اقتصادی اور فنی حالات لکھے ہیں، اس عہد کی پوری فارسی تاریخ میں نہیں مل سکتے، کیا ہندوستان کی کسی فارسی تاریخ میں آپ کو یہ لکھا مل سکتا ہے، کہ ان سلاطین کے زمانہ میں ہندوستان کی تعلیم کا کیا حال تھا، اور کتنے مدارس قائم تھے، لیکن ابن فضل اللہ کا بیان سنئے جو لکھا ہو کہ محمد تغلق کے زمانہ میں صرف دلی میں ایک ہزار مدرسے، ۷۰ شفا خانے اور دو ہزار خانقاہیں تھیں، یا وہ مشہور شاہی مدرسہ جو فیروز شاہ تغلق کے زمانہ میں دلی میں شاہانہ فیاضی سے قائم ہوا تھا، وہ کیسا تھا، اس کی تعلیم کیا تھی، کون کون بڑے بڑے مدرسین تھے، فارسی کی لفاظانہ انشا پردازی میں اس کا بیان گو برنی نے صفحوں میں کیا ہو مگر اس کا حاصل کچھ نہیں، بدر چاچ اور مطہر کڑہ اس عہد کے دو شاعروں نے اس مدرسہ کا جو ذکر اپنے قصائد میں کیا ہے اسکو پڑھکر اس کی عظمت کا اندازہ کرنے کے لئے ہم آج بے قرار ہیں مگر نہیں کر سکتے،

مسالک الابصار کے بیان کا یہ حصہ جو ہندوستان کی تاریخ سے متعلق ہے، فرانسیسی، اور انگریزی میں ترجمہ ہو گیا ہے، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے، کہ عرب مورخ کی نگاہ میں کتنی وسعت ہوتی ہے، ابن فضل اللہ کے بعد مصر کے دوسرے مورخ قلقشندی المتوفی ۸۲۱ھ نے اپنی کتاب صبح الاعشیٰ فی کتابۃ الانشا میں اس حصہ کو نقل کر دیا ہے، اور ہماری اکاڈیمی نے چودہ برس ہوئے کہ اس کا ترجمہ معارف دسمبر ۱۹۲۰ء میں شائع کر دیا ہے، اس عہد کے عرب سوانح نگاروں نے بھی آٹھویں اور نویں صدی ہجری کے اکابر کے حالات میں اپنے زمانہ کے ہندوستانی بادشاہوں کو بھی جگہ دی ہے، جیسے ابن حجر مصری نے الدرر الکامنہ فی اعیان المائۃ الثامنہ میں، شوکانی یمنی نے البدر الطالع فی قرن التاسع میں جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کے متعدد سلاطین فضل و کمال کے لحاظ سے اہل علم میں شمار کئے جانے کے لائق تھے،

اگر ہر دور میں ایک ابن بطوطہ ایک ابن فضل اللہ اور ایک ابو العباس احمد قلقشندی ہوتا، تو آج ہندوستان کے زیر نظر عہد کی تاریخ اس سے مختلف ہوتی، جو آج نظر آتی ہے، تیموریوں کے

مقابلہ میں سلاطین دہلی کا زمانہ عام طور سے اہم نہیں سمجھا جاتا ہے، اس کی وجہ یہ نہیں کہ اس عہد کے سارے حکمراں ادنیٰ درجہ کے تھے، یا ان کا نظام سلطنت اتنا مکمل اور مرتب نہ تھا، جیسا کہ ان کے بعد کے فرمانرواؤں کا تھا، بلکہ اس کا اصلی سبب یہ ہے کہ ان کی سیاسی سطوت، اور تمدنی عظمت کی صحیح تصویر پیش کرنے والا کوئی مورخ پیدا نہیں ہو سکا، اور نہ خود ان سلاطین نے اپنے شاندار ملکی، جنگی اور کلچرل کارناموں کو باضابطہ تحریر میں لانے کی کوشش کی، اگر اس دور میں کم از کم کوئی ابوالفضل، کوئی عبدالحمید لاہوری، کوئی عبدالباقی نہاوندی، اور کوئی محمد کاظم بھی پیدا ہو جاتا، تو ان سلاطین کی تاریخ ویسی پرشکوہ اور باوقار معلوم ہوتی جیسی وہ درحقیقت تھی، موجودہ دور کے محققین کا اب یہ فرض ہے کہ اس زمانہ کے تاریخی سرمایہ کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالیں، اور مورخین کے گذشتہ تغافل کی تلافی کریں، اس عہد کا جو کچھ تاریخی لٹریچر ہے، وہ زیادہ تر یورپ یا کسی اور جگہ کے کتب خانوں میں قلمی نسخوں کی شکل کی میں زینت و آرایش کی خاطر رکھ چھوڑا گیا ہے، ان کتب خانوں میں بیٹھکر جو کوئی بھی ان قلمی نسخوں کے کے ذریعہ سے اچھے اور برے، صحیح و غلط معلومات فراہم کر دیتا ہے، ہم انہی پہ اکتفا کر لیتے ہیں، ان کی حقیقی اور غیر حقیقی تعبیر و تصریح پر ہم کسی قسم کی روشنی ڈالنے سے بالکل قاصر رہتے ہیں، اگر غیر مطبوعہ لٹریچر طبع اور شائع ہو کر سہولت سے ملنے لگے، تو محققین کا کام بہت ہی آسان اور ہلکا ہو جائے،

ہم بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے ممنون ہیں کہ اس کی طرف سے بہت سی کتابیں شائع ہو گئی ہیں، علی گڈھ کے اساتذہ نے بھی مفید کتابوں کا اضافہ کیا ہے، آگرہ یونیورسٹی، لاہور اور نیشنل کالج اور حیدرآباد کے کچھ اصحاب قلم نے بھی بعض قلمی نسخوں کو محنت کے ساتھ اڈٹ کر کے تاریخ ہند کے شائقین کو مرہون منت کیا ہے، مگر پھر بھی بہت سا ایسا لٹریچر ہے، جس کے نہ ملنے کی وجہ سے محققین کی راہ میں ہر قسم کی رکاوٹیں ہیں، اس لئے اگر خود کانگریس یا تاریخ کا کوئی ادارہ ایسا قائم ہو جائے کہ ان کتابوں کا پتہ لگائے، ان کی نقلیں اور فوٹو بہم پہونچائے، یا ان کو اڈٹ اور شائع کر کے اہل تحقیق

کے ہاتھوں تک پہنچائے، تو ایک بڑی کمی پوری ہو جائے، مثلاً غلاموں کے عہد میں حسن نظامی نے تاج المآثر میں بعض غلام سلاطین کے حالات لکھے ہیں لیکن اس کی عبارت آرائی کی وجہ سے اس کو تاریخی اہمیت نہیں دی جاتی ہے، اور یہ کہکر اس کو نظرانداز کر دیا جاتا ہے، کہ اس میں واقعات کم اور الفاظ کا طومار زیادہ ہے، شاید اسی لئے یہ اب تک نہیں چھپ سکی ہے، اس میں گو واقعات کم ہوں، مگر اس کی سطروں کے درمیان بعض ایسی ضروری چیزیں مل جاتی ہیں جن سے اس زمانہ کے بعض تمدنی، کلچرل، اور عمرانی پہلو واضح ہو جاتے ہیں، جس طرز کی عبارت اس میں استعمال ہوئی ہے، اس سے اس زمانہ کے علمی اور انشاپردازانہ ذوق کا بھی اندازہ ہوتا ہے، اس کے شائع ہونے سے اس عہد کے تاریخی اور علمی حالات کا جائزہ لینے میں کچھ نہ کچھ مدد ضرور مل سکتی ہے، التمش کے زمانۂ حکومت میں آداب الحرب والشجاعہ لکھی گئی، جو اس عہد کے حربی و فوجی معلومات کے لئے ایک بیش قیمت ماخذ ہے، اورینٹل کالج لاہور نے اس کا کچھ حصہ شائع کیا ہے، مگر اس کے مکمل نسخہ کی کمی غیر معمولی طریقہ پر محسوس ہو رہی ہے، اسی زمانہ میں محمد عوفی نے التمش کے دربار میں رہ کر جامع الحکایات ولوامع الروایات لکھی، جو گو قصوں اور کہانیوں پر مشتمل ہے لیکن ان سے بعض اوقات بہت سی تاریخی اور معاشرتی تفصیلات واضح ہوتی ہیں، ضیاء الدین برنی نے اپنی تاریخ فیروز شاہی میں طبقات ناصری، تاج المآثر، اور جوامع الحکایات کے مولفوں کے علاوہ کبیر الدین ابن تاج الدین عراقی کا بھی نام لیا ہے، جس نے علاء الدین خلجی کی فتوحات کی تاریخ لکھی تھی، لیکن اس کتاب کا اب تک کہیں پتہ نہیں چل سکا ہے، تیموریوں کے آخری دور کے ہندو مورخ سبحان رائے نے اپنی خلاصۃ التواریخ میں عزالدین خالد خانی کی کتاب تاریخ فیروز شاہی کا ذکر کیا ہے، لیکن اس کے متعلق بھی اب تک کسی کتب خانہ میں کوئی پتہ نہیں چلا، خالد خانی کی ایک دوسری تصنیف دلائل فیروز شاہی کا ذکر فرشتہ نے کیا ہے، مگر وہ اقسام حکمت علمی و عملی میں ہے، تاریخ

فیروز شاہی کے مؤلف شمس سراج عفیف کی ایک کتاب مناقب سلطان محمد بھی لاپتہ ہے، ایک نامعلوم مصنف کی ایک اہم کتاب سیرت فیروز شاہی کا واحد نسخہ خدا بخش خاں کے کتب خانہ پٹنہ میں موجود ہے مگر اب تک کسی اہل علم یا ادارہ نے اس کو شائع کرنے کی تکلیف گوارا نہیں کی ہے، امیر تیمور کی طرف دو کتابیں تزک تیموری اور ملفوظات تیموری منسوب ہیں، دونوں ایک ہی چیز ہیں، مگر بمبئی کے مطبوعہ نسخہ تزک تیموری اور ایلیٹ کے اقتباسات ملفوظات تیموری میں بڑا اختلاف ہے، ملفوظات تیموری مترجمہ ابو طالب حسینی کو جعلی بتایا گیا ہے، لیکن اس کی تحقیق اب تک نہیں ہوئی ہے، کہ بمبئی کا مطبوعہ نسخہ تزک تیموری مستند ہے، یا غیر مستند، لودیوں کی کسی معاصر تاریخ کا پتہ اب تک معلوم نہیں ہو سکا ہے، طبقات اکبری، تاریخ فرشتہ، واقعات مشتاقی، اور تاریخ داؤدی سے اس خاندان کی تفصیلات معلوم ہو جاتی ہیں، مگر یہ تمام کتابیں تیموریوں کے دور میں لکھی گئیں، اسی طرح یہ یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا ہے، کہ سوریوں کے زمانہ میں اُن کی حکومت کی کوئی تاریخ مرتب نہ ہوئی ہوگی، یا تو اس عہد کی معاصر تاریخیں نظروں سے اوجھل کہیں پڑی ہیں، یا تلف ہو گئی ہیں،

تیموریوں کے دور میں سوریوں کے حالات تاریخ شیر شاہی (مؤلفہ عباس خاں شروانی)، مخزن افغانان (مؤلفہ نعمت اللہ) اور تاریخ داؤدی (مؤلفہ عبداللہ) میں لکھے گئے، عباس خاں شروانی کی تاریخ شیر شاہی ایک اہم اور مفید تاریخی لٹریچر ہے جو اگر چھپ کر محققین کے ہاتھوں تک پہنچ جا تو ایک مفید کام ہو،

بابر کی تاریخ کے لئے خود اُس کی تزک بابری اور اُس کے خالہ زاد بھائی مرزا حیدر دوغلت کی تاریخ رشیدی اہم کتابیں ہیں، تزک بابری کے انگریزی ترجمہ کو جن مفید حواشی اور تشریحات کے ساتھ اے۔ ایس۔ بیورج نے شائع کیا ہے، اس کے احسان کی گراں باری ہمیشہ رہے گی، اس کے اور بھی

ترکی نسخہ کی تو نہیں مگر اس کے فارسی ترجمہ کے طبع ہونے کی پھر بھی ضرورت ہے، جو عبدالرحیم خانخانان نے اکبر کے لئے کیا تھا۔ تاریخ رشیدی میں وسط ایشیا کے مغلوں اور خصوصاً چغتائیوں کے حالات زیادہ ہیں، مگر یہ کتاب ہندوستان میں لکھی گئی، اور بابر اور ہمایوں کے متعلق بعض مفید معلومات فراہم کرتی ہے۔ مسٹر ڈینیسن راس نے اس کا انگریزی ترجمہ کرکے اس کتاب کے اوریجنل فارسی نسخہ سے محققین کو قدرے بے نیاز کر دیا ہے، مگر ترجمے خواہ کتنے ہی معتبر اور مستند ہوں صرف ان ہی پر بھروسہ اور اعتماد کرنا تحقیق کے اعلیٰ معیار کو کم کرتا ہے، بعض اوقات ان ترجموں کی غلطیوں اور کمزوریوں سے واقعات کے استنباط اور نتائج کے اخذ کرنے میں جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں، ان کا ہلکا سا اندازہ مسٹر ہوڈی والا کی کتاب Studies in Indo Muslim History کے مطالعہ سے ہوگا، اس کتاب میں مسٹر ہوڈی والا نے الیٹ کی جو غلطیاں دکھائی ہیں، اُن کو پڑھنے کے بعد محققین کو الیٹ پر شاید اعتماد کُلّی باقی نہ رہا ہوگا، اسی طرح تاریخ یمینی، طبقات ناصری، اور تاریخ فرشتہ کے انگریزی ترجمہ پر جو نکتہ چینیاں ہوتی رہی ہیں، ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے، ترجموں کو زیادہ اہمیت تحقیق کے سلسلہ میں نہیں دیجا سکتی ہے،

حضرات! مجھ سے پہلے شاید اس کرسی سے آپ کی توجہ اس بات کی طرف دلائی گئی ہو گی کہ مرکزی حکومتوں کے ساتھ ساتھ مختلف صوبوں میں جن خاندانوں نے حکمرانی کی، ان کی تاریخ نظر انداز کرنے کے لائق نہیں ہے، اوّل تو صوبوں کے والیوں ہی کے مختلف کارناموں کی اتنی تفصیلات ہیں، کہ ان کو قلم بند کیا جائے تو ہر صوبہ کی علحدہ علحدہ تاریخ ہوگی، پھر مرکزی حکومتوں کی حریف یا جگہ ریاستیں تو مستقل تاریخ کی مستحق ہیں، احسن آباد گلبرگہ کے بہمنی خاندان، بیجاپور کے عادل شاہی سلاطین، تلنگ کے قطب شاہی بادشاہوں برار کے عماد شاہی حکمرانوں، اور بیدر کے برید شاہی والیوں نے جنوبی ہندوستان کی سیاست، معاشرت، تمدن، اور آرٹ پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں، مالوہ

اور منڈو میں خلجی، برہان پور میں فاروقی خاندان اور گجرات میں مظفر شاہی حکمرانوں کے کارنامے فراموش نہیں کئے جا سکتے ہیں، گجرات کی خود مختار سلطنت اپنی علمی و تجارتی و بحری ترقیوں میں دلی کی مرکزی سلطنت سے کہیں بڑھ کر ہے، اسی طرح بیجانگر کی تاریخ بھی ہماری توجہ کی مستحق ہے، اور یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہیں، کہ اس ہندو سلطنت کی جنگی طاقت میں مسلمان سپاہیوں کو بھی خاص حیثیت حاصل تھی، ٹھٹھہ اور سندھ میں ایبک اور التمش کے حریف حکمرانوں تاج الدین یلدوز اور ناصر الدین قباچہ کا دربار دلی کے دربار سے کم پرشکوہ اور زرنگار نہیں رہا۔ ناصر الدین قباچہ کے بعد یہاں خاندان جام کی حکومت قائم ہوئی، تو اس کے تاریخی واقعات بھی گوناگوں رہے، ملتان کے لنگاہ سلاطین کی حربی عظمت اس دور میں اس لئے تھی کہ ان کی حکومت ایک اہم سرحد پر واقع تھی، جنت نظیر کشمیر کے بادشاہوں کے حالات تاریخی لٹریچر کے لئے دلچسپ مواد فراہم کرتے ہیں،

مذکورۂ بالا حکومتوں اور فرماں رواؤں کی تاریخ کی تدوین کے لئے ابھی حال ہی سے ہمارے موجودہ محققوں نے اپنی علمی جدوجہد کا ثبوت دینا شروع کیا ہے، عثمانیہ یونیورسٹی کے بعض اساتذہ دکن کی بعض حکومتوں خصوصًا بہمنی خاندان کے مختلف کارناموں کو روشن کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، احمد آباد کی اینگلو ورنیکولر سوسائٹی گجرات کے اسلامی دور کی بھی تاریخ لکھا رہی ہے، سرجدوناتھ سرکار کی نگرانی میں بنگال کے ابتدائی مسلمان بادشاہوں کی تاریخ کی ترتیب کی ۔۔۔ بھی خبر ملی ہے، ان مختلف خاندانوں اور ریاستوں کی تاریخی تحقیقات میں ایک بڑی مشکل یہ بھی ہے، کہ ان کے ماخذ کی بڑی کمی ہے خصوصًا معاصر تاریخوں کا پتہ تو بالکل نہیں ملتا، ان کی تاریخ زیادہ تر ایسی کتابوں میں ملتی ہے، جو تیموری دور میں لکھی گئیں،

فرشتہ نے بہمنی خاندان کی تاریخ کے ماخذ میں حاجی محمد قندھاری کا بہمن نامہ، ملا داؤد بیدری کی تحفۃ السلاطین، اور ملا عبدالکریم سندھی کی سوانح محمود گاواں کا ذکر کیا ہے، فرشتہ نے

شاہ خورشاہ ایک مورخ کا نام بھی لکھا ہے، جس نے ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں عراق سے آکر ہندوستان میں وقائع قطب شاہی لکھی تھی، مگران تمام کتابوں کا کہیں پتہ نہیں، گجرات کی ایک معاصر تاریخ "محمود شاہی" ہے، جو ۸۶۳ھ سے ۹۱۷ھ تک کے واقعات پر مشتمل ہے، گجرات کے مظفر شاہ ثانی کے معاصر مانڈو پر بھی ایک نا معلوم مؤلف کی کتاب ہے، جو شاید اسی زمانہ میں لکھی گئی، مگر یہ دونوں کتابیں ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں، ان دونوں کتابوں کے علاوہ گجرات کے مظفر شاہی خاندان کی معاصر تاریخوں کا حال معلوم نہیں، مالوہ کی تاریخ پر صرف ایک کتاب تاریخ ناصر شاہی کا پتہ ملتا ہے، جس میں مالوہ کے حکمراں ناصرالدین عبدالقادر شاہ کی حکمرانی کے واقعات ۹۰۶ھ سے ۹۱۶ھ تک کے درج ہیں، مگر یہ بھی ابھی تک قلمی نسخہ کی شکل ہی میں ہے، عادل شاہی، برید شاہی، عماد شاہی حکومتوں، برہان پور کے فاروقی خاندان، سندھ، کشمیر، ملتان، بنگال اور جونپور کے سلاطین کی بھی معاصر تاریخیں نہیں لیکن معاصر ماخذ نہیں ملتا ہے، تو بعد کی لکھی ہوئی مستند تاریخوں ہی سے فائدہ اٹھا کر مختلف صوبوں اور ریاستوں کے واقعات قلم بند کرنے چاہئیں، مگر اس کے لئے ضروری ہے کہ غیر مطبوعہ مخطوطات کو چھاپ کر زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے۔

حضرات! زیر نظر عہد کی تاریخ کی ترتیب میں شعراء کا کلام اور علماء و صوفیہ کی تصانیف بھی قیمتی ماخذ ہو سکتی ہیں، ہم اپنی تحقیقات میں زیادہ تر سلاطین اور فرمانرواؤں کے واقعات کو تحریر میں لانے کی کوشش کرتے ہیں، مگر تاریخ صرف بادشاہوں کے کارناموں کا نام نہیں، ہر زمانہ میں ملک کی عام علمی، تمدنی، معاشرتی، اور اخلاقی کیفیات کا جائزہ لینا تاریخ کا اہم موضوع ہے، چنانچہ پیش نظر دور کے شعراء میں سے ناصری خراسانی، محمد عوفی، امیر روحانی، سمرقندی، ابوالفرج رونی، تاج الدین دبیر، شہاب مہمرہ، امیر فخر الدین، عمید تولکی، بدر چاچ، مطہر کڑہ، خسرو

حسن سجزی، عبید، اعز الدین، خالد خانی اور شمس الدین وغیرہ کے کلام کا استقصا کیا جائے، تو اس عہد کی نہ صرف علمی ترقیوں کا اندازہ ہوگا، بلکہ اُن کے اشعار کے درمیان بہت سے تاریخی واقعات کی بھی جھلک نظر آئے گی، مگر افسوس ہے کہ ان میں سے بہت کم ایسے خوش نصیب شعراء ہیں، جن کا کلام اور دیوان چھپ کر اہل علم کے ہاتھوں تک پہونچ سکا ہے، اسی وجہ سے ان کی تحریروں کے ذریعہ سے کسی قسم کی تحقیق کرنے کی اب تک کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے، امیر خسرو کی نظمیں چھپ گئی ہیں تو اُن سے تحقیقات کے سلسلہ میں مدد بھی لیجارہی ہے،

صوفیہ کرام کی تصانیف ہندوستان کے اسلامی عہد کی مذہبی، اخلاقی اور معاشرتی تاریخ کیلئے ایسی ضروری ہیں، کہ اُن کے بغیر تینوں پہلوؤں کی تصویر واضح نہیں ہوسکتی ہے، ہندوستان کے اسلامی دور میں دو قسم کی بادشاہت ساتھ ساتھ قائم تھی، ایک تو تخت و تاج کے حکمرانوں کی، اور دوسری خانقاہ کے بوریا نشینوں کی، ایک توپ و تفنگ سے مملکت کو اپنے زیر نگیں کرتے تھے، تو دوسرے اپنے بلند اخلاق اور اعلیٰ اوصاف کے ذریعہ سے ذہن و قلب کو تسخیر کرتے تھے، اور آج یہ کہنا مشکل ہے کہ دونوں میں کس کے اثرات زیادہ غالب رہے، مگر اتنا تسلیم کرنا پڑے گا کہ آج بھی ان صوفیہ کرام کی تصانیف ذہن کی پراگندگی کو سکون، قلب کے انتشار کو اطمینان، اور گمراہوں کی کج روی کو ہدایت بخشنے میں کامیاب اور موثر ہیں، چنانچہ اُن کی تصانیف کو بجا طور سے اسلامی دور کا ایک بیش قیمت خزانہ کہا جاسکتا ہے، اور اس دور کے مذہب، اخلاق، اور معاشرت میں ان صوفیائے کرام نے جو انقلابات پیدا کئے، اُن کو صحیح طور سے سمجھے بغیر اس عہد کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی ہے، خواجہ معین الدین چشتیؒ، خواجہ بختیار کاکیؒ، خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ، خواجہ شہاب الدین علی ہمدانیؒ، خواجہ نظام الدین احمد بدایونیؒ، خواجہ نصیر الدین چراغ دہلویؒ، بوعلی قلندرؒ، ضیاءالدین نخشبیؒ، خواجہ رکن الدین عماد کاشانیؒ، حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ، خواجہ گیسو درازؒ، شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ، حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ، محمد غوث گوالیاریؒ

میر خورد دہلویؒ، عبداللہ شطاریؒ وغیرہ کی تصنیفات، مکتوبات اور ملفوظات میں اگر تلاش کیا جائے تو زیرِ نظر عہد کی تاریخ کے لئے بہت سے مواد فراہم ہوسکتے ہیں، اور اُن سے اخلاق و معاشرت کے رخ بہت اچھی طرح روشن ہو سکتے ہیں، مگر ان تصانیف کی طرف تاریخ ہند سے دلچسپی لینے والے محققین کی کی توجہ بالکل نہیں رہی ہے، اس لئے اُن کی نظریں بھی سلاطین کے میدانِ جنگ کے کشت و خون ہی تک محدود رہی ہیں،

ان صوفیۂ کرام کے ساتھ علمائے نے بھی ہندوستان کو ذہنی اور علمی حیثیت سے مالامال کیا، زیرِ نظر دور میں عرب اور وسط ایشیا کے اربابِ کمال سے ہندوستان علم و فن کا مرکز بنا ہوا تھا، ان علمائے نے اس عہد کی مختلف زبانوں میں جو تصانیف کی ہیں اُن کے مقدمہ یا خاتمہ میں اپنے زمانہ کے بادشاہوں کا کچھ نہ کچھ نام و نشان اور حال بھی لکھا ہے، خواہ وہ کتاب کسی فن پر لکھی گئی ہو جیسے نصاب الاحتساب، فتاویٰ تاتارخانی، تفسیر تاتاری، تفسیر بحر مواج دولت آبادی (طب) معدن الشفار سکندری (تصوف) عین الحیوٰۃ، ترجمہ امرت کنڈ، بارا ہی سنکھا بھٹ بن ارا ہ مہر کی کتاب ہیئت کا فارسی ترجمہ ملا عبدالنبی احمد نگری کی دستور العلمار وغیرہ،

حضرات! ابتک ہمارے موجودہ محققین کی جماعت، زیرِ نظر عہد کے سلاطین کے سیاسی، حربی، اور ملکی کارناموں کی تفصیلات لکھنے میں منہمک رہی ہے، اس دور کے حکمرانوں کی مختلف تعمیرات کی جیتی جاگتی یادگاروں کا مطالعہ کرکے یورپین اہلِ قلم ان کے اس آرٹ اور فن کے کمال کی داد دیتے رہے ہیں، مگر اس زمانہ میں علوم و فنون تعلیم، تمدن، معاشرت، رفاہ عام کے کام، زراعت، حیوانات، صنعت و حرفت اور تجارت میں جو ترقیاں ہوئیں، اُن کا استقصا صحیح طور پر نہیں ہو سکا ہے، اس عہد کے علوم و فنون کی ترقی پر کلکتہ یونیورسٹی کے ایک اہلِ علم نے اپنی کتاب - Promotion of learning in India during The mohammadan rule

کے چند ابواب میں روشنی ڈالی ہے، پٹنہ یونیورسٹی کے ایک لکچرر نے اس دور کے دو چار شعرا کے حالات لکھے ہیں، لکھنؤ یونیورسٹی کے ایک پروفیسر نے امیر خسرو پر ایک کتاب لکھی ہے، ناگپور یونیورسٹی کے ایک پروفیسر نے "ہندوستان کے عہد مغلیہ سے پہلے دور کی فارسی" کے نام سے ایک کتاب پیش کی ہے، مگر پھر بھی اس عہد کے ادب و شاعری کی صحیح تصویر سامنے نہیں آسکی ہے، تعلیمی نصاب اور تعلیمی اداروں کا ہلکا سا خاکہ ہماری اکاڈمی کی ایک تالیف "اسلامی درس گاہیں" سے مل جاتا ہے، ہماری جماعت ندوۃ العلماء کے سابق ناظم مولانا حکیم سید عبدالحئی صاحب مرحوم نے بیس برس کی عرق ریزی سے عربی میں دس جلدوں میں فتح سندھ سے لے کر اخیر اسلامی عہد تک ہندوستان کے علماء و مشائخ و شعراء و مورخین کے حالات جمع کئے ہیں، جو بڑا نادر سرمایہ ہے، یہ اگر چھپ جائے تو محققین کی عمروں کا بہت بڑا حصہ ان معلومات کی تلاش و محنت میں ضائع ہو جانے سے بچ جائے، صرف اس کا ایک حصہ جو آٹھویں صدی ہجری سے متعلق ہے، دائرۃ المعارف حیدرآباد سے شائع ہوا ہے، مگر افسوس کہ پوری کتاب حلیۂ طبع سے محروم ہے، ابھی حال میں ہمارے فاضل دوست مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ نے ہندوستان میں اسلامی نظام تعلیم و تربیت" پر ایک پُر از معلومات کتاب اردو میں لکھی ہے، جس میں شروع سے لے کر اس وقت تک تعلیم و تربیت کے اصول اور طریقوں اور تصنیف و تالیف اور کتابوں کی فراہمی وغیرہ کے حالات لکھے ہیں، زیر نظر عہد کی عام معاشرتی، اقتصادی، اور تجارتی تفصیلات کا ایک اچھا خاصا خلاصہ ڈاکٹر کنور اشرف کے قلم سے بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کی اشاعت Life and con- dition of people of Hindustani $\frac{1206}{1526}$ میں پیش کیا گیا ہے، ڈاکٹر اشتیاق کی کتاب سلاطین دہلی کے نظام سلطنت پر قابلِ تحسین ہے،

اس عہد پر جتنی کتابیں بھی پائی جاتی ہیں، اُن میں مختلف تمدنی پہلوؤں کو یا چند پیراگراف

یا زیادہ سے زیادہ ایک باب میں لکھ کر ختم کر دیا جاتا ہے، حالانکہ ان میں سے ہر پہلو پر ایک مستقل کتاب لکھی جا سکتی ہے، لیکن اب تک اس کی طرف توجہ نہیں کی گئی ہے، اس کی وجہ یہ نہیں کہ اس کے لئے کافی لٹریچر اور مواد موجود نہیں، بلکہ محض اس لئے کہ اس کی تحقیق و تدقیق میں غیر معمولی محنت، تلاش، جستجو، اور دقتِ نظر کی جو ضرورت ہے، وہ ہمارے نزدیک محققین کی جماعت میں ابھی پیدا نہیں ہو سکی ہے، اس لئے ہمارے ماضی کے تمدن کا صحیح اور روشن رُخ پیش نہیں ہو سکا ہے، اور ہمارے سامنے گذشتہ تاریخ کے زیادہ تر واقعات ایسے ہیں، جن کو پڑھنے کے بعد دکھ اور رنج پہنچتا ہے،

اسی احساس کا نتیجہ ہے کہ میں نے اپنی شبلی اکیڈمی کی طرف سے آج سے چودہ[۱۴] برس پہلے اردو میں ایک مکمل تاریخ ہند لکھوانے کا فیصلہ کیا، جس کی تقسیم دس بارہ جلدوں میں کی گئی تھی، اور جس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کی تمدنی و تعمیری ترقی میں مسلمانوں نے کیا کام کیا، الحمد اللہ کہ یہ کام شروع کر دیا گیا ہے، اور اس وقت تک اس کی تین جلدیں مرتب ہو چکی ہیں، تمدنی کارناموں کی ایک جلد الگ تیار ہوئی ہے، ممکن ہے کہ اسی موضوع پر کئی اور جلدیں لکھی جائیں[۱]،

خدا کا شکر ہے کہ اب اہلِ ہند کو اس ضرورت کا عام احساس ہو رہا ہے، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے انڈین ہسٹاریکل سوسائٹی کی بنیاد اسی غرض سے رکھی ہے، بنارس میں بھارت اتہاس پریشد اسی لئے قائم ہوئی ہے، اور ہم نے خوشی سے یہ بھی سنا کہ اس ہسٹاریکل کانگریس نے بھی جس میں ہم آپ جمع ہیں، ایک تاریخ ہند لکھوانے کا فیصلہ کیا ہے، اور اس کے لئے ہندوستان کی سب سے بڑی دیسی ریاست نے شاہانہ امداد دی ہے، امید ہے کہ یہ تینوں سلسلے کامیابی کے ساتھ اپنے فرض کو انجام دیں گے، مگر ضرورتِ اصلی یہ ہے کہ جس کا اظہار تقریر کے آغاز میں کیا گیا تھا، اسی کی یاد دہانی

[۱] اس خطبہ کے لکھنے کے بعد دار المصنفین سے تاریخ ہند پر حسب ذیل کتابیں شائع ہو چکی ہیں، اور ابھی

تقریر کے اختتام پر کہیائے، کہ اب اس کے بعد ہندوستان کی جو تاریخ لکھی جائے، اس کا مقصد ہندوستان کے متفرق اجزاء کو باہم جوڑنا ہو، توڑنا نہ ہو، حال کو ماضی کی ناگواری کی تلخی کو بڑھا کر کیوں پر باد کیا جائے اور کیوں مستقبل کے لئے یہ کوشش جاری رہے، کہ وہ کبھی خوش آیند نہ ہوسکے،

ہندوستان کے مورخو! تم ہندوستان کی صرف تاریخ نہ لکھو، بلکہ اپنے کارناموں سے ہندوستان کی نئی تاریخ بھی بناؤ، نیک ارادہ سے اٹھو، خدا تمھاری مدد کرے گا،

(معارف اپریل ۱۹۴۵ء)

(بقیہ حاشیہ ص ۴۰۲) اور شائع ہوں گی، جو زیر ترتیب ہیں،

(۱) تاریخ سندھ از مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی مرحوم (۲) بزم تیموریہ (۳) بزم مملوکیہ (۴) ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک ایک جھلک (۵) ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام، (۶) ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے، (۷) ہندوستان کے سلاطین علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر (۸) ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں (۹) عہد مغلیہ ہندوؤں اور مسلمان مورخین کی نظر میں، از سید صباح الدین عبدالرحمٰن (۱۰) گجرات کی تمدنی تاریخ مسلمان حکمرانوں کے عہد میں، از مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی مرحوم (۱۱ و ۱۲) ہندوستان عربوں کی نظر میں ۱ و ۲ . (۱۳) ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی کارنامے

(مرتب)

ہندی الاصل و ہندوی النسل مسلمان سلاطین

چار پانچ سال کی بات ہے کہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن نے مجھ سے یونیورسٹی میں، توسیعی لکچر دینے کی خواہش کی تھی، اس تقریب سے میں نے اس مضمون کو تیار کیا تھا، ایک سال تو مضمون کی عدم تکمیل کے سبب بیتا، اس کے بعد ملک کے انقلابی حالات نے ایسی صورتیں پیدا کیں کہ یونیورسٹی کے تقاضے کے باوجود افسردہ دلی نے نقل و حرکت سے باز رکھا، اور یہ مضمون یونہی اہمال و تغافل کے جزودان میں پڑا رہا، اب جب اتفاق سے میرا کراچی آنا ہوا تو ان اوراق پر نظر ثانی کو رس لئے دل چاہا کہ اس میں سندھ اور ملتان کے نومسلم بادشاہوں کے تذکرے تھے، اور جن کے لئے یہ سرزمین مناسب نظر آئی، اس مضمون کے لکھنے اور ابتدائی خاکہ تیار کرنے میں میرے عزیز برادرزادہ مولوی سید ابوظفر صاحب ندوی ریسرچ سکالر گجرات ورناکیولر سوسائٹی احمدآباد نے میری مدد کی ہے جس کے لئے میں ان کا شکر گذار ہوں۔"

دنیا میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کو شہرت عام کی بنا پر لوگ مسلّم سمجھنے لگتے ہیں لیکن جب تحقیق کا دائرہ وسیع ہوجاتا ہے تو حقیقت کے رُخ سے پردہ اٹھ جاتا ہے، اور صداقت کا روشن چہرہ صاف نظر آنے لگتا ہے، چنانچہ تاریخوں میں اس کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں، مثلاً سندھ کے مسلمان عرب

فاتح محمد بن قاسم ثقفی کو خلیفہ کے حکم سے کھال میں سی کر، دار الخلافہ بغداد روانہ کرنا، اثنائے راہ میں اس کی وفات اور راجہ داہر کی دو لڑکیوں کا انجام بے بنیاد واقعہ ہے، اسی طرح سلطان محمود غزنوی کا سومنات مندر میں گرز، مورتی کے سر پہ مارنا، خزانہ کا دستیاب ہونا بھی ایک کہانی ہے ٹھیک اسی قسم کی یہ بات بھی مشہور ہے کہ ہندوستان میں جتنے مسلمان بادشاہ ہوئے وہ سب غیر ملکی تھے، حالانکہ خاص ہندو نسل کے مسلمان بادشاہ تقریبًا ہندوستان کے ہر صوبہ میں ہوئے، اور انھوں نے اپنے نمایاں کارناموں سے ملک کو بڑا فائدہ پہنچایا، مثلاً کشمیر، ملتان، سندھ، گجرات، دکن، دہلی وغیرہ آج کی مجلس میں انہی سلاطین کا تذکرہ کرنا ہے، جو خالص ہندی یا مخلوط ہندی النسل ہیں، اور بتانا ہے کہ ان لوگوں نے سلطنت یا کرہند وستان کے دوسرے بادشاہوں سے ہندوستان کی کسی طرح کم خدمت نہیں کی، یہاں پر یہ بات ذہن نشین رہے کہ لفظ ہندوستان پرانے معنی میں بولا جارہا ہے، جو ہندوستان اور پاکستان دونوں کو شامل ہے،

تقریر کے موضوع بحث یعنی "ہندی الاصل اور ہندوی النسل سلاطین" سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں، ایک یہ کہ ہندوستان کے مسلمان شاہی خاندان، سب کے سب غیر ملکی نہ تھے، بلکہ ہر صوبہ میں ایسے مسلمان بادشاہ اور اُن کے خاندان گذرے ہیں، جو اپنی اصل و نسل کے لحاظ سے ہندی یا ہندوی تھے، اس لئے تمام مسلمان شاہی خاندانوں کو غیر ملکی سمجھنا کسی طرح صحیح نہیں، دوسری بات یہ ثابت ہوتی ہے کہ اسلام نے اپنی سیاست میں وہ راستہ اختیار نہیں کیا، جس پر دوسری قومیں گامزن ہیں، جنھوں نے اصل نسب اور قومیت کو حاکمیت اور محکومیت کا معیار قرار دے لیا ہے، اسلام کی نظر میں قومیت اور وطنیت کو کوئی اہمیت حاصل نہیں، اس کا منتہائے نظر زندگی کا ظاہری اور باطنی اسلوب وہ ہے جس کو اصطلاح میں "دین" کہتے ہیں جب کبھی کسی غیر مسلم نے معتقدات اسلام اور قانون اسلام کی زندگی کو قبول کیا ہے، تو اُس کیلئے

ترقی کی غیر محدود وسعتیں پیدا ہوگئی ہیں، یہاں تک کہ باطنی حیثیت سے ایک نومسلم کبھی علم اور دین کی امامت اور پیشوائی کے درجہ کو پہنچ گیا ہے، تو دوسری طرف سلطنت اور حکومت کے تخت اس کے لئے بارہا بچھائے گئے ہیں،

سلاطینِ ہند کی تقسیم | ہندوستان میں ابتداے اسلام سے برٹش حکومت کے اختیار لینے تک چار قسم کے سلاطین حکمراں رہے، اول وہ جن کا وطن ہندوستان نہیں، بلکہ غیر ملک تھا، جیسے قطب الدین ایبک شمس الدین التمش، دوسرے وہ جن کی ولادت تو ہندوستان میں ہوئی، مگر اُن کے والدین ہندی نسل کے نہ تھے، جیسے معز الدین کیقباد، بغرا خاں وغیرہ، تیسرے ایسے سلاطین جو مخلوط النسل ہیں، یعنی اُن کے باپ تو غیر ہندی ہیں لیکن اُن کی مائیں ہندی نسل کی ہیں، جیسے فیروز شاہ تغلق، جہانگیر، اور شاہجہان وغیرہ، چوتھے وہ فرماں روا جو ہر حیثیت سے ہندی ہیں یعنی اُن کے باپ اور مائیں دونوں ہندی نسل کی ہیں، اور ان کی ولادت بھی اسی ملک میں ہوئی ہے مثلاً ظفر خاں گجراتی، قطب الدین لنگاہ (ملتان) وغیرہ میری تقریر کا تعلق ان میں سے صرف دو آخری قسم کے سلاطین سے ہے، ایک وہ جو والدین کے لحاظ سے، ایک طرف سے بیرونی، اور دوسری طرف سے ہندی ہیں، اور دوسرے وہ جو باپ وماں دونوں طرف سے ہندی ہیں،

ان سلاطین کی تعداد کچھ کم نہیں ہے، اور تقریباً ہندوستان کے ہر صوبہ میں وقتاً فوقتاً ایسے بادشاہوں کی حکومتیں قائم ہوتی رہی ہیں، اور انھوں نے انتظامِ مملکت میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیا ہے، ان میں سے بعض خاندان ایسے ہیں جنھوں نے دو سو برس ہندوستان میں استقلال کے ساتھ سلطنت کی، اور اپنی بہترین یادگاریں چھوڑیں، ہم ان سلاطین کا تذکرہ دہلی کے مرکز سے شروع کرتے ہیں،

ان نومسلم سلاطین میں سے جنھوں نے دہلی کے تختِ حکومت پر قدم رکھا، پہلا نام خسرو خاں

کا ہے، خسرو خاں پٹن (گجرات) کا رہنے والا، مذہب کا ہندو اور ذات کا بھڑ واڑ (گڈریا) تھا، سلطان علاء الدین خلجی کے زمانہ میں مالوہ کی لڑائی میں قید ہو کر دہلی آیا، اور مسلمان ہوا، اور اس کا اسلامی نام "حسن" رکھا گیا، سلطان کے حاجب ملک شادی نے اس کی پرورش کی، قطب الدین خلجی کے عہد میں اُس نے بہت نمایاں کام انجام دیئے، جن کے صلہ میں اُس کو "خسرو خاں" کا خطاب ملا، ۱۷؁ھ میں قطب الدین خلجی نے اس کو چتر و دورباش دے کر معبر (کرناٹک) روانہ کیا، وہ دیوگیری ہو کر تلنگانہ پہنچا، اور فتحیاب ہو کر پٹنی چلا گیا، اور کامیابی حاصل کر کے معبر میں برسات کے سبب سے مقیم ہو گیا،

اس جنگ میں ایک ہزار بیس ہاتھی چھ درم کے برابر ایک ہیرا اور بے شمار دولت اُس نے حاصل کی، اور اب اُس نے خود مختاری کا خواب دیکھنا شروع کیا، دوسرے ترکی افسروں نے اس کو گرفتار کر کے ڈاک کے ذریعہ سات دن میں دہلی پہنچا دیا، لیکن قطب الدین نے اس کی چرب زبانی سے متاثر ہو کر اپنے بڑے بڑے افسروں کو خسرو خاں کی شکایت پر قتل کر ڈالا، اور اس کو گجرات کا ناظم بنا دیا، اور پھر نائب ملک کا بھی عہدہ دیا،

خسرو خاں نے آہستہ آہستہ ہم قوم بھرواڑیوں کی ایک فوج تیار کی، اور ایک دن موقع پا کر بادشاہ کی خدمت میں عرض کی کہ حضور کی خدمت سے فرصت نہیں ملتی، اگر حکم ہو تو اپنے رشتہ داروں کو محل میں بلا لیا کروں، بادشاہ نے اجازت دیدی، اُس نے اس بہانے سے رات کے وقت بھرواڑوں کا ایک دستہ اندر بلا لیا، اور اُن کے ہاتھ سے دھوکہ سے قطب الدین کو قتل کرا کے خود بادشاہ بن بیٹھا، بڑے بڑے امراء کو عہدے دے کر اپنا طرفدار بنا لیا، اور جو ساتھ دینے پر راضی نہ ہوئے اُن کو قتل کر ڈالا، اور اس طرح خسرو خاں ہندوستان کا بادشاہ اور مسلمانوں کا سلطان بنا، اور چار ماہ چند دن سلطنت کی، یہ بڑا حوصلہ مند اور ہوشیار اور چالاک شخص تھا، اُس نے چند ہی مہینوں میں

چالیس ہزار فوج جمع کر لی تھی لیکن افسوس یہ ہے کہ اس کی قوم نے جو بالکل جنگلی تھی، عام مسلمانوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا، خسرو خاں اپنی جنگی مصلحتوں کو مدِنظر رکھ کر ان کی ان غلطیوں کو نظر انداز کرتا رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ عام مسلمانوں کی ہمدردی حاصل نہ کر سکا، اور اس سے خلجی امراء میں سے بہت سے لوگ ناراض ہو گئے، انہی میں سے ایک محمد جونا تغلق بھی تھا جس کا باپ ملک غازی تغلق دیپالپور سندھ کا حاکم تھا، خسرو خاں نے محمد جونا تغلق کو داروغۂ اصطبل کا عہدہ دیا تھا لیکن وہ خسرو خاں سے خوش نہ تھا، موقع کا منتظر رہا، اور ایک دن موقع پا کر دلی سے بھاگ کر اپنے باپ کے پاس چلا گیا اور خسرو خاں کی قوت و جمعیت اور مسلمانوں کی ناراضگی اور امراء کی نااتفاقی کے سارے احوال سے مطلع کر کے لڑائی کا مشورہ دیا، اس لڑائی میں خسرو خاں مارا گیا، اور دہلی پر ملک غازی کا قبضہ ہو گیا، اور تغلق سلاطین کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوا، لیکن یہ تغلق کون تھا ؟

تغلق ایک ترکی لفظ ہے، جس کے معنی پہاڑی کے ہیں، یہ پشتو لفظ رہیلہ کے مرادف ہے، تغلق کے متعلق سب سے قدیم بیان ابن بطوطہ کا ہے، وہ لکھتا ہے کہ شیخ رکن الدین قریشی ملتانی سے میں نے سنا ہے کہ تغلق ترک قوم کے قبیلہ قرونہ سے تھا، اور یہ لوگ ترکستان اور سندھ کے بیچ کے پہاڑوں میں رہتے تھے، لفظ قرونہ کی نسبت آٹھویں صدی کا مشہور سیاح مارکو پولو اس طرح تشریح کرتا ہے، کہ قرونہ ان لوگوں کو کہتے ہیں کہ جن کے باپ تاتاری اور ماں ہندی ہوں[1]، ان لوگوں کا پیشہ لوٹ مار اور قزاقی ہے، جہاں یہ چلے جاتے ہیں، اس ملک کو بے چراغ

---

[1] بعض لفظ اپنے اندر تاریخ کا خزانہ رکھتے ہیں، اوپر کی چند سطروں میں تین نام آئے ہیں، قزاق، بربر، جٹ، یہ تین قوموں کے نام ہیں، مگر قوموں کے ان ناموں میں ان قوموں کی تاریخی صفات نے قوم کے معنی کے بجائے قوم کی صفات کا جامہ پہن لیا ہے، قزاق، قازاق کی صورت میں روس کے ایک مسلمان قبیلہ کا نام ہے، جن کا پیشہ لوٹ مار تھا، اس سے قزاق ڈاکو کے معنی پیدا ہو گئے، بربر شمالی

کرڈالتے ہیں، ان کا سردار نکودار ہے، جو چغتائی کا بھتیجہ ہے" ۲؎ دوسری تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے، کہ پہلے تو قرونہ کا تومان (دس ہزار کا لشکر) مغلوں کے لشکر کے ساتھ ہوتا تھا لیکن بعد میں انھوں نے لوٹ مار اپنا پیشہ بنالیا، مشہور ہے کہ اصل میں یہ لوگ چین کے شمال میں قردن چیدن یا فیدن ایک پہاڑ کے پاس رہتے تھے،

خلاصۃ التواریخ کا مصنف لکھتا ہے کہ "سلطان کا باپ تغلق ایک ترک سلطان غیاث الدین بلبن کے غلاموں میں سے تھا، اور اس کی ماں پنجاب کی قوم جٹ ۱؎ سے تھی" بہرحال خلاصۃ التواریخ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ قرونہ کے لفظ سے ابن بطوطہ کے راوی شیخ قریشی نے یہی مراد لی ہے، اور مارکوپولو کا بیان بھی صحیح معلوم ہوتا ہے، اور صاف صاف یہ پتہ چلتا ہے کہ تغلق قوم کا نام نہ تھا بلکہ شخص کا نام تھا، اس خیال کی تصدیق بعض سکوں سے بھی ہوتی ہے، چنانچہ غیاث الدین کے ایک سکہ پر ہے،

"السلطان الغازی غیاث الدنیا والدین المظفر تغلق شاہ السلطان ناصر امیر المومنین"

اور اس کے لڑکے کے سکہ پر

(بقیہ حاشیہ ص ۴۰۸) افریقہ کا قبیلہ ہے، جو آوارہ گرد وحشی تھا، رومیوں نے اس نام کو صفت بناکر بربرازم (اور بربریت کو وحشت اور عدم تمدن کے معنی میں مشہور کر دیا، جٹ سندھ کا قبیلہ تھا، جو غیر متمدن اور جنگجو اور نوشت وخواند سے عاری تھا، اسی سے ہندوستان میں جٹ کی اصطلاح پیدا ہوئی، ہوسکتا ہے کہ جٹ اور جاٹ ایک لفظ ہوں، پنجابی میں بیچ کا لفظ الف اکثر گر جاتا ہے، جیسے کھاٹ سے کھٹ وغیرہ ۱؎ جٹ کے نام سے پنجاب سے زیادہ سندھ کے لوگ واقف ہیں، کہ انھوں نے سندھ کی جنگی تاریخ میں کافی حصہ لیا ہے، اور ان کا اصل پیشہ شتربانی ہے جس سے وہ کبھی کبھی جہانبانی تک پہنچے

"المجاہد فی سبیل اللہ محمد بن تغلق شاہ ؒ"

نقش ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تغلق شخص کا نام ہے، خاندان کا نہیں، اب یہ تغلق نام یا تو خود ملک غازی غیاث الدین کا ہے یا اس کے باپ کا، اور اغلب یہی ہے، کہ خود اس کا نام تھا،

فرشتہ لکھتا ہے کہ میں جب لاہور گیا، تو اہلِ علم سے اس معاملہ کی تحقیقات کی لیکن کسی نے تغلق کے متعلق صحیح اور قابلِ وثوق بات نہیں بتائی، البتہ یہ بات کہی کہ "عام طور پر مشہور ہے کہ غیاث الدین تغلق کا باپ ملک تغلق بلبن کے غلاموں میں سے تھا، اس نے کسی پنجابی جٹ لڑکی سے شادی کرلی تھی، جس سے غیاث الدین تغلق پیدا ہوا، جٹوں کا تعلق مسلمانوں سے بہت پرانا ہے، عرب ان کو زط اور زدط کہتے ہیں، اور سندھ میں اُن کی بڑی آبادی تھی، ان تمام بیانات سے جو ایک دوسرے کی تائید میں ہیں، یہ ثابت ہوتا ہے کہ تغلق گو نسلاً خود ترک تھا، مگر اس کی بیوی پنجاب کے کسی جٹ کی لڑکی تھی، جس کے بطن سے غیاث الدین تغلق پیدا ہوا، اور اُس کے بعد اُس کے خاندان نے ۷۲۰ھ سے ۸۱۵ھ تک پنچانوے ۹۵ برس حکومت کی،

غیاث الدین کے اصلی نام کا پتہ نہیں چلا، تخت سلطنت پر قدم رکھنے سے قبل اس کو ملک غازی کہتے تھے، اس کے ابتدائی حالات پردۂ خفا میں ہیں، غالباً ابتدائے جوانی میں خراسان سے سندھ آیا، پہلے کسی سوداگر کا ملازم ہوا، پھر الغ خاں خلجی کے لشکر میں سپاہی بن گیا، اور جب کچھ دست ہوئی، اور گھوڑا بہم پہنچ گیا، تو سواروں میں داخل ہوا، اور اپنی بہادری سے سب کے دل پر سکہ جمالیا، اور اس طرح درجہ بدرجہ ترقی کرتے ہوئے میراخور (داروغۂ اصطبل) ہوگیا، جو اس عہد میں بہت بڑا عہدہ تھا، اور صرف وفادار امیروں کو اس پر ممتاز کیا جاتا تھا، اور اس زمانہ میں جونکہ مغلوں کا

---

[۱] یہ دونوں سکے میرے برادر زادہ مولوی سید ابو ظفر صاحب ندوی ریسرچ اسکالر گجرات ورناکیولر سوسائٹی کے پاس ہیں؛

بڑا ڈر تھا، اس لئے سرحدی علاقے مخصوص وفادار امیروں کے حوالے کئے جاتے تھے، چنانچہ ملک غازی کو بھی دیپال پور کا علاقہ سپرد ہوا، جو آج بھی مونٹ گمری (پنجاب) کے ضلع میں بیاس (ندی) کے پرانے شکم پر پاک پٹن سے ۲۸ میل مشرق کی طرف واقع ہے، وہ عرصہ تک اسی جگہ رہا، اور اس کا بڑا لڑکا محمد جونا جس کے نام پر شہر جونپور یو پی میں بسایا گیا ہے، پایہ تخت دہلی میں رہتا تھا، قطب الدین کے بعد نومسلم امیر خسرو خاں گجراتی اپنے آقا کو دھوکے سے قتل کرکے تخت پر بیٹھ گیا، تو جیسا اوپر گذرا، ملک غازی تغلق نے لڑکر اس سے سلطنت چھین لی، اور سلطان غیاث الدین تغلق کے نام سے یکم شعبان ۷۲۰ھ کو تخت پر بیٹھا، اور چند سال بڑی شان وشوکت سے سلطنت کرکے ربیع الاول ۷۲۵ھ مطابق ۱۳۲۴ء میں چھت گرنے سے وفات پاگیا، چالیس دن کے بعد اس کا بڑا لڑکا فخر الدین محمد جونا تخت نشین ہوا، اور پورے پچیس برس حکومت کرکے دق کی بیماری میں مبتلا ہوکر ۷۵۲ھ میں مرگیا،

سلطان فیروز شاہ تغلق ملک تغلق کے ساتھ اس کے دو بھائی ابوبکر اور سپہ سالار رجب بھی تھے، ملک تغلق (۷۵۹ ہجری) دیپال پور کا حاکم تھا، اس نے جب اپنے بھائی سپہ سالار رجب کی شادی کرنی چاہی تو رانا مل بھٹی کی لڑکی کا انتخاب کیا، ملک سعد الملک شہاب عفیف کو منگنی کے لئے راجہ کے پاس بھیجا، جو ضلع ابوہر کا حاکم تھا، اور بھٹیوں کا ملک انہی کے زیر اثر تھا، اس لڑکی کا نام "نائلہ" تھا، کچھ رد وکد کے بعد نسبت قرار پاگئی، اور پھر جلد دونوں کا نکاح ہوگیا، جب نائلہ رجب کے گھر آئی تو اس کا نام "کدبانو" رکھا گیا، چند سال کے بعد (۷۰۶ھ ۔ ۷۱۲ھ) کدبانو کے بطن سے .... فیروز شاہ پیدا ہوا، ملک تغلق نے بڑی خوشی منائی، اور لوگوں کو انعام و اکرام سے مالامال کیا، اس بیان سے معلوم ہوا کہ فیروز جو آگے چل کر فیروز شاہ کے نام سے پہلے سندھ میں تخت نشین ہوا، ماں کی طرف سے بھٹی تھا، جو پنجاب کا ایک مشہور قبیلہ ہے، اور بہت سے اکا؟

کے ناموں کیساتھ خاندانی لقب کی حیثیت سے اب بھی مستعمل ہے،

فیروز شاہ جب سات برس کا ہوا (۷۱۹ھ) تو سپہ سالار رجب کا انتقال ہوگیا، اس کے چچا ملک تغلق نے اس کی پرورش کی، اور اپنے بچوں کے ساتھ مثل اپنی اولاد کے اس کو پالا اور رکھا، ملک تغلق نے جب ۷۲۵ھ میں وفات پائی تو اُس کی عمر ۱۶ برس کی تھی، ملک تغلق کے بعد سلطان محمد تغلق کی تخت نشینی سے اس کو بڑا فائدہ یہ ہوا، چونکہ دونوں تقریباً ہم سن تھے، اور ساتھ کھیلے ہوئے تھے، اس لئے وہ اس کو اپنا بھائی سمجھ کر اُس کے ساتھ بڑی مہربانی سے پیش آتا تھا، اور چونکہ خود بھی غایت درجہ فرمانبردار، بہی خواہ اور نیک بخت تھا، اس لئے سلطان کی نظر عنایت اس پر ہمیشہ رہی،

محمد شاہ نے تخت نشین ہوکر فیروز کو نائب امیر حاجب کا عہدہ بخشا، اور نائب باربک کے خطاب سے سرفراز کیا، اس وقت بارہ ہزار سوار اُس کے زیر فرمان تھے، انتظامی امور کے سبب سلطان نے دہلی کے چار حصے کرکے ہر ایک پر ایک سردار مقرر کیا تھا، انھیں سے ایک حصہ کا افسر فیروز تھا،[۱]

فیروز شاہ کو شکار کا بڑا شوق تھا، اور اس فن کا وہ بڑا ماہر تصور کیا جاتا تھا، فارغ اوقات میں اکثر شکار کھیلتا، سفر میں بھی جب فرصت ملتی، تو اس کا شغل رکھتا، چنانچہ سفر گجرات کے وقت ہم اس کو شکار میں مشغول پاتے ہیں، ۷۴۶ھ میں جب وہ گجرات آیا ہے، تو شکار کھیلنے میں رات ہوگئی، اور شب باشی کے لئے تنہا وہ ایک قصبہ میں پہونچا، جس کو تھاسیر (یا تھاسرہ) کہتے ہیں، جو راجپوت قبیلہ ٹانک کے قبضہ میں تھا، قصبہ کے ایک مُکھیا سہارن نامی نے اپنے گھر میں مہمان اُتارا، سہارن کے دوسرے بھائی کا نام سادھو تھا، عالم سرور میں شہزادے نے اپنی حقیقت ظاہر کی، تو سہارن اور سادھو نے اپنی کنواری بہن کو شہزادہ کے نکاح میں دیدیا،[۲] اور صبح کو جب اس کا لشکر نکلا تو فیروز شاہ

---

[۱] فیروز شاہی عفیف ص ۴۱ تا ۴۳ کلکتہ [۲] مرآۃ سکندری ص ۷،

اپنی نئی بیوی اور اس کے دونوں بھائیوں کو لے کر محمد شاہ کے پاس پہنچا، اور پھر اس کے ساتھ ٹھٹھ گیا، تقدیر کا کرشمہ دیکھیے، سلطان محمد تغلق محرم ۷۵۲ھ میں بمقام ٹھٹھ وفات پاگیا، اور اسی سرزمین سیہوان کے مقام پر جیسا کہ پروفیسر محمد شفیع صاحب نے کتبات سے ثابت کیا ہے، وہ سپردِ خاک ہوا، ارکانِ دولت کے مشورے سے یہیں سندھ کی سرزمین میں فیروز شاہ تخت سلطنت پر رونق افروز ہوا، اور لشکر کا انتظام کرکے دہلی چل پڑا، سرستی کے مقام پر ۷۵۲ھ میں اس گوجرانی کے بطن سے لڑکا پیدا ہوا، جس کا نام فتح خاں، رکھا گیا، دہلی پہونچ کر اس نے ایک محل تیار کرایا، جس کا نام گوجری محل رکھا چنانچہ بہ عرصہ دراز تک دہلی میں گوجری محل قائم اور مشہور رہا، اس کی مرنج و مرنجاں طبیعت کے سبب سے ملک میں ہمیشہ امن رہا، اور کبھی کوئی بدنظمی ہوئی تو فوراً اس کو دباکر امن قائم کردیا، محمد شاہ کے آخری عہد میں جو بدنظمی پیدا ہوگئی تھی، اس کو درست کیا، ملک کو آباد کرنے کی بے حد کوشش کی، ٹھٹھ، بھیم گڈھ (کانگڑہ) گجرات، قنوج، بنارس، بہار، ترہٹ، بنگالہ، خاندیس میں بذاتِ خود جاکر بگڑے ہوئے معاملات کو سدھارا، ۳۸ سال کی بادشاہت کرکے ۷۹۰ھ میں انہوں نے وفات پائی، "وفاتِ فیروز" سے اس کی تاریخ نکلتی ہے[۵۱]

آپنے فیروز تغلق کو پہچانا، اوّل تو یہ پدری نسبت سے تغلق خاندان کا تھا، جس کی مادری اصل جٹ تھی، اس کا ننہال بھٹی تھا، اور اس کی ایک بیوی گوجری تھی، اس کا لڑکا فتح خاں اسی گوجری کے بطن سے پیدا ہوا تھا، ۷۶۵ھ میں سلطان فیروز شاہ نے فتح خان کو اپنا ولی عہد بنایا، اس وقت سراپردہ سرخ اور اچھی غنایت کیا، خطبہ، گرز، اور سکہ اس کے نام سے جاری کیا[۵۲]، پھر فراش خانہ، چتر لعل، اور سامان سلطنت غنایت کئے، شاہزادہ سواری، اور علم مجلس میں

---

۵۱ منتخب التواریخ ص ۲۵۵، کلکتہ۔ ۵۲ چنانچہ اس کے متعدد سکے گجرات ورنیکیولر سوسائٹی احمد آباد میں موجود ہیں،

بڑا ماہر تھا، بڑا متین اور صاحب وقار تھا، اس عمر میں مقدمات کا فیصلہ بڑوں کے سامنے اس عمدگی کے ساتھ کرتا کہ لوگ انگشت بدنداں رہ جاتے، اگر یہ شاہزادہ زندہ رہ گیا ہوتا تو اس خاندانِ (تغلق) کی عمر کچھ بڑھ گئی ہوتی، لیکن افسوس کہ سلطان فیروز کی یہ آرزو پوری نہیں ہوئی، اور یہ شاہزادہ عمر کی پچیس بہاریں دیکھ کر ۱۲ ر صفر ۷۶۰ھ میں اس خرابۂ عالم سے رخصت ہوگیا،

خان جہاں آپ حیرت سے سنیں گے کہ سلطان فیروز شاہ کے عہد میں نائب السلطان یعنی قائم مقام سلطان کا عہدہ خان جہاں نام ایک نومسلم امیر کو حاصل تھا، یہ امیر اصل میں تلنگانہ کا ایک ہندو نومسلم تھا، جس نے محمد تغلق بادشاہ کے ہاتھ پر فتح تلنگانہ کے موقع پر اسلام قبول کیا تھا، اس کا ہندوانہ نام "کنور" تھا، اسلامی نام مقبول رکھا گیا، اور بڑھتے بڑھتے مسندِ وزارت تک پہنچا، [۱] پہلے قوام الملک پھر خانجہاں اس کا خطاب ہوا، تمام مہمات ملکی اور بندوبست مالی کا سرانجام اس کے ہاتھ سے ہوتا تھا، اور جب بادشاہ فتوحات یا سیر و شکار کے لئے دہلی سے باہر جاتا، وہ اس زمانہ میں بادشاہ کی نیابت کرتا تھا، بلکہ یہ عہدنامہ اس کو لکھ دیا تھا، کہ جب تک قائم ہے سلطنت میرے خاندان میں اور وزارت تیری اولاد میں رہے گی، [۲] اس سے اندازہ ہوگا کہ سلاطین اسلام نے کسی نسل و نسب کو جاہ و منصب کے لئے مخصوص نہیں کیا تھا، جب ہندوستان پر ۸۰۰ھ میں تیمور کا حملہ ہوا تو تغلق خاندان کا شیرازہ بکھر گیا، اخیر جانشین محمود ۸۱۵ھ میں مرگیا، اور اسی پر تغلق خاندان کا خاتمہ ہوگیا، اور دہلی کی سلطنت سیدوں کے ہاتھ میں آئی،

سلاطین تغلق کے کارنامے تغلق خاندان نے جس کے نونو تعلقات نومسلم خاندانوں سے رہے، تقریباً سو برس تک ہندوستان پر حکومت کی، اس عرصہ میں بہت اچھے اچھے کام کئے، انھوں نے مغلوں کے اچانک حملوں کا سدباب کیا، بہت سے نئے شہر آباد کئے، جن میں ایک دہلی کے پاس فیروزآباد

---

[۱] فیروز شاہی سراج عفیف، ص ۳۹۴، [۲] شمس سراج عفیف ص ۴۰۰،

اور دوسرا یورپ میں جونپور مشہور ہیں، بعض اچھے اچھے قانون جاری کئے، جابرانہ اور ایک وحشیانہ سزائیں موقوف کیں، شراب کی قطعی طور پر بندش کی گئی، خراج کی وصولی میں آسانیاں پیدا کیں، مختلف قسم کے جبری ٹیکس موقوف کئے گئے، حکام کے انتخاب میں بڑے غور وفکر سے کام لیا، اور اچھے لوگوں کو اہم خدمات پر مامور کیا، اور اس کا خیال رکھا، کہ حاکم ایماندار اور خدا ترس ہو، اور اگر اس کے خلاف کبھی کوئی واقعہ پیش آتا، تو فوراً تحقیقات کے بعد معزول کیا جاتا، جیسا کہ فیروز شاہ کے عہد میں کئی بار ہوا، فیروز شاہ نے احتیاطاً قتل کی سزا بھی موقوف کر دی تھی، دینی مفسدوں کو جو ملک میں بدامنی کا باعث ہوئے، خارج البلد کر دیا، عام مجمعوں سے مردوں عورتوں کا خلا ملا قانون کے ذریعہ ممنوع قرار دیا، ہندوؤں پر اعتماد کر کے اُس نے دو صوبوں کی نظامت اُن کے سپرد کی، ایک سندھ اور دوسرا گرنار یعنی جونا گڑھ، اس وقت تک فوج میں صرف ترک تھے، افغانوں پر بھروسہ نہیں کیا جاتا تھا، مگر فیروز شاہ نے اُن کو فوج میں بھرتی کیا، اور اچھے اچھے عہدے اُن کے سپرد کئے، مغلوں کے خیال سے فوج کی بڑی تعداد ہر وقت رکھنی پڑتی تھی، اسی زمانہ سے یہ رواج پھر شروع ہوا، کہ فوجی عہدہ داروں کو نقد تنخواہ کے عوض بڑی بڑی جاگیریں دی گئیں، لوٹ کا مال جس کا صرف پانچواں حصہ فوج کو ملتا تھا، اس کو اس طرح بدل دیا، کہ صرف پانچواں حصہ خزانۂ شاہی میں داخل ہو، باقی سب فوج میں تقسیم کر دیا جائے، محمد تغلق کے زمانہ میں فقط دہلی میں ستّر شفاخانے تھے، جہاں بیماروں کو دوا کے ساتھ کھانا بھی ملتا تھا، اور ایک ہزار مدرسے تھے، جہاں طلبہ کے قیام وطعام کا انتظام تھا[1]، فیروز شاہ تغلق نے اس میں اور بہت اضافہ کیا، اُس نے پچاس نہریں، تیس مدرسے، بیس خانقاہیں، ایک سو محلات، پانچ شفاخانے، ایک سو مقبرے، دس حمام، ایک سو پچاس کنوئیں، ایک سو پل جدید بنوائے،

دہلی کے قریب فیروز آباد کے نام سے شہر آباد کیا گیا تھا، اس میں عالیشان مسجدیں اور مدرسے

---

[1] صبح الاعشیٰ ج ۵ ص ۹۱ مصر،

تعمیر ہوئے، ہندوستان میں سب سے پہلے گھنٹہ گھر اسی نے فیروز آباد میں تعمیر کرایا، سلطان محمد تغلق کے عہد میں سڑکیں بکثرت تھیں، ڈاک کا بڑا اچھا انتظام تھا، ڈاک مختلف قسم کی رائج تھی، ڈاک نقارہ، ڈاک کبوتر، گھوڑوں کی ڈاک، شتر سواروں کی ڈاک وغیرہ، بڑے بڑے علمار حکمار اس کے دربار میں حاضر رہتے، امیر خسرو، بدر چاچی، مطہر کڑہ شاعر، ضیا برنی مؤرخ، سید منطقی، گانگو برہمن منجم، حضرت نظام الدین اولیار، رکن عالم ملتانی، نصیر الدین چراغ دہلوی، مخدوم جہانیاں جہاں گشت جیسے مشائخ اس عہد میں موجود تھے، محکمہ تصنیف و تالیف اور ترجمہ کا بھی قائم تھا، بعض سنسکرت کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کیا گیا، انہی میں دلائل فیروز شاہی کے نام سے ایک سنسکرت کتاب کا فارسی میں ترجمہ ہوا، جو حکمت طبیعی میں تھی، اس کا مترجم مشہور شاعر اعز الدین خالد خانی ہے، اس کے علاوہ فال اور شگون کی کتابوں کے بھی ترجمے ہوئے، فتاویٰ تاتار خانیہ، اور تفسیر تاتار خانی بھی اسی عہد کی یادگار ہیں، تاریخ فیروز شاہی عفیف، تغلق نامہ وغیرہ اسی عہد میں لکھی گئیں، فتوحات فیروز شاہی کے نام سے خود سلطان فیروز شاہ نے ایک کتاب لکھی، اور اس کو فیروز آباد کی جامع مسجد کے ہشت پہل برجوں پر کندہ کرایا،

قحط کے ایام میں محمد تغلق نے آب پاشی کی ایک اسکیم تیار کی تھی، جو نامکمل رہ گئی تھی، فیروز شاہ نے اس کی تکمیل کرکے پچاس نہریں نکالیں، جس سے کاشتکاری کو بڑا فائدہ پہنچا، اور بہت سی زمین کاشت میں آگئی، اسی سبب سے اس عہد میں غلہ کی بڑی ارزانی رہی، محمد تغلق کے عہد میں گندم ۱۲ جیتل کا ایک من، جو ۸، چنا ۴، اور فیروز کے زمانے میں گندم ۸، جو ۴، چنا ۴ جیتل کا ایک من، اور من ۴۰ سیر کا، اور جیتل ایک پیسہ کے مساوی تھا، سلطان محمد تغلق کے عہد تک جیتل سب سے چھوٹا سکہ تھا، اس نے غریبوں کا خیال کرکے اس سکے کو بھی چھوٹے چھوٹے حصے کرکے بنوائے، ہندوستانیت کو بھی اس عہد میں میل ملاپ کو بہت ترقی دی گئی، ترجمے کے لئے کچھ پنڈت مقرر کئے گئے، ہندو جوگیوں سے محمد تغلق اکثر تخلیہ میں

ملاقات کرتا تھا،

ہندوؤں کے ساتھ ازدواجی تعلقات کا سلسلہ بھی اس خاندان سے شروع ہوا، اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ اس زمانہ میں بہت سے ہندو خاندان مشرف باسلام ہو کر بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوئے غیر ملک سے بھی تعلقات اچھے تھے، خلیفہ کے سفیر محمد تغلق اور فیروز شاہ کے زمانے میں متعدد بار آئے اور گئے، تجارت کو کافی فروغ ہوا، خراسان، عراق، عرب، مصر، ترکستان اور افریقہ کے تاجروں سے ملک بھرا رہتا تھا، بندرگاہوں میں غیر ملکی جہاز ہر وقت آتے جاتے رہتے، افریقہ سے فیروز شاہ کے زمانے میں ہاتھی کئی مرتبہ لائے گئے،[1] بھروچ، کھنبایت، مانگرول، ٹھٹھہ مشہور بندرگاہیں تھیں، مانگرول، کھنبایت، بھروچ، دھولکہ میں اُن کی بنائی ہوئی مسجدیں آج بھی موجود ہیں، ابن بطوطہ اس عہد کا مشہور سیاح ہے، ایک بڑی خوبی اس خاندان کی یہ ہے کہ ہندوستان کا چاندی سونا کسی صورت سے ہندوستان سے باہر جانے نہیں دیتا تھا، اس عہد میں گچ پر سونے کا کام بڑے اعلیٰ درجہ کا ہوتا تھا، چھتوں میں ایسی نقاشی کرتے کہ پھولوں کا چمن نظر آتا،[2]

یہ کارنامے ایسے مسلمان بادشاہوں کے ہیں جو گو باپ کی طرف سے ترک، مگر ماں کی طرف سے ہندی الاصل، اور ہندی النسل تھے، دلی کی مرکزی حکومت کے علاوہ اطراف و جوانب میں خود مختار ریاستیں جن مسلمانوں نے قائم کیں، وہ زیادہ تر ہندی تھے، ان ریاستوں میں سب سے پہلا نام سندھ کا ہے،

سندھ | سندھ محمد بن قاسم کی فتح کے بعد عرصۂ دراز تک خلیفہ کے بھیجے ہوئے والیوں کے ماتحت رہا، اور دریائے سندھ کے دونوں طرف کے حصے ایک ہی حاکم کے ماتحت تھے، اس عرصہ میں بہت

---

[1] تاریخ فرشتہ جلد اول، تاریخ برنی، تاریخ عفیف فتوحات فیروز شاہی ملاحظہ ہوں [2] بزم تیموریہ ص ۲۶۶ مطبوعہ معارف پریس اعظم گڈھ،

ثقیف سے عرب خاندان سندھ میں آباد ہوگئے، جیسے بنو منبہ (ملتان میں) ہباری قریشی (منصورہ میں) بنو (بھکر اور میں) ان کے علاوہ بنی تمیم، آلِ مغیرہ، عباسی، صدیقی، فاروقی، عثمانی، اشعری، بنو اسد، بنو عتبہ، سادات، وغیرہ، ملک کے مختلف حصوں میں آباد ہوگئے، صدیوں سندھ میں رہنے سہنے شادی بیاہ کرنے سے اُن کی اصل عربی معاشرت میں فرق آ گیا، اور آہستہ آہستہ وہ مخلوط معاشرت کے خوگر ہوگئے، اور پھر خاندان کے نام سندھی تلفظ میں ایسے ہوگئے، کہ شناخت مشکل ہوگئی، مثلاً مغیرہ سے موریہ اسی لئے مورخین کو اس صوبہ کی تاریخ لکھنے میں بہت مغالطے پیش آتے ہیں[1]، خاکسار نے اپنی کتاب "عرب و ہند کے تعلقات" میں اُن میں سے بہت سے مغالطوں کو دور کیا ہے،

ابتدائے عہد میں زمین کے بڑے بڑے قطعات، مثلاً صوبہ تحصیل وغیرہ ان خاندانوں کو ٹیکس وصول کرنے اور انتظامی امور کی انجام دہی کے لئے سپرد کئے گئے، جن پر وہ نسلاً بعد نسلٍ بطور وراثت قابض رہے، مرکزی حکومت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اُن میں سے قریش کے ایک خاندان نے اپنی حکومت قائم کرلی، اس خاندان کا پہلا حاکم عمر بن عبدالعزیز ہباری ہوا، جو ۲۴۰ھ میں سندھ کا خود مختار حاکم بنا، اور تیس برس حکومت کرکے وفات پاگیا، اس کے بعد اس کا لڑکا عبداللہ تخت نشین ہوا، ۲۷۹ھ میں ایک عام بلوہ ہوا، جس میں حمہ جو بنو کندہ کا غلام تھا، سندھ پر قابض ہوگیا، گو منصورہ پر عبداللہ کا دوبارہ قبضہ ہوگیا، معلوم ہوتا ہے کہ ملتان اس کے اقتدار سے باہر رہا۔ کیونکہ بنو سامہ کا خاندان جو عمان میں آباد تھا، اس کی ایک شاخ بنو منبہ ملتان میں بس گئی تھی، اس نے بدامنی سے فائدہ اٹھا کر ملتان پر قبضہ کرلیا، اور ۲۹۰ھ ہجری میں بلا شرکت غیرے وہ ایک بڑی طاقت ور اور وسیع سلطنت ہوگئی، غرض سندھ کے دونوں حصوں پر یہی دونوں قبیلے عرصۂ دراز تک حکمراں رہے

۲۷۰ھ میں جب فاطمی حکومت مصر میں قائم ہوئی، تو عبداللہ المہدی کی طرف سے داعی

---

[1] تحفۃ الاکرام جلد سوم ص، بمبئی،

ابوالقاسم بن فرخ کا بھائی ہیثم نامی سندھ میں ان کا پہلا داعی بن کر آیا، اور فاطمی حکومت کی دعوت میں مصروف ہوگیا[1]، عزیز باللہ خلیفہ (متوفی ۳۸۶ھ) کے عہد میں جلم بن شیبان یا شیبان کو فوجی مدد کے ساتھ سندھ بھیجا گیا، جس نے اچانک ۳۶۳ھ کے بعد ملتان پر قبضہ کر لیا[2]،

یہ امر قابل ذکر ہے کہ سندھ و بلوچستان کے علاقے چونکہ بحرین و عمان اور یمن کے سواحل سے آمد و رفت اور تجارت کے ذریعہ پیوستہ تھے، اس لئے عربی سواحل کے مذہبی و سیاسی اثرات سندھ و بلوچستان کے مسلمانوں پر لازماً پڑتے رہے، اس کا نتیجہ تھا، کہ سندھ کے سومرہ نام قبیلے نے جس کی اصلیت پر پردہ پڑا ہوا ہے، غالباً ۳۷۰ھ میں اسماعیلی دعوت قبول کرلی، ۴۰۱ھ میں محمود غزنوی نے جب ملتان کی اسماعیلی سلطنت کا خاتمہ کر دیا، تو گمان غالب یہ ہے کہ یہ لوگ ملتان سے بھاگ کر منصورہ چلے آئے، اور اچانک منصورہ کو ہباری خاندان سے چھین کر، وہاں اپنی حکومت قائم کر لی، ۴۱۹ھ میں محمود غزنوی نے یہاں سے بھی اُن کو بے دخل کر دیا، اب ملک میں اُن کی کوئی مرکزی حکومت نہ رہی، لیکن چھوٹے بڑے زمیندار جن کو ہندوستانی عام طور پر راے اور راجہ کہتے ہیں، متعدد تھے جن میں سے سومرہ کا خاندان سب سے زیادہ طاقتور تھا، اسی سبب سے مصر کے فاطمی امام نے اس کو سندھ کی مذہبی سرداری عطا کی، اور شیخ کا خطاب عنایت کیا، یہ خاندان سندھ میں تقریباً دو سو برس سے باجگذار کی حیثیت سے ملک کے ایک حصہ پر قابض تھا[3]، جن میں سے اُن کے نامور اشخاص یھونردا، جو دل بتلائے ہیں، سومرہ اول، سلطان محمود غزنوی (متوفی ۴۲۱ھ) کا ہم عصر ہے، اور چونکہ اُس نے سلطان سے مقابلہ کی طاقت اپنے میں نہیں دیکھی، اس لئے اپنی جگہ پر خاموش رہا، اس کی وفات کے بعد اس کے لڑکے پال بن سومرہ کو جو سلطان مسعود غازی (۴۲۱ھ تا ۴۳۰ھ) کا ہم عصر تھا، دروزیوں (شام میں اسماعیلیوں کا ایک فرقہ) کے امام نے خط لکھ کر ابھارا، غالباً اُسی وقت سے

---

[1] نزہۃ الافکار قلمی و موسم بہار جلد سوم ص ۲۴ و ص ۷۷، [2] یمینی، [3] موسم بہار جلد سوم د

ملک کے تمام اسماعیلی خاندان سامرہ (سومرہ) کی معیت میں انقلاب کی کوشش میں لگ گئے اور دس برس کے بعد سلطان عبدالرشید غزنوی (۴۴۱ھ تا ۴۴۴ھ) کے عہد میں مرکزی سلطنت کی خانہ جنگی سے فائدہ اٹھاکر سومرہ دوم نے بمقام تھری ریگستانی علاقے میں ۴۴۵ھ (مطابق ۱۰۵۳ء) میں ایک سلطنت قائم کی، اور سندھ کے ایک زمیندار سعد نامی کی لڑکی سے شادی کر لی، جس سے اس کا ولی عہد پیدا ہوا[1] یہ خاندان روز بروز ترقی کرتا گیا، اور آہستہ آہستہ تمام سندھ اور ملتان پر قابض ہو گیا، ۵۷۱ھ میں سلطان محمد غوری نے اسماعیلیوں سے ملتان لے لیا، تب اچھ میں انھوں نے سلطنت جمائی، ۵۷۸ھ میں اُس نے اچھ بھی چھین لیا، اور سندھ پر علی کرماخ کو حاکم بنایا، اس وقت سے محمد تغلق کے عہد تک سندھ اور ملتان دونوں دہلی کے ماتحت رہے، اور ایک حاکم (صوبہ دار) ہمیشہ وہاں حکومت کرتا رہا، لیکن سومرہ (اسماعیلی) ایک ماتحت ... ...

... ...

کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے میں کامیاب رہے، وہ ہر وقت آزادی کی فکر میں لگے رہتے اور جب کبھی اُس کا موقع ملتا، آزاد ہو جاتے، اور مجبور کئے جانے پر پھر ماتحت ہو جاتے، جیسا کہ علاء الدین خلجی، ملک تغلق، سلطان محمد تغلق کے ابتدائی دور اور آخری عہد میں ہوتا رہا،[2] ۷۵۲ھ کے بعد اور ۷۶۳ھ کے درمیان سمہ قوم نے سومریوں سے سلطنت چھین لی، اس پوری تاریخ میں ہم کو ان ہی دو قوموں یعنی سومرہ اور سمہ سے تعلق ہے، جس پر پوری تفصیل سے "عرب و ہند کے تعلقات" میں بحث کی جا چکی ہے،

سومرہ قوم کی اصلیت سومرہ قوم کے متعلق جس نے پانچویں صدی ہجری کے اواسط سے اٹھویں

(بقیہ حاشیہ ص ۴۱۹) کتاب الہند بیرونی، ۵۳ تحفۃ الکرام جلد سوم ص ۲۷ بمبئی،

۱ تاریخ معصومی ص ۶۰ بمبئی، و تحفۃ الکرام، ۲ تحفۃ الکرام جلد سوم ص ۲۲ بمبئی و سفرنامہ

صدی کے اواسط تک سندھ پر حکومت کی، اتنا تو یقینی طور سے ثابت ہے، کہ یہ مذہباً مسلمان اور مسلکاً اسماعیلی تھے لیکن اُن کی قومیت پر ایسا پردہ پڑا ہوا ہے، جو کسی طرح نہیں اٹھتا،

اُن کے نام بیشتر ہندوانہ ہیں، اور بعض مورخین کی تصریح بھی ملتی ہے، کہ وہ ہندو تھے، یورپ کے مورخوں نے تو علانیہ لکھا ہے، کہ یہ نومسلم راجپوت تھے، مگر قیاس کے سوا انھوں نے اس کی کوئی سند پیش نہیں کی ہے، اسی سلسلہ میں سب سے پہلی چیز اسماعیلی دروزی امام کا ایک خط ہے جس میں ۴۲۳ھ میں شیخ ابن سومر راجہ بل کو سندھ اور ملتان میں دوبارہ اسماعیلی حکومت کے قیام کے لئے غیرت دلائی گئی ہے، شیخ بن سومر راجہ بل کے نام سے اس کا نومسلم ہندو ہونا ظاہر ہوتا ہے، تاریخ معصومی میں جو ۱۰۰۱ھ کی تصنیف ہے، یہ لکھا ہے کہ غزنویوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر سومرہ (مردم سومرہ) نے سومرہ نام ایک شخص کو اپنا افسر بنا کر حکومت قائم کرلی، اور صاد نام ایک زمیندار کی لڑکی سے شادی کی، جس سے ایک لڑکا پیدا ہوا، جس کا نام بھونگر رکھا گیا، اور وہ اس کا جانشین ہوا، اس کے بعد اس کی نسل سے چند اور بادشاہ ہوئے، لفظ صاد کا املا کچھ بے معنی سا معلوم ہوتا ہے، میں نے "عرب ہند کے تعلقات" میں اس کو "سعد" قرار دیا ہے، اگر یہ صحیح ہے تو قیاس ہوتا ہے کہ نومسلم سومری راجہ نے کسی قدیم عرب مسلمان خاندان میں شادی کی، اور اس سے نسل چلی، در اس سے ظاہر ہوتا ہے، کہ یہ قبیلہ ہندی عربی مخلوط نسل کا تھا، اس خاندان کے بادشاہوں کے نام معصومی کی کتاب میں حسب ذیل ملتے ہیں :۔

(۱) سومرہ (۲) بھونگر (۳) دودا (۴) تاری (شہزادی کا نام) (۵) سنگھار (۶) ہمون سنگھار کی بیوہ (۷) پھتو (شاید کہ بھٹو ہو) (۸) خیرا۔ (۹) ارمیل،

تاریخ طاہری میں جو ۱۰۳۰ھ کی تصنیف ہے، سومرہ قوم کی اصلیت کے متعلق یہ مذکور ہے

(بقیہ حاشیہ ۴۲۰) ابن بطوطہ جلد دوم اردو،

کر سندھ میں دلورائے ایک راجہ تھا، اس نے اپنے بھائی چھوٹا امرانی پر ظلم کیا، چھوٹا امرانی فریاد لے کر خلیفہ بغداد کی خدمت میں گیا، خلیفہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

. . . .

. . . .

نے سامرا (عراق کے شہر کا نام) کے سو عربوں اور سادات کو اس کے ساتھ کر دیا، سید السادات نے سندھ آکر سکونت اختیار کر لی، اور دلورائے نے اپنی لڑکی اس سے بیاہ دی، تاریخ طاہری نے دلورائے اور اس کے بھائی کے اختلاف کی وجہ یہ لکھی ہے کہ یہ چھوٹا بھائی بچپن سے اسلام کی طرف مائل تھا، اور قرآن پڑھا تھا، اور دل میں مسلمان ہو گیا تھا، وہ چھپ کر حج کو چلا، راستے میں ایک عجیب طریقہ سے فاطمہ نام ایک لڑکی سے شادی کر لی، اس کتاب میں یہ بھی مذکور ہے کہ سومرہ قوم سامرہ کے عربوں سے نکلی ہے، جو سندھ میں دوسری صدی ہجری میں قبیلہ تمیم کے ساتھ آئی تمیم عباسیہ کے زمانہ میں سندھ کے گورنر مقرر ہوئے تھے"

غرض سومرہ کی وجہ تسمیہ کو مصنف نے عراق کے "سامرا" سے نکالنے کی کوشش کی ہے لیکن سب سے پہلے یہ جاننا چاہئے، کہ شہر سامرہ جس کی عربی اصل "سر من راے" (جو اس کو دیکھے وہ خوش ہو) یہ شہر معتصم عباسی نے ۲۲۱ھ میں بسایا تھا، دوسری صدی میں اس کا نام و نشان بھی نہ تھا، پھر عباسی دور میں قبیلہ تمیم کا جو گورنر موسیٰ بن کعب تمیمی نام سے آیا تھا، وہ سفاح کے زمانہ ۱۳۲ھ سے ۱۳۶ھ میں یہاں آیا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جب کہ سامرہ کا وجود بھی نہ تھا، اس لئے سومرہ قوم کے نام کا جوڑ شہر سامرا سے پیدا کرنے کی کوشش لفظی صنعتگری کے سوا کچھ اور نہیں ہے،

تحفۃ الکرام میں سومرہ بادشاہوں کے نام حسب ذیل لکھے ہیں،

۱۔ سومرہ (۲) بھنگر بن سومرہ (۳) دودا بن بھونگر (۴) سنگھر (۵) حفیف (یا خفیف) (۶) عمر (یا انر) (۷) دودا دوم (۸) بھتو (۹) گھنرا اول (۱۰) محمد نور (۱۱) گھنرا دوم (۱۲) دودا سوم

(۱۳) نائی (۱۴) چنیر (۱۵) بھونگر دوم (۱۶) حفیف (یا خفیف دوم) (۱۷) دودا چہارم (۱۸) عمر سومرا (۱۹) بھونگر (۲۰) ھمیر (یا امیر)

ظاہر ہے کہ ان ناموں کی ساخت تمام تر عربی ہے، عمر نام حقیقت میں امر یا ادمار ہے چنانچہ یہی نام ابن بطوطہ اور سراج عفیف میں ہے، حفیف اس سومرہ سردار بادشاہ کا نام تھا، جو سلطان محمود غزنوی کا معاصر تھا، چنانچہ سلطان کے درباری شاعر فرخی نے سومنات کی فتح پر جو قصیدہ دربار میں پیش کیا تھا، اس میں اس کا نام موجود ہے،

۶۲۰ھ سے ایک دو سال پہلے سلطان جلال الدین خوارزمشاہ چنگیزی مغلوں سے بھاگ کر سندھ میں بمقام ٹھٹھ آیا، تو اس وقت کے سومری بادشاہ کا نام فرشتہ میں چنیر لکھا ہے، جو اصل میں چنیز ہے، طبقات ناصری میں "ملک سنان الدین چنیر والی دیول و سندھ" کے لقب و نام سے اس کا ذکر آیا ہے، جس نے ۶۲۵ھ میں بادشاہ دہلی کی اطاعت[۵۱] قبول کی تھی، چنیر کی اصل ایک عزیز[۵۲] "چندا ایشور" (چندر چاند، اور ایشور خدا، نام کی یہ اصل ایک ہندو نسل کا پتہ دیتی ہے، اور ملک سنان الدین کا لقب اس کے اسلام کو ظاہر کرتا ہے،

ان سومری بادشاہوں کے نام معتبر معاصر حوالوں سے ثابت ہیں، بعض ناموں کی تصحیح قیاساً بھی کی جاسکتی ہے، مثلاً سومرہ نام کی اصل سوم رائے معلوم ہوتی ہے، سوم کے معنی ہندی میں چاند کے ہیں، وہ اصل میں رائے ہے جیسے لہرا جو گجراتی راجاؤں کا عربی تلفظ کا نام ہر اصل میں دلبھ رائے ہے، اسی طرح سنگھر کو سنگھ رائے اور بھونگر کو بھونگ رائے گنھرا کو گھن رائے بھتو کو بھٹو سمجھا جائے،

فرخی نے والی منصورہ حفیف کی شکست اور فرار کی جو کیفیت اپنے قصیدہ میں لکھی ہے

---

[۵۱] حواشی تاریخ معصومی از ڈاکٹر داؤد پوتا [۵۲] عزیزی مولوی عبد القدوس ہاشمی ندوی،

اس موقع کے چند شعر قابلِ ذکر ہیں :-

وزاں حصارِ منصورہ روے کرد براند | براں ستارہ کجا را ند حیدر از خیبر
خفیف چوں خبر خسرِ جہاں بشنید | وداں گذشتہ و بجوے اندرافتاد بجر
خفیف را پیہ وپیل و مال چنداں بود | کہ بیش ازاں نبود در ہوا ہما نازر

ان شعروں میں گو خفیف کو سومری نہیں کہا گیا ہے، مگر مورخین نے خفیف کو سومرہ سلاطین ہی کی فہرست میں درج کیا ہے۔

ان شعروں میں اس بادشاہ کی فوج، ہاتھی، اور مال و منال کا یہ حال لکھا ہے کہ وہ شمار میں غبار و ذرہ سے بھی زیادہ تھا، اس کو کسی قدر زیادہ مُبالغہ سمجھا جائے، پھر بھی وہ اہمیت رکھتا ہے۔

پایۂ تخت | اس کا پتہ واضح طور سے نہیں چلتا، کہ سومرہ قوم کا اصل وطن سندھ کے کس حصہ میں تھا، تاریخ کی چھان بین سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ ان کی بڑی آبادی سندھ کے مشرقی جانب کے زیریں حصہ " میں ضلع پارکر اور تھرپی میں تھی، اور اسی لئے ان کا پہلا سیاسی مرکز تھری محمد نور مقام میں تبدیل ہو گیا، اور وہ ان کا عرصۂ دراز تک پایۂ تخت رہا، عمرکوٹ یا امرکوٹ (ازکوٹ) بھی عرصہ تک ان کا پایۂ تخت بنا رہا، سلطان محمود کے زمانہ میں ان کا پایۂ تخت منصورہ تھا، جس کا دوسرا نام بقول ابوالفضل بھکر ہے، سلطان شہاب الدین غوری کے عہد میں اچھ ان کا پایۂ تخت تھا، اور آخر زمانہ میں (سنہ ۷۵۲ھ) ان کا مرکزی مقام ٹھٹھ نظر آتا ہے، اس سے اندازہ ہوجاتا ہے، کہ ان کی سلطنت کی وسعت ملتانی سرحد سے لے کر زیریں سندھ کے نصر پور بلکہ کچھ (کچ) تک تھی، جس میں مختلف انقلابوں کے بعد وہ اپنا پایۂ تخت بدلتے رہے،

اس قوم کے افراد کی تعداد کا صحیح پتہ معلوم نہیں ہو سکا، لیکن محمود بیگڑہ (گجرات) کے عہد (نویں صدی) میں سندھ کی جو فوج اس کے مقابلہ کے لئے آئی تھی، اس کی تعداد چالیس ہزار تھی، اس سے اُن کی آبادی کا ایک خفیف سا اندازہ لگا سکتے ہیں،

ان لوگوں نے سندھ پر تین سو برس سے زیادہ حکومت کی، جس میں اس قوم کی مختلف شاخوں نے حصہ لیا، ان کے بعض حکمراں چالیس برس تک برسرِ حکومت رہے، انھوں نے جس قدر گاؤں شہر اور قصبے آباد کئے، اُن کی صحیح فہرست ہم تک نہیں پہونچی، لیکن تین بڑے شہروں سے ان کا تعلق معلوم ہوتا ہے، امرکوٹ (عمرکوٹ) تھری، اور ٹھٹھ سے، ان شہروں میں انھوں نے متعدد قلعے بھی تیار کئے، جن کا ذکر تحفۃ الکرام میں موجود ہے، لیکن چونکہ محمد تغلق کے عہد تک مغلوں کی یورشیں بکثرت سندھ پر ہوئی، اس سبب سے ان کی اکثر عمارتیں ویران ہوگئیں، اور بہت کم آثار باقی رہے،

سمہ | سندھ کی دوسری نومسلم قوم سمہ ہے، جس نے سومرویں کے بعد ملک میں طاقت حاصل کی، طبقات بہادر شاہی میں ہے کہ سمہ قوم اُن لوگوں میں سے ہے جو تمیم انصاری کے خاندان کے ہیں، لیکن میرے نزدیک یہ صحیح معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ سندھ میں ان کا وجود عربوں کے سندھ فتح کرنے سے قبل نظر آتا ہے، چنانچہ چچ نامہ میں جو سندھ کی سب سے قدیم تاریخ ہے مذکور ہے، کہ محمد بن قاسم کے پاس سمہ قوم کے کچھ لوگ آئے، اور اطاعت کے صلہ میں انعام حاصل کیا[۱]، اس کے علاوہ کچھ اور کاٹھیاواڑ میں بھی ان کا خاندان تھا، اور آج بھی موجود ہے، جو ہندو مذہب رکھتا ہے، کچھ اور جام نگر کے ہندو جام سمہ خاندان سے ہیں، جونا گڈھ میں سمہ خاندان نے ۸۰۵ھ سے ۱۴۷۲ء تک یعنی چھ سو برس حکومت کی[۲]، اُن کا مذہب بھی ہندو تھا، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سمہ قوم سندھ میں اسلام سے قبل موجود تھی، مذہب ہندو تھا، اس قوم نے اسلام قبول کر لیا، مگر ان کے اسلام کی صحیح تاریخ نہیں معلوم (لس) بیلائے مسلمان

---

[۱] چچ نامہ قلمی کتب خانہ دار المصنفین اعظم گڈھ [۲] تاریخ مصطفیٰ آباد (جونا گڈھ) حصہ اول ص ۴۴ بمبئی،

والی آج بھی جام کہلاتے ہیں، جام کے لفظ سے بعض لفظ پرستوں نے جام جمشید سے ان کا رشتہ جوڑا ہے جو سراسر وہم ہے،

اسلام | تاریخ طاہری کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ الاسلام مخدوم زکریا ملتانیؒ کے فیض کے اثر سے یہ لوگ مسلمان ہوگئے، کیونکہ اس قوم کے امرا سے اُن کے تعلقات وابستہ تھے، اس کے بعد اُن کے خلیفہ جلال الدین بخاری اور اُن کے پوتے مخدوم جہانیان جلال الدین حسین بخاری کے ذریعہ اس قوم میں اسلام کی اشاعت ہوئی، اور یہ قوم آخر تک حضرت مخدوم کی اولاد کے ساتھ عقیدت کا نذرانہ پیش کرتی رہی، چنانچہ احمدآباد (گجرات) میں بھی قطب عالمؒ اور شاہ عالمؒ کے ساتھ اُن کے تعلقات بڑے گہرے رہے، اور اسی سبب جام نے اپنی لڑکی شاہ عالم صاحبؒ سے منسوب کر دی تھی[1] جن سے ایک لڑکا پیدا ہوا، مگر زندہ نہ رہا، اُن کے نام بھی نومسلم ترکوں کی طرح کہیں خالص سندھی، اور کہیں اسلامی مخلوط ملتے ہیں، یہ مذہب کے لحاظ سے مسلمان اہل سُنّت والجماعت سے تھے، اور اسی لئے سندھ کے جاموں کی شادیاں گجراتی سلاطین کے ساتھ ہوتی رہیں،

تاریخ طاہری میں مرقوم ہے کہ سمہ قوم کی آبادی سمندر کے کنارے تھی، جو لوگ جزیرہ نمائے کچھ میں گئے، وہاں انھوں نے اپنی حکومت قائم کی جو آج تک قائم ہے، اسی طرح کچھ سے نکل کر کاٹھیاواڑ کے شمال مغربی ساحل پر جنھوں نے قبضہ کیا، وہاں جام نگر بسا کر پایۂ تخت بنایا، اور وہ ریاست بھی آج تک موجود ہے، تیسرے گروہ نے کاٹھیاواڑ میں جوناگڈھ کو آباد کیا، جس کی حکومت گجراتی سلاطین نے ختم کر دی، اور یہ سب ہندو تھے، لیکن دریائے سندھ سے لیکر کچھ مکران تک کی آبادی نومسلم سمہ کی تھی، اور اسے کچھ کے زیر سایہ رہتے رہتے جب طاقت ور ہوگئے تو کچھ پر قبضہ کر لیا[2]، اور آہستہ آہستہ بالائے سندھ آبادی بڑھاتے گئے، سومرہ قوم کے آخری زمانہ میں یہ

---

[1] مرآۃ سکندری، ص ۴۴، [2] تحفۃ الکرام جلد سوم بمبئی،

طاقت در ہو گئے تھے، اور آخری سومرہ بادشاہ جس کا پایۂ تخت ٹھٹھ تھا، محمد تغلق سے جنگ لڑتے لڑتے بے حد کمزور ہو گیا تھا، سمہ قوم کا سردار انار نامی نے اس سے فائدہ اٹھا کر انقلاب سلطنت کی کوشش کی، اور اس میں کامیاب ہوا، (۷۵۲ھ بمطابق ۷۶۶ھ) پہلے ان کا پایۂ تخت سامو ئی تھا، اور سومریوں پر فتح پانے کے بعد ٹھٹھ ہو گیا،

اُن کے حکمرانوں کی فہرست مندرجۂ ذیل ہے،

(۱) جام انار (۲) جام جونا (۳) جام تماجی (۴) جام خیر الدین (۵) جام بابھنیہ (۶) جام تماجی دوم (۷) جام صلاح الدین (۸) جام نظام الدین (۹) جام علی شیر (۱۰) جام دن (۱۱) فتح خاں (۱۲) جام تغلق (۱۳) جام مبارک، (۱۴) جام سکندر (۱۵) جام راے دن (۱۶) جام سنجر (۱۷) جام نندا نظام الدین (۱۸) جام فیروز، جام فیروز سے شاہ بیگ ارغون والی قندھار نے ۹۲۷ھ میں سندھ کا ملک چھین لیا، اس خاندان نے ۱۹۲ برس حکومت کی،[۱]

سمہ ابتدا میں سومریوں سے جنگ کرنے میں مصروف رہے، اور جب استقلال کے ساتھ تمام حکومت ہاتھ میں آگئی، اور امن وامان قائم ہو گیا، تو ملک کو فروغ دینے میں مصروف ہو گئے، چنانچہ جام سنجر نے سب سے پہلے عدالت کی طرف توجہ کی، اور وہ تمام خرابیاں جو عدالت، قاضی، شاہد اور اس محکمہ کے عمّال میں ہوتی ہیں، اُن کو دور کرنے کی بیحد کوشش کی، قاضیوں کی تنخواہیں بہت زیادہ کر دیں تاکہ رشوت کا سدِّ باب ہو، خیر الدین کے عہد میں قافلوں اور کاروانوں کے راستوں کی حفاظت اور تجارت کو بہت فروغ ہوا، ڈاکوؤں کا قلع قمع کیا گیا، سمہ قوم سیدوں کی بڑی عزت کرتی تھی، انھوں نے مدرسے، اور خانقاہیں بنائیں، بڑی بڑی مسجدوں کی بنیادیں رکھیں، ہمسایہ سلطنتوں سے اچھے تعلقات قائم رکھے، چنانچہ ملتان اور گجرات سے

---

[۱] معصومی اور عرب وہند کے تعلقات،

سفیر ایک دوسرے کے یہاں اکثر آیا جایا کرتے تھے، گجراتی بادشاہوں کے ساتھ ان کے ازدواجی تعلقات بھی قائم ہوگئے تھے جس کے باعث بعض اوقات سیاسی فائدہ بھی اٹھا لیتے علماء کے بڑے قدردان تھے، محمد بن سعد جلال الدین دوانی کو سندھ میں آنے کی انھوں نے دعوت دی تھی لیکن موت نے علامۂ موصوف کی آمد کی آرزو پوری نہ ہونے دی، مولانا میر معین الدین سید ابو الفیث مولانا محمد، اثیر الدین بہری (منطقی) مخدوم عبدالعزیز بہری، محدث جیسے یگانۂ روزگار فاضلوں نے سندھ میں عمریں گزار دیں، عمدۃ الملک دریا خان، اور سارنگ خاں جیسے وزراء سندھ میں وزارت پر مامور رہے، کاشتکاری اور باغبانی پر بھی انھوں نے کافی توجہ کی، ارغون کے آنے سے قبل سندھ میں بکثرت باغات تھے، اُن کے لئے بڑے بڑے کنوئیں بنوائے گئے، جن کو اونٹ کھینچتے تھے، تجارت کو فروغ ہوا، ملتان، کشمیر، خراسان، اور گجرات وغیرہ دوسرے صوبوں اور ملکوں سے تجارتی تعلقات قائم تھا،

جام نظام الدین کے حالات میں معصومی نے لکھا ہے کہ

"جام نظام الدین در اوائل حال طالب علم می بود، و در خوانق و مدارس می گذرانیدہ و بغایت متواضع و خلیق بود، و بصفات پسندیدہ و اخلاق حمیدہ متصف و زہد و عبادت بدرجۂ کمال داشتہ و فضیلت و حالت او زیادہ از ان بود کہ تمتہ، ازاں تحریر تواں نمود" (ص ۷۴)

اس کی صلح پسندی کی یہ تصویر ملاحظہ ہو:-

"جام نظام الدین ہر ہفتہ باصطبل خود می رسید و دست بہ پیشانی اسپاں می کشیدہ و می گفتہ کہ اے دولت منداں غیر غزا نمی خواہم کہ سواری بہ شما واقع شود، چراکہ در حدود ولایت حکام اسلامند، دعا کنید کہ بے سبب شرعی بجائے نروم و کسے نیز ایں جا نیاید، مبادا

خونِ مسلمانان بے گناہ ریختہ شود، وعند اللہ سبحانہ شرمسار شوم"۔

اس کے زمانے میں سندھ میں احکامِ شریعت کی ترویج کا حال یہ تھا کہ

"در زمان دولت او احیاے سنن نبوے شیوع یافتہ بود کہ مافوق آں تصور نتواں کرد، و در مساجد اقامت جماعت بہ نہجے می بود کہ خرد و کبیر محلہ در مسجد حاضر آمدہ بگذاردن نماز تنہا راضی نبودند اگر وقتے از یکے جماعت فوت شدے بغایت نادم گردیدہ و در دو سہ روز باستغفار مشغول می بود"۔ (ص ۷۵-۲)

سلاطین لنگا ملتان میں | نویں صدی ہجری کے وسط میں ملتان پایہ تخت دہلی کے ماتحت ایک صوبہ کی حیثیت رکھتا تھا، سیدوں کے آخری بادشاہ علاء الدین کے عہد میں کابل، غزنہ اور قندھار پر مغلوں کے قبضہ ہو جانے کی وجہ سے وہ ملتان پر جو قندھار کے بالمقابل واقع ہے، آئے دن یلغار کرکے لوٹ مار کرتے تھے ۸۴۷ھ (۱۴۴۳ء) میں ایسی حالت ہو گئی کہ وہاں کوئی حاکم نہ رہا، اس لئے اہلِ شہر نے مل کر شیخ بہاء الدین کی خانقاہ کے متولی شیخ یوسف قریشی کو اپنا حاکم بنایا، ملتان اور اردگرد کے مقامات میں اُن کے نام کا خطبہ اور سکہ جاری کیا گیا، ملتانیوں کی خوش قسمتی سے شیخ میں حکومت کی اعلیٰ لیاقت موجود تھی، اُن کے حسنِ انتظام سے تمام مخلوق خوش ہو گئی، ملتان کے اطراف میں ایک نو مسلم قوم لنگاہ رہتی تھی، جو نسلاً راجپوت تھی، اس قوم کا سردار راے سہرا نام قصبہ سوئی کا زمیندار تھا، اس کے آبا و اجداد حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی اور اُن کے خلفاء کی تبلیغ سے اسلام لائے تھے، اُس نے شیخ یوسف کو پیغام دیا کہ سلطان بہلول لودی بادشاہ دہلی کی طرف سے ہمیشہ خطرہ لگا رہے گا، اس لئے فوری امداد کے لئے میری قوم لنگاہ کا دل ہاتھ میں لیجئے تاکہ وقت پر کام آئے، شیخ نے اس کی درخواست منظور کی اور اس کی استدعا پر اُس کی لڑکی سے شادی بھی کر لی، وہ لڑکی کے بہانے کبھی کبھی آیا بھی کرتا، ایک دفعہ وہ اپنی پوری قوم کو ساتھ لایا، اور

شیخ سے عرض کیا، کہ میری قوم کا معائنہ کرکے میرے لائق کوئی خدمت عنایت کریں، شیخ نے قبول کیا۔ رائے عشا کے وقت لڑکی سے ملنے کے بہانہ قلعہ میں داخل ہوا، اور پھر فریب سے لنگاہ قوم کو اندر لاکر قلعہ پر قبضہ کرلیا، اور شیخ یوسف کو نکال دیا، شیخ دہلی پہونچے، اور بہلول لودی سے مدد کے طالب ہوئے، شیخ نے کل گیارہ برس حکومت کی،

رائے سہرہ نے ملتان پر قبضہ کرکے ۸۵۸ھ مطابق ۱۴۵۴ء میں تخت سلطنت پر قدم رکھا، اور اپنا لقب قطب الدین لنگاہ مقرر کیا، یہ شخص بڑا مدبر تھا، اس انقلاب کے باوجود اس نے کسی قسم کی بدامنی نہیں ہونے دی، یہ بڑا محنتی آدمی تھا، اہل کمال کا بے حد قدردان تھا، بادشاہ کا سارا وقت ان کل پرزوں کے درست کرنے میں صرف ہوتا، جو بادشاہ گردی سے بگڑ گئے تھے، اور مغلوں کی لوٹ مار سے جو ویرانی چھا گئی تھی، اس کو دور کرنے پر توجہ مبذول کرتا رہا سولہ[16] سال سلطنت کرکے ۸۷۴ھ مطابق ۱۴۶۹ء میں دنیا سے رخصت ہوگیا،

اس کے مرنے پر اس کا بڑا لڑکا حسین لنگاہ تخت نشین ہوا حسین جفاکش، صاحب علم اور اہل ہنر کا قدر داں تھا، اس نے ابتدا ہی میں قلعہ شور پھر چنیوٹ پر قبضہ کرلیا، شیخ یوسف نے بہلول لودھی کو توجہ دلائی، کہ حسین لنگاہ دھن کوٹ (سرحد پنجاب) تک آگیا ہے، چنانچہ لودی نے اپنے لڑکے باربک شاہ کو فوج لے کر ملتان بھیجا، جس کو حسین شاہ نے بآسانی شکست دیدی، اور کوٹ کرور کے حاکم کی بغاوت کو جو خود اس کا بھائی تھا، فرو کرکے انتظام سلطنت میں مشغول ہوگیا، روہیلہ قوم کا سردار ملک سہراب ملتان آیا، اور بادشاہ کا ملازم ہوگیا، بادشاہ کی عنایت دیکھ کر قوم بلوچ ملتان آ دھمکی، اور شاہی وفاداری کا یقین دلا کر جاگیریں حاصل کیں، اس سے حسین شاہ کے پاس ایک اچھی بہادر قوم کی فوج تیار ہوگئی، سمہ قوم کے دو سردار بایزید اور ابراہیم بھی سندھ چھوڑ کر دربار میں حاضر ہوئے، بایزید کو شور کوٹ، اور ابراہیم کو اچھ عنایت ہوا، دہلی

میں بہلول کے بعد سکندر لودی تخت نشیں ہوا، تو تعزیت کے لئے سفیر بھیجے، اور اس طرح صلح کی بنیاد رکھ کر تحفوں کا تبادلہ کیا، سلطان محمود گجراتی سے بھی اس کے تعلقات اچھے تھے، اور سفیر آیا جایا کرتے تھے،

لنگاہ بادشاہوں کے کارنامے | ملتان کی یہ نومسلم خود مختار ریاست تقریبًا ۸۵ برس قائم رہی اس کی فوجی وعسکری قوت کے ثبوت کے لئے حسبِ ذیل اقتباس کافی ہے، جو معصومی کی تاریخ سے ہے:

"وزاں جانب رائے زادہا لنگاہ و بلوچاں وسائر سپاہ روبرو آمدہ (۱۵۲) چوں غلبہ میرزا شاہ حسین بگوش سلطان محمود لنگاہ حاکم ملتان رسید، مردم باطراف وسرحدہا فرستادہ، تا لشکر بلوچ وجٹ وسائر سپاہ را جمع سازند و در عرض یک ماہ ہشتاد ہزار سوار و پیادہ در ملتان جمع آمدہ جمعیتے عظیم بہم رسید" (۱۵۳)

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نومسلم سلطان کے پرچم کے نیچے کتنی قومیں جمع تھیں، ملتان چونکہ اس زمانہ میں ایران وخراسان وافغانستان سے آنے والی قوموں کو رہ گذر تھا اس لئے نئے نئے حملوں کا ہمیشہ نشانہ رہا، اسی وجہ سے یہاں کے بادشاہوں کو اصلاحی کاموں کے بجائے فوجی استحکام میں دولت اور دماغ کو زیادہ صرف کرنا پڑتا تھا، لیکن ان مشکلات کے باوجود جب ان بادشاہوں کو موقع ملا تو اصلاحی وتعمیری کاموں کی طرف بھی فراخ دلی سے متوجہ ہوئے، چنانچہ شیخ یوسف کے عہد میں زمینداروں کی حالت سدھارنے میں کافی کوشش کی گئی، شاہ حسین کے زمانہ میں فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا، پنجاب کی سرحد دھن کوٹ سے دریائے سندھ کے کنارے تک اس کے حدود وسیع ہوگئے، اس کا فوجی نظام بھی قابلِ تعریف تھا، اس نے اپنی فوج میں لنگاہ، سندھی، مکرانی، بلوچی زیادہ بھرتی کئے، جس سے ان کی طاقت بڑی زبردست ہوگئی، نقد تنخواہ کے بجائے

افسروں کو بڑی بڑی جاگیریں دی جاتی تھیں، اور عام سپاہیوں کو یہ جاگیردار تنخواہیں دیتے تھے، یہ بادشاہ علم کا بھی قدرداں تھا، دربار میں بڑے بڑے علماء حاضر رہتے اور وہ انکے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آتا اسی کا اثر تھا کہ وزراء اور امراء بھی علم کے بڑے قدرداں تھے، چنانچہ وزیر باریدتا خاص طور پر قدردانی میں شہرۂ آفاق تھا، خراسان اور ہندوستان کے بہت سے عالم وہاں جاکر مقیم ہوگئے، شیخ جمال الدین قریشی اسی دربار سے فیضیاب تھے، مولانا فتح اللہ اور مولانا عزیز اللہ اسی عہد کے باکمال لوگ ہیں جن کے ذریعہ ہندوستان میں معقولات کو رواج ہوا، میر عماد گردیزی مرزا شہید انہی دنوں ملتان آکر مقیم ہوئے، شیخ بہاء الدین قریشی اس عہد کے صوفیوں میں ممتاز تھے، مولانا بہلول قوت گویائی، اور شیریں زبانی میں سب پر فوقیت رکھتے تھے، قاضی محمد بھی اس عہد کے مشہور علماء میں سے تھے، مدرسے بھی ہر جگہ جاری تھے، جس میں قاضی جامعی کا مدرسہ زیادہ مشہور تھا، اس کے صدر مدرس مولانا ابراہیم جامعی تھے، جو ساٹھ برس تک اس مدرسہ میں تعلیم دیتے رہے، مولانا سید الدین لاہوری بھی اسی مدرسہ کے معلم تھے، جو آخر میں صدر ہوگئے، اس عہد میں علم فقہ کا بڑا زور تھا، یہاں تک کہ دربار میں شرح وقایہ اور ہدایہ ہی کا چرچا رہتا، دوسرے ملکوں کے ساتھ بھی سلاطین ملتان کے تعلقات بڑے خوشگوار تھے، چنانچہ دہلی، کشمیر، گجرات، سندھ اور خراسان سے سفیروں کی ہمیشہ آمدورفت رہتی، سرحدی مقام ہونے کے سبب خراسان سے زیادہ گھوڑوں کی تجارت ہوتی، سلاطین کو باغ لگانے کا بھی بے حد شوق تھا، سلاطین ملتان کی یادگار میں آج بھی لنگاہ خان کا باغ موجود ہے، جو بلدیہ کے زیر انتظام ہے[1] اور سنا ہے کہ لنگاہ قبیلہ کے مسلمان خاندان آج بھی موجود ہیں، اور اس نسبت سے اپنے کو منسوب کرتے ہیں۔

کشمیر سندھ کے ریگستان سے نکل کر اب کشمیر کے سبزہ زار میں آئیے، ۱۳۱۵ء میں کشمیر کا راجہ

---

[1] ترجمہ تاریخ فرشتہ جلد چہارم ص ۴۷۲، حیدرآباد

سینہ دیو تھا، جو پشت در پشت کشمیر پر حکومت کرتا آتا تھا، اس کے عہد میں ایک شخص شاہ میرنامی فقیروں کے لباس میں وارد کشمیر ہوا، جس کا باپ طاہر نومسلم تھا، وہ اپنا نسب نامہ ارجن تک ملاتا تھا، جو مہابھارت کا مشہور ہیرو ہے، شاہ میر نے راجہ کی ملازمت کرلی، راجہ کے مرنے پر اس کا لڑکا "رنجن" راجہ ہوا، اس نے شاہ میر کو وزیر بنالیا، پھر رنجن کے مرنے پر راجہ اودن جو اس کا رشتہ دار تھا، قندھار سے آکر کشمیر پر قابض ہوگیا، ۷۴۷ھ میں وہ بھی چل بسا، اس عرصہ میں وزیر اور اس کا خاندان طاقت ور ہوگیا تھا، رانی نے چاہا کہ حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں لے، اس لئے وزیر سے اختیارات واپس لینے کے لئے اس کو جنگ کرنی پڑی لیکن وہ شکست کھا کر قید ہوگئی، اور اس نومسلم وزیر نے اس سے شادی کرلی، اور وہ شمس الدین کے نام سے کشمیر کا بادشاہ ہوگیا، محمد اعظم نے واقعات کشمیر میں جو ۱۱۴۸ھ میں لکھی گئی ہے ایک اور روایت بیان کی ہے کہ کشمیر کا ہندو راجہ "رنجو" دین حق کا جویا تھا، اُس نے ایک مرتبہ ایک مسلمان بزرگ بلبل شاہ کو دست بدعا اور سربسجود دیکھا، اور ان کا عقیدت مند ہوکر مع اہل و عیال، اور امراء و وزراء کے مسلمان ہوگیا، یہ واقعہ ۷۲۵ھ میں پیش آیا، اُس نے مسلمان ہوکر اپنا لقب صدر الدین اختیار کیا، اس کے خاندان میں کئی بادشاہ وارث تخت ہوئے، ۸۲۶ھ میں علی کے انتقال کرنے پر شاہی خاندان کے ایک شخص نے سلطان زین العابدین کے نام سے اپنے سر پر تاج شاہی رکھا، یہ کشمیر کا سب سے ہر دلعزیز بادشاہ ہوا ہے، اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اُس نے نومسلموں کو جو بہ دستی مسلمان بنائے گئے تھے، اجازت دیدی کہ جو چاہے، اپنے پرانے مذہب میں واپس آسکتا ہے، چنانچہ بعضوں نے اس اجازت سے فائدہ اٹھایا، اور اکثر نئے دین پر قائم رہے، اس کے قوانین، اس کا تدبر، اُس کی سیاست اس عہد کے لئے ایک نمونہ تھی، علم و فن، صنعت و حرفت کو اس نے بڑی ترقی دی، بہت سے نئے گانوں اور شہر آباد کئے، بہت سی نئی عمارتیں بنائیں، اُس کے انصاف کے سبب سے رعایا امن سے سوتی تھی،

کشمیر پران نومسلم خود مختار بادشاہوں نے دو سو برس سے زیادہ حکومت کی، اس عرصہ میں انھوں نے ملک کو ترقی دینے میں جو کوشش کی، تاریخ زبان حال سے اوس کو آج تک سراہتی ہے انھوں نے زراعت کے لئے زمینداروں کے ساتھ جو رعایت کی، اس کا نتیجہ یہ نکلا، کہ چپہ چپہ بھی زمین خالی نہ رہی، اور کاشت کار فارغ البال ہو گئے، باغوں پر بھی انھوں نے کافی توجہ دی اور بکثرت باغ لگائے، عمارتیں کافی تیار کرائیں، ڈل پر جو عمارت تیار کی گئی، وہ عجائبات میں شمار ہونے کے قابل ہے، قوانین بھی اچھے اچھے جاری کئے، دوسرے ملکوں کے سفیر بھی آتے رہتے تھے، مثلاً سمرقند، خراسان، مکہ معظمہ، مصر، گیلانی کے علاوہ ہندوستان کے بادشاہوں سے بھی مراسم دوستانہ تھے[1]،

گجرات نومسلم سلاطین کے سب سے نامور خاندان نے گجرات پر حکمرانی کی ہے، اُن کا نام آل مظفر تھا، اُن کی تاریخ یہ ہے: کہ ۷۴۶ھ میں فیروز شاہ تغلق گجرات میں شکار کھیل رہا تھا، کہ اچانک اپنے لشکر سے جدا ہو کر رات کے وقت تھنیر ضلع تھانیسر پہنچا، وہاں کے پٹیل سہارن نامی نے شب باشی کا انتظام کیا، اور صبح کو حسن خدمت کے عوض میں سہارن اور اس کا بھائی سادھو دونوں کو ساتھ لے کر جب دہلی پہنچا تو سہارن کو آبداری کے عہدہ پر ممتاز کیا، فیروز شاہ کے بعد محمد شاہ نے ۷۹۳ھ میں سہارن کے لڑکے ظفر خاں کو گجرات کا ناظم بنا کر بھیجا، اس نے بدامنی کو دور کر کے چند سال میں اپنی حکومت مضبوط کر لی، ۸۰۶ھ میں اس کے لڑکے محمد شاہ تاتارخاں نے دہلی فتح کرنا چاہا، لیکن راستہ ہی میں مر گیا،

۸۱۰ھ میں ظفر خاں نے مظفر شاہ کے لقب سے گجرات کا خود مختار بادشاہ بن کر دہلی سے علحدگی کا اعلان کر دیا، ۸۱۳ھ میں اس کے مرنے پر احمد شاہ اس کا پوتا بادشاہ ہوا، اس نے ٹمن کو

[1] تاریخ فیروز شاہی و طبقات اکبری جلد سوم

چھوڑ کر احمد آباد کی بنیاد رکھی، اور اسی کو پایۂ تخت بنایا، قلعہ اور محلات کے علاوہ ایک عظیم الشان جامع مسجد تیار کی، جو آج تک موجود ہے، سنہ ۸۴۶ھ میں اس کا لڑکا محمد شاہ ثانی تخت نشین ہوا، یہ بڑا فیاض تھا، اسی لئے اس کو "زر بخش" کہتے تھے، اسی نے احمد شاہ اور شیخ احمد کھٹو کے مقبرے تیار کرائے، گجرات میں ایک ہی خاندان کی حکومت پونے دو سو برس رہی، اس عرصہ میں گجرات نے ہر صورت سے ترقی کی، ان کا پایۂ تخت احمد آباد اور چانپانیر رہا، ان بادشاہوں نے بہت سے گانوں اور شہر بسائے، سلطان پور، احمد نگر، محمود آباد، مظفر آباد (کتیانہ) دولت آباد (بڑودہ) مصطفےٰ آباد، محمد آباد (چانپانیر) احمد آباد وغیرہ اس زمانہ میں آباد ہوئے، احمد آباد میں پتھر کی عمارتیں بکثرت بنائی گئیں، خاص کر بعض مسجدیں اس کاریگری سے تیار ہوئیں کہ اس کے ایک مینار کو ہلانے سے دوسرا مینارہ بھی ہلنے لگتا ہے، میں نے اس مینارہ کو خود دیکھا ہے، اسی طرح کھجوریا مسجد بھی عجائبات میں شمار کی جاتی ہے، مقبرے، مدرسے، حمام، سرائیں، بہ کثرت بنیں، جن کے آثار آج بھی موجود ہیں،

سلاطین گجرات عالموں اور صوفیوں کی بڑی قدر کرتے تھے، یہی سبب ہے کہ دوسرے ملکوں سے بڑے بڑے محدثین اور فقہا، مشائخ اور علماے باکمال گجرات میں آکر آباد ہو گئے، اور تمام عمر توسیع علوم و فنون میں مصروف رہ کر اسی جگہ پیوند خاک ہوئے، محمود اول کے زمانہ میں قاضی اور محتسب پر ملا بادشاہ کو ٹوکتے اور ان پر احتساب کرتے، مظفر حلیم مدعی کے ساتھ عدالت میں کھڑا ہوتا، مولانا رکن الدین شکر گنج، شیخ کھٹو ہی، قطب عالم، شاہ عالم، ماہ عالم، شیخ برہانی جیسے مشائخ کبار اسی زمانے میں تھے، علامہ محمد طاہر پٹنی، شاہ وجیہ الدین گجراتی، عماد الدین طارمی، اسی زمانہ کے بھنزون علمار میں سے تھے،

اسی عہد میں بے شمار کتابیں ہر علم و فن کی تصنیف اور ترجمہ کی گئیں، زراعت کے لئے بڑی تعداد میں تالاب کھدوائے گئے، جن میں سے اکثر اب بھی موجود ہیں، اسی کا نتیجہ تھا کہ مظفر شاہ ثانی

کے زمانہ میں زمین کسی جگہ خالی پڑی نہیں ملتی تھی، آم اور کھرنی کے کئی لاکھ درخت لگائے، درختوں کی کثرت سے احمدآباد کا شہر باغ ہی باغ نظر آتا تھا، احمدآباد کے پاس جو کئی کوس کا باغ لگایا تھا، اُس کا نام "باغ فردوس" تھا، ایرانی طرز کی چمن بندی گجرات میں بہت عام ہوگئی تھی، عام طور پر بادشاہ سخی ہوتے تھے، اُن کی سخاوت سے خاص کر قحط کے زمانہ میں بڑا فائدہ ہوتا تھا، اکثر سلاطین گجرات کو عدل و انصاف کا بڑا خیال رہتا، ضرورت کے وقت بادشاہ خود بھی تحقیقات کرتا، غیر ممالک سے اُن کے تعلقات خوشگوار رہے، جونپور، دہلی، بنگالہ، کشمیر، ایران، روم، مصر، اور دیگر جگہ کے سفیر تحفے لیکر اُن کے دربار میں حاضر ہوتے، مصر میں جب تک عباسی خلافت قائم رہی، سفیر کئی بار آئے، اور گئے، آصف خان، افضل خان، عماد الملک، ملک شعبان، خداوند خان جیسے لائق وزیر اسی زمانہ میں تھے، فوجی قابلیت یہاں کی خاص قوموں میں فطری تھی اس سبب یہاں کی فوجی قوت ہمسایہ سلطنتوں سے ہمیشہ زیادہ رہی، ہندوؤں کو فوجی اور ملکی عہدے ملتے تھے، احمد شاہ اوّل کے وقت میں نائب وزیر، محمد شاہ ثانی کے عہد میں وزیر مال محمود اوّل کے زمانہ میں رائے رایان امیر، بہادر شاہ کی فوج میں سپہ سالار اور قلعدار ہندو تھے، دکن کے بعد توپ کا استعمال بھی سب سے پہلے گجرات ہی میں ہوا، فوجی بھرتی کا قاعدہ موروثی تھا، ابتدا میں تنخواہ نقد ملتی تھی، لیکن احمد شاہ نے نصف نقد اور نصف جاگیر (زمین) مقرر کی، مظفر دوم کے عہد میں زراعت کو اس قدر ترقی ہوگئی تھی، کہ جانوروں کا چرنا مشکل ہوگیا، ناچار گانوں میں چرائی کے لئے چراگاہیں الگ بنانی پڑیں، بحری تجارت کو اسقدر ترقی ہوگئی تھی، کہ ۸۴ بندرگاہیں گجرات کے ماتحت تھیں، یہاں ہر موسم میں ملکی اور غیر ملکی جہاز کھڑے رہتے تھے، ایران، عراق، یمن، حبشہ، عرب اور مصر کے تاجر موجود تھے، بہادر شاہ کے عہد میں گجرات کا بحری بیڑہ اس قدر مضبوط تھا کہ اُس وقت ہندوستان میں کسی کے پاس

نہ تھا (مرآۃ سکندری بمبئی ، تاریخ فرشتہ جلد چہارم حیدرآباد و طبقات اکبری سوم کلکتہ)

یہ کارنامے ایک خالص ہندی الاصل اور ہندوی النسل مسلمان خانوادہ کے ہیں ؛

دکن کے بہمنی | دکن کی اب سے بڑی اور پہلی سلطنت کا نام بہمنیہ ہے ، بہمنیہ کیوں کہلاتے ہیں ؟ مورخوں نے اس کی کوئی معقول توجیہ اب تک پیش نہیں کی ہے ، بہمنی سلاطین کے درباری مورخوں نے اس باب میں اس خصوصیت کا اظہار کیا ہے ، جو عجمی مورخوں کا خاصہ ہے ، یعنی اپنے ممدوحوں کو اعلیٰ نسب اور پرانے ایرانی سلاطین کی نسل ظاہر کرکے ان کے لئے سلطنت کا پیدائشی حق ثابت کرنا ، انھوں نے لفظ بہمن کے شاعرانہ ضلع جگت اور مناسبات کی بنا پر ، ان کو بہمن ابن اسفندیار کی نسل بناکر کلاہ کیانی ان کے سروں پر رکھا ، اور کبھی جام جم سے ان محفلوں کو سجایا ہے یہ اسی قسم کی لفظی غلطی ہے ، جیسے سندھ اور کچھ کے جام لقب کے راجاؤں کو جمشید ایران سے نسبت دینے کی کی گئی ہے ، میں نے اپنے امکان بھر تمام موجودہ تاریخوں میں ان سلاطین بہمنیہ کی اصلیت کی تلاش کی کوشش کی ، مگر کامیابی نہیں ہوئی ، یہاں تک کہ ایک زمانہ میں میرا رجحان یہی تھا کہ یہ نومسلم خاندان تھا ، مگر اب تک دلائل اس کی تائید میں نہیں ملے ہیں ، پروفیسر ہارون خاں شروانی نے مطلع کیا ہے ، کہ ان کی تحقیق میں یہ بہمنی عجمی امراء میں سے تھے ، میں نے ابھی تک اُن کے دلائل نہیں پڑھے ، اس باب میں جو کچھ بھلا بُرا موجود ہے ، وہ مورخ فرشتہ کے بیانات اور اقتباسات ہیں ، مورخ مذکور نے بھی خوب چھان بین کی ، مگر افواہ اور قیاس کے سوا وہ بھی کچھ نہ کہہ سکا ، سلطنت بہمنیہ کے بانی کا نام قبل از سلطنت اس کے ہم عصر دہلوی مورخین سراج عفیف اور ضیا برنی نے ہر جگہ حسن گانگو لکھا ہے ، (ملاحظہ ہو فیروز شاہی سراج عفیف مطبوعہ کلکتہ ص ۵۱۵ و ۵۲۰)

عصامی نے فتوح السلاطین میں حسن کا نام بہمن بتایا ہے کہتا ہے :-

بہ سیرت فریدوں و بہمن بنام　　　　　شدہ کنیش ابوالمظفر ہذا م

میری تحقیق میں حسن کا دوسرا نام بہمن کبھی نہ تھا، بلکہ یہ وہ لقب ہے، جس کو سلطنت کے بعد اس نے اختیار کیا تھا، حالانکہ اس قسم کے فارسی ناموں کا رواج اس زمانہ میں بھی تھا، جیسا کہ خود حسن کے داماد کا نام بہرام خاں تھا، مگر صحیح یہی ہے، کہ یہ لقب اس نے سلطنت کے بعد اختیار کیا ہے، اور اس کی صحیح صورت وہی ہے، جو اس کے کتبوں اور سکوں پر ہے، اس کے سکون اور کتبوں پر اس کے یہ خطابات کندہ ملے ہیں، جیسا کہ باغ عامہ حیدرآباد دکن کے عجائب خانہ میں ایک پتھر بھی نظر آتا ہے،

"سکندر ثانی یمین الخلافت ناصر امیر المومنین السلطان الاعظم علاء الدنیا والدین ابو المظفر بہمن شاہ السلطان"

"حسن" اس کا اصلی نام ہونا یقینی ہے، جس کی نسبت سے گلبرگہ کا حسن آباد نام رکھا گیا ہے، کانگو یا گانگو اس کے نام کا دوسرا جزء بھی اس کے ہم عصر مورخین کے بیان سے ثابت ہے، اور بہمن نہیں، بلکہ بہمن شاہ کی صورت میں اس کا یہ لقب سکوں اور کتبوں میں موجود ہے، اس لئے اس کا پورا نام و لقب "حسن گانگو بہمن شاہ" تھا، جیسا کہ فرشتہ نے تینوں کو یکجا کر کے لکھا ہے،

ان میں سے گانگو اسلامی نام نہیں، پھر حسن کے ساتھ گانگو کا جوڑ کیا ہے، فرشتہ کا بیان ہے، کہ گانگو پنڈت اصل میں ایک دکھنی برہمن کا نام تھا، یہ پہلا برہمن ہے، جس نے کسی مسلمان کی نوکری اختیار کی، یہ علم نجوم اور جوتش میں ماہر تھا، اس نے دکن سے دلی آکر شہزادہ محمد تغلق کی نوکری اختیار کی، اور جاہ و منصب پیدا کیا، اسی زمانہ میں حسن نام ایک غریب و بدحال شخص دلی آکر گنگو برہمن کے پاس پہنچا، برہمن نے اسے ہل بیل دے کر دلی کے پاس کسی کھیت کے جوتنے پر نوکر رکھ لیا، حسن نے کھیت میں ہل چلایا تو پل کسی بھاری چیز سے ٹکرایا، اس نے اس کو نکالا، تو ایک بڑا خزانہ پایا،

حسن نے یہ پورا خزانہ جوں کا توں گنگو برہمن کے سامنے لاکر پیش کیا، برہمن کو اس کو دیانت داری ایمانداری پر بہت تعجب ہوا، اور اس کا ذکر اس نے شہزادہ محمد تغلق سے کیا، شہزادہ نے اس کی تعریف بادشاہ وقت غیاث الدین تغلق سے کی، غیاث نے خوش ہو کر اس کو اپنے امیران صدہ میں شامل کرلیا، گانگو برہمن کو حسن کے زائچہ سے یہ معلوم ہوچکا تھا کہ یہ ایک دن بادشاہ ہوگا، چنانچہ اس نے حسن سے یہ شرط قبول کرائی کہ جب اللہ تم کو سلطنت دے، تو میرا نام اپنے نام کا جزو بنانا، اور سرکاری دفاتر کا سارا اہتمام مجھ کو اور میری اولاد کو نسلاً بعد نسلٍ سپرد کرنا، حسن نے دونوں شرطیں قبول کیں، چنانچہ اسی وقت سے اس نے اپنا نام حسن گانگو بہمنی قرار دیا، اور سلطنت کے بعد اپنے تمام سرکاری دفاتر کا کام گنگو برہمن کے سپرد کردیا،

اب اس کے بہمن نام کی توجیہ سنیئے، اس کے مداح موزخوں نے اس بہمن کو بہمن بن اسفندیار سے ملایا ہے، جیسا کہ تحفۃ السلاطین یا فتوح السلاطین سراج التواریخ اور بہمن نامہ میں مذکور ہے، فرشتہ لکھتا ہے، کہ مجھے خود بھی بہمن سلاطین کے حسب و نسب کی بڑی تلاش تھی، اتفاقاً احمد نگر کے کتب خانہ میں اس کو ایک قلمی رسالہ اس بحث پر ملا، جس میں بہمنی سلاطین کا پورا نسب نامہ درج تھا، جو حسب ذیل ہے،

حسن بن کیکاؤس بن محمد بن علی بن حسن بن سیام بن سیمون بن سلام بن ابراہیم بن شیدو بن فرخ بن شہریار بن عاد بن سید بن ملک داؤد بن ہوشنگ بن نیک کردار بن فیروز بخت بن نوح بن صانع، اور صانع چند واسطوں سے بہرام گور کی اولاد تھا، اور بہرام گور ساسان کی نسل سے تھا، اور ساسان بہمن بن اسفندیار کی نسل سے تھا،

یہ نسب نامہ جیسا کہ اس کی ترتیب سے ظاہر ہے سراسر جعلی ہے، یہ نہ عربی نہ فارسی نہ ترکی ہے، اور بے جوڑ ناموں کا بے میل سلسلہ ہے، خود فرشتہ بھی اس کی صحت کا قائل نہیں، اور اس نے اپنے اسی

نظریہ کو جو گنگو برہمن کی حکایت پر مبنی ہے، ترجیح دی ہے،

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ حسن کی قومیت اور قبیلہ کے باب میں تمام مورخین خاموش ہیں لیکن فرشتہ کے قلم سے ایک جگہ ایک فقرہ اس سلسلہ میں نکل گیا ہے، جو یہ ہے،

"علی شاہ خواہرزادہ مظفر خاں علائی کہ از امیران صدہ بود واز دولت آباد جہت تحصیل ال سلطانی بگلبرگہ رفتہ بود چوں آں حدود از عمال خالی دیدبرادران خود را کہ یکے از آنہا حسن گانگوی بود یکجا جمع کردہ (صفحہ ۲۷۱ نولکشور)

اس فقرہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ظفر خاں جو سلطان علاء الدین خلجی کا مشہور سپہ سالار تھا، اس کا بھانجا علی شاہ تھا، اور اس کے بھائیوں میں سے حسن گانگو تھا،

(۱) لیکن اس فقرہ میں کسی غلطی کا ہونا مجھے نظر آتا ہے، اگر فرشتہ کو واقعاً اس کے خاندان کا علم تھا، تو اس کے نسب کی تحقیق کے موقع پر اس کا ذکر کیوں نہیں کیا،

(۲) اس کے نہ ماننے کا دوسرا سبب یہ ہے کہ اس کے بعد ہی یہ ہے کہ علی شاہ مع برادران قید ہو کر سزائے قتل کو پہونچے، اب اگر حسن اُس کے بھائیوں میں سے ہوتا، تو وہ بھی قتل ہو چکا ہوتا،

فرشتہ کا یہ بیان اس وقت اور بھی مشتبہ ہو جاتا ہے، جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرشتہ کے اس بیان کا ماخذ برنی کی فیروز شاہی ہے، لیکن اس واقعہ کے ذکر میں یہ فقرہ کہ حسن گانگو علی شاہ کا بھائی تھا، اس میں مطلقاً موجود نہیں، عبارت یہ ہے :-

"فتنہ علی شاہ کہ خواہرزادۂ ظفر خان علائی کہ امیر صدہ قتلغ خان بود ظاہر شد وعلی شہ مذکور از دیوگیر بہ تحصیل در گلبرگہ رفتہ بود آنطرف را از سوار و پیادہ و مقطعان و والیان خالی دید، برادران خود را با خود یار کردہ .... سلطان علی شہ باغی غدار را با برادران دست راست دادہ و از حصار فرو آورد .... سلطان محمد علی شہ برادران او را

درغزنین فرستاد و ایشاں از آنجا باز آمدند، و ہر دو برادر ان پیش داخول سیاست نمودند"

(تاریخ فیروز شاہی جلد اول ص ۲۴۸ و ۲۴۹)

مجھے خیال ہوا کہ فرشتہ کی عبارت میں کچھ کتابت کی غلطی ہے، "برادران خودرا" کی جگہ "برادران خودرا" ہوگا، اس غرض کے لئے میں نے فرشتہ مطبوعہ بمبئی کا قدیم نسخہ اور کتب خانہ ندوۃ العلماء میں ایک قلمی نسخہ دیکھا، سب میں برادران ہی لکھا پایا، اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ حسن کے ساتھ گانگو نام اور بہمن شاہ لقب کی کوئی صحیح توجیہ تک میری رسائی نہیں ہوئی ہے، بہمن شاہ لقب اور دکھن کے برہمنوں کے اس کے ساتھ اتحاد سے یہ خیال ہوتا ہے کہ اس نے نسبی طور سے نہیں تو سیاسی طور سے دکھنی برہمنوں کو ضرور اپنے ساتھ ملالیا تھا، اور یہی اس کی کامیابی کا راز تھا، اور اسی کی علامت کے طور پر ان کے خوش کرنے کیلئے اس نے اپنا شاہی خطاب بہمن شاہ یعنی برہمنوں کا بادشاہ مقرر کیا تھا، جیسا کہ اس کے کتبوں اور سکوں میں کندہ ملتا ہے۔

لفظ بہمن وہی مشہور لفظ برہمن ہے، شمالی ہند میں اس کا تلفظ فارسی بہمن یا برہمن ہے، اور اس کی جمع براہمہ اور دکن میں اس کا عام تلفظ بہمن ہے، اور اس کی جمع بہامنہ بولی جاتی ہے، چنانچہ فرشتہ میں لفظ کی یہ دونوں شکلیں ایک ساتھ ملتی ہیں،

"اول کسے کہ از فرقہ براہمہ در دور اسلام نوکری قبول کرد، گانگو پنڈت بود، تا حال کہ سنہ ۱۰۱۵ ہجری است بخلاف سائر ممالک ہند خصوصاً دفتر بادشاہان دکن و نویسندگی ولایات ایشان بہ بہامنہ مرجوع است" (ص ۲۷۸ نولکشور)

اس عبارت میں شمالی ہند کے تعلق سے براہمہ کہا گیا ہے، اور جنوبی ہند کے تعلق سے بہامنہ، بہمن شاہ یعنی برہمن شاہ ویسی ہی ترکیب ہے، جیسے کابل شاہ، ہندو شاہ، شیروان شاہ، خوارزم شاہ، جو مشہور بادشاہوں کے خاندانی نام ہیں،

یہ تو بہمن شاہ کی ایک لگتی ہوئی توجیہ ہے، مگر گانگو نام کی توجیہ کا جو شروع ہی میں اس کے نام کا جزو ہے، جیسا کہ سراج عفیف اور ضیا برنی کے حوالوں سے ثابت ہے، ابھی تک حل نہ نکل سکا،

بہرحال بہمن شاہیہ اگر نسل کے ہندو نہ ہوں تاہم انھوں نے وجے نگر کے ہندو راجاؤں کی بیٹیوں کو قبول کیا تھا، مگر ان سے نسل کا چلنا ثابت نہیں ہوتا،

بہمینہ سلطنت کے ختم ہونے پر اوس کی خاک سے پانچ چھوٹی بڑی سلطنتیں پیدا ہوئیں جن میں تین نظام شاہی، عماد شاہی، اور برید شاہی ہمارے موضوع سے متعلق ہیں،

نظام شاہی | نظام شاہی سلطنت کا بانی نظام الملک بحری تھا، یہ خالص دکنی ہندو نسل سے تھا، فرشتہ کا بیان ہے کہ اس کا ہندو نام تیما بھٹ اور باپ کا نام بھیرو تھا، اس کا اسلامی نام حسن رکھا گیا، اور بعد کو بھیرو کو بحری بنا کر حسن بحری کے نام سے مشہور ہوا، (فرشتہ نمبر ۲ ص ۱۸۱ و طبقات اکبری نمبر ۳ ص ۰۰) فرشتہ کا بیان ہے:

"از بہامنہ معتبر دولت خانہ نظام شاہیہ شنیدم کہ پیش از سلطنت نظام شاہ بحری بچندیں سال اجداد نظام شاہیہ از براہمہ پرگنہ پاتری در قدیم الایام تعلق آبا و اجداد داشتہ بودند، بتقریب سببے تغیر مکان کردہ بولایت بیجانگر رفتہ بودند، دراں عدو دبسر می بردند"

اسی تعلق کی بنا پر برہان نظام شاہ نے اس پرگنہ پر قبضہ کرکے اپنے خاص گاؤں کو اپنے ہندو برہمن عزیزوں کے سپرد کر دیا تھا، فرشتہ کی شہادت ہے کہ

"برہان نظام شاہ آن پرگنہ را بقبض خویش درآوردہ موضع موروثے بہ بہامنہ خویش و قرابت خود کہ رئیس کفرہ بودند بطریق انعام عنایت فرمودہ"

اس سے معلوم ہوا کہ اس کا اصل وطن موضع پاتری تھا، جہاں اس کا خاندان آباد تھا،
یہ بیجانگر کے ایک برہمن کا لڑکا تھا، سلطان احمد شاہ بہمن نے اس کو ذہین، دانشمند اور حساب کتاب میں ماہر پایا، اس لئے اس کو بھی شاہزادوں کے ساتھ مکتب میں بٹھادیا، اور فارسی کی تعلیم دلائی، پہلے وہ میر شکار کے عہدہ پر فائز ہوا، پھر نائب وزیر بنایا گیا، سلطان محمود بہمنی کے عہد میں خواجہ جہاں محمود گاواں کے مرنے کے بعد وزیر کل ہوا، اس کا لڑکا احمد باپ کی جاگیر کا انتظام کرتا تھا، نظام الملک کے مرنے پر اس نے سلطنت کو اس خوبی سے چلایا، کہ اس کی کوئی ڈھیلی کل ڈھیلی نہ رہنے دی، محمود بہمنی کے وزیر کو شکست دے کر ۸۹۵ھ میں ایک باغ اس فتح کی یادگار میں لگایا اور اپنا نام نظام شاہ رکھا، ۹۰۰ھ میں دولت آباد کے مقابل ایک نیا شہر احمد نگر کے نام سے بساکر اس کو بنایا، اس سے قبل جنیر اس کی راجدھانی تھی، چند ہی سال میں یہ شہر بڑا آباد اور بارونق بن گیا، باغ نظام کو قلعہ نما تیار کرایا، اور مختلف محلوں کو رنگین کانچ کے ذریعہ دلکش تصویروں سے آراستہ کیا، دولت آباد فتح کر کے کاندیس اور بگلانہ کو مطیع کیا، ۹۱۴ھ میں اس نے وفات پائی،
اس کا لڑکا برہان نظام شاہ کمسن تھا، اس لئے سارے اختیارات پر اس کے وزیر مکمل خاں کا قبضہ ہوگیا، ۹۲۴ھ میں اس نے پاتری کو جو اس کے باپ دادوں کا اصلی وطن تھا فتح کرلیا، ۹۲۰ھ میں ایک شیعہ بزرگ شاہ طاہر کے اثر سے اس نے شیعی مذہب اختیار کیا، اور اسی کو سرکاری مذہب قرار دیا، ۹۳۵ھ میں بہادر شاہ گجراتی سے جنگ میں شکست کھاکر خراج دینے کی شرط پر صلح کرلی، اس طرف سے مطمئن ہوکر اس کے وزیر کنور سین نے مرہٹوں سے لڑکر ۳۲ قلعے چھین لئے، ۹۶۱ھ میں سلطان دنیا سے کوچ کر گیا، حسین نظام شاہ نے تخت نشیں ہوکر پہلے تو خانہ جنگی کا خاتمہ کیا، پھر پرتگیزوں کو اپنا مطیع بنایا، ۹۷۰ھ میں نظام شاہ کی بیٹی چاند بی بی سے عادل شاہ (بیجاپور) کا نکاح ہوا، ۹۷۲ھ میں دکنی فوجوں کے ساتھ تالی کوٹ کی جنگ میں شریک ہوا،

وجیانگر کے راجا "رام راج" کا خاتمہ کرکے جب واپس آیا، تو خود بھی دنیا سے کوچ کر گیا، نظام شاہی سلطنت کی عمر صرف ڈیڑھ سو برس رہی اُن کا پایۂ تخت احمد نگر تھا، یہاں انھوں نے بڑے بڑے محل بنائے، ان میں ششتی محل خاص شہرت رکھتا تھا، باغ بکثرت لگائے، باغوں کی کثرت کے باعث ملک بہشت کا نمونہ معلوم ہوتا تھا، صلابت خاں اور خواجہ جہاں دکنی جیسے وزیر اسی زمانہ میں تھے، اُن کا علمی دربار بھی بڑا بارونق تھا، ملا پیر محمد، شاہ طاہر، ملا ظہوری، ملک قمی جیسے اہلِ علم اور شاعر اسی دربار سے تعلق رکھتے تھے، رعایا کا مذہب سُنّی مہدوی تھا، اور حکمران شیعہ تھے، غیر ملکیوں سے بھی اُن کے تعلقات اچھے تھے، ایک دوسرے کے سفرا تحفوں کے ساتھ آمد ورفت رکھتے تھے، ہمایوں بادشاہ ایران سے اسی عہد میں واپس آیا، ملکی اور غیر ملکی جھگڑے البتہ اکثر ہوتے جس نے سلطنت کو کمزور کر دیا، عورتیں بھی سیاست میں حصہ لیتی تھیں دکن کی مشہور ملکہ چاند سلطانہ اسی خاندان سے تھی، اس کی فوجی طاقت بھی کسی سے کم نہ تھی یہ سلاطین بڑے جنگجو تھے، عادل شاہی اور برار کے ساتھ ہمیشہ جنگ کرتے رہتے، احمد نظام شاہ کو کشتی کا بڑا ذوق تھا، یہی مذاق رعایا کا ہو گیا تھا، اسی کے یہاں یک کی (دو کل) کا بڑا رواج تھا، علما تک اس سے محفوظ نہ تھے، آخر زمانہ میں ملک عنبر حبشی نے جنگ کا ایک نیا طرز ایجاد کیا، جس کو جنگ گریزپا (قزاقانہ جنگ) کہتے ہیں یعنی گوریلا وار، اس کی فوج میں مرہٹے زیادہ تھے، اسی سبب سے مرہٹوں کو اس لڑائی کی بڑی مہارت ہو گئی، سیوا جی کو تو یہ طریقہ اس قدر پسند آیا کہ عمر بھر اسی طریقہ پر لڑتا رہا، صلابت خاں کے وقت میں تجارت کو بھی اچھی ترقی ہوئی، مگر جنگ اور خانہ جنگی کے سبب زراعت وصنعت پر کافی توجہ نہ ہو سکی[1]

عماد شاہی | دکن کی دوسری سلطنت جو بہمینہ کے ایک گوشہ میں قائم ہوئی تھی، عماد شاہی

---

[1] آثر نظامی شاہی، مطبوعہ دہلی، فرشتہ جلد چہارم حیدرآباد

عماد شاہی سلطنت کا بانی فتح اللہ عماد الملک ہے، یہ بیجانگر کے ایک ہندو کا لڑکا تھا، بچپن میں گرفتار ہو کر سپہ سالار خانجہاں کے غلاموں میں داخل ہوا، اس کی وفات پر سلاطین بہمن شاہی کے غلاموں میں شامل کر لیا گیا، محمود بہمن شاہ کے عہد میں خواجہ محمود گاواں وزیر کی عنایت سے اس کو عماد الملک کا خطاب ملا، اور برار کا صوبہ دار مقرر ہوا، ۸۹۰ھ میں وہ خود مختار ہو گیا، اس کے مرنے پر اس کا لڑکا علاء الدین عماد شاہ تخت کا وارث ہوا، اس نے اسماعیل عادل شاہ کی لڑکی سے شادی کرکے اپنی قوت کو ترقی دی،

برہان نظام شاہ نے اس کے دو قلعے دبائے تھے، اس کے لئے بڑی خونریز جنگ ہوئی، شکست پا جانے پر خاندیس کے حاکم سے مدد کا طالب ہوا، لیکن نظام شاہ نے دونوں کی فوجوں کو شکست دی، ۹۳۴ھ میں خاندیس کے حاکم کے ذریعہ مدد کے لئے سلطان بہادر گجراتی کو بلایا، جس نے برار اور نظام شاہ دونوں کو اپنا باجگذار بنا لیا، اس کے مرنے پر اس کا لڑکا دریا عماد الملک حاکم ہوا، اس نے اپنی لڑکی کی شادی حسن نظام شاہ سے کر دی، عرصہ تک حکومت کرکے دنیائے فانی کو خیرباد کہا، اب اس کا چھوٹا کم عمر لڑکا برہان عماد شاہ مالک تخت ہوا، لیکن تفاول خاں دکنی نے برار پر قبضہ کرکے اس سلطنت کا خاتمہ کر دیا، اور خود تفاول خان کو مرتضیٰ شاہ نے شکست دے کر قتل کر دیا، اور برار کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا، اس سلطنت کا پایۂ تخت کاویل تھا، یہ ایک چھوٹی سی ریاست تھی، اور ہمیشہ لڑنے بھڑنے کے سبب اس کو اس کا موقع نہیں ملا، کہ امن و امان قائم کرکے ملک کو ترقی دے، اس کی فوجی طاقت بھی بہت معمولی تھی،[1]

بریدشاہی | بہمنیہ کی تباہی کے بعد بریدشاہی خاندان دکن کی ایک چھوٹی سی سلطنت کا فرمانروا تھا، جس کا پایۂ تخت بیدر تھا، اس کا بانی قاسم برید المتوفی ۹۱۰ھ ترک تھا، مگر اس نے اپنے لڑکے کی شادی جس کا نام علی برید تھا، سابا جی ایک مرہٹہ سردار کی لڑکی سے کر دی تھی، اور اسی تعلق سے چار سو مرہٹہ بہادر دو...

[1] فرشتہ جلد چہارم حیدرآباد

اس کی نوکری کی، اور سب رفتہ رفتہ مسلمان ہوگئے، اور انہی کی فوجی طاقت سے اس سلطنت کی بنیاد مستحکم ہوئی افسوس ہے کہ کسی مؤرخ نے اس کا حال نہیں لکھا، فرشتہ نے اُن کے سات بادشاہوں میں سے صرف تین کا حال لکھا ہے، اور معذرت کی ہے کہ ان کے حالات کسی کتاب سے معلوم نہیں ہوئے، اور جو لکھا ہے وہ بھی بزرگوں کی زبانی سُن کر،

بنگالہ | ہندوستان کے مشرقی گوشہ میں بنگال ہے، بنگال کو گو بختیار خلجی نے فتح کرکے اسلامی ممالک میں داخل کیا، اور مدت تک وہ دلی کے اسلامی مرکز سے وابستہ رہا، لیکن ۷۴۲ھ میں اس نے اپنی خودمختاری کا اعلان کردیا، بنگالہ کا مشہور حکمران حاجی الیاس شمس الدین بھنگرہ کا خاندان عرصہ تک یہاں حکمران رہا، ۸۱۵ھ میں بادشاہ کے وفات پاجانے پر اس کا لڑکا شمس الدین تخت نشین ہوا، لیکن کنس نے اس قدر اقتدار پیدا کرلیا تھا، کہ تمام لوگ اس سے دبنے لگے تھے، اس سے اس نے یہ فائدہ اٹھایا کہ سلطان شمس الدین کے خلاف بغاوت کرکے ۸۱۸ھ میں وہ خود تخت نشین ہوا، ابتدا میں اُس نے مسلمانوں پر بڑے مظالم کیے، لیکن حضرت نور قطب عالم کے اشارے سے جب جونپور کا بادشاہ ابراہیم شرقی، بنگال کی سرحد پر نمودار ہوا، تو راجہ کی آنکھیں کھلیں، اپنے بیٹے کو حضرت نور قطب عالم کے قدموں میں ڈال کر معافی چاہی، راجہ سات سال کے بعد چل بسا، اُس کے بعد اس کا لڑکا جیت مل جو شیخ نور کے ہاتھ پر مسلمان ہوا تھا، ۸۲۳ھ میں جلال الدین کے نام سے تخت پر بیٹھا، اس نے عدل و انصاف کا ایسا نمونہ پیش کیا کہ لوگ اس کو نوشیروان ثانی کہنے لگے، اس کے عہد میں لوگ بڑی فارغ البالی رہے، شہر پنڈوا آبادی کی کثرت سے اتنا بڑا ہوگیا کہ اس اطراف میں کوئی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا، گوڑ میں بکثرت حوض، تالاب، سرائے، مسجدیں تیار کرائیں، اور دوبارہ گوڑ کو بڑے پیمانہ پر آباد کیا، علما کی بڑی قدردانی کرتا تھا، دور دور سے علما کو بلا کر آباد کیا، تبلیغ اسلام میں بھی اس نے بڑی کوشش کی، سترہ سال حکومت کرکے ۸۴۰ھ میں وفات پاگیا، اور اس کا لڑکا احمد شاہ اس کا جانشین ہوا، اس نے بھی اپنے باپ کی روش پر چل کر ملک کو خوشحال بنانے میں کافی حصہ لیا، اس نے ۱۶ برس حکومت کی، ۸۳۰ھ میں وفات پاگیا، اور اسکے بعد پھر حاجی الیاس

کے خاندان میں حکومت چلی گئی، اس نو مسلم خاندان نے ۴۴ برس حکومت کی قلیل مدت میں اُس نے بنگالہ کو آباد کرنے اور ملک میں تمدن کو ترقی دینے میں بجد کوشش کی[1] بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت کی وجہ یہ بھی ہو کہ راجہ کے مسلمان ہو جانے سے رعایا پر بھی اثر پڑا، اور کثرت سے لوگ مسلمان ہوئے،

صوبہ متوسط | صوبہ متوسط اصل ہندوستان اور دکن کے بیچ میں پڑا ہو۔ آرین حملہ آوروں نے ہندوستان کے اصلی باشندوں گونڈ اور بھیل وغیرہ کو جب شمالی ہندوستان کے حدود سے باہر نکال دیا، تو اُن کا بڑا حصہ دکن میں چلا آیا، صوبہ متوسط میں بھی ان کی ایک آبادی قائم ہو گئی جن میں گونڈ خاص ذکر کے قابل ہیں، ان گونڈوں کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں موجودہ بھوپال، ہوشنگ آباد اور ناگپور کے اطراف میں قائم تھیں، اُن کے رئیس راجہ کہلاتے تھے، ان راجاؤں میں سے غالباً کچھ مغلوں سے پہلے اور کچھ مغلوں کے زمانہ میں مسلمان ہو گئے، اُن میں سے کسی زمانہ میں سب سے بڑا راج ناگپور کے گونڈ راجہ کا تھا، اس کا سلسلہ اب تک قائم ہے، غالباً ۱۹۱۳ء میں جب ندوہ کا جلسہ ناگپور میں ہوا تھا اس خاندان کے لوگوں سے میں ملا تھا، اس وقت کے راجہ کو انگریزوں نے پاگل بنا رکھا تھا،

دوسرا خاندان ہوشنگ آباد کے مسلمان گونڈ راجہ کا ہے، جو اس وقت بھی موجود ہیں، اُن کا نام لیاقت شاہ تھا، بھوپال میں باڑی ایک مقام ہے، وہاں تیسرے مسلمان گونڈ راجہ ہیں، جو سابق ریاست بھوپال کے جاگیردار تھے، ان سے بھوپال ہی میں ملنے کا اتفاق ہوا، ان سے معلوم ہوا کہ اُن کے پاس شاہی فرامین موجود ہیں، مجھے ان فرامین کے دیکھنے کا خود موقع نہیں ملا، مگر بعض دوستوں کے ذریعہ ان کا حال معلوم ہوا، وہ زیادہ تر قدیم ثابت نہیں ہوئے، امیر دوست محمد خان نے بارہویں صدی ہجری کے وسط میں جب بھوپال کی ریاست قائم کی تو انہی گونڈ راجاؤں کے چھوٹے چھوٹے راجاؤں کو ملا کر یا فتح کر کے ریاست کی بنیاد ڈالی، فتح بی بی جن کا نام ریاست کی تاریخ میں بہت روشن ہے، گونڈ ہی خاندان کی تھیں، جو مسلمان ہو گئی تھیں،

ان لوگوں میں عجیب بات یہ ہے کہ ان کے راج کی گدی کی مالک عورت ہوتی ہے، اور اُن کی طرف سے اُن کے شوہر راج کرتے ہیں، دوسری عجیب رسم ان میں یہ ہے کہ ان کے ہاں شادی کے موقع پر بارات دلھن

---

[1] ریاض السلاطین کلکتہ ص ۱۱۶ و تاریخ فرشتہ جلد ۴ حیدرآباد،

کی طرف سے دو دلھا کے گھر آتی ہے اُن کے راجاؤں کے آخر میں شاہ ہوتا ہے افسوس ہے کہ ان کے حالات کا پتہ اب تک نہیں چل سکا۔

مغلیہ | ہندوستان کی سب سے شاندار اور ہر دلعزیز سلطنت مغلیہ ہے لیکن اس کی شان و شکوہ اور ہر دلعزیزی کے جہاں اور بہت سے اسباب ہیں وہاں اس کی ایک بڑی وجہ اس کا حکمراں راجپوتوں سے معاشرتی میل جول ہے میں اپنے نظریہ کے مطابق راجپوتوں کو اصلاً افغان سمجھتا ہوں قندھار ان راجپوتوں کا پہلا مسکن تھا یہ اسلام سے پہلے تاتار ہندوستان آئے اور تلوار کے زور سے انھوں نے ہندوؤں کو فتح کر لیا اور تمدن کے زور سے ہندیوں نے ان کو اپنے میں جذب کر لیا، اسی لئے مسلم راجپوت اپنے لئے آج بھی خان ہی کا لقب اختیار کرتا ہے، اس لئے مغلوں اور راجپوتوں کا یہ ازدواجی میل جول ان بن نہ تھا، اس نسل اور راجپوت میل جول کا بانی اکبر ہے، اُس نے خود راجپوتوں کے متعدد خاندانوں میں شادیاں کیں، اور اپنے لڑکے جہانگیر سلیم شاہ کی بھی متعدد شادیاں کیں، چنانچہ راجہ بھگوان داس کی دختر کے بطن سے یکم ربیع الثانی سنہ ۱۰۰۰ھ کو وہ شاہزادہ خرم پیدا ہوا جس کو دنیا شاہجہاں کہتی ہے اکبر کے چچا ہندال مرزا کی لڑکی رقیہ بیگم نے جو لاولد تھی، راجہ بھگوان داس کے اس نواسے اور اکبر کے اس پوتے کو اپنے آغوشِ عاطفت میں لیا اور مادرانہ شفقت سے اس کی پرورش کی شاہجہاں کے مزاج میں جو لطافت و نفاست تھی عجب نہیں کہ وہ اسی ترکی و ہندی خون کی آمیزش کا نتیجہ ہو جس کا نمونہ اس کے عہد کی عمارتوں اور صنعتوں میں نظر آتا ہے شاہجہاں کے بیٹے اورنگزیب نے اودے پور کی رانی سے شادی کی، اس رانی کے بطن سے شاہزادہ کام بخش پیدا ہوا، بادشاہ نے اس کو بیجاپور اور حیدرآباد کے علاقے کی حکومت حوالہ کی، سنہ ۱۱۱۸ھ میں عالمگیر کی وفات کے بعد اُس نے ان علاقوں پر اپنی خود مختار حکومت قائم کی لیکن اپنے نالائق مصاحبوں کے مشورہ سے وہ اپنے بڑے بھائی شاہ عالم سے لڑ پڑا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سنہ ۱۱۱۹ھ میں وہ لڑائی میں مارا گیا،

یہ ہے اسلامی ہندوستان کی عظمت کی داستان کا آخری صفحہ ہے اس کے بعد جو کچھ ہے وہ نہ کہنے کے قابل ہے اور نہ سننے کے،

داستانِ عہدِ گل را از نظیری بشنوید بلبلاں آشفتہ تر گفتند ایں افسانہ را

تاریخ و سیاسیات کراچی اپریل ۱۹۵۱ء

